مہر نیمروز

اختر اورینوی

ماہنامہ

مہرِ نیمروز

اختر اورینوی نمبر

سید حسن مثنیٰ ندوی

فی شمارہ

دس روپے

سالانہ ____ بیرون ملک

روپے ____ ۴ پونڈ

طابع - مستفیض احمد صدیقی - انٹرنیشنل پریس شارع چندریگر - ناشر - حسن مثنیٰ ندوی العمران ۲۰۱/۹ اشرف آباد کراچی ۵

مابیخوداں بہ حلقۂ ماتم نشستہ ایم

"از خویشتن بگوئے کہ تنہا چگونہٗ"

۱۹۷۷ء

(غالبؔ)

فہرست

جلد ۲	سنہ ۱۹۷۷ء		شمارہ ۷-۸

پہلی کرن

تابشِ اختر

مہر نیمروز کے قارئین نے جو ڈاکٹر اختر اورینوی کے دوستوں، شاگردوں اور قدر دانوں کا حلقہ ہے، اچانک یہ فیصلہ کیا کہ ایک شمارہ خاص ان کی یاد میں نکالا جائے۔ ان کا انتقال اسی سال مارچ کے اختتام پر ہوا۔ ان کی جدائی کا صدمہ بھی تھا اور یہ احساس بھی کہ ایک ایسا بڑا ادیب اٹھ گیا ہے، جو نہ صرف اپنی فکر، اپنے تصورات اور اپنے نظریات کی حقیقت و اہمیت سے آگاہ تھا بلکہ پوری قوت کے ساتھ ان کو دوسروں تک پہنچانے میں مشغول تھا۔ ڈاکٹر اورینوی ان لوگوں میں نہیں تھے جو ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کی طرف لپک جاتے، ان کو صلاحیت نقد و نظر ملی تھی "اصلی سونا" بھی ان کے سامنے تھا اور اصلی سونے سے زیادہ چمکدار چیزیں بھی بازارِ حیات میں موجود تھیں نگاہوں کو خیرہ کرنے والی۔

مہر نیمروز پر ان کا حق یوں بھی تھا کہ اصلاً یہ رسالہ انہیں کے ایک محبوب شاگرد سید علی اکبر قاصد نے ۱۹۵۶ء میں نکالا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں سید علی اکبر قاصد نے انتقال کیا تو ڈاکٹر اورینوی زندہ تھے، اس خبر نے ان کو بہت تڑپایا، انہوں نے اپنے شاگرد کے مرنے پر اپنے دردِ دل کا اظہار کیا تو لکھا تھا کہ میں سمجھتا تھا میرے مرنے پر وہ لکھیں گے . . . آج علی اکبر زندہ ہوتے تو وہ اپنے استاد کی وفات پر پھوٹ پھوٹ کے روتے اور نہیں معلوم کہ کیا کچھ لکھتے۔ وہ ان کے جمال و کمال، نیک نفسی و خاکساری و خوش مزاجی کا اکثر تذکرہ کرتے تھے، اور شکیلہ اختر کا بھی جو ان کی تمام خوبیوں کی روح ہیں... آج علی اکبر تو نہیں ہیں مگر ان کا رسالہ موجود ہے۔

مہر نیمروز کے اس شمارے میں نئے مضامین بھی جمع ہیں، اور کچھ پرانے بھی۔ پرانے مضامین وہی لئے گئے ہیں جو اختر اورینوی کے ہم عصر ادیبوں اور فنکاروں نے ان کی شخصی خوبیوں اور فنی قابلیتوں کے بارے میں لکھے تھے، جس میں آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی شامل ہیں۔ اور مولانا طیب عثمانی ندوی بھی اور مشہور شاعر کلیم عاجز بھی۔ ان حضرات کے مضامین کے ساتھ ہی ایک مضمون خود اختر اورینوی کا بھی ہے "میرا نظریۂ فن"۔ یہ مضامین ہم نے ماہنامہ ساغرِ نو "پٹنہ کے اختر اورینوی نمبر" سے لئے ہیں، جو بہت قیمتی ہیں۔ یہ نمبر ڈاکٹر اختر اورینوی کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا۔ ہم ساغرِ نو کے ممنون ہیں کہ اس نے ایک بڑے ادیب کی قدر و منزلت کا حق اس کی زندگی ہی میں ادا کیا اور اب کئی سال بعد جب اس ادیب شہیر نے کوچ کیا اور یہاں اس کے شیدا بے چین ہوئے تو اسی گرانقدر مجموعے نے ہماری مدد کی۔

ہم نے اپنا یہ شمارہ خاص بڑی جلدی میں مرتب کیا ہے، یہ جامع تو نہیں ہے مگر اظہار درد کا ایک وسیلہ ضرور ہے۔ ہم اس کو سلسلے کا پہلا قدم تصور کرتے ہیں۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ نہ تو ہم نے اس شمارۂ خاص کا اعلان کیا، نہ پاکستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے دوستوں سے مضامین مانگے اور نہ ہندوستان کے قلم کاروں سے کوئی درخواست کی جن میں بیشتر ان کے قدر دانوں میں ہیں۔ ان کو خبر ہوتی تو یقیناً ان کے قلم کاغذ پر جھک جاتے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ضرور لکھیں گے۔ اختر اورینوی کی تمام ادبی کاوشوں کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور ان کے سلجھے ہوئے انداز کو آگے بڑھانے کی بھی تاکہ نئی نسل کو صحیح ادبی راستہ ملے۔

اختر اورینوی نے اس قوم کی آغوش میں آنکھیں کھولی تھیں جس کی فکر عمیق اور تاریخ وسیع ہے، وہ جانتے تھے کہ جو قوم اپنے افکار و تصورات اور تاریخ و روایات اور اپنے اسلاف کے کارناموں سے بے خبر ہو جاتی ہے وہ کبھی باقی نہیں رہتی، وہ آگاہ تھے کہ جس قوم کا ادب اپنے سرچشمے سے دور ہو جاتا ہے وہ اپنی قوم کی نہ تو پیاس بجھانے کے قابل رہتا ہے نہ اسے زندگی کا کوئی پیام دے سکتا ہے، بالآخر وہ خود بھی سوکھ کے ختم ہو جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اس ملت کی حریف تو یوں دنیا میں بہت موجود ہیں اور حریفوں کی روش دوستانہ بھی ہو تو دوستانہ نہیں ہوتی، دوستی تو وہی ہے جس میں اخلاص ہو، صداقت ہو اور یہ کمیاب ہے۔ زندہ ملت کے افراد کو ہمیشہ چوکس رہنا چاہیے اپنے حریفوں کے مقاصد و عزائم سے آگاہ رہنا چاہیے اور ان کی رفتار علمی و عملی پر نظر رکھنی چاہیے۔ اس دنیا میں غفلت سے زیادہ ہلاکت آفریں اور کوئی چیز نہیں اور غفلت کی ہزار ہا صورتیں ہیں۔

یورپ کے سیاسی دماغ نے ایک دو نہیں، بیسیوں مفروضات پر علمی و فکری ملمع چڑھا کر مشرق میں ان کو عام کیا ہے۔ اس نے اپنے زمانۂ تسلط میں دوسری اور کارروائیوں کے ساتھ جو نصاب تعلیم یہاں رائج کیا اور اس کے ذریعہ ذہنوں کو مروڑنے کی جو کوششیں کیں وہ تو الگ ہیں، اصطلاحیں ایسی ایسی رائج کیں کہ کیا کہیے۔ "نیشنلزم" بھی انہیں میں سے ایک ہے اور "کلچر" بھی۔ اور پھر کمال یہ ہے کہ کلچر کو اس نے ایک وسیع محل خانہ قرار دے کر مذہب کو بھی اس کے ایک طاقچے میں سجا دیا۔ یورپ ایک مدت سے یہ باور کرانے کی جد و جہد میں ہے کہ زندگی کے بہت سے مظاہر ہیں، سائنس، عمرانیات، فلسفہ اور فنون لطیفہ وغیرہ اور انہیں میں ایک مذہب بھی ہے، اس مفروضے کو تسلیم کر کے آگے بڑھنے پھر دیکھیے آپ کے قدم وہیں پہنچ جائیں گے جہاں یورپ آپ کو کھینچ کر لے جانا چاہتا ہے۔ اور اگر آپ چلتے چلتے کہیں بیچ راستے میں اڑ گئے تو وہ ایسی جگہ ہوگی جہاں آپ کو مذہب سے انکار کے سوا اور کوئی راستہ دکھائی نہ دے گا اس میں بھی اس کا فائدہ ہے، عالمی بساط سیاست پر جو شطرنج کی بازی بچھی ہوئی ہے۔ اس پر مہرے خاطر خواہ طریقے سے چلیں تب بھی مفید، اور اگر کسی مہرے کے ہٹ جانے سے اپنی کوئی راہ کھلتی ہو تو اس کا پٹ کر بساط سے دور ہو جانا بھی مفید۔

اختر اورینوی کی نظر جدید و قدیم دونوں علوم پر تھی، ان کے اندر صرف لسانی و ادبی تجسس کا ذوق نہیں تھا وہ تاریخی واقعات کی تہ میں اترنے کی کوشش بھی کرتے تھے ان کو معلوم تھا کہ یورپ نے مذہب کو خدا اور بندے کا ایک نجی اور شخصی رشتہ قرار دے کر بڑی چالاکی سے خدا کی حاکمیت کی جگہ اجتماعی زندگی پر اپنی حاکمیت قائم کی ہے۔ چرچ اور اسٹیٹ کی باہمی کشاکش یورپ میں کچھ بھی رہی ہو مشرق سے اس کا کوئی تعلق نہیں، نہ مشرق پر اسے چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن غور کیجیے چرچ اور اسٹیٹ کی یہ تقسیم کیا ٹھیک اسی طرح کی مشہور تقسیم معلوم نہیں ہوتی کہ

از صحن خانہ تا بلب بام از آن من — واز سقف تا بہ اوج ثریا از آن تو

گھر کے صحن سے چھت تک صرف چھت تک، بس "یہ مختصر سا حصہ" میرا۔ باقی چھت سے لے کر ساری فضا اور سارا آسمان، ثریا کی بلندی تک سب کا سب تمہارا۔ اب یورپ میں اسٹیٹ کا تعلق چرچ کے معاملات سے نہیں اور چرچ کا تعلق اسٹیٹ کے معاملات سے نہیں۔ اور یہی ان کا عقیدہ ہے۔

آدمی کی زندگی میں اصل چیز عقیدہ ہی ہے، آپ اسے فکر کہہ لیجیے، عقیدہ ہو یا فکر، اسی کا ظہور اعمال میں ہوتا ہے۔ اچھا دیکھیے۔ یورپ والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آدمی پیدائشی گنہگار ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ کہ گناہ بہر حال ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی عقیدہ ہے کہ اتنا اتنا گناہ ہوا کہ دنیا گناہوں سے بھر گئی (بھری کہ نہیں مگر وہ یہی کہتے ہیں کہ بھر گئی) آخر خدا نے اپنی مخلوق کے انجام پر ترس کھا کے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیجا جس نے مخلوق کے نام پچھلے گناہوں کی عام معافی کا اعلان کیا اور اس طرح کیا کہ خود سولی پر چڑھ کے سب کی طرف سے کفارہ بن گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ کہ اگلے پچھلے گناہ ہوا

کی عام معافی کے بعد کوئی گناہ گناہ باقی نہ رہا بلکہ "جو گناہ کیجئے ثواب ہے اب"۔ اسی طرح کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ یا فکر بھی ہے کہ یہ دنیا اتفاقی حادثے کی بدولت وجود میں آگئی ہے اور اس میں ہم انسان بھی بس خود بخود ہی اگ آئے ہیں۔ لہٰذا ہمارا اگر کوئی خالق ہے تو حادثہ ہی ہے اور کوئی نہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ کہ اب اس دنیا میں جو کچھ کرنا ہے خود ہمیں کو کرنا ہے۔ آخر جنگل میں دوسرے جانور بھی تو یہی کرتے ہیں۔ جھنڈ چڑیوں کے بھی ہوتے ہیں، غول بھیڑوں کے بھی اور ریچھ بھیڑیوں کے بھی۔ یہ ان کا سماج ہے۔ اسی طرح ایک ہمارا سماج ہے۔ پھر اس تصور کا دوسرا لازمی نتیجہ یہ کہ مر کر ہمیں یہیں مٹی میں مل جانا ہے، اور زندگی بس یہیں تک ہے۔ آگے کچھ نہیں

لیکن اختر اور رضوی قرآن مجید پڑھتے تھے۔ اور اس میں درج ہے کہ یہ بات چودہ سو سال پہلے کے لوگ کہتے تھے۔ یہ بات اگر ترقی یافتہ اور صاحب فکر رسا ہونے کی دلیل ہے تو چودہ سو سال پہلے کے لوگ تو واقعی بڑے ترقی یافتہ تھے۔ بہرحال اس قسم کے تمام عقائد وافکار سے اختر اور رضوی کو شدید الجھن ہوتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ ایسی باتوں سے مشرق اور اہل مشرق کا سرے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں یہ عقیدہ ہے کہ یہ کائنات یہ دنیا اور یہ انسان سب کچھ ایک برتر قوت کی بالارادہ تخلیق ہے۔ ہم اگر اپنے نظام جسمانی ہی پر غور کر لیں تو ہماری آنکھیں کھل جائیں گی۔ کہ یہ کسی حادثے کا نتیجہ نہیں بلکہ کسی غیر معمولی "پلانر" کے پلان کا حاصل ہے۔ ڈاکٹر اختر اور رضوی نے باقاعدہ علم الابدان کا مطالعہ بھی تو کیا تھا۔ پھر وہ اس سے بھی واقف تھے کہ مشرق کے عقیدے کے مطابق کوئی بچہ گناہگار پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ بڑے ہو کر اپنے اعمال و کردار سے اچھا یا برا بنتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کوئی بھی ایسا نہیں جو کسی فرد یا قوم یا ساری انسانیت کی طرف سے کفارہ بن جائے اور سب کو "بری الذمہ" قرار دے کر اعمال کے معاملے میں ان کو کھلی چھٹی دیدے یہاں ہر فرد بشر ایک "ذمہ دار ہستی" ہے۔ مشرق یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ حضرت مسیحؑ کو سولی دی گئی۔ یہ بات اس کے نزدیک یکسر خلاف واقعہ ہے۔ پھر یہاں جو چرچ ہے وہی اسٹیٹ ہے، اور جو اسٹیٹ ہے وہی چرچ ہے اور کوئی بھی خدا کے قانون سے باہر نہیں ہے۔ یہاں نہ کوئی پوپ ہے نہ کنگ یا کوئی، نہ ڈکٹیٹر۔ اس قسم کے سارے تصورات مشرق کے لئے اجنبی اور بیرونی ہیں یہاں بتایا گیا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں اور ان کی حیثیت صرف ان کے اعمال و اخلاق سے متعین ہوگی۔ اس دنیا میں بھی اور آنے والی دنیا میں بھی۔ یہاں دین پرائیوٹ نہیں اجتماعی ہے یہ خدا اور بندے کا مناجاتی اور روحانی رشتہ جوڑنے کی حد تک محدود نہیں۔ ہمہ گیر ہے اور پوری زندگی میں دخیل ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ بندے اور بندے کے روابط کو تم نے کس حد تک جوڑا اور اجتماع کے لئے تم کس حد تک مفید ثابت ہوئے۔ یہاں خالق کے حقوق سے بھی زیادہ اہمیت بندوں کے حقوق کی ہے یہاں نہ تو فرد ہی بے لگام ہو سکتا ہے نہ اسٹیٹ کہ جو چاہے کرے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہاں حکومت کا فریضہ معاشرے کی بہترین اخلاقی تنظیم اور زندگی کے تمام بنیادی حقوق کی فراہمی ہے۔ یہاں جس طرح خودکشی ممنوع ہے اسی طرح اخلاق کشی بھی ممنوع ہے۔ اور جس طرح بے ایمانی و ضمیر فروشی ممنوع ہے اسی طرح بے حیائی اور جسم فروشی بھی ممنوع ہے۔ اور جس طرح آدمی کو زہر کھلا کر ہلاک کرنا جرم ہے، اسی طرح اس کو کھانا نہ کھلا کر ہلاک کرنا بھی جرم ہے۔ یہاں دین کا اصرار ہے کہ ہر شخص کو صحیح علم فراہم کیا جائے اور یہ بھی اصرار ہے کہ ہر شخص کی جبلتوں کی تربیت کی جائے۔ شخصی میلانات اور حرص و ہوس کے جذبات کو کنٹرول کیا جائے تاکہ ایک ایک کو منظم و مرتب کر کے آدمی بنایا جائے اور خالص انسانی رخ پر لگا دیا جائے۔ تاکہ دنیا کو امن و سکون نصیب ہو۔ انسان پریشانی، بے اطمینانی، خوف و ہراس اور محرومیوں کی فضا سے نکلے اور صرف ایک خطہ یا طبقہ یا گروہ نہیں بلکہ پوری نوع انسانی بلا تفریق و امتیاز ایک خاندان آدم بن کر زندگی بسر کرنا سیکھے یہی نظام نو ہے اور یہی نظام قدیم بھی۔

یورپ میں مذہب و سیاست کا تصور جو کچھ بھی ہو، مشرق اس کا ہم فکر و ہم خیال کبھی نہیں رہا۔ مشرق میں معاشرے کے نظم و ضبط اور زندگی

انسانی کا حقیقی راہ نما دین ہی ہے اور یہ مشرق ہی ہے جہاں سے اس مہر درخشاں نے ساری دنیا کو روشنی، حرارتِ زندگی اور وحدت عطا کی ہے۔

اختر اورینوی کی رائے یہی ہے کہ یورپ سے آنے والے افکار و نظریات، خواہ کتنے ہی خوشنما لفظوں کے جامے میں ملبوس کیوں نہ ہوں ان کو تسلیم کرنے کی بجائے ان کی تہہ میں اترنے کی اور ان کو جاننے پہچاننے کی شدید ضرورت ہے اور یہ نظر عام ہونی چاہئے ورنہ اہل بصیرت تو کہتے رہے ہیں کہ ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　　من انداز قدت را می شناسم

اور اب تو "دام ہمرنگ زمیں" والی بات بھی نہیں کہ اس کو پہچاننے میں کچھ دشواری ہو۔ یورپ تو اب برملا کہتا ہے کہ "یہ نظریاتی عہد ہے اس میں قوموں کو میدان جنگ میں نہیں پچھاڑا جاتا۔ نہ اب بندوقوں اور رگو یوں کی کوئی ضرورت باقی رہی۔ اب ان کی جگہ نظریاتی حربوں نے لی ہے اور دیکھ لو کہ پچھلے برسوں میں کتنی قومیں بلا معرکہ پچھاڑی جا چکی ہیں" یہ خود یورپ کا بیان ہے اور دیکھنے والوں نے اس کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا ہے۔

مشرق میں دین ہی کلچر بھی ہے اور "قانون" بھی، وہ آدمی کے "باطن" کو بھی خوب تر بنانے کی جد و جہد میں رہتا ہے۔ اور آدمی کے "ظاہر" کو بھی۔ فکر و نظر کو بھی بہتر بنانا چاہتا ہے اور اعمال و اخلاق کو بھی۔ کلچر صرف لباس و پوشاک کی وضع اور رہن سہن کے انداز کا نام نہیں ہے، جو بحالت مجبوری یا بصورت نقالی کوئی اختیار کرے۔ کلچر نام ہے۔ انسانی ذہن و فکر اور احساس و جذبات کو تربیت کے ذریعے انسانی سانچے میں ڈھالنے کا۔ "ہیلنو کلچر اور رومی کلچر" آپ کے سامنے واضح مثالیں موجود ہیں۔ اسی طرح مشرق میں "دین" ہی تہذیب بھی ہے اور آرٹ بھی۔ تہذیب سماج کو جنگل نہیں سمجھتی کہ خود رو گھاس اگتی چلی جائے۔ چمن بندی اس کا کام ہے اور اس لئے صفائی ستھرائی اس کے نزدیک ضروری ہے تاکہ وہ فضول بڑھی ہوئی شاخوں کو بھی کترتی رہتی ہے تاکہ ان میں حسن و جمال پیدا ہو۔

سب سے بڑا ظلم دنیا میں یہ ہے کہ جس چیز کی جو اصلی جگہ اور محل و مقام ہے وہاں سے اس کو ہٹا دیا جائے۔ "دین" کوئی شعبۂ حیات نہیں ہے، ضابطۂ حیات ہے۔ دین کوئی شاخ نہیں ہے درخت ہے، دین کوئی جزو نہیں ہے کل ہے۔ اس کو بار بار شاخ کہنے والے در اصل اس کو اس کے محل و مقام سے ہٹانا اور اس کی "بنیاد" پر ضرب لگانا چاہتے ہیں۔

یہ تمام نکات وہ ہیں جو ہر مشرقی ادیب کے سامنے رہنے چاہئیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے ۱۹۴۰ء سے اب تک جو تحریریں لکھی ہیں ان میں طرح طرح سے یہی بتانے کی کوشش کی ہے، مگر ساری باتیں ادبی لہجے میں کہی ہیں، صاف صاف لکھتے تو وہ دوسری چیز ہو جاتی۔ ان کے افسانے ہوں یا مقالے، ناول ہوں یا ڈرامے یا نظمیں ان سب کے حدود و قیود کی پابندی کرتے ہوئے وہ ان حقائق کی اہمیت کو برابر نمایاں کرتے رہے ہیں۔ ان کا وہی افسانہ دیکھئے جو "انہیں مردہ نہ کہو" کے عنوان سے چھپا اور جس پر ترقی پسند اس بنا پر ان سے خفا ہو گئے کہ عربوں کے خلاف سازش کرنے والی استعمار پرست طاقتوں میں امریکہ برطانیہ اور روس تینوں کے نام ایک ساتھ انہوں نے کیوں لئے، یہ عنوان قرآن مجید کی ایک آیت کا حصہ ہے، اور قرآن مجید ادب کی بھی دنیا میں سب سے بڑی کتاب ہے۔

ادب بھی یورپ میں خواہ کوئی مفہوم رکھتا ہو، مشرق میں اس کی نوعیت علیحدہ ہے۔ گفتگو اصناف سخن کی یا ان کی ہیئت اور ساخت کی نہیں، اس کی روح کی ہے۔ اس کی مقصدیت کی ہے۔ اس کی مرتب کردہ فکر و نظر کی ہے۔ لفظ "ادب" کو دیکھئے کہ اپنا تعارف آپ ہے۔ اسے انگریزی، فرانسیسی یا امریکی اور روسی زبانوں کے ذریعے سمجھنے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے۔ "ادب" تادیب نفس، تربیت نفس، تہذیب نفس، اصلاح اخلاق اور تعمیر کردار کا مجموعہ ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو سراسر بے ادبی ہے۔ کوئی ادیب اگر فن کا بنیادی وصف "حسن و جمال" کو قرار دینے پر

اصرار کرے . . . تو اس کو تضاد کا شکار نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ ادب بے ادبی، بے ترتیبی، بدنظمی، بدصورتی اور بدقوارہ پن کا نام نہیں ہے یہ سچ ہے کہ دنیا میں ہر حسن فانی ہے لیکن "حُسنِ مطلق" لازوال ہے، اور وہی سرچشمۂ حسن وجمال ہے۔ اسی سے اپنی روح کو مربوط کرنا ہوگا، اس کے بغیر اپنے گرد وپیش کو حسن وجمال بخشنے کا تصور بھی ناممکن ہے، آدمی کو اس کا سلیقہ سیکھنا چاہئے۔ آدمی سیکھ کر ہی آدمی بنتا ہے اور اس کی ساری زندگی سیکھنے ہی میں صرف ہوئی ہے، نہ سیکھے گا تو اس کے افکار بھی اور اعمال بھی، سب غیر مرتب، غیر منظم اور غیر انسانی ہو کر رہ جائیں گے۔ اور غیر معقول بھی خواہ فنکار اسے محسوس کرے یا نہ کرے، ڈاکٹر اختر اورینوی ساری عمر یہی کہتے رہے۔ اپنی بائیوگرافی پر ان کو بہت اصرار تھا۔

ڈاکٹر اختر اورینوی نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۷۷ء تک ادبی دنیا میں قلمی جولانیاں بہت دکھائی ہیں انہوں نے صرف نظمیں ہی نہیں لکھیں، ناول نویسی ہی نہیں کی۔ افسانے اور ڈرامے ہی پیش نہیں کئے بکثرت تعداد میں تنقیدی وتحقیقی مقالات بھی سپرد قلم کئے ہیں۔ ان کا وہ طویل مقالہ جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی "بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقاء" ہے اور یہ مقالہ اسی نام سے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں طبع ہو کر عام لوگوں کے ہاتھوں میں بھی پہنچ چکا ہے۔ "پنجاب میں اردو" اور "دکن میں اردو" کی طرح "بہار میں اردو" کا یہ انداز بھی ذہنوں پر اثر ڈالنے والا ہے۔ اردو زبان کے بارے میں نظریات کی کوئی کمی نہیں ہے مثلاً:-

(۱) ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر محمود شیرانی نے اردو کا بنیادی سانچہ "پنجابی" کو بتایا ہے۔

(۲) پروفیسر مسعود حسین اور ان کے ہم خیالوں نے اردو کا بنیادی سانچہ "ہریانی (بانگڑو یا جاٹو)" کو ٹھہرایا ہے۔

(۳) مولانا محمد حسین آزاد اور نواب نصیر حسین خیال اردو کا بنیادی سانچہ "برج بھاشا" کو قرار دیتے ہیں۔

(۴) گریرسن، بیمز اور چٹرجی کہتے ہیں کہ اردو کا بنیادی سانچہ "کھڑی بولی ہندوستانی" ہے۔

(۵) علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ اردو کا قدیم ترین سانچہ "سندھی کی آمیزش" سے تیار ہوا ہے۔

(۶) ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو زبان کی اصل "پالی" کو قرار دیا ہے۔

اور ڈاکٹر اختر اورینوی کہتے ہیں کہ اردو کا بنیادی "سانچہ" نہیں بلکہ "سانچے" تیار ہوئے اور "ہر بھاشا" سے ریختہ کی عمارت اٹھی ہے اور اس پر انہوں نے لمبی بحث کی ہے۔

اردو زبان پاکستان کی "قومی زبان" ہے، جو دنیا کی چند سب سے بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اہل پاکستان کو خصوصیت کے ساتھ ان تمام نظریات پر غور کرنا ہوگا اور ڈاکٹر اختر اورینوی نے جو محاکمہ ان پر کیا ہے اور خود بھی ایک بات کہی ہے اس کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ان تمام نظریات میں سے کون سا نظریہ تحقیق کی نظر میں درست ہے؟ کیا یہ سب درست ہیں؟ یا یہ ساتواں نظریہ قابل توجہ ہے جو ڈاکٹر اورینوی نے پیش کیا ہے؟ یا تلاش وجستجو اپنے دلائل وبراہین کے ساتھ ہمیں اس مسئلے پر کوئی نئی تحقیق وتشریح پیش کرنے کے قابل بناتی ہے؟ ماہرین لسانیات اور اساطین تاریخ ادب سے توقع رکھنی چاہئے کہ وہ اس مسئلے کو از سر نو تنقید وتحقیق کی روشنی میں لائیں گے، اس میں شک نہیں کہ پچھلے محققین نے بڑی محنت کی ہے، لیکن نتائج کی اس بوقلمونی اور کثرت تعبیر کو اب بہر صورت کسی ایک نقطے پر لے جا پہنچنا چاہئے۔

"ادب کی خدمت بھی خدمتِ خلق ہے، اس لئے کہ ادب عوام و خواص کے دلوں کی پکار ہے۔ اس کے پس پشت ایک ہمہ گیر قابل احترام جذبہ ہوتا ہے جس کی وسعت و نیابت لامحدود ہے۔ ادیب کی ہر جنبشِ قلم آواز دیتی ہے کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ اختر اور ینوی صاحب ادب کے ایسے وتیع خدمت گزار ہیں جن کی ادبی کاوشوں نے ایک زمانے کو اپنا لیا ہے، ان کی ذات وصفات ادبی پیکر کا نمونہ بن گئی ہے۔ ادب نے بھی ان کی خدمات کو مستحسن سمجھ کر ان کی کرسی موجودہ نقادوں کی صف اول میں لگا دی ہے جس پر وہ قد و قامت کے لحاظ سے بھی بہت موزوں نظر آتے ہیں۔ یہاں میری مراد خارجی جسامت سے نہیں بلکہ ان کا ادبی مرقع پیش نظر ہے یعنی ان کے ادبی شعور و بالیدگی کا احساس ہے ..."

ڈاکٹر اعجاز حسین

ادارہ

اختر اورینوی

ڈاکٹر اختر اورینوی کا مرنا ایک قیامت کا گزرنا ہے۔ صرف شکیلہ اختر ہی کے دل پر نہیں، ان کے دوستوں اور قدر دانوں کے دل پر بھی، اور علمی و ادبی حلقے پر بھی۔ اس میں شک نہیں کہ جو اس دنیا میں آیا ہے اس کو ایک دن یہاں سے جانا بھی ضرور ہے۔ یہی قانون قدرت ہے، پھر بھی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں جی یہی چاہتا ہے کہ وہ کچھ اور جیتے، کچھ اور رہتے۔ کچھ اور اپنے ذہن و فکر کی جولانیاں دکھاتے، مگر جانے والے کو روکنا کس کے بس میں ہے۔

ڈاکٹر اختر اورینوی ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۷ء میں وفات پائی۔ لگ بھگ سرسٹھ سال کا ایک حصہ حصول تعلیم میں گزرا باقی ساری عمر دوستوں کی محبت اور علم و ادب کی خدمت میں گزار دی، سخنوری و سخن فہمی، افسانہ نگاری و تحلیل نفسی، ڈرامہ نگاری و فکر انگیزی ناول نویسی و تربیت ذہنی، مقالہ نویسی و توضیح علمی، تحقیق و تنقید، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ وہ اردو زبان کے شیدا تھے۔ انگریزی بھی خوب جانتے تھے مگر اردو کی نسبت سے ہر وہ چیز جو اس کے ذخیرے میں ہے ان کو محبوب تھی۔ اسلامی فکر، اسلامی جذبے اور اسلامی اخلاق سے مالا مال تھے۔ یہ چیزیں کتابوں سے نہیں بزرگوں کی توجہ اور بزرگوں کی نظر سے ملتی ہیں اور یہ بچپن سے ان کو ملیں خود لکھتے ہیں کہ "دادی اماں نے میری تربیت کی، وہ اپنے پوتوں پوتیوں کو قصص القرآن سناتیں اور نماز کی بہت تاکید کرتی رہتیں اور کہتیں کہ ہم کتنے گناہگار ہیں، نہ خدا کا حق ادا کرتے ہیں نہ بندوں کا۔ . . " "میری زندگی اور نصب العین کو انہوں نے بہت متاثر کیا ہے . . ." یہ بھی لکھتے ہیں کہ "میری دادی حضرت سید احمد شہید کی تحریک و پیغام کی علامت تھیں . . ." حضرت سید احمد شہید کی تحریک و پیغام سے ہر شخص آگاہ ہے، وہ انگریزوں کے تسلط سے برعظیم کو نجات دلانا چاہتے تھے، اور یہاں صحیح اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریز پوری طرح برعظیم پر مسلط ہو گئے۔ تحریک سید احمد شہید اور آزادی کے علمبردار علماء و زعماء کو جب پھانسی دے چکے اور جو بچ رہے ان کو عبور دریائے شور کی سزا سنا کر انڈمان بھیج چکے تو انہوں نے اطمینان سے مسلمانوں کے نظام دین کو، نظام معاشرت کو، نظام تعلیم کو، نظام سیاست کو، نظام تجارت و زراعت کو اور نظام صنعت و حرفت کو تباہ کیا۔ شیرازہ بکھیرا، خوف و دہشت کی فضا پیدا کی اور ساتھ ہی برعظیم کے ذہن و فکر پر بھی یلغار کی جس کا توڑ کرنے کے لیے بہت سے پختہ فکر و نظر کے اہل علم آگے بڑھے اور کامیاب مقابلہ کیا۔ عیسائیوں نے اور پھر آریہ سماجیوں نے مناظرے کی ایک ہمہ گیر بساط بچھائی، مقصود اس کا انتشار ذہنی پھیلانا تھا، یہی مشنری یہ کام بنگال و بہار میں پہلے ہی سے کر رہے تھے اور ان کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی حاصل تھی، اس مناظرے نے بہتوں کو راہ سے بے راہ کیا، بہت سے گروہ پیدا کر دیئے، مسلمان باہم بھی الجھنے لگے۔

پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا جب ملک میں سیاسی و تعلیمی جدوجہد کی فضا ہموار ہوئی۔ اس وقت ڈاکٹر اختر اورینوی کے والد صاحب نے بھی مناظرہ کرنے کے لئے کمر ہمت باندھی مگر مناظرہ کرتے کرتے وہ قادیانی حلقے سے وابستہ ہوگئے۔ حضرت مولانا ابوالجلال صاحب ندوی بھی اپنے دور میں مناظرے کے بڑے ماہر تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مناظرہ ایسا فن ہے جو حریف کو خاموش تو کر دیتا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر ایمان و ایقان کی تہ میں تشکیک کے کانٹے بھی بو دیتا ہے۔ شبہات کے بہت سے جراثیم مناظرہ کرنے والے کے اندر بھی پرورش پانے لگتے ہیں اور عوام کو بھی صحیح راہ نہیں ملتی۔ اس لئے مناظرے سے بچنا چاہئے"۔ مناظرہ بازی رفتہ رفتہ کم ہوئی تو اہل یورپ نے کلوکیم، سمپوزیم اور سمینار جیسی جدید صورتیں رائج کیں۔ سیاسی مجالس میں موافقانہ اور مخالفانہ بحث و مباحثہ کے بعد تو ایک قرار داد سامنے آ بھی جاتی ہے جو کبھی بالاتفاق اور کبھی کثرت رائے سے منظور ہوتی ہے۔ مگر ان میں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ان کی مختلف تقریریں شکوک آفرینی ہی کرتی ہیں۔

ڈاکٹر اورینوی کے سامنے پورے دور کے واقعات تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی اسی پٹنہ میں گزاری ہے جو سید احمد شہید کی تحریک کا مرکز تھا، اس تحریک کے رہنماؤں پر جو "مقدمۂ پٹنہ" اور "مقدمۂ انبالہ" وغیرہ انگریزوں نے چلائے ان کی ساری کارروائیاں بھی ڈاکٹر اختر اورینوی نے پڑھی ہوں گی جو اسی پٹنہ میں محفوظ ہیں اور مرکز تحریک کے قریب سے بھی صبح و شام گزرتے رہے ہوں گے اور ان کے حافظے میں یہ بات تازہ ہوتی رہی ہوگی کہ انگریزوں نے انتقام میں اس مرکز کو اور ان کے رہنماؤں کے مکانات کو کھدوا کے پھنکوا دیا، اور پھر وہاں میونسپلٹی کی عمارت قائم کر دی تاکہ مرکز تحریک کا نام و نشان مٹ جائے۔ لیکن جس کی یاد دلوں میں گھر کر لیتی ہے اس کا نام در و دیوار کے مٹنے سے کہاں مٹتا ہے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی کے اندر اسلامی فکر، اسلامی جذبہ اور اسلامی اخلاق اور اس کے ساتھ ہی سامراجیوں سے نفرت اور اپنی حریت و آزادی کا جوش کہاں سے آیا تھا اس کا سراغ کچھ مشکل نہیں۔

ضلع مونگیر کی بستی "اورین" اختر کی دادیہال تھی اور ضلع گیا کا "قصبہ کاکو" ان کی نانیہال۔ یہ دونوں بستیاں اور دونوں ضلعے مسلمانوں کی شان و شوکت کے تاریخی گہواروں میں ہیں۔ اختر "کاکو" میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ "اورین" میں رہے، مونگیر ضلع اسکول سے میٹرک کیا اور پٹنہ پہنچ گئے انہوں نے جو کچھ پڑھا لکھا، یہیں پڑھا لکھا اور ساری زندگی اسی شہر میں گزار دی۔ ان کا سلسلۂ نسب مشہور صوفی بزرگ حضرت سید احمد جاجنری بغدادی سے ملتا ہے۔ ان کے اسلاف علمی بھی تھے اور عملی بھی۔

ڈاکٹر اختر اورینوی کسی فرقے، کسی حلقے اور کسی گروہ کو برا نہیں کہتے تھے، نہ وہ مناظرے کو پسند کرتے تھے۔ ان کا ذہن و فکر ان کے اسلاف گرانمایہ کا عطیہ، ان کی دادی کا پروردہ اور پھر ان کا اپنا تعمیر کردہ تھا۔ قرآن مجید اور سیرت طیبہ ہی ان کے لئے شمع ہدایت تھی۔ اکتساب فیض وہ انہی سے کرتے تھے۔ قرآن مجید کی آیات اور مسائل کی موشگافیوں تک نہ وہ پہنچے تھے نہ پہنچنا چاہتے تھے، نہ اس میں پڑ کر وہ اپنی حیات مستعار کو عملی کارناموں سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ قرآن مجید کے احکام "تعمیل" کے لئے ہیں "بحث" کے لئے نہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ سیرت طیبہ "نمونہ" ہے اور زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالنا چاہئے۔ نمونہ پیروی کے لئے ہوتا ہے، ریسرچ کے لئے نہیں۔ ان کی آرزو تھی کہ لوگ اسلام کے دائرے میں آجائیں اور جو مسلمان ہیں وہ اپنی زندگی میں اسلام کو جاری و ساری کر لیں، پھر ان کے اہل نظر علماء و مفکرین مسائل کی مختلف نوعیتوں کی بابت کوئی ایسا قطعی فیصلہ کر لیں جو وحدت ملی کے استحکام اور قوت و شوکت کا سرچشمہ ثابت ہو۔

ڈاکٹر اختر اورینوی خواجہ کمال الدین کے نقش قدم پر تھے۔ دنیا اپنے اپنے کاموں میں مشغول مگر یہ گاندھی جی، پنڈت جواہر لال، راج گوپال اچاریہ اور ججے پرکاش نرائن سے ملتے تو کانگریس اور مسلم لیگ، آزادی ہند اور مطالبۂ تقسیم یا اس قسم کے مسائل کی بجائے "اسلام" کی گفتگو کرتے اور اس کی تبلیغ

کرتے، ان کا مقصود ان لیڈروں سے ملنے کا یہی ہوتا تھا۔ انہوں نے بہار کے وزیر اعلیٰ سری کرشن سنہا اور جسٹس بھونیشور پرشاد وغیرہ کو بھی اسلام کی طرف آنے اور قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی، ان کے سامنے ہمیشہ انسانیت کا فلاح تھا سیاست و معاشرت اور معیشت کے حلقوں میں دھوم مچانے والے تو بہت تھے لیکن اس انداز سے خاموش کام کرنے کا خیال کتنوں کو تھا جنتی کہ وہ اسلام کے نظام معیشت کی تبلیغ کے لئے قادیان بھی پہنچے اور جماعت احمدیہ کے پیشوا کو بھی مشورہ دیا کہ اسلام کے اقتصادی نظام کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر اختر اورینوی کو حضور اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عشق تھا اور وہ ایسے فدائی تھے کہ حضور کی شان میں بے ادبی کا شائبہ بھی کہیں پیدا ہوتا تھا تو بیچین ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر مطیع الرحمٰن نے لکھا ہے کہ ۱۹۴۵ء کے موسم برسات میں ایک مقامی ہائی اسکول کے ایک ٹیچر نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں کچھ گستاخانہ الفاظ استعمال کئے اور دوسرے روز جب آنرز کلاس میں ہم لوگوں کے ذریعے ان کو اس کی خبر ملی تو ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، چہرہ تمتما اٹھا اور رنج و ملال کے سبب اس روز وہ کلاس نہ لے سکے۔ اور ڈاکٹر محمد مجتبیٰ رضوی نے اسی واقعے کی نسبت یوں لکھا ہے کہ "کلاس میں وہ آئے تو ان کا دل زخموں سے چور تھا، وہ نہایت افسردہ تھے۔ اور صرف ایک جملہ ان کے منہ سے نکلا کہ "اس قوم کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں جس کے ہادیٔ برحق کی شان میں ایسی گستاخیاں ہوں"۔ کلاس میں بقول ڈاکٹر رضوی چند ہی طلبہ تھے، وہ سب دیوانہ وار نکلے اور سارے شہر میں اعلان کرتے پھرے، شام کو اسلامیہ ہال میں پرجوش مسلمانوں کا عظیم الشان احتجاجی جلسہ منعقد ہوا اور اس کے مطالبے پر بابو کملیشوری پرشاد نے غیر مشروط تحریری معافی مانگی"۔

ڈاکٹر اختر اورینوی بے ادبی کا شائبہ تک برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو اگر یہ محسوس ہو جاتا کہ پیغمبر آخر الزماںؐ کے بعد کسی قسم کی نبوت و رسالت کا تذکرہ بھی شانِ ختمی مرتبت میں بہت بڑی جسارت اور گستاخی ہے۔ تو وہ اپنے آپے میں نہ رہتے۔ اور کیا پتہ اخیر میں یہ نکتہ بھی ان پر کھل چکا ہو۔ وہ اقبال کے بھی شیدا تھے جن کی نظم و نثر ہمیشہ ان کے مطالعے میں رہتی تھی۔ وہ ان سے بے انتہا متاثر تھے۔ اس مسئلے پر اقبال نے بڑی مدلل بحث کی ہے اور نہایت ہی نازک نکتے بیان کئے ہیں۔ اور مثال دے کر بتایا ہے کہ ہندوستان میں اس خیال یا عقیدے کے علمبردار اصل میں برطانوی سامراج ہیں۔ ناممکن ہے کہ اختر کے ذہن و فکر پر ان نکات نے کوئی اثر نہ ڈالا ہو، وہ بیحد حساس تھے، ذکی الفہم تھے اور ان کا ضمیر بیدار تھا۔

ترقی پسندوں کا حلقہ بھی ان کو اپنا فرد شمار کرتا تھا۔ لیکن ان کی "ترقی پسندی" اور "انسان دوستی" کا کوئی تعلق کمیونزم سے نہیں تھا، وہ قرآن مجید اور حضور اکرمؐ کی تعلیمات پر مبنی تھی۔ وحدتِ انسانی کا تصور ان کو اسلام سے ملا تھا اور وہ اسی کی بنیاد پر خدا کے تمام بندوں کو چاہتے تھے، حق کہیں بھی پامال ہو۔ انسان کہیں بھی نشانۂ ستم ہو، ان کا دل تڑپتا تھا۔ انہوں نے اپنے افسانوں۔ آخری الٹی، کام، جینے کا سہارا، بیل گاڑی، یہ دنیا، اب، گندے انڈے، منٹ پاتھ اور وہ واقعہ — وغیرہ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے کمیونسٹوں نے ان کو اپنا حلقہ بگوش تصور کیا اور حسب معمول ان کی بڑی واہ واہ ہوئی اور ان کو انجمن مصنفین شاخ بہار کی صدارت بھی پیش کی گئی، انہوں نے استعمار پسندوں کی مذمت کی، دنیا بھر کے سرمایہ داروں اور مہاجنوں کی چالبازیاں بے نقاب کیں، اطالوی فاشزم کی دھجیاں اڑائیں۔ جنگ زرگری کی پول کھول تو بقول پروفیسر حسین ترقی پسندوں کی طرف سے تحسین و آفرین کی انتہا نہ رہی، نئے ادب کے معماروں میں ان کو جگہ دی گئی۔ لیکن جب اسی اختر نے تقسیم فلسطین کے خلاف مظلوم عربوں کی حمایت میں ایک افسانہ لکھا "انہیں مردہ نہ کہو" اور امریکہ برطانیہ اور روس تینوں کی یکساں مذمت کی کہ ان تینوں نے عربوں کے خلاف سازش کی ہے تو ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں بھونچال آگیا اور ہر طرف سے ان کی مخالفت میں آوازیں بلند ہونے لگیں۔ انہیں "رجعت پسند" کے خطاب سے نوازا گیا، بمبئی میں ترقی پسندوں کا ایک جلسہ ہوا اور اس میں اختر کے خلاف باضابطہ نفرت و مذمت کا اظہار کیا گیا اور انجمن نے ایک گشتی مراسلہ پٹنہ کی شاخ

بھیجا کہ اختر کی مذمت کی جائے ۔ جس کے بعد اختر اورینوی نے یہ محسوس کیا کہ یہ لوگ دانستہ یا نادانستہ استعمار پسندوں کا آلۂ کار بن گئے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور روس ان کے آقائیم ثلاثہ ہیں۔ انسانیت کا نعرہ ان کی زبان پر فقط نعرہ ہے انسانیت سے کوئی ہمدردی ان کو نہیں ہے۔ اور ترقی پسندوں نے یہ محسوس کیا کہ اختر کچھ بھی لکھیں ابھی تک وہ خدا سے اور اس کے رسول مقبولؐ سے اور اسلام سے برگشتہ نہیں ہوئے۔ لہذا ہمارے نہیں ہو سکتے ۔ اور یوں دونوں میں جدائی ہو گئی۔

تمام مذاہب کو مساوی قرار دینے کی آواز بھی امریکہ برطانیہ اور روس ہی کی اٹھائی ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ ہر استعمار پسند کے لئے اس آواز میں بڑی کشش ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں میٹرکولیشن کے لئے اردو نصاب مرتب کرنے کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کے ایک رکن ڈاکٹر اختر اورینوی بھی تھے "رواداری" کا نام لے کر تمام مذاہب کو مساوی قرار دینے کی کوشش وہاں بھی کی گئی۔ ایک ہندو ممبر نے تجویز پیش کی کہ "رواداری تو صرف اسی طرح پیدا ہوگی جب طلبہ کو یہ پڑھایا جائے کہ تمام مذاہب مساوی ہیں"۔ تو اس موقع پر اختر اورینوی نے اس کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ جہاں تک "رواداری" کی تعریف اور تعصب کی مذمت کا تعلق ہے یہ ایک علٰحدہ چیز ہے اس کو نصاب میں ضرور شامل کیجئے لیکن یہ مسئلہ کہ تمام مذاہب برابر ہیں مسلمانوں کے عقیدے کے یکسر خلاف ہے۔"

ڈاکٹر اختر اورینوی کو معلوم تھا کہ دنیا کا قدیم ترین "دین" "اسلام" ہے اور یہی دین فطرت ہے۔ امتداد زمانہ سے لوگوں نے نئی نئی چیزیں اختیار کیں اور اصل دین سے دور ہوتے گئے اور پھر ان کے گروہ بنتے چلے گئے اس لئے یہ تمام مذاہب جو مذاہب کہلاتے ہیں دین سے بچھڑے ہوئے لوگوں کے گروہ ہیں۔ — دین پہلے بھی ایک ہی تھا اور آج بھی ایک ہی ہے۔ لفظ "ادیان" سے جو لفظ "دین" کی جمع ہے دھوکہ ہرگز نہ کھانا چاہئے۔ لفظ اللہ کی جمع بھی الٰہہ موجود ہے تو کیا اس سے اللہ کی وحدانیت میں کوئی فرق آسکتا ہے۔ اس کے علاوہ "لکم دینکم ولی دین" کی وضاحت بھی قرآن مجید نے "لنا اعمالنا ولکم اعمالکم" سے کر دی ہے اور اعلان کر دیا ہے "اَلدِّین" "اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے"، اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جو شخص "غیر اسلام" کو دین بنا کر اختیار کرے گا اسے ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ مگر ایک مدت دراز سے اہل یورپ بھی اور برعظیم کے ہندو سیاست داں بھی یہ بات مسلمانوں کے دلوں میں بٹھانے کی کوشش میں سرگرداں رہے ہیں کہ "تمام مذاہب برابر ہیں"۔ حصول اختیارات کے بعد جب تعلیمی ادارے میں اس کو داخل کرنے کی کوشش کی گئی تو ڈاکٹر اختر اورینوی نے شدت سے اس کی گرفت کی ظاہر ہے کہ امریکی برطانوی اور روسی استعمار کے شیدا اور ان کی راہ پر چلنے والے سبھی اختر اورینوی کی اس آواز حق پر تلملائے ہوں گے لیکن اختر اورینوی کو کسی کے تلملانے کی کوئی پروا نہیں تھی، انہیں صرف حق کو حق کہنے کا خیال تھا۔

ڈاکٹر اختر اورینوی نے لکھا ہے کہ "میری زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب میں نے اشتمالیت (کمیونزم) کو مکمل انسانی نظام سمجھا ہو"۔ لیکن وہ سرمایہ دارانہ و زرپرستانہ نظام کے بھی سخت مخالف تھے۔ کیونکہ اسلام نہ تو "فرد" کو بے لگام ہونے کی اجازت دیتا ہے نہ "اجتماع" کو۔ نہ اسے "فرد" کا سرمایہ دار بننا پسند ہے نہ "حکومت" کا۔

ڈاکٹر اختر اورینوی لکھتے ہیں کہ رحم و انصاف کا دعویٰ کرنے والے نظاموں میں اسلام کو سب سے افضل سمجھتا ہوں، میں نے اپنے فن میں براہ راست اسلام کی تبلیغ نہیں کی ہے لیکن انسانی ہمدردی کا درس مجھے اسی سرچشمے سے ملا ہے، زندگی کا ایک اعلیٰ مقصد ضرور ہے۔ اور وہ یہ کہ زندگی اور نظام زندگی کو حق و انصاف کے مطابق ڈھالا جائے۔ اسے رفعت عطا کی جائے اور اس دنیا میں بھی جنت کی تعمیر کی جائے۔ اگر ادب کے ذریعے بھی سلیقے سے اس مقصد کا اظہار و ابلاغ کر سکیں تو "نور علی نور"۔ ان کے اس جملے میں کہ "دنیا میں بھی جنت تعمیر کی جائے" یہ بھی "خصوصی توجہ کی چیز" وہ جانتے تھے کہ اسلام "دین عدل" ہے۔ اور اس دنیا سے اُس دنیا تک ایک سلسلہ ہے، سب کچھ اسی

دنیا تک محدود نہیں ہے۔

ڈاکٹر اختر اورینوی معلم تھے اس لئے نظام تعلیم کی نسبت بھی ان کی خاص رائے تھی "انگریزوں نے ہندوستانی زندگی کا ایک ناقص تصور پیش کیا اور اسی کے مطابق ایک ناقص نظام تعلیم جاری کر دیا۔۔۔ میکالے نے نہایت سوچ سمجھ کر ایک نظام تعلیم جاری کیا جو ہمارے لئے برا اور انگریزوں کے لئے اچھا تھا۔۔۔ ہم کسی مخصوص نظام معاشی یا نظام سیاست کو مانیں یا نہ مانیں لیکن ایشیا کی بہترین روایت میں خدا پرستی، انسان دوستی، عدل و انصاف، رحم و شفقت، کمزوروں کی دستگیری، ضبط نفس اور مکافات عمل کا خاص لحاظ پایا جاتا ہے، ہمارے نظام تعلیم کو ایسا ہونا چاہئے جو ابتدائی منزلوں سے آخری منزل تک ان اقدار کی پرورش کرے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ جو رویہ قرآن حکیم کا ہے نظام تعلیم میں وہی رویہ ہمیں بھی رکھنا چاہئے۔ بنیاد کی اہمیت اور اولیت ہمیشہ ماننی پڑے گی۔ تزکیہ کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ جدید یورپ کا یہی عیب ہے کہ وہ تزکیہ سے دور ہے۔۔۔"

پٹنہ یونیورسٹی اکیڈمک کونسل اور سینیٹ کے ۱۹۴۹ء کے فیصلہ پر عملدرآمد ہو رہا تھا جس کی مدد سے ہندی کے علاوہ مادری زبان رکھنے والے طلبہ کی تعلیم کا مسئلہ کھٹائی میں ڈالا جا رہا تھا اور اس کی حیثیت اختیاری بنائی جا رہی تھی پروفیسر اختر اورینوی نے علام سرور کی معرفت پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ایک میمورنڈم بھجوایا اور کوشش بلیغ شروع کر دی کہ پٹنہ یونیورسٹی اردو دشمنی سے باز آئے۔ اسی زمانے میں یوپی سے بھی سکنڈری اور پرائمری اسکولوں سے اردو کے اخراج کی خبریں آ رہی تھیں۔ یوپی میں سمپورنانند کی وزارت اردو دشمنی پر تلی ہوئی تھی۔ لیکن اختر کی مدبرانہ قیادت بار آور ثابت ہوئی اور میٹرک کے نصاب میں اردو کا لازمی پرچہ شامل ہو گیا بلکہ غیر لسانی پرچوں کے امتحانات میں بھی سوالوں کا جواب مادری زبان میں دیئے جانے کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ یہ عبارت مولانا بیگ صدیقی کی ہے جو بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری تھے۔ انہوں نے یہ بات ۶۵ء میں لکھی تھی جس میں بتایا ہے کہ ڈاکٹر اورینوی نے اردو تحریک کی خدمت کس کس طرح کی ہے اسی طرح ۵۲ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں انہوں نے اردو کا ایک الگ شعبہ قائم کروایا۔۔۔ اردو رسم الخط کے بارے میں بھی وہ بہت شدید تھے انہوں نے ہر ایسی تجویز کی شدت سے مخالفت کی جس سے اردو کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ انجمن ترقی اردو بہار کی روح و رواں اس وقت وہی تھے۔

ڈاکٹر اختر اورینوی کو ایک لگن تھی کہ اسلام اس برعظیم میں پورے آب و تاب سے جلوہ گر ہو، وہ جانتے تھے کہ کیسے کیسے بیرونی اور اندرونی دشمن اس کے خلاف سرگرم کار ہیں، مگر جس کے دل میں لگن ہوتی ہے، وہ صرف اپنی دھن میں رہتا ہے اور کوشش کئے جاتا ہے ان کا ایمان تھا کہ اخلاص سے کوشش کرو تو محنت رائیگاں نہیں جاتی اللہ راستہ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اپنی بہت سی کوششوں میں کامیاب بھی ہوئے اور بہت سی کوششیں ایسی بھی نظر آتی ہیں جو کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکیں۔ ہم لیڈروں سے ان کی ملاقات کا تذکرہ اوپر کر چکے ہیں، کچھ اور سنئے۔ پنڈت نہرو ۴۶ء میں پٹنہ پہنچے تو وہ ان سے ملنے گئے اور "اسلام کا اقتصادی نظام" اور "نظام نو" دو کتابیں ان کی نذر کیں۔ پنڈت جی تھے تو ٹھیٹ پنڈت لیکن لوگ ان کو سوشلسٹ کہتے تھے اور سمجھتے تھے، ڈاکٹر اورینوی نے خیال کیا کہ عدل اجتماعی سے جتنی دلچسپی پنڈت جی کو ہو سکتی ہے دوسرے لیڈروں کو اتنی نہ ہوگی۔ انہوں نے یہ دو کتابیں پیش کیں تو پنڈت جی نے کہا "اچھا یہ وہی ہے چودہ سو سال پہلے کا پیش کیا ہوا پرانا نظام" انہوں نے بڑی چوٹ کی تھی۔ قدیم و جدید، پرانے اور نئے کی پر فریب اصطلاحیں بہت سے سیاسی لیڈروں نے استعمال کی ہیں، اور ان سے بہت لوگ گمراہ بھی ہوئے ہیں۔ اور پنڈت جی کو تو ایسی اصطلاحات کے استعمال میں ملکہ حاصل تھا۔ لیکن اختر اورینوی ان لوگوں میں

سے نہ تھے جو اس چوٹ پر خاموش رہ جاتے۔ انہوں نے برجستہ کہا "جی ہاں، آدمی کی پیاس بھی پرانی ہے اور اس پیاس کا بجھانے والا پانی بھی پرانا" پنڈت جی مسکرا کے رہ گئے اور کتابیں لے لیں۔

پھر وہ ۳۶ء میں پٹنہ پہنچے تو اختر اور رینوی پھر ان کی خدمت میں موجود تھے۔ اب کی وہ انگریزی ترجمے کا قرآن مجید لے کر گئے، یہ ترجمہ غالباً مولوی محمد علی لاہوری کا تھا۔ خیال یہ تھا کہ پہلی چوٹ کے بعد دوبارہ نہ جائیں گے لیکن وہ خود بھی تو جوابی چوٹ کرنے سے نہ چوکے تھے۔ اس کے علاوہ یہ دلیل ہے کہ ان کے دل میں بڑی لگن تھی، صورت حال کچھ بھی ہو وہ اپنا کام کئے جاتے تھے۔

نوابزادہ لیاقت علی خاں ۴۶ء میں جب پٹنہ پہنچے تو اختر اور رینوی ان کے پاس بھی پہنچے۔ ان سے انہوں نے بین الملی سیاسیات و روابط اسلامی معاشرہ اور اسلامی معاشیات و اقتصادیات کے نفاذ پر گفتگو کی، بہار کے بااثر مرشد طریقت حضرت مولانا شاہ حسین میاں پھلواروی جو مسلم لیگ کے رہنما بھی تھے ۴۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں ایک تجویز پیش کر چکے تھے کہ نظام زکوٰۃ کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر وہ بیمار رہے اور پھر اسی ۴۶ء میں انہوں نے وفات پائی۔ اختر اور رینوی چاہتے تھے کہ ہمارے زعماء اسلام کے اقتصادی نظام کو پوری قوت سے آگے بڑھائیں۔

خواجہ کمال الدین کا بھی یہی حال تھا۔ "نظام نو" کے عنوان سے خواجہ کمال الدین نے نہایت ہی اعلیٰ اور طویل مضمون یورپ میں شائع کیا تھا، ممکن ہے وہی مضمون اختر اور رینوی نے پنڈت نہرو کو دیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس پر نظر ثانی کر کے اضافے کے ساتھ شائع کیا گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی روشنی میں بالکل نئی کتاب تیار کی گئی ہو۔

خواجہ کمال الدین کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ "احمدی جماعت میں ہمارے نزدیک وہ عام مسلمانوں سے سب سے زیادہ قریب تھے ... نیز ان کی تصنیفات کے بڑے حصے کا موضوع "احمدیت" نہیں "محمدیت" ہے۔ افسوس کہ ان کی موت سے دنیا کی مذہبی بزم میں ایک اہم جگہ خالی ہو گئی، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال صالحہ کے صدقے میں ان کو اپنی مغفرت سے نوازے اور ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔"

لیکن خواجہ کمال الدین کی یہ جگہ خالی نہ رہی۔ خواجہ کمال الدین کے بعد اس جذبے اور جوش کا حامل ایک ہی شخص ہمیں اور نظر آیا۔ اختر اور رینوی۔ البتہ خواجہ کمال الدین کا میدان یورپ تھا۔ اختر اور رینوی کا میدان، ہندوستان تھا۔ سل کے مرض میں خواجہ کمال الدین بھی مبتلا تھے اور سل کے مرض میں اختر اور رینوی بھی مبتلا تھے۔ "خواجہ کمال الدین نے سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۳۲ء تک پورے بیس برس کی زندگی اسلام کی تبلیغ اور اس کے محاسن کی اشاعت اور یورپ میں اسلامی لٹریچر کی فراہمی میں صرف کی تھی"۔ ان کے بعد اختر اور رینوی نے یہ جگہ لی، اور اپنی زندگی اسلام کی تبلیغ، اس کے محاسن کی اشاعت اور اپنے ملک کے اندر سیرت طیبہ کے جلسوں میں پرجوش تقریروں اور بعض ادبی تحریروں کے ذریعے اسلامی فکر و نظر پیدا کرنے میں صرف کر دی۔

خواجہ کمال الدین معاصر تھے حکیم نورالدین صاحب کے اور حکیم نورالدین خلیفہ تھے مرزا صاحب کے، وہ جانتے تھے کہ احمدی جماعت مرزا صاحب کے "مریدوں کی ایک جماعت" ہے، یہی حکیم نورالدین صاحب نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۸ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء میں لکھا ہے یہ مکتوب اختر اور رینوی کا ہم عمر ہے کیونکہ اسی سنہ ۱۹۱۰ء میں اختر اور رینوی پیدا ہوئے۔ حکیم صاحب نے اس مکتوب میں جو حضرت قبلہ مولانا شاہ سلیمان قادری چشتی پھلواروی کو لکھا تھا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب تفہیمات الٰہیہ مانگی تھی۔ اس میں یوں تحریر ہے کہ "حضرت کے خدام میں کوئی کاتب ہو وہ لکھوا دے یا حضور مجھ ہیچمیرز پر اعتماد فرما دیں، مجھے ہزاروں سے زیادہ لاکھوں تو ضرور جانتے ہیں اور ہر طرح اطمینان دلانے کو حاضر ہوں میرا

نام نور الدین ہے۔ اور اس وقت قادیان میں مرزا قادیانی کے مریدوں کا مرجع ہوں"۔ قیاس ہے کہ اختر اورینوی بھی اس مکتوب سے آگاہ تھے۔ حکیم نور الدین صاحب کے دو مکاتیب ۱۹۳۵ء میں حضرت قبلہ مولانا شاہ محمد سلیمان قادری چشتی پھلواروی کی سوانح خاتم سلیمانی میں شائع ہوگئے تھے۔ خاتم سلیمانی حضرت مولانا شاہ علاء الدین صاحب چشتی سلیمانی کی لکھی ہوئی ہے جن سے اختر اورینوی پھلواری شریف جا جا کر ملتے رہتے تھے۔

اختر اورینوی "قادیانی" تھے۔ "لاہوری" تھے یا خواجہ کمال الدین کی نسبت سے "کمالی" تھے۔ یا حکیم نور الدین کی طرح "مرزا قادیانی" کو ایک "پیر" سمجھتے تھے۔ جو کچھ بھی تھے۔ ان کی تصنیفات بتاتی ہیں کہ وہ بڑے ادیب تھے۔ اور اسلام کے مبلغ بھی تھے اور آدمیت کا جوہر ان کے اندر غیر معمولی تھا۔ قادیانیت نے اب کیا رخ اختیار کیا ہے یا آئندہ کیا رخ اختیار کرے گی اس کا کوئی اثر نہ خواجہ کمال الدین پر پڑ سکتا ہے نہ اختر اورینوی پر۔

پاکستان میں اب قادیانیت مسلمانوں سے علیحدہ ایک اقلیت قرار پاگئی ہے۔ پاکستان کی ہر اقلیت کے افراد پاکستان کے شہری ہیں [illegible] ہیں اور ان کی عزت و حرمت ہر پاکستانی کی ذمہ داری ہے اور ہمارے دل میں سب کی محبت اور سب کا احترام ہے۔ "الدین" کے معاملے میں کسی جبر و اکراہ کی کوئی اجازت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ برعظیم پر جب سے مسلمان حکمراں ہوئے ہمیشہ ان کی روش یہی رہی اور آج بھی ہے۔ محمد بن قاسم نے بھی بدھ مت اور ہندو مت اور جین مت کے پیروؤں سے محبت و اخلاص ہی کا سلوک کیا۔ ان کے اہل علم و اہل فن کا بڑا احترام اس کے دل میں تھا۔ جس کا عملی اظہار بھی اس نے کیا۔ عربوں ترکوں غوریوں لودھیوں، سیدوں، پٹھانوں اور مغلوں سب کے زمانے میں یہی اصول رائج رہا۔ برہمنوں، چھتریوں، راجپوتوں، شودروں، مجوسیوں، یہودیوں اور عیسائیوں وغیرہ میں سے جس جس نام کے لوگ بھی یہاں موجود تھے۔ ان سب کی عزت و حرمت اور ان کے اہل علم و اہل فن کی قدر و منزلت کو مسلمانوں نے اپنا فریضہ تصور کیا۔ اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ تمام مسلمان چاہے دنیا کے کسی خطے میں ہوں وہ دین کے رشتے سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور تمام انسان چاہے وہ کہیں کے بھی ہوں، وہ انسانی رشتے سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ مسلمانوں نے خود بھی علم و فن کی بڑی خدمت کی ہے اور ارباب علم و فن کی قدر دانی سکھائی ہے۔

علم و ادب کی دنیا میں ٹیک چند بہار، چندر بھان برہمن، بندرابن داس خوشگو، آنند رام مخلص، راجہ رام نرائن موزوں، راجہ رام موہن رائے سے لے کر پنڈت رتن ناتھ سرشار، چکبست، دیا شنکر نسیم، ہرگوپال تفتہ، پھر منشی پریم چند وغیرہ اور مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، جواہر سنگھ جوہر، دلو رام کوثری، جوش ملسیانی، فراق گورکھپوری، ہری چند اختر، راجہ راؤ، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، کنہیا لال کپور وغیرہ وغیرہ اور ہاں پنڈت دتاتریہ کیفی، سر تیج بہادر سپرو، آنند نرائن ملا۔ سب ایک سے ایک ہیں۔

موسیقی میں چھوڑیے پرانے لوگوں کو خود ہمارے اپنے عہد میں پنڈت اومکار ناتھ ٹھاکر، پنڈت پلسکر، پنڈت ویاس اور پٹ وردھن وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

سیاست دانوں میں دادا بھائی نوروجی، سر سریندر ناتھ بنرجی، گوپال کرشنا گوکھلے، بال گنگا دھر تلک، سی آر داس، اینگر، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مالویہ، گاندھی جی، راجگوپال اچاریہ، جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، بھولا بھائی ڈیسائی، ڈاکٹر امبیدکر، راجندر پرشاد، سر رادھا کرشنن، وجے لکشمی دیوی، اور سروجنی نائیڈو وغیرہ وغیرہ فکری (نظری و عملی) اختلافات کے باوجود سب محترم رہے۔

یورپ کے اہل علم کی فہرست تو اور بڑی ہے۔ سقراط اور ارسطو اور افلاطون سے شروع کیجیے اور اس وقت تک چلے آئیے، سومرسٹ موم،

ملٹن، چاسر، شیکسپیر، شیلی، کیٹس، روسو، مل، اسپینسر، شاپنہاور، اسپینوزا، گبن، ملیبان، اسکاٹ، کارلائل، میکالے، نیوٹن، آئنسٹائن، میتھو آرنلڈ، ٹی ایس ایلیٹ، برٹرنڈ رسل، برنارڈ شا، ڈی ایچ لارنس، سمرسٹ ماہم، نطشے، گوئٹے، برگساں، کانٹ، برکلے، ہیگل، کارل مارکس، فرائڈ، اینجلز، اڈلر، ینگ، موپساں، ٹراٹسکی، چیخوف، ٹالسٹائی، لینن، چیسٹرٹن، مارک ٹوین، پروفیسر ٹوئن بی، ول ڈورانٹ، ییونا روڈونسی، ادان تو، تو گاں، موٹ، ہر علم و فن کے لوگ، دنیا بھر کے لوگ کسی ایک ملک کی قید نہیں، بڑے چھوٹے ہزارہا نام ملیں گے جن میں مسلمان بھی ہیں، مسیحی بھی، یہودی بھی ہیں، مجوسی بھی، بدھسٹ بھی ہیں، جین بھی، برہمو سماج بھی ہیں، اور سکھ بھی، لامذہب اور دہریئے بھی اور گم کردہ راہ بھی یہ سبھی ملیں گے راجہ مان سنگھ اور راجہ ٹوڈرمل وغیرہ کے نام ہم نے نہیں لئے جو شہنشاہ اکبر کے نورتن میں تھے، نہ ابوالفضل اور فیضی کے نام لئے۔

یہ اور ایسے بے شمار نام آپ کی زبان پر روز آتے رہتے ہیں موجدین کے، محققین کے، مصنفین کے جن کی علمی و ادبی اثر پذیری اور اثر اندازی کا تذکرہ صبح و شام ہوتا رہتا ہے۔ ان میں کچھ نام اپنی طرف سے اور جوڑ لیجئے۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ علم و فن کی دنیا میں کہیں دیواریں ہیں، کبھی آپ ان کی تحریر پڑھتے ہیں، کبھی اپنی تحریر میں ان کا حوالہ دیتے ہیں۔ کبھی ان کے کسی خیال کی تردید کرتے ہیں، یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ عہد حاضر میں، جہاں بہتوں نے علمی ادبی، لسانی اور تعلیمی شعبوں میں نمایاں کام کئے ہیں وہاں ڈاکٹر اختر اورینوی نے بھی بڑے کام کئے ہیں۔ سید احتشام حسین اور سید اختر اورینوی دونوں دوست بھی تھے شاعری اور تنقید کی وادی میں یکساں گامزن بھی، دونوں رخصت ہوگئے کرشن چندر اور اختر اورینوی دونوں ممتاز افسانہ نگار تھے، دونوں چل بسے، لسانی تحقیق میں پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر اورینوی، دونوں لگن کے ساتھ قدم بڑھاتے جانے محقق تھے، دونوں نے کوچ کیا۔ کسی مسئلے میں آپ کو ان لوگوں سے اختلاف ہو، تو اختلاف کرنے کا پورا حق آپ کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے جو علمی ادبی خدمات انجام دی ہیں ان کا بھی حق ہے اور پورا حق ہے کہ ان کا اعتراف ایمانداری سے کیا جائے۔

اہم تاریخی خطوط کا عکس

عکس نمبر ١

عکس نمبر ۲

عبارت اہم تاریخی خطوط

(ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے
کے خلیفۂ اول اور قادیانیوں کی ہر جماعت کے متفقہ مقتدا جناب حکیم نورالدین صاحب کے
چند مکاتیب بھی یہاں پر درج کر دیں جو کئی حیثیتوں سے مسلمانوں کی دلچسپی کا باعث
ہوں گے)

ادارہ

مکتوب اول

(بنام حضرت مولانا شاہ سلیمانؒ پھلواروی)

حضرت مولانا المکرم المعظم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اس خاکسار کو تفہیمات الٰہیہ شاہ ولی اللہ دہلوی کا شوق ہے اور مختلف اماکن سے اس کے اجزاء بھی میسر آئے والحمد للہ رب العالمین۔ سید محمد حسین وزیر اعظم پٹیالہ،

مولوی عبدالعزیز ساکن کوم لدھیانہ۔ سید احمد ولی اللٰہی دہلوی سے۔ مگر پھر بھی کتاب پوری نہ ہوئی۔ خاکسار نے سید نورالحسن خاں بالقابہ کو عریضہ لکھا اور انہوں نے ارشاد فرمایا کہ حضرت مولانا الاستاد شاہ سلیمان پھلواروی کے پاس کامل نسخہ ہے۔ اس لئے یہ عریضہ پیش خدمت کر کے امیدوار ہوں۔ کتاب کو کسی طرح کامل کروں یا حضرت کے خدام میں کوئی کاتب ہو اور وہ لکھدے یا حضور مجھ ہیچ میرز پر اعتماد فرما دیں مجھے ہزاروں سے زیادہ لاکھوں تو ضرور جانتے ہیں اور ہر طرح اطمینان دلانے کو حاضر ہوں میرا نام نورالدین ہے اور اس وقت قادیان میں مرزا قادیانی کے مریدوں کا مرجع ہوں یا کوئی اور تدبیر حضور کریں والاجر من اللہ الکریم۔
نیز انسان کامل عبدالکریم الجیلی کی کوئی بسیط یا وسیط شرح حضور کے مکتبہ میں ہو تو اس کا شوق ہے،

امیدوار جواب نورالدین از قادیان
ضلع گورداسپور۔ پنجاب
۱۸ اپریل [illegible]

مکتوب دوم

(بنام مولانا شاہ حسن میاںؒ فرزند اکبر حضرت قبلہ رح)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم والہ مع التسلیم

اما بعد

مکرم معظم ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

مکرمت نامہ پڑھا اور معاً سجدہ میں گر گیا۔ فالحمدللہ رب العالمین ۔ تفہیمات کو رجسٹرڈ یا بیرنگ روانہ فرما دیں۔ کچھ حصہ کتاب کا میرے پاس لکھا موجود ہے۔ نیز کاتب میرے پاس موجود ہیں ۔ والحمد للہ رب العالمین ثم احمد والشکر والمنہ والاحسان ولہ الفضل ۔ بحضور حضرت والد ماجد مکرم و معظم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ ۔ باادب گزارش فرما کر مجھ خاکسار کی طرف سے شکریہ ادا ہو۔ اب مجھے کتب تصوف میں علیہ ابو نعیم اصفہانی اور شرح انسان کامل کا شوق باقی ہے۔ خیر کثیر شاہ ولی اللہ کا شوق تھا۔ مگر کسی نے مجھے رویا میں کہا خیر کثیر ہندوستان میں نہیں۔ ہندوستان کا لفظ علم رویا میں وسیع معنی رکھتا ہے وعندہ علم الکتاب۔ پھر ممکن ہے کہ خیر کثیر معنی وسیع ہوں۔

نیز باادب عرض ہے کہ حضرت فتوحات مکیہ کے بعض مقامات مجھ خاکسار کے فہم سے بالاتر ہیں۔ کیا اس کتاب کے ایسے مقامات پر کسی مقدس و مطہر انسان نے کچھ یادداشتیں لکھی ہیں۔ چشتیہ خواجگان پنجاب کے عمائد اراکین میں ایک دعا ر کبیر مروج ہے۔ اس کے اکثر الفاظ سنسکرت اور سریانی و عربی اور پرانی فارسی کے ہیں۔ کیا اس پر کسی نے ان بلاد میں کچھ لکھا ہے

دعاگو خاکسار

نورالدین

۲۸ اگست ۱۰ء

ہمارے چند مضمون نگار

اس شمارے میں اختر اورینوی کے ممتاز ادبی معاصرین کے نام بھی ہیں مگر وہ اتنے مشہور ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، ان میں سے کچھ اس دنیا سے رخصت بھی ہو چکے — ان کے صرف نام کافی ہیں۔ ہم نے یہاں صرف ان اہل قلم کے بارے میں کچھ سطریں درج کی ہیں جو اختر اورینوی سے کسی نہ کسی طرح براہ راست تعلق رکھتے ہیں، اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ اہل قلم کچھ نئے ہیں، ان کا بھی علمی و ادبی دنیا میں ایک مقام ہے۔ دیکھئے:۔

ڈاکٹر سید محمد حسنین

پروفیسر شہاب الدین احمد

ڈاکٹر کلیم عاجز

ڈاکٹر سید مجتبیٰ رضوی

سید معین الدین دردائی

ڈاکٹر سید محمد حسنین

عہد حاضر کے عظیم ناقد ادب پروفیسر کلیم الدین احمد اور عظیم محقق قاضی عبدالودود کے سائے میں قیام پاکستان سے پہلے جن نوجوانوں نے تنقید و تحقیق کی آنکھیں کھولیں اور بزم ادب پٹنہ کالج کے ارکان کی صورت میں ابھرے، ان میں مرتضیٰ پرویز، سید علی اکبر قاصد، سید محمد حسنین اسلم، صلاح الدین، یعقوب، مجتبیٰ، شمس الضحیٰ، منان، متین، قیوم اور جیلانی و جعفر وفا جیسے طلبہ تھے جو گلدستہ بنے ہوئے تھے۔ یہ سب بڑی صلاحیتوں کے مالک ہوئے۔ مرتضیٰ پرویز، سید علی اکبر قاصد، جیلانی اور جعفر وفا پاکستان چلے آئے، مجتبیٰ بھی اور شمس الضحیٰ بھی۔ البتہ یعقوب لندن سدھارے اور وہیں کے ہو رہے۔ پاکستان آجانے والوں میں صرف شمس الضحیٰ نے (جو شین ضحیٰ مشہور ہوئے) اپنی علمی ادبی اور تحقیقی دلچسپی برقرار رکھی بلوچستان پر انہوں نے بڑا کام کیا تھا لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ علی اکبر قاصد نے نقد و نظر اور تحقیق اور تخلیق کی تمام صلاحیتیں لفظ و بیان کی بجائے اینٹ پتھر پر صرف کیں۔ وہ بہت اچھی غزلیں اور نظمیں لکھتے۔ بہت اچھے افسانے اور ناول پیش کرتے یا تحقیق و جستجو کے بڑے کارنامے انجام دیتے لیکن کراچی کے ویرانے کو جس طرح آباد کیا اور جیتی جاگتی خوبصورت بستیاں بسائیں وہ سب سے بڑا کارنامہ ہے، انہوں نے بستیاں بسائیں اور خود بہت دور شہر خموشاں میں جا کر سو گئے۔ وہ کوآپریٹو موومنٹ کے نہایت ہی مقبول و با اثر و فعال رہنما تھے۔ مرتضیٰ پرویز کا قلم ملازمت نے چھین لیا۔ جعفر وفا نے وفادارانہ خاموشی سے پاکستان ریلوے کی خدمت کو ضروری کام تصور کیا۔ جیلانی اپنی افسانہ نویسی بھول گئے، ملازمتوں اور دوسری سماجی سرگرمیوں میں پڑ کر اپنا قلم طاق پر رکھ دیا۔ مجتبیٰ کو بھی اسی طرح بعض اداروں نے بزم ادب سے اچک لیا۔

سید محمد حسنین اسلم، پٹنہ ہی میں رہے۔ ان کا علمی و تحقیقی سلسلہ منقطع نہ ہوا۔ نہ ان کی یکسوئی میں کوئی فرق آیا۔ اب وہ مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا (بہار) میں شعبہ اردو کے صدر ہیں، ۲۰ فروری ۱۹۲۶ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ ہی میں تعلیم پائی۔ میٹرک کیا، بی اے کیا، ایم اے کیا اور پھر پی ایچ ڈی بھی۔ بہار میں . . . یوں تو بہتوں نے پی ایچ ڈی کیا اور کریں گے لیکن عربی فارسی اور اردو میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کا پہلا نام تلاش کیا جائے گا تو یوں کہا جائے گا کہ عربی میں جہاں اوّل نام ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا ہے وہاں فارسی میں ڈاکٹر اقبال حسین کا اور اردو میں ڈاکٹر سید محمد حسنین کا۔

ڈاکٹر حسنین کی تین زبانیں ہیں اردو، انگریزی اور ہندی، وہ آل انڈیا یونیورسٹی اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن بہار اردو اکیڈمی اور جامعہ اردو علی گڑھ تینوں کی ایگزیکٹو کے رکن ہیں۔ افسانے ڈرامے اور ہلکے پھلکے مضامین بھی لکھتے رہے مثلاً "ثریا کا خواب" (افسانہ) "برزخ کا مشاعرہ" (ڈرامہ) "تیل مرام" (کہانیاں) "نشاط خاطر" اور "نقش بہار" (ہلکے پھلکے مضامین) مگر ان کا اصل موضوع تنقید و تحقیق ہے۔ مرزا محمد علی فدوی کے عہد، ان کی زندگی اور شاعری پر بڑا تحقیقی کام کیا ہے، اور ان کی یہ تحقیق دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ "نثر اور نثری اسالیب" اور "صنف انشائیہ" ان کی تنقیدی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ اور اب وہ اس مقام پر ہیں جہاں دوسرے نوجوان ان سے ذہنی و فکری اور فنی و تحقیقی رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ مرحوم سید علی اکبر قاصد کے بہترین دوستوں میں ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے، اپنے دوست کی زندگی میں وہ پاکستان کی سیر کو نہ آسکے اب آئے تو ان کا دوست اس دنیا میں نہیں تھا، تصویر پر نظر پڑتے ہی ان کے دونوں ہاتھ اس کی مغفرت کی دعا کے لیے اٹھ گئے۔ علی اکبر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہماری بزم ادب پہلے چار یاری تھی جس کے ایک رکن سید محمد حسنین اسلم تھے۔ پھر اس بزم کا دائرہ بڑھا۔

پروفیسر سید شہاب الدین احمد

عظیم آباد پٹنہ کا ایک محلہ ہے "ڈنکے کی املی"۔ یہاں کی املی کا تعلق "ڈنکے" سے کیا ہے یا "ڈنکے کی املی" کیا ہوتی ہے اس کا پتہ تو کوئی محقق ہی دے سکتا ہے۔ شاید قاضی عبدالودود صاحب کبھی اس کی حقیقت واضح کریں۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ بہت سے نام مرورِ زمانہ اور کثرتِ استعمال سے کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں "کوا کھوہ" آپ کی سمجھ میں نہ آئے گا اسی طرح "مرغیا چک" بھی سمجھ میں نہ آئے گا لیکن محققین نے بتایا ہے کہ ان میں سے ایک "کیوان شکوہ" تھا۔ دوسرا "امیر غیاث الدین چک"۔ کیا پتہ "ڈنکے کی املی" کا قصہ بھی کچھ اسی قسم کا ہو۔ بہرحال پروفیسر شہاب جہاں پیدا ہوئے اس محلے کا نام ڈنکے کی املی تھا اور اب بھی ہے۔

پروفیسر شہاب اہلِ علم صوفی اور مجاہد خانوادے کے فرد ہیں۔ ان کے مورثِ اعلیٰ خواجہ سید شاہ امیر عطاء اللہ عہد ہمایونی کے ایک بزرگ ہیں۔ جو منصب دہ ہزاری پر فائز تھے اور پٹنہ میں ان کی مستقل اقامت تھی۔ پروفیسر شہاب کے بزرگوں میں حضرت سید شاہ عماد الدین قلندر پھلواروی بڑے مرشدِ طریقت گزرے ہیں۔ پھر وہ دور آیا۔ جب یہ خانوادۂ طریقت پھلواری سے منگل تالاب پٹنہ سٹی منتقل ہوا۔ پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبیہ، خانقاہ فریدیہ، خانقاہ سلیمانیہ اور رسالہ عیسیٰ پور وغیرہ سب اسی خانوادے کی شاخیں ہیں۔

پروفیسر شہاب کو ان کے والد ماجد جناب سید شاہ حبیب الدین احمد نے تعلیم کے لئے خانقاہ عمادیہ منگل تالاب کے سجادہ نشین حضرت مولانا شاہ رشید الحق صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا اور یوں انہوں نے کم عمری میں اپنے "پیر دادا" سے عربی کی ابتدا صوفیانہ چاشنی کے ساتھ کی اور جب حضرت نے وفات پائی تو ان کے بعد اپنے عم محترم حضرت مولانا شاہ حبیب الحق صاحبؒ سجادہ نشین سے علوم حدیث و فقہ کی تعلیم پائی۔ عربی ادب و علم کلام کی تعلیم علامہ تمنا عمادی پھلواروی نے دی۔ اور نحو و صرف مولانا محمد عباس پھلواروی نے سکھائی۔ عربی کے ساتھ انگریزی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ پروفیسر شہاب نے ۳۵ء میں پٹنہ کالج سے امتیاز کے ساتھ ایم اے کیا۔ اسی دوران ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب سے قرآن مجید اور حدیث نبوی پڑھنے اور سمجھنے کا انداز سیکھا۔ قانون کی تعلیم کی طرف توجہ ہوئی، اور ٹریننگ کالج کی تعلیم بھی اسی اثنا میں پائی۔

قیام پاکستان سے قبل پروفیسر شہاب نے حکومتِ ہند کی ملازمت قبول کرلی تھی اور اچھے عہدے پر فائز تھے۔ پھر کچھ عرصہ بعد تحریک آزادی کامیاب ہوئی اور مملکت پاکستان وجود میں آئی۔ پروفیسر شہاب کہتے ہیں کہ "اب پاکستان کی طرف ہجرت کرنا فرض تھا اور وطن میں رہنا کفر تھا۔ میں کراچی آ گیا اور انصار ربابِ الاسلام نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایسا جذبہ تھا، ایسا اخلاق تھا، ایسا خلوص تھا کہ انصارِ یثرب کا نقشہ آنکھوں کے سامنے تاریخ ہجرت نے کھول کے رکھ دیا۔" ان کے یہ جملے ان کے ذہن و فکر کے اور جذبات کے ترجمان ہیں۔

یہاں پروفیسر شہاب کی ملاقاتیں سر غلام حسین ہدایت اللہ مرحوم، جناب پیر الہٰی بخش مرحوم، جناب ہاشم گزدر مرحوم اور جناب محمد ایوب کھوڑو سے نیز دوسرے اکابر انصار سے ہوئیں اور ہوتی رہیں۔ پروفیسر شہاب کہتے ہیں کہ "سب پوچھتے تھے بتاؤ کیا چاہتے ہو ہم تمہارے لئے کیا کریں۔ میں بصد ادب عرض کرتا تھا کہ ہم لوگ مہاجر تو ہیں لیکن آپ لوگوں پر بوجھ بننا نہیں چاہتے، شریفانہ وسائل درکار ہیں۔ ہم تعلیم یافتہ ہیں۔ اپنا راہ خود نکال لیں گے اور آپ کے معاونین کی صف میں ہوں گے۔ آج بھی اور کل بھی۔" پروفیسر شہاب کہتے ہیں کہ "ایک دن پیر الہٰی بخش صاحب نے کہا کہ آپ شکارپور کالج کو سنبھال لیجئے۔ ڈاکٹر محمد داؤد پوتہ بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب عربی فارسی اور اسلامی تاریخ کے بڑے ماہر تھے۔ انہوں نے بھی زور دیا کہ سید صاحب اب انکار کی گنجائش نہیں۔ اور یوں میں نے شکارپور کالج میں عربی اور اسلامی تاریخ کا شعبہ سنبھالا۔"

پروفیسر شہاب نے شکارپور کالج کے بعد گورنمنٹ کالج حیدرآباد کی خدمت کی۔ پھر گورنمنٹ کالج ٹنڈو جان محمد کے پرنسپل بنا کر بھیجے گئے۔ پھر یہیں

لاہور طلب کیا گیا، لیکن ٹریننگ کالج کراچی کی طلب غالب آئی۔ وہ سینیئر پروفیسر کی حیثیت سے یہاں آگئے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔

پروفیسر شہاب نے پاکستان میں اپنی پوری زندگی صیغۂ تعلیم میں بسر کی۔ ۱۹۵۱ء میں کل پاکستان ہسٹری کانفرنس منعقد ہوئی اور یہ تجویز ہوئی کہ کوئی ان لکھا مقالہ اس میں پڑھا جائے تو اس کا قرعۂ فال پروفیسر شہاب کے نام نکلا انہوں نے "اسلامک سوشلزم" پر مقالہ لکھا اور پڑھا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ خال خال ہی لوگ اس عنوان سے باخبر تھے آج کی سی بات نہ تھی کہ جو سمجھتا ہے وہ بھی اور جو نہیں سمجھتا وہ بھی یہ نام لیے چلا جاتا ہے۔ پروفیسر شہاب نے اپنا مقالہ پڑھا تو علامہ سید سلیمان ندوی نے کرسی صدارت سے اٹھ کر اس کی تعریف و تحسین فرمائی۔ وہ مقالہ کانفرنس کی "پروسیڈنگ" میں طبع ہو چکا ہے۔

پروفیسر شہاب نے مضامین و مقالات کے علاوہ ایک کتاب مورش اسپین (MODRISH SPAIN) لکھی ہے جو شائع ہو چکی ہے آج کل "عربوں کا نظام حکومت" زیر تصنیف ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب معلومات کا ذخیرہ ہوگی۔

ڈاکٹر کلیم عاجز

ایک مضمون اس شمارے میں کلیم عاجز کا بھی موجود ہے۔ وہ عظیم آباد کے مقبول و مشہور شاعر ہیں اور سراپا درد ہیں۔ بہار ہی میں نہیں ہندوستان میں دھوم ہے۔ ان کا دیوان بڑے آب و تاب سے ۱۹۷۶ء میں پٹنہ سے شائع ہوا ہے اور ایک سو دس روپے میں بک رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خریدار اردو کتنے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ کلیم عاجز میر کی زبان میں شاعری کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں وہ اپنی زبان میں شاعری کرتے ہیں۔ میر کی زبان اور ان کی زبان دو نہیں، وہی "آؤ ہو"، "جاؤ ہو" اور "پوچھو ہو" "سنو ہو"۔ میر کی زبان بھی تھی، ان کی زبان بھی ہے ؎

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اجاڑ کے

میر کے بعد اردو زبان کو شیخ امام بخش ناسخ لاہوری نے قواعد و ضوابط عطا کیے، نگینے کی طرح الفاظ کی تراش خراش کی، افعال کو ایک شکل دی اور یکسانی بخشی۔ نامانوس الفاظ چھانٹ کر الگ کیے۔ جملوں کو ہموار کیا۔ انداز بیان کو نکھارا۔ "پوچھو ہو" کی جگہ "پوچھتے ہو" اور "سنو ہو" کی جگہ "سنتے ہو" کا چلن عام کیا۔ پھر یہی صاف ستھری، ہموار و آبدار زبان سارے برعظیم میں یکساں رائج ہوئی۔ یہ ناسخ کا بہت بڑا کارنامہ ہے

میر کے زمانے میں جو دلی کی زبان تھی وہی بہار کی زبان تھی اصلاح زبان کے لیے جب لکھنؤ آگے بڑھا تو اہل بہار نے بھی لکھنؤ کے ساتھ ہو کر وحدت لسانی کی بڑی خدمت اپنی تحریروں کے ذریعے انجام دی۔ اگرچہ ان کی بول چال کی زبان وہی رہی جو پہلے تھی اور آج بھی ہے۔ وہی "آؤ ہو" "جاؤ ہو" "پوچھو ہو" اور "سنو ہو"، جو کلیم عاجز کو اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی ہے۔ ہم نے عرض کیا ہے کہ اہل بہار نے اپنی تحریروں میں وہی زبان اختیار کی جو ناسخ نے دی تھی۔ ان کی نثریں، نظمیں اور غزلیں اس کی شاہد ہیں اور کلیم عاجز کی شاعری کی زبان بھی یہی ہے۔ البتہ کلیم نے کہیں کہیں اپنی وہ قدیم زبان بھی استعمال کی ہے جو اہل بہار کی بول چال کی زبان ہے جو میر و ناسخ کے زمانے میں دلی سے بہار تک استعمال ہوتی تھی۔ کلیم عاجز کے ایسے اشعار لوگوں کے سامنے آ کر

غافل نہ کبھی بیٹھیو اس بزم میں رندو
ساغر یہاں ٹھہرے ہے تو شمشیر چلے ہے

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

پتھر کی طرح تیری ہر اک بات لگے ہے
دل توڑ کے ناصح تجھے کیا "ہات" لگے ہے

بکنے بھی دو عاجزؔ کو جو بولے ہے بکے ہے　　دیوانہ ہے دیوانے سے کیا بات کرو ہو

یہ سن کر لوگ چونک پڑے۔ وہ بہت پہلے اس انداز کو چھوڑ چکے تھے۔ تحریر میں بھی تقریر میں بھی۔ گرچہ میر و راسخ کی کلیات ان کے ہاتھوں میں تھی جس میں یہی طرز و انداز محفوظ ہے اور وہ اس کو پڑھتے بھی رہتے ہیں۔ لیکن دور حاضر کی تحریر میں اور پھر غزل میں جب کلیم نے یہ زبان اختیار کر لی، تو یہ کہنے کی جرأت تو کسی کو نہیں ہوئی کہ یہ زبان متروک ہے، کلیم کی غزلیں پر معنی بھی ہیں، پر درد بھی اور پر تاثیر بھی لوگوں نے اسے "میر کی زبان" کہہ کر ایک سند فراہم کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ چند الفاظ کا اشتراک الگ چیز ہے اور روح کلام الگ چیز۔ کلیم کی غزلوں کی زبان یہ ہے۔

قفس میں لالہ و سرو و سمن کی بات کرتے ہیں　　کہاں بیٹھے ہوئے کس انجمن کی بات کرتے ہیں
سنے گا کون میری چاک دامانی کا افسانہ　　یہاں سب اپنے اپنے پیرہن کی بات کرتے ہیں
بے مشقت کبھی آرام نہیں ملتا ہے　　گل بھی ملتے ہیں تو کانٹوں میں نہاں ملتے ہیں
وہی زندہ رہنے کا فن جانتے ہیں　　جو آداب دار و رسن جانتے ہیں
تم تو بے درد ہو بیتابیٔ غم کیا جانو　　اہل دل پر جو گزرتے ہیں ستم کیا جانو
وہ تو کہیے ہم نے رکھ لی آشیانے کے لئے　　ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لئے
خرد زنجیر پہناتی رہے گی　　جو دیوانے ہیں دیوانے رہیں گے

یہ زبان آج ہی کی زبان ہے اور یہ داستان بھی آج ہی کی داستان۔

انجمن کی انجمن بن کر تماشائی گئی　　تیرے دیوانے کو جب زنجیر پہنائی گئی
جان دینا ہی پڑی شرح وفا کے واسطے　　بات نازک تھی بڑی مشکل سے سمجھائی گئی

"جان دینا ہی پڑی" خالص لکھنوی انداز بیان ہے۔ لکھنو نے یہی اصول متعین کیا ہے کہ تذکیر و تانیث کی صورت میں ساری عبارت متاثر ہوگی لیکن "مصدر" جوں کا توں رہے گا۔ اہل لکھنو کے یہاں مصدر مستقل ہوتا ہے، وہ نہیں بدلتا۔ دلی والے "جان دینا ہی پڑی" کی جگہ "جان دینی ہی پڑی" کہتے ہیں۔ ان کے یہاں تذکیر و تانیث کا اثر مصدر کو بھی متاثر کرتا ہے۔ خیر آپ تو کلیم عاجز کے کچھ اشعار سنئے۔

ہم رہے تو کیا ہے ہم ہیں کس شمار میں　　قافلے کا قافلہ لٹ گیا بہار میں
پہلو میں ہمارے دل کیسا دل پر تو قیامت بیت گئی　　مرجھایا ہوا اک غنچہ ہے ٹوٹا ہوا اک پیمانہ ہے
سنتے ہیں وفا کے رستے میں منزل نہ مسافر خانہ ہے　　کیا جانے کہاں تک پہنچے ہیں کیا جانے کہاں تک جانا ہے
رسن و دار نہیں اہل جنوں کی منزل　　ہم مسافر ہیں بہت دور کے جانے والے

کلیم عاجز کی غزلیں آپ بیتی بھی ہیں جگ بیتی بھی۔

ہر گل یہ کہہ رہا ہے چمن میں پکار کے　　سائے سے دور دور ہی رہو بہار کے
ہم نے بے فائدہ چھیڑی غم ایام کی بات　　کون بیکار یہاں ہے کہ سنے کام کی بات
عقل کے جتنے کرشمے تھے سب افسانے ہوئے　　ہم تو ہیں لے عشق تجھ کو پیشوا مانے ہوئے

بوالہوس محلوں میں ہیں بیخواب اور تیرے فقیر — سو رہے ہیں چادرِ آسودگی تانے ہوئے
یہ سمندر ہے کنارے ہی کنارے جاؤ — عشق ہر شخص کے بس کا نہیں پیارے، جاؤ
بڑی طلب تھی بڑا انتظار، دیکھو تو — بہار لائی ہے کیسی بہار، دیکھو تو
اس دور میں اے عاجز کیا ذکر محبت کا — اک دفترِ گم گشتہ، اک قصۂ پارینہ
دیکھ لے آج کہ ابتک کسی قابل ہم ہیں — کل خدا جانے زمانہ ہمیں کیسا رکھے

یہی انداز ان کے کلام کا ہے، لیکن وہ صحیح کہتے ہیں کہ

دل میں نہ ہو گداز تو بولی میں کچھ نہیں — لفظوں کے ساتھ آنکھ مچولی میں کچھ نہیں

کلیم عاجز کی بستی تلہاڑا ضلع پٹنہ ۱۹۴۶ء کے فسادات بہار میں "تہ تیغِ ستم" ہوئی، ٹھیک عید کے دن آٹھ سو مسلمان اس بستی میں شہید ہوئے جن میں کلیم کی والدہ اور چھوٹی بہن بھی شہید ہوئیں اور دو درجن کے قریب ان کے دوسرے قریبی رشتہ دار بھی، بستی کی بستی اجڑ گئی۔ کلیم اس لئے بچ گئے کہ وہاں موجود نہ تھے وہ پٹنے میں تھے۔ وہ ہوتے تو وہ بھی لڑ کر جان دیتے، مگر وہ زندہ ہیں، اپنے کلیجے پر سینکڑوں زخم لئے ہوئے ان کے کان میں ہمیشہ یہ آواز گونجتی رہتی ہے کہ "کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست"۔ اور یہ آواز انہیں شب و روز بے قرار رکھتی ہے۔ میر نے ایک عمر صرف کر کے درد کی پرورش اپنے دل میں کی تھی۔ بھارت کی مہاسبھائی درندگی نے عاجز کا سینہ چھلنی کر کے سارے جہاں کا درد اس میں یکلخت انڈیل دیا۔ وہی درندگی جس نے ۱۹۴۶ء میں کم از کم تیس ہزار مسلمانانِ بہار کے خون سے ہولی کھیلی۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ حصولِ آزادی کے بعد بھی سالہا سال ہندوستان کے طول و عرض میں اسی طرح ہولی کھیلی جاتی رہی۔ کلیم عاجز کی آپ بیتی یوں جگ بیتی بن گئی۔

وہ ستم پہ بھی منصف ہم وفا پہ بھی مجرم — دوست اک جہاں ان کا دشمن اک جہاں اپنا
ہر طرف حکم ہے اشکوں کے ستارے لاؤ — طے ہوا ہے کسی محفل میں چراغاں ہونا
زمانے کو نیند آ رہی ہے جگاؤ — کلیم آؤ کوئی غزل گنگناؤ
ذرا دل کے زخموں کے پردے اٹھاؤ — غضب کا اندھیرا ہے شمعیں جلاؤ

کلیم عاجز تلہاڑا ضلع پٹنہ میں ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ نواحِ پٹنہ میں یہ بستی قدیم شرفاء کی ممتاز بستیوں میں تھی۔ مگر اب تو اک گنجِ شہیداں ہے۔ کلیم کی ننھیال صوفی عالموں کی ہے اور دادیہال زمینداروں و کاشتکاروں کی جو سپہ گری میں بھی امتیاز رکھتے تھے مولوی ضمیر الدین صاحب کلیم کے نانا تھے اور رہبر اکبر علی پرنانا۔ کلیم کے والد کلکتے میں تجارت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کلیم کو صرف مولوی یا صوفی ہی نہیں بننا ہے اسے پہلوان بھی بننا ہے"۔ چنانچہ کلکتے میں انہوں نے چھوٹے گاما کے عزیز محمد نواب پہلوان اور فیروز پہلوان کے سپرد کلیم کو کر دیا تھا۔" ۱۹۳۹ء میں کلیم نے اسکول کے نویں درجے میں قدم رکھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے نانا سے پائی تھی۔ اردو و فارسی کی اچھی اچھی کتابیں پڑھ چکے تھے اور ان کی بنیاد پختہ ہو چکی تھی۔ اسکول میں پہنچے تو ان کا ذہن مرتب ہو چکا تھا۔ انٹر میں اول آئے پھر ایم اے پی ایچ ڈی ہوئے۔ پھر کالج کے لیکچرر بھی مقرر ہوئے۔ مگر ان کی دنیا بدل چکی تھی اور اب تو وہ مجسم درد ہیں۔

کلیم عاجز کے کلام پر پروفیسر کلیم الدین احمد کا تبصرہ، علامہ جمیل مظہری کا مقدمہ، سید علی عباس کا تعارف شریکِ دیوان ہے۔ لیکن خود کلیم عاجز نے جو داستانِ درد قلم بند کی ہے، اور کشتگانِ خنجرِ سیاست کا تذکرہ کیا ہے وہ دل کے ٹکڑوں کی ایسی لہولہان تصویر ہے کہ آنکھوں کی پتلیوں پر

ایک آہی چادر سی کھنچ جاتی ہے اور دل حلق میں آکر اٹکنے لگتا ہے۔ ان کا پورا نام کلیم احمد ہے۔ پہلے شعلہ تخلص تھا، بعد میں عاجز اختیار کیا۔ اس میں بھی بڑی معنویت ہے۔ یہ تخلص ان کے جذبات و احساسات کا غماز ہے۔ ان کا کلام "واردات" خارجی و داخلی کا ترجمان ہے۔ کلیم عاجز ڈاکٹر اوریبنوی کے بھی شاگرد ہیں۔ پہلے پہل ان کی ملاقات ڈاکٹر اوریبنوی سے کس طرح ہوئی اس کا تذکرہ انہوں نے بڑے دلپذیر انداز میں کیا ہے۔ اس مضمون میں استاد اور شاگرد دونوں کے بارے میں معلومات مہیا ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد مجتبیٰ رضوی

نانیہال حسن پورہ (متصل پھلواری شریف پٹنہ) اور دادیہال سید آباد (نزد کاکو جہان آباد گیا) یکم مارچ ۱۹۲۶ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ کے مشہور و معروف وکیل مولوی سید محمد کاظم صاحب کے نواسے ہیں۔ علمی و قانونی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ہائی اسکول سے بی اے تک پٹنہ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی سے "تاریخ اسلام" میں ایم اے کیا۔ ۱۹۵۵ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ پھر ۱۹۶۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے "انٹرنیشنل ریلیشنز" میں ایم اے کیا اور فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۶۹ء میں لندن اسکول آف اکنامکس اینڈ پولیٹیکل سائنس" سے انٹرنیشنل ریلیشنز میں پی ایچ ڈی کیا۔

اردو کالج کراچی میں شعبۂ تاریخ و سیاسیات کے صدر رہے۔ کراچی یونیورسٹی میں ڈیپارٹمنٹ آف انٹرنیشنل ریلیشنز کے چیرمین اور اب اسی یونیورسٹی میں انٹرنیشنل ریلیشنز کے اسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔

ان کی مشہور کتاب "دی فرنٹیرز آف پاکستان" پاکستان فارین ریلیشنز کا ایک باب ہے اور بے حد فکر انگیز و پر از معلومات تحقیقی مقالہ ہے اور اس پاکستان پر آخری کتاب ہے جو مشرقی و مغربی صوبوں پر مشتمل تھا۔ اس کتاب میں پاکستان کی سرحدوں پر سرحدی مسائل پر اور انڈیا، افغانستان، چین، برما، اور ایران کے روابط پر محققانہ بحث تاریخی دستاویزوں سے مزین ہے۔ دنیا کے علمی و فکری حلقوں میں اس کتاب کا بڑا چرچا ہوا اور پاکستان کی تصنیفات میں اسے غیر معمولی اہمیت کی تصنیف قرار دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے سیاسی بصیرت، جغرافی اہمیت، بین الاقوامی تعلقات کی نزاکت، غور و فکر اور تلاش و جستجو کے اعتبار سے پاکستانی مصنفین کا سر اونچا کیا۔ ایسے محقق اور ایسے مصنف پاکستان میں مفقود نہیں ہیں مگر ان میں بیشتر گوشہ گمنامی میں پڑے رہ گئے۔ ان کی کاوشیں طبع ہوکر منظر عام پر نہ آسکیں۔ پروفیسر شمس ضحی کی تحقیق و جستجو کا ذخیرہ جو بلوچستان کے ماضی و حال و مستقبل کا قیمتی آئینہ ہے، کہاں سامنے آیا۔ مصنف بھی اس جہان فانی سے رخصت ہوگیا۔ یہ ایک مثال ہے۔ اور ایسے بھی ہیں جو زندہ ہیں، سلامت ہیں اور کام میں لگے رہتے ہیں۔ مگر زمانہ ان کے لئے مساعد نہیں ہے۔ تحقیق و تجسس میں سرگرداں رہنا، ذرہ ذرہ سمیٹ کر ایک خوبصورت اور مفید ذخیرہ علمی مرتب کرنا اور پھر یہ سوچتے رہنا کہ یہاں تک تو جانفشانی کے تمام مرحلے طے کرکے ہم نے اپنا کام جس میں کسی اور کی مدد نہ درکار تھی نہ کام آسکتی تھی کرلیا مگر اب آگے کی منزل کس طرح طے ہو؟ یہ بڑی دردناک داستان ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ڈاکٹر سید محمد مجتبیٰ رضوی نے اپنی اس قیمتی کتاب کے بعد پھر جو قلم اٹھایا اور نیا ذخیرۂ تحقیق تیار کیا ہوگا اس کے بارے میں اب انہیں کتنی سہولت میسر ہوگی اور نہ ہوگی تو دوسرا ذخیرہ کس طرح منظر عام پر آسکے گا۔

پروفیسر محمد معین الدین دردائی

پروفیسر دردائی کا وطن کراچی پاکستان ہے۔ ان کے آبا و اجداد کا وطن ماضیؔ قریب میں عظیم آباد تھا۔ جو بھارت میں ہے۔ ماضیؔ قریب اس لئے کہا کہ ماضی بعید کی تاریخ بتائے گی کہ ان کے مورث اعلیٰ کا تعلق عربستان سے تھا۔ بحیرۂ عرب کا کنارہ ان کو بلا سبب پسند نہیں آیا۔ ان کے نام کے ساتھ جو "دردائی" کا لفظ ہے وہ مشہور صحابی حضرت ابو درداؓ کی طرف نسبت ہے۔ کتنے ہی لوگ اور ہوں گے جن کا شجرۂ نسب حضرت ابو درداء پر جاکے تمام ہوتا ہوگا۔ مگر ایک پروفیسر معین الدین دردائی ہیں جنہوں نے اس نسبت کو تازہ کیا اور قائم رکھا یہ نسبت بظاہر نسلی و نسبی ہے۔ مگر اصلاً اس میں فکر غالب یہ ہے کہ یہی وہ بزرگ صحابی جن کے توسط سے ہمارا رشتۂ محبت حضورؐ کے دامن فیض سے مربوط ہے۔ صدیقی فاروقی عثمانی علوی زبیری وغیرہ مسلمان ان سے پہلے والوں کی کوئی نسبت تازہ کرنا اسی لئے مناسب نہیں سمجھتے کہ پھر وہ نسبت ذہنی و فکری اعتبار سے اسلامی نسبت باقی نہیں رہے گی۔

پروفیسر دردائی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے، فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر عربی کی مزید تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں پائی۔ ۱۹۲۶ء میں انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کرکے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے گئے اور ایم اے تک وہیں پڑھتے رہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ صرف یونیورسٹی نہ تھی۔ مسلم انڈیا کے ذہن و فکر کی مرکزی تربیت گاہ بھی تھی اور ترجمان بھی۔ تحریک آزادی کے بیشتر علمی و فکری و سیاسی رہنما اسی درسگاہ کی آغوش سے ابھرے۔ پروفیسر دردائی نے بھی اسی درسگاہ میں چھ سال تک تربیت پائی۔ اس اثنا میں وہ "حدیقۃ الشعر" مسلم یونیورسٹی کے سکریٹری بھی رہے اور علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی منتخب ہوئے۔ علی گڑھ سے امتیاز کے ساتھ اردو میں آنرز اور ایم اے کرنے کے بعد انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے ہندوستانی ڈکشنری مرتب کرتے رہے۔ تین چار برس بعد پٹنہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور تعلیمی محکمے میں چلے گئے۔ کوشی کالج کھگڑیا (مونگیر) اور گیا کالج میں اردو و فارسی کے پروفیسر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان کے ایک ڈگری کالج میں شعبہ اردو کے صدر کی حیثیت سے بلا لیے گئے۔ جہاں علم و ادب کی خدمت میں مشغول رہے۔ ایک اردو بنگلہ چھاپے خانہ خرید کر دار الاشاعت بھی قائم کیا۔ اور مختلف علمی و ادبی اور تحقیقی موضوعات پر خود بھی کام کیا اور دوسروں سے بھی کام لیتے رہے۔ ان کے شب و روز اسی غیر معمولی علمی تگ و دو اور ادبی تحقیقی سرگرمیوں میں گزر رہے تھے کہ ۱۹۶۳ء میں ان پر اچانک حملہ ایک مہلک اعصابی مرض کا ہوا جس نے دو سال تک ان کو ذی فراش رکھا۔ جاں بر ہوئے تو چلنے پھرنے کی طاقت کھو چکے تھے۔ اب بھی جسمانی طور پر وہ صحت مند نہیں ہیں لیکن ان کا قلم بدستور رواں دواں ہے اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ہندوستان و پاکستان میں اب تک ان کی حسب ذیل کتابیں طبع ہو چکی ہیں:۔

۱۔ بہار اور اردو شاعری ۲۔ ہندوستان کی قومی زبان اور رسم الخط ۳۔ تحقیقی مقالے ۴۔ جلوے ۵۔ تاریخ سلسلۂ فردوسیہ ۶۔ لسانی مطالعے (لاہور سے)، ۷۔ صوفیائے سندھ اور اردو (کراچی سے) ۸۔ صوفیائے بہار اور اردو (کراچی سے) ۹۔ سیر الاقطاب (کراچی سے) ۱۰۔ اسرار الاولیا (کراچی سے) ۱۱۔ کلیلہ دمنہ کی سبق آموز کہانیاں (لاہور سے) اور (۱۲) مجلس صوفیہ (۱۳) جوامع الکلم ۱۴۔ زبدۃ المقامات۔ یہ تینوں آخری کتابیں زیر طبع ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اردو بنگلہ ڈکشنری بھی ہے جو مسودے کی شکل میں رکھی ہے۔

محمد انیس الرحمٰن ایڈوکیٹ

کراچی میں ایک مدت دراز سے وکالت کرتے ہیں اور آزادانہ زندگی گزارتے ہیں ۔ وکالت و سیاست کا وزشان کو اپنے علمی گھرانے سے ملا ہے
وہ برعظیم کے نامور قانون داں جسٹس سید امیر علی کے خانوادے کے فرد ہیں ۔ ان کے جد امجد سید امداد علی جسٹس سید امیر علی کے بڑے بھائی تھے جسٹس امیر علی
کے سب بھائیوں نے آرہ ضلع شاہ آباد (بہار) کو اپنی سکونت کے لئے پسند کیا تھا ۔ اس لحاظ سے سید انیس الرحمٰن "آروی" ہیں ۔ لیکن ۸ مئی ۱۹۱۹ء
کو وہ پیدا موتیہاری میں ہوئے ۔ وطنیت اگر سرزمین پیدائش سے متعین ہوتی ہے تو وہ "موتیہاری" ہوئے اور اگر کسی بستی اور شہر کو نہیں بلکہ پورے
مجموعے کو لیجئے تو وہ "بھوجپوری" ہیں ۔ زمانہ قدیم میں ایک علاقہ تھا جس میں غازی پور بلیا سے لے کر مونگیر اور ادھر آرہ شاہ آباد وغیرہ سب
اس میں داخل تھے جن کو انگریز دل نے اپنی انتظامی ضرورت کے لئے کچھ یوپی اور کچھ بہار کے حصے میں ڈال دیا ۔ اور اگر وطنیت کی نسبت اس جگہ
سے قائم کی جاتی ہے جہاں حصول علم اور ذہنی تربیت کا زمانہ زیادہ گزرا ہو تو وہ "پٹنوی" ہیں ۔ اور اگر آدمی چھوٹے دائرے میں بند نہیں ہو سکتا
اسے وسعت چاہیے تو پھر ان کو عظیم آبادی بہاری کہنا چاہیے ، مگر ان کو ایک نسبت حیدر آباد دکن سے بھی ہے اور کچھ علی گڑھ سے بھی ۔ میٹرک تک
موتیہاری میں تعلیم پانے کے بعد وہ حیدر آباد چلے گئے تھے اور جامعہ عثمانیہ سے انٹرنس پاس کیا تھا جہاں مولانا مناظر احسن گیلانی سے مستفیض ہوتے
رہے ۔ پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا رخ کیا مگر خرابیٔ صحت نے ان کو زیادہ عرصے تک وہاں رہنے نہ دیا بلکہ پلٹ کر پٹنے پہنچے اور وہیں اپنی تعلیم مکمل
کی ۔ ایم اے بھی کیا اور ایل ایل بی کی ڈگری بھی لی ۔ موتیہاری کے اسکول میں معلمی بھی کی ۔ اور قومی زندگی میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ موتیہاری کے
توسط سے داخل ہوئے جس کے وہ سالار تھے ۔ پھر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن موتیہاری کی تنظیم میں حصہ لیا اور اس کے نائب صدر منتخب ہوئے ۔
بہار صوبائی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مجلس عمل کے رکن اور اس کی آل انڈیا کونسل کے ممبر بھی ہوئے ۔ وہ آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی
بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک ہیں ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیم اور تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن تھے ، اس لحاظ سے دیکھئے تو ان کا اصلی
وطن "پاکستان" ہی تھا اور پاکستان ہی ہے ، چنانچہ وہ پاکستان چلے آئے ۔

سید انیس الرحمٰن ایڈوکیٹ اپنے وکیلانہ مشاغل کے علاوہ شہر کی مختلف علمی ادبی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہتے
ہیں ، اردو اور انگریزی میں ابتدا ہی سے ان کی زبان بھی چلتی رہی ہے اور قلم بھی ، وہ مصنف بھی ہیں اور مقرر بھی ۔ شاعر بھی ہیں اور مضمون نگار بھی ۔
برعظیم کے بزرگ فلسفی عالم "خلافت ربانیہ" کے علمبردار ، شعلہ بیان خطیب اور بیباک ملی قائد حضرت مولانا عبدالقدیر آزاد سبحانی کے شیدائیوں میں
ہیں ۔ ان کے پاؤں بھی دبائے ہیں اور فیض بھی پایا ہے ۔ اس فیض کا یہ اثر ہے کہ اظہار خیال میں یہ بھی کسی رو رعایت سے کام لینے کے قائل نہیں ،
معاشرتی خرابیوں سے بے حد نالاں ہیں اور ان خرابیوں کو وہ اس انگریزی نظام قانون کا لازمی نتیجہ بتاتے ہیں جو انگریزوں نے اس
برعظیم میں اپنی مصلحتوں کی تکمیل کے لئے جاری کیا تھا ۔ تاریخ سے بھی خاص دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے نظر دور تک جاتی ہے اور وکیل ہیں اس لئے دلائل
اور نظائر کی بھی ان کے پاس کمی نہیں ہے ۔ ان کی متعدد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں ۔ ان میں "انیس معاشرہ" کے نام سے بھی ایک کتاب ہے ،
اور قانون کے موضوع پر بھی جس میں انہوں نے کہا ہے کہ انگریزی قانون نے معاشرے میں لاقانونیت کے جرائم کی پرورش کی ہے ۔

سید شرف الدین شرف عظیم آبادی

عظیم آباد ان کے نام کا جزو ہے۔ لیکن وہ اسی طرح پاکستانی ہیں جس طرح زعیم پاکستان حسین شہید سہروردی تھے کہ "سہرورد" کی نسبت اُن کے نام کا جز تھا۔ یا جیسے سید ذوالفقار علی بخاری کہ تھے پاکستانی مگر بخارا کی نسبت ان سے بہ نوبہ پیوستہ تھی۔

جناب شرف عظیم آبادی کہتے ہیں کہ "میرا وطن سات پشتوں سے عظیم آباد ہے" بالفاظ دیگر آٹھویں پشت (اوپر والی) عظیم آبادی نہیں تھی۔ اور آٹھویں پشت (نیچے والی) بھی نہیں ہے۔ ہر سید اپنی مختلف پشتوں کے بارے میں اسی طرح بتائے گا ورنہ سادات کرام سے مراد اگر ہاشمی ہیں تو مکہ مکرمہ کی گلیوں میں ان کے گھر تلاش کئے جائیں گے اور اگر "سید اشباب اہل الجنۃ" کی نسبت نے یہ شرف بخشا ہے تو ان کے گھر مسجد نبوی کے آس پاس مدینہ منورہ میں ملیں گے۔ ویسے سادات مستقل ہی سفر میں رہے ہیں۔ کبھی بغدادی ہیں، کبھی بخاری، کبھی مصری ہیں، کبھی مراکشی کبھی گجنوی، لکھنوی، دہلوی لاہوری، مرشد آبادی پشاوری، کشمیری، بھکری، سکھری، ٹھٹھہ کا اور ملتانی وغیرہ، وہ کہاں نہیں گئے اور کہاں نہیں پہنچے، آدمی نباتات نہیں ہے کہ اس کی جڑیں کہیں زمین میں گڑی ہوتی ہوں۔ سارا کرۂ ارضی اس کا وطن ہے اور اس کا اپنا ملک، اس کا اپنا گھر۔

سید شرف عظیم آبادی کی تاریخ پیدائش ۱۵ ؍جون ۱۹۰۶ء میٹرک کی سرٹیفکیٹ میں درج ہے۔ بہار و بنگال اس زمانے میں ایک ہی تھے۔ لہٰذا وہ جہاں عظیم آبادی اور بہاری ہیں وہیں بنگالی بھی ہیں۔ ان کے دادا حضرت شاہ محمد یحییٰ صاحبؒ اپنے وقت کے مشہور بزرگ، ممتاز عالم، صوفی اور شاعر تھے۔ ان کے والد جناب سید شاہ محمد مہدیؒ بھی صوفی تھے اور بڑے بھائی جناب سید شاہ محمد حامد بھی صوفی ہی تھے اور تحریک خلافت کے سرجوش سپاہی۔ حضرت سید شاہ شرف الدین شرف عظیم آبادی کیا ہیں یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ یہ معاملہ معرفت کا ہے جو بغیر مجاہدہ حاصل نہیں ہوتی۔ مشہور ادیب و صاحب دیوان شاعر خواجہ سید فخر الدین حسین سخن دہلوی ان کے نانا تھے۔

سید شرف عظیم آبادی بتاتے ہیں کہ ترک موالات کے زمانے میں ان کو کپڑا بننے کا کام سیکھنے کے لئے بھی جانا پڑتا تھا کیونکہ انگریز کی نوکری کرنے کے لئے قوم تیار نہیں تھی۔ اس لئے ہر ایک کو کسی نہ کسی طرح ہنرمند بنا دینا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ تاکہ زندگی مشکلات سے محفوظ رہے۔ ابتدا میں عربی پڑھنی شروع کی تھی۔ پھر محمڈن اینگلو عربک اسکول میں ان کو داخل کیا گیا اور وہیں سے انہوں نے میٹرک کیا۔ انٹر پٹنہ کالج سے پاس کیا۔ اور بی اے علی گڑھ سے۔ اور کئی سال بعد سرکاری ملازمت کے دوران پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ مضمون نگاری کا شوق بچپن سے تھا۔ رفتہ رفتہ ملک کے مشہور رسالوں، نیرنگ خیال، رومان، بہارستان، علی گڑھ میگزین اور عصمت وغیرہ میں ان کے مضامین چھپنے لگے اور مشہور ادیبوں سے خط و کتابت بھی ہونے لگی۔ تہذیب نسواں میں بھی مضامین لکھے اور اتنے مقبول ہوئے کہ سید امتیاز علی تاج نے ان کو لاہور بلایا اور وہ لاہور جانے کو تیار ہو گئے مگر ان کی والدہ ماجدہ کو جب معلوم ہوا کہ لاہور تو علی گڑھ سے بھی زیادہ دور ہے تو اجازت نہ دی، وہ لاہور نہ جا سکے۔ ورنہ مولانا تاجور، سید حبیب اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی طرح لاہوری ہو جانے والوں کی فہرست میں ایک نام ان کا بھی ہوتا۔

سید شرف عظیم آبادی نے ۳۲ء میں بہار اسمبلی کی ملازمت اختیار کی اور آٹھ سال تک اس سے وابستہ رہے۔ ۴۰ء میں انکی شادی ہوئی اور اسی سال صوبائی اسمبلی سے مرکزی حکومت کے محکمۂ رسد (سپلائی) میں تقرری ہوئی۔ "کچھ عرصہ بعد جب دلی میں دل لگنے لگا تو خبر ملی کہ پاکستان بن گیا اور میں کراچی آ گیا"۔ پھر کہتے ہیں کہ "مجھے فخر ہے کہ میں بھی ان جاں نثاروں میں سے ایک ہوں جس نے زمین پر بیٹھ کر شب و روز کام کیا۔

پرانے اخبار کے ٹکڑوں پر نوٹ لکھے، پن (Pin) کی جگہ ببول کے کانٹے استعمال کئے۔ ٹائپ رائٹر تو حصے میں ملا نہیں تھا، سب ہی سرشار تھے مگر قائد اعظم اور قائد ملت کا رخصت ہونا تھا کہ فضا یکایک بدل گئی ۔ ۔ ۔" ان کی یہ عبارت "خالص پاکستانی کی ہے اور پاکستانی جذبات کی حامل

۱۹۵۲ء میں وہ پاکستانی ہائی کمیشن کے دفتر کے لئے لندن گئے اور پانچ سال بعد واپس آئے۔ دسمبر ۱۹۶۶ء میں پنشن ہوگئی مگر کہتے ہیں کہ پنشن کے بعد میری ذمہ داریاں ذرا مختلف ہوگئی ہیں مثلاً "آٹے دال کا بھاؤ"۔ اب میرے لئے محض محاورہ نہیں رہا، بلکہ تمام اشیائے خوردنی کی قیمتیں مجھے ازبر ہوگئی ہیں"۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک مضمون "پنشن سے پہلے اور پنشن کے بعد" کے عنوان سے لکھا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس طرح تمام پنشن یافتہ حضرات کی ترجمانی بھی ہوگئی اور جن کو پنشن ہونے والی ہے ان کو بھی پہلے ہی سے اندازہ ہوگیا کہ بہت جلد ان کا انجام کیا ہونے والا ہے"۔

سید شرف عظیم آبادی نہایت ہی باغ و بہار آدمی ہیں۔ شاعر بھی ہیں، ادیب بھی۔ لیکن اپنے جگری دوست ڈاکٹر اختر اورینوی کے انتقال بعد سے مرجھا کے رہ گئے ہیں۔ ان کی چند سطریں پڑھئے: "میں دوستوں کے معاملے میں بہت محتاط ہوں۔ بڑی مشکل سے میں کسی طرف کھنچتا ہوں اسی لئے بس گنتی ہی کے چند دوست مجھے مل سکے۔ شہنشاہ اکبر کے نورتن کے متعلق میں نے سنا تو بہت تھا، لیکن اس چنڈال چوکڑی کا بھی جواب نہ تھا، پیچھے چند نام بھی سن لیجئے (۱) سید علی اطہر وکیل، پھر مصنف، پھر وکیل اور اب وکیل ہی وکیل (۲) محمد یحییٰ تقوی، بے حد ذہین اور غضب کا شاعر مگر یہ دونوں چیزیں عملی زندگی میں ان کو راس نہ آسکیں (۳) تمنائی ایک دلکش، درد مند اور رومانٹک انسان ان کو بھی اپنی نیتوں بچوں سے ہمیشہ نقصان ہی پہنچا (۴) محمد رضا نقوی، یہ اسمبلی میں بھی ممبر "ہمزاد" رہے۔ خطرناک حد تک ذہین، آج ان کا شمار ہندوستان کے بہترین مزاح نگاروں میں ہوتا ہے واہی تخلص ہے اور ان کی متعدد تصانیف میں ایک مجموعہ کلام "واہیات" بھی ہے (۵) ہاں ایک نام اور رہ گیا ہے، لیکن اس کے متعلق مجھ سے کچھ کہا نہیں جاتا، یہ ہے اختر میرا سب سے پرانا دوست سب سے پیارا دوست۔ ان پانچ میں رضا پٹنہ ہی میں رہ گئے۔ اختر بہت دور چلے گئے۔ اطہر، یحییٰ اور تمنائی کراچی ہی میں ہیں۔ مگر برسوں ملاقات نہیں ہوتی، میں خود تو عرصہ ہوا مر چکا ہوں اس لئے میرا ذکر ہی کیا۔"

خواجہ محمد شرف الدین منّانی

کچھ لوگ وہ بھی ہیں جن کا کام صرف "پڑھنا" ہے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک حصول علم بذات خود ایک مقصود ہے۔ منّانی صاحب ڈگریوں کے "سرمایہ دار" ہیں لیکن ایسے سرمایہ دار جو خون پسینہ ایک کر کے دولت علم سمیٹتے ہیں اور اسے علم کے طلب گاروں تک پہنچاتے ہیں۔ یہ معلمی بھی کرتے رہے ہیں مگر یقین ہے کہ ان کو نہ تو کبھی تنخواہ کی پریشانی ہوتی ہوگی نہ گریڈ کی۔ اس لئے کہ وہ معلموں کی فہرست میں ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں، روزی اپنی محنت سے حاصل کرتے ہیں اور علم لٹانے کی اجرت لینا نہیں چاہتے۔ خبر نہیں کالجوں کے اساتذہ جب اپنے مطالبات کی فہرست لے کر نکلتے ہوں گے تو یہ کسی ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے ہوں گے یا کسی لائبریری میں محو مطالعہ۔ کئی کالجوں میں اردو، فارسی اور اسلامیات کی تدریس کی ہے مگر اعزازی۔ آج کل اردو گورنمنٹ کالج میں قانون پڑھاتے ہیں اور یہ بھی اعزازی۔

پھلواری شریف ضلع پٹنہ کے قریب ہی راسخ العقیدہ مسلمانوں کی ایک بستی "حسن پور" تھی۔ "تھی" اس لئے کہا کہ ایسی بستیاں فسادات میں بری طرح اجڑیں۔ گو یہ توقع ہے کہ پھر بس گئی ہوگی۔ صیاد آشیانے اجاڑتا رہتا ہے اور آشیانے بنتے رہتے ہیں۔ نہ یہ سلسلہ رکا ہے، [illegible] منّانی صاحب

اسی حسن پورہ میں پیدا ہوئے، کہتے ہیں کہ میرے خاندان میں پیدائش کی تاریخ و سال لکھنے کا رواج نہ تھا اس لئے صحیح سنہ بتانا مشکل ہے اتنا ضرور معلوم ہے کہ مہینہ رمضان المبارک اور تاریخ ۱۴ تھی۔ اسکول میں جب نام لکھوانے کا وقت آیا تو وہاں اندازے سے ۳۰ء لکھا گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ قرآن حکیم ناظرہ اور حفظ کا سلسلہ شروع ہوا، حفظ کی تکمیل تو نہ ہو سکی لیکن فارسی میں گلستاں بوستاں اور اردو میں اسماعیل میرٹھی کی پانچ چھ کتابیں پڑھائی گئیں اور پھلواری شریف کے مڈل اسکول میں داخل کر دیئے گئے۔ حضرت مولانا شاہ غلام حسنین صاحب چشتیؒ کی سرپرستی میں تعلیم پائی۔ مڈل پاس کیا پھر پٹنہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے میٹرک تک پہنچے ۱۹۴۶ء کے فسادات بہار نے گھر سے بے گھر کر دیا۔ ۵۰ء میں پاکستان چلے آئے۔ پہلے پشاور کو مسکن بنایا پھر کراچی کو۔ متعلقین کی کفالت کے لئے ایک پٹرولیم کمپنی میں ملازمت کر لی۔ جو آج تک برقرار ہے۔ کچھ اطمینان ہوا تو تعلیم کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر جوڑا۔ اور اب تک وہ تین چار ڈگریاں ایم اے اور ایل ایل بی وغیرہ کی حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ قانون کا "ڈپلوما" نہیں بلکہ "ڈپلومے" مختلف قسم کے انہوں نے حاصل کئے، علوم شرقیہ کے شعبوں میں ادیب فاضل اور منشی فاضل کی سندیں بھی لیں اور اب فاضل عربی کے امتحان میں شرکت کا عزم رکھتے ہیں پھر صحافت میں پی ایچ ڈی کرنے کی نیت الگ ہے، اور ریسرچ بھی کیا۔ اس کا تحقیقی مطالعہ بھی تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے۔

منانی صاحب کراچی میں مختلف رسائل و جرائد کے مرتب، رکن مجلس ادارت، معاون مدیر اور مدیر بھی رہ چکے ہیں اور حلقہ فکر و ادب کے سکریٹری بھی۔ حلقے میں جو مضامین پڑھے گئے اس کا ایک انتخاب بھی انہوں نے شائع کیا ہے۔ اور خود بھی بہت افسانے لکھے ہیں۔ شاعر بھی ہیں اور شعر و سخن کی تقریباً تمام اصناف سے دلچسپی لیتے ہیں۔ ادب و ثقافت کے علاوہ انجمن سماجی بہبود کے سلسلے میں بھی کچھ کام کئے ہیں۔ آئندہ کیا کریں گے اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ شاید وہ خود بھی نہ جانتے ہوں۔

حسن پورہ کے باشندے اور خصوصاً ان کے اپنے خانوادے کے افراد کو بزرگان دین سے غایت محبت و عقیدت تھی اسی عقیدت کا پرتو ان کے نام پر ہے۔ پورا نام کچھ یوں تھا "خواجہ سید محمد شرف الدین احمد"۔ "خواجہ" کا لفظ خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتیؒ کی نسبت کا اشارہ ہے۔ "محمد" مسلم ہونے کی دلیل۔ اور "شرف الدین احمد" حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی عقیدت کا اظہار۔ اس نام کے آخر میں "منانی" کا لفظ انہوں نے خود بڑھا لیا ہے۔ اس لئے کہ ان کے والد مرحوم کا نام سید عبدالمنان تھا۔ مگر اب یہ سب کچھ حذف کر کے طوالت سے اختصار کی طرف انہوں نے ہجرت کر لی ہے۔ کبھی "ایس منانی" لکھتے ہیں کبھی صرف "منانی"۔ لیکن ڈگریوں اور سندوں کے معاملے میں ان کی رفتار ہمہ گیری کی فاتحانہ رفتار ہے۔ ان کی فتوحات علمی کا تذکرہ کبھی ہو گا تو ان کا طویل نام منشی فاضل، ادیب فاضل، فاضل عربی ایم اے ایل ایل بی، پی ایچ ڈی وغیرہ وغیرہ کی بھیڑ میں ڈھونڈے نہ ملے گا۔ اور وہ اطمینان سے الگ بیٹھے داغ کا یہ شعر گنگناتے ہوں گے کہ

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو!
اور پھر ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

سید محمد ظفیر الحسن

پروفیسر کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالودود اور پروفیسر سید حسن عسکری وغیرہ کے فیض علمی سے مالا مال ہونے والوں میں ایک سید محمد ظفیر الحسن صاحب بھی ہیں۔ ہندوستان پر لودھیوں نے بھی زبردست حکمرانی کی ہے، ان کی یادگار پانی پت کی پہلی لڑائی کے علاوہ پٹنے کا قدیم محلہ "لودی کٹرہ" بھی ہے۔ اسی محلے میں "باغ کالو خاں" ظفیر صاحب کا ننہالی علاقہ تھا۔ وہیں ۱۳۴۶ھ کی بارہویں محرم کو پیدا ہوئے۔ "سبل پور" ان کی دادیہالی بستی تھی جہاں قرآن مجید اور اردو کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد مقامی سرکاری اسکول میں داخل ہوئے۔ علم الحساب ایک پنڈت سے سیکھا، اسی لئے حساب کے بڑے ماہر ہیں اور پہاڑے جو اکثر پڑھے ہوتے ہیں، اب بھی ان کی نوک زبان پر ہیں پھر بانکی پور کے رام موہن رائے سیمنری اسکول سے میٹرک کیا۔ اختیاری مضمون ریاضی تھا۔ بی این کالج سے انٹر سائنس کیا۔ بی اے ریاضی کے ساتھ کیا اور انگریزی میں آنرز لیا تھا پھر ڈبل ایم اے بھی کیا۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کی سرپرستی میں پانچ سال تک رہے۔ جو طالب علم ذہین سنجیدہ اور محنتی ہوتا ہے اس پر استاد کی شفقت ہمیشہ بہت زیادہ رہتی ہے۔ ظفیر صاحب بھی ان خوش نصیبوں میں ہیں جن پر استاد کی شفقت خاص رہی۔ اختیاری مضمون تو ریاضی تھا۔ لیکن جولانیاں اردو اور انگریزی اور فارسی میں دکھائیں۔ اس کا علم ہمیں ہے۔ ریاضی کی جولانیوں کا علم سرکار کو ہوگا جس کی خدمت گزاری میں وہ غرق رہتے ہیں۔ اردو اور انگریزی کا وسیع مطالعہ انہوں نے کیا ہے اور رسالہ معاصر پٹنہ میں ان کے مضامین بھی چھپتے رہے ہیں۔

۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے آئے اور کراچی میں اقامت پذیر ہوئے۔ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے لئے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان کی وزارت صنعت نے "شماریات" کی اعلیٰ تعلیم کے لئے یونیسکو اسکیم کے تحت کولمبو پلان فیلوشپ دے کر بین الاقوامی ادارہ شماریات میں کلکتہ بھیجا۔ تکمیل کے بعد ۱۹۵۳ء میں واپس آئے اور اپنے فرائض منصبی میں مشغول ہوئے۔ غالباً لودی کٹرہ کی نسبت سے لودھیوں کی سی محنت و مشقت کا جوش بھی ان کو ملا ہے۔ وہ کراچی کی علمی ادبی سرگرمیوں سے بھی دلچسپی لیتے ہیں۔ شرف آباد بیدل لائبریری کے بانیوں میں ہیں اور اس کے معتمد اعزازی بھی وہی منتخب ہوئے۔ اسی طرح انجمن شرفیہ کے شریک معتمد بھی ہیں۔ وہ بیدل عظیم آبادی کے شیدا ہیں۔ بیدل کے کلام کا انتخاب بھی کیا ہے، اس کے علاوہ انتخاب کلام جوشش کیا، ڈاکٹر سید مطیع الامام کے فارسی مقالہ ڈاکٹری "احوال و آثار حضرت مخدوم الملک" کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ اور اپنے استاد پروفیسر کلیم الدین احمد کی انگریزی کتاب "تحلیل نفسی اور ادبی تنقید" کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ اور عظیم آباد کے مشہور شاعر محمد عابد دل کے نایاب قلمی دیوان کو برآمد کر کے ایڈٹ کیا اور اس پر تنقیدی و تحقیقی انداز سے مقدمہ لکھا جس پر ان کے اساتذہ نے بڑی مسرت کا اظہار کیا، اور پٹنہ میں یہ کتاب ایک نعمت کی طرح پہنچی۔

ظفیر صاحب بڑے افسر ہیں مگر افسر معلوم نہیں ہوتے اور لوگوں پر ان کا رعب قائم نہیں ہوتا۔ دفتر کے اندر کا حال ہمیں نہیں معلوم۔ ان کی طبیعت میں بڑی خاکساری اور بڑی سادگی ہے۔ لمبی سی خوبصورت کار سے برآمد ہوتے، ہاتھ میں ۵۵۵ کا ڈبہ ہوتا تو رعب کچھ جمتا۔ مگر وہ تو سگریٹ بھی نہیں پیتے۔ وہ جس انہماک سے اپنے فرائض منصبی بجا لاتے ہیں۔ اسی انہماک سے اپنے خالی وقتوں میں کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ شعرا کے تذکروں کا ذکر کیجئے تو وہ کوئی ڈیڑھ سو تذکروں کے نام فر فر گنوا دیں گے۔ دنیا کے کن کن کتاب خانوں میں کون کون سی کتاب ہے اس کی بھی خبر رکھتے ہیں۔ لاہور اور کراچی کے کتب خانوں اور میوزیم کے قلمی نسخے بیشتر ان کے دیکھے ہوئے ہیں۔ ان کی محنت و مشقت کی عادت اور جذبے کا شباب قابل رشک ہے۔

ڈاکٹر محمد منصور عالم

رفیع گنج ضلع گیا (بہار) کے رہنے والے ہیں، وہیں ۱۹۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ پاکستان سے ایک سال عمر میں چھوٹے ہیں، ویسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کمیونسٹ چین سے عمر میں ایک سال بڑے بھی ہیں۔ گیا کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۹۶۶ء میں بی اے اردو آنرز فرسٹ کلاس میں پاس کیا اور ۱۹۶۸ء میں مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے ایم اے کیا اور فرسٹ کلاس میں پاس کیا اور ۱۹۷۴ء میں پی ایچ ڈی کیا۔ مقالے کا عنوان تھا "بہار میں تذکرہ نگاری" اور ڈی لٹ کا عنوان ہے "اردو میں تحقیقاتی ادب کا آغاز و نشوونما"۔ یہ زیر تکمیل ہے۔ ڈاکٹر محمد منصور عالم بہار اردو اکیڈمی پٹنہ میں ریسرچ اسسٹنٹ ہیں اور ایچ ڈی جین کالج آرہ کے شعبہ اردو میں لکچرر۔

ان کی تصانیف میں مضامین و مقالات کے علاوہ "فن تذکرہ اور بہار میں تذکرہ نگاری" تحقیقی کتاب ہے اور زیر طبع ہے اور "کاشِ نقد" ان کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے یہ زیر ترتیب ہے، "کاشِ نقد" دلچسپ نام ہے۔

مغل سرائے سے کلکتے کی طرف جانے والی لائنیں دو ہیں، ایک مین لائن جو پٹنہ ہو کر کلکتے جاتی ہے۔ دوسری گرینڈ کورڈ جو گیا ہو کر کلکتے جاتی ہے۔ اسی گرینڈ کورڈ لائن پر ایک اسٹیشن "ڈہری آن سون" ہے۔ دریا سون جو اصل میں "سوہن" تھا۔ وہ دریا جس کی شان میں حضرت غالب نے یہاں تک فرمایا ہے کہ

گفتمش سلسبیل خوشتر باشد ... گفت خوشتر نہ باشد از سوہن

غالب نے کلکتے جاتے ہوئے دریائے سوہن کا پانی پیا ہوگا اور کشتیوں کے پل سے پار بھی ہوئے ہوں گے۔ اس دریائے سوہن کا پاٹ بہت سے اور اب اس کے اوپر لوہے کا بہت لمبا پل ہے جو غالب کے زمانے میں نہیں تھا۔ اتنا لمبا پل ہے کہ ادھر اسٹیشن اور ادھر اسٹیشن۔ بیچ میں ٹرین سارا راستہ پل کے اوپر رہتی ہے ایک اسٹیشن سے چلی اور پل شروع ہو گیا۔ پل ختم ہوا اور دوسرا اسٹیشن آ گیا۔ پھر دو تین چھوٹے اسٹیشنوں کے بعد "پامر گنج" ایک اسٹیشن تھا۔

۱۹۷۴ء میں ہم جو دلی گئے اور وہاں سے "پامر گنج" کا ٹکٹ خریدنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اس نام کا کوئی اسٹیشن نہیں ہے۔ ہم نے کہا جانے دو، چوری ہو گیا ہوگا۔ شہنشاہ اورنگ زیب سے اگر حضرت ملا جیون یہ کہہ سکتے ہیں کہ پل چوری ہو گیا تو ہم بھی اس دور میں یہ باور کر سکتے ہیں کہ پامر گنج ریلوے اسٹیشن چوری ہو گیا۔ ملا جیون نے تو پل چوری ہو جانے کی بات اس لئے کہی تھی کہ چند مسلمانوں نے ان سے یہی کہا تھا۔ ان کے نزدیک پل کا چوری ہو جانا ممکن تھا۔ مسلمانوں کا جھوٹ بولنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن میرے نزدیک بھارت میں ایک معمولی اسٹیشن کی کیا حقیقت ہے علاقے کا علاقہ چوری ہو جا سکتا ہے۔ بکنگ افسر ہماری یہ گفتگو سن کر لطف لے رہا تھا۔ ہم نے کہا بھئی رفیع گنج تو موجود ہے۔ وہیں کا ٹکٹ دے دو۔ ہم راستے میں کہیں پامر گنج کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ بکنگ افسر ریلوے ٹائم ٹیبل کو مسلسل ٹٹول رہا تھا۔ اس نے کہا "پامر گنج" کا نام تو نہیں ملتا۔ ایک اسٹیشن "اورنگ آباد روڈ" موجود ہے۔ ہم نے کہا نہیں بھئی، ہم ایسی سودیشی راہ سے نہیں جائیں گے جو روڈ پر چلتی ہے۔ میرا ویزا اتنا لمبا نہیں ہے۔ وہ ہنس پڑا اور پوچھا آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟ ہم نے کراچی کا نام لیا تو بولا اچھا پاکستان سے؟ اور پھر اس نے مجھے یقین دلایا کہ جو محل وقوع آپ نے بتایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسٹیشن یہی ہے۔ ٹائم ٹیبل پر نظر ہماری بھی تھی۔ ہم نے کہا، ہاں لاؤ یہیں کا ٹکٹ دے دو، پامر گنج کو انگریز کے نام پر رکھا گیا ہوگا اچھا کیا تم لوگوں نے اس کا نام بدل دیا۔ مگر ایک انگریزوں کو بھی اپنے … سے نکالو، جو یہاں بدستور جمع ہوئے ہیں۔ وہ مسکرایا تو ہم نے کہا

بھی سچ سچ بتانا۔ کیا تمہارے یہاں ریل گاڑی اب روڈ پر چلنے لگی ہے؟ کہیں اس میں بیل جُتے ہوئے تو نہ ہوں گے؟۔۔۔

اسی ریلوے اسٹیشن "پامرگنج" کا نام بدل کر اسے اورنگ آباد روڈ کر دیا گیا۔ وہیں سے ایک پختہ سڑک مڑ کر اورنگ آباد جاتی ہے۔ یہ وہاں کا ایک پرانا شہر ہے۔ "اورنگ آباد روڈ" سے آگے دو تین چھوٹے اسٹیشنوں کے بعد رفیع گنج آتا ہے جو ڈاکٹر محمد منصور عالم کا رفیع گنج ہے۔ اسی رفیع گنج کے قریب "عماد پور" ہے وہی عماد پور جس نے تحریک پاکستان کے زمانے میں بھی اپنے مشہور و مقبول شاعر حضرت شفق عماد پوری کی وجہ سے بڑی شہرت پائی۔ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" انہیں کا لکھا ہوا ترانہ تھا جو سارے برعظیم میں گونجا۔ رفیع گنج عماد پور اور آس پاس کی بستیوں میں خاصے ممتاز اہل علم گزرے ہیں۔ کیا عجب ڈاکٹر محمد منصور عالم ان کا بھی کھوج لگائیں اور ان کے ناموں اور کاموں کو بھی اہل نظر کے سامنے لائیں۔

ڈاکٹر اختر اورینوی کا ادبی مقام متعین کرنے کی جو کوشش انہوں نے اپنے مضمون میں کی ہے۔ وہ ان کی سنجیدگی، متانت، قوت نقد، وسعت نظر اور صلاحیت تجزیہ و تحلیل کا ایک نمونہ ہے۔ حالانکہ ان کی عمر ابھی وہ ہے جس میں جذبات کی شدت ہوتی ہے اور اکثر سیاحت اس کی نذر ہو جاتے ہیں۔

مہ جبیں ناز

عظیم آباد کے مشہور شاعر و ادیب سید شاہ ولی الرحمٰن کاکوی (جانشین حضرت شاد عظیم آبادی) کی نظم و نثر ہندوستان میں معارف اعظم گڑھ اور نگار لکھنؤ کے صفحات پر چمکتی رہتی تھیں۔ پھر پاکستان میں نقوش لاہور اور مہر نیمروز کراچی بھی ان کی ملایت علمی و قلم و دانش میں داخل رہے۔ سید صاحب عربی فارسی اور اردو ادب کا گہرا علم رکھتے تھے۔ انگریزی ادب پر بھی عبور تھا۔ وہ سینئر ڈپٹی مجسٹریٹ تھے مگر علمی و ادبی چسکا اپنی جگہ پر تھا۔ کاکو ضلع گیا میں نہایت صاف ستھرے ذہن و فکر اور علم و عمل کے علمبردار سیدوں کی قدیم بستی تھی۔ اب بھی ہوگی۔ یہ خاندان وہیں کا ہے۔ اور اسی کی نسبت اس گھرانے کے تمام افراد اپنے نام کے ساتھ "کاکوی" لکھتے ہیں۔ کاکو کی خاک سے ہر دور میں بڑے بڑے علماء، صوفیا، ادبا اور شعراء اٹھے ہیں پھر یہ خاندان پٹنہ کا ہو کر رہ گیا۔ لیکن یہ بھی کیوں کہیے کہ پٹنہ کا ہو کر رہ گیا۔ اس گھرانے کے متعدد افراد نے تو پاکستان کے شرقی و غربی علاقوں کو بھی آباد کیا۔ مہ جبیں ناز انہیں سید شاہ ولی الرحمٰن کاکوی کی صاحبزادی ہیں اور پاکستانی ہیں۔

مہ جبیں ناز کے دادا سید شاہ عفور الرحمٰن صاحب کاکو کے زمیندار تھے۔ اور بڑے ذی علم، حوصلہ مند، وسیع القلب، وسیع النظر بزرگ تھے۔ حمد تخلص کرتے تھے۔ شاعری میں حضرت وحید الہ آبادی سے تلمذ تھا۔ کلیات دس ہزار پر مشتمل ہے۔ مہ جبیں ناز کے نانا سید امانت حسین عطا بھی علمی آدمی تھے اور سینئر ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ اس طرح ان کی دادیہال و نانیہال دونوں کو علم و ادب اور تہذیب و شرافت کا گہوارہ سمجھئے۔ شاہ ولی الرحمٰن کاکوی بھی ممتاز ہوئے اور ان کے بھائی عطا کاکوی اور اختر کاکوی بھی سب ایک سے ایک ہیں۔ پھر ان کی اولاد میں نعیم الرحمٰن صبا کاکوی۔ رشید الرحمٰن ارشد کاکوی، اور محمود الرحمٰن کاکوی نے بھی علم و ادب کا ورثہ پایا اور مہ جبیں ناز نے بھی۔ یوں کہیے کہ ایں خانہ تمام آفتاب است۔

مہ جبیں ناز نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کی۔ عربی فارسی اردو اور انگریزی زبانیں سب ان کے گھر کے اندر موجود تھیں۔ پھر آرہ گرلز اسکول سے میٹرک کیا۔ اول آئیں اور فارسی میں امتیاز حاصل کیا۔ پھر کچھ وقفے کے بعد ویمن کالج پٹنہ میں داخلہ لیا۔ انٹر کیا۔ پھر پٹنہ کالج سے بی اے (آنرز) کیا۔ اور فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ طلائی تمغہ بھی پایا۔ ان کی فطری ذہانت و فطانت نے ہر موضوع پر ایک ...

آگے رکھا۔ ان کے شفیق اساتذہ علامہ جمیل مظہری، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر صدر الدین فضا اور پروفیسر مطیع الرحمٰن، پروفیسر ترلیشہ اور پروفیسر ہیمونہ وغیرہ نے اپنی توجہ سے ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ مہ جبیں ناز نے قاضی عبدالودود کی مجالس علمی سے بھی کسب فیض کیا۔

۱۹۵۵ء میں ان کی شادی سید محمد انور سے ہوئی۔ جو صاحبزادے ہیں جناب سید محمد اصغر صاحب جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دربھنگہ کے۔ اسی زمانے میں انہوں نے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا تھا اور اب تو ماشاءاللہ وہ ایک بڑے افسر ہیں۔

مہ جبیں ناز نے شادی کے بعد ایم اے اردو میں داخلہ لیا اور پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا ان کو ادب اور موسیقی سے غیر معمولی دلچسپی ہے کہتی ہیں کہ اچھی کتابیں پڑھ کر اور خوبصورت نغمے سن کر یا گنگنا کر دل کو ایک سکون حاصل ہوتا ہے۔ مضامین بھی لکھتی ہیں اور شعر بھی کہتی ہیں شعر گوئی کی ابتدائی مشق اپنے چچا کے فرزند ارشد کاکوی کی مدد سے کی تھی، ارشد خود بہت ذہین اور ہونہار ادیب و شاعر تھے اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ ڈھاکے چلے گئے تھے اور صرف وہیں نہیں پورے پاکستان کے ادبی حلقے میں اپنی نمایاں جگہ بنالی تھی۔ ایک رسالہ ندیم بھی ڈھاکے سے نکالتے تھے۔ مگر افسوس کہ یہ شعلۂ مستعجل جتنی تیزی سے چمکا اسی تیزی سے بجھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس جواں عمری میں وہ ایسے شعر کیوں کہتا تھا۔

اس جگ سے دل چھوٹ چلا اب ایک ایک پل ہے ایک ایک سال
دیکھو اس دربار میں ارشد کب ہوتی ہے اپنی پکار

اس کی جواں مرگی خاندان ہی کو نہیں عزیز و ہی کو نہیں، دور دراز کے چاہنے والوں کو بھی زخمی کر گئی۔ ابھی دن تھے کہ اس دربار سے وہ اپنی پکار کی راہ اس طرح دیکھتا مگر دیکھ رہا تھا اور کیا یقین تھا کہ ایک دن ضرور اس کی پکار ہوگی اور جلد ہوگی سو ہوئی اور وہ چلا گیا۔ واقعی چلا گیا۔

معاف کیجئے، خیال کی رو کچھ ہوتی ہی ایسی ہے کہ جدھر چاہے نکل جائے حالانکہ بات یہاں دوسری ہو رہی تھی گفتگو مہ جبیں ناز کی تھی، وہ چاہتی تھیں کہ پٹنہ ہی میں رہ کر اپنے تحقیقی کام کو تکمیل تک پہنچائیں۔ پٹنہ میں جو علمی ماحول اور کتابوں کا انمول ذخیرہ موجود ہے وہ کسی دوسری جگہ مشکل سے دستیاب ہوگا، وہاں پی ایچ ڈی کرنے میں بڑی سہولتیں تھیں۔ تنہا کتب خانہ خدا بخش جو وسط شہر میں واقع ہے بے شمار قیمتی کتابیں ایک ہی جگہ فراہم کر دیتا ہے اس کے علاوہ شخصی کتب خانے ایک سے ایک موجود ہیں۔ مگر حالات نے ان کو پاکستان پہنچا دیا۔ یہاں انہوں نے دل بہلانے کے لئے کچھ عرصہ کراچی کالج فار ویمن میں لکچر دیتی رہیں اور پی ایچ ڈی کا موضوع طاق نسیاں پر رکھا رہ گیا حالانکہ ان کا اصلی ذوق علمی تحقیق و جستجو ہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں پروفیسر کلیم الدین نہیں ہیں، قاضی عبدالودود نہیں ہیں، پروفیسر حسن عسکری نہیں ہیں۔ پروفیسر حسن عسکری ایک ہمارے یہاں بھی موجود ہیں۔ ادیب بھی ہیں اور نقاد بھی مگر صوفی ہو کر وہ اپنے اندرون میں ڈوب گئے ہیں۔ پروفیسر احمد علی ہیں اور وہ تو اور بھی بہت کچھ ہیں۔ لیکن انہوں نے بھی تقریباً گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ مجنوں گورکھپوری موجود ہیں لیکن ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں، اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ہیں اسی طرح دوسرے ہیں اصل یہ ہے کہ ان جیسے حضرات کی کوئی محفل علم و ادب نہیں ہے، اور پٹنہ میں ہر محفل اپنی جگہ پر جمی ہوئی اور رچی ہوئی ملے گی۔ پٹنہ میں اہل علم کے سر پر علم و ادب کا شامیانہ تنا ہوا ہے اور وہ اس کے سائے میں مست و مسرور بیٹھے ہوئے ہیں، وہ کبھی پلٹ کر سیاست کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔ کراچی کے سر پر کوئی شامیانہ علمی نہیں ہے وہ کھلی دھوپ میں کھڑے ہیں بزنس کی تجارت کی، سیاست کی ملازمت کی ایک ایسی بھاگ دوڑ صبح سے شام تک جاری رہتی ہے کہ کیا کہئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ان کو مستقل رگید رہا ہو۔ یہاں کے علمی اداروں میں بھی علمی فضا کم ہی ملے گی۔ لاہور نسبتاً جمی ہوئی بستی ہے وہاں کے لوگ علمی و ادبی بنیاد پر بھی ایک دوسرے کے برابر ملتے جلتے رہتے ہیں ان کی نشستیں ہوتی ہیں علمی ماحول اور علمی روایات بڑی حد تک قائم ہیں بہر حال مہ جبیں ناز اور ان کے جیسے دوسرے طلبگاران علم و ادب کے لئے کراچی میوزیم میں مخطوطات ہزارہا کی تعداد میں ایک سے ایک موجود ہیں، لیاقت نیشنل لائبریری بھی ہے جامعہ کراچی کا کتب خانہ بھی ہے۔ کراچی سے باہر لاہور ہے، پشاور ہے، اسلام آباد ہے، جن کے علمی مراکز، علمی شخصیات اور کتب خانے قیمتی ہیں اسی طرح سندھ بلوچستان اور بہاولپور و ملتان میں علم و دانش کے ذخیرے بکھرے ہوئے ہیں۔ مہ جبیں ناز اپنی تحقیق و جستجو کی پیاس بجھانا چاہیں تو ضرور بجھا سکتی ہیں انہیں علم و ادب کی خدمت ضرور کرنی چاہئے۔

اُم حبیبہ

سید جعفر امام پٹنہ کا نام ہماری تحریک آزادی میں بہت نمایاں رہا ہے ۔ اُم حبیبہ انہیں کی صاحبزادی ہیں ۔ اس دور میں جب برطانیہ و کانگریس کے ساز باز نے اور سیاسی الٹ پھیر نے مسلمانان برعظیم کی کشتیٔ حیات کو منجدھار میں پہنچا دیا تھا ۔ سید جعفر امام گنتی کے ان چند رہنماؤں میں ہیں جن کی ہمت و حوصلہ اور قوت ارادی نے مسلم لیگ کی تنظیم جدید کا بیڑا اٹھایا تھا ۔ مسلمانان برعظیم کو از سر نو منظم کرنے کے لیے تمام صوبوں کے زعماء مسلم کنونشن لکھنؤ کے نام سے یکجا ہوئے تو پٹنہ سے جانے والوں میں پیش پیش سید جعفر امام ، سید بدر الدین ، سید مظہر امام ، نواب اسمٰعیل خان اور سردار لطیف الرحمٰن تھے ۔ پھر یہی لوگ تھے جنھوں نے بہار میں دیوانہ وار جدوجہد کی ۔ یاس و قنوط کی کیفیت عام لوگوں کے دلوں سے دور کی ، اور مسلم لیگ کو منظم کر کے اتنا طاقتور کر دیا کہ ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں اس صوبے کے مسلمانوں نے حکومت کو کانگریس کو اور ان تمام حریفوں کو جو مسلمانوں میں انتشار پھیلانا چاہتے تھے ، عبرت ناک شکست دی ۔ مسلم لیگ کے نمائندے ہزارہا رکاوٹوں کے باوجود ستانوے فی صد نشستوں پر کامیاب ہوئے ۔ ۱۹۴۶ء میں ایک ہی سال بعد یہاں جو قتل عام ہوا اور تیس ہزار مسلمانوں کو شہید کیا گیا وہ اسی غیر معمولی اسلامی جذبے ، سیاسی شعور ، صلاحیت تنظیم اور سرجوشیٔ وحدت کے خلاف انتقامی کارروائی تھی اور ایک اسکیم کے ماتحت روبہ عمل لائی گئی تھی ۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے لیڈروں نے جو یورپ کی طرز سیاست یہاں رائج کرنے پر مصر تھے ، یورپ کا یہ اصول لوگوں کے ذہن میں بٹھایا تھا کہ " اکثریت ہمیشہ اقلیت کو ڈرا دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے " ۔ مگر مسلمان کہتے تھے کہ تلوار ہماری گردنیں تو اڑا سکتی ہے ہمیں اپنے اصول سے نہیں ہٹا سکتی ۔ انگریزوں نے اپنے ڈیڑھ سو سال کے دور تسلط میں سب کچھ کر کے دیکھ لیا اب وہی کچھ وہ آپ کے ہاتھوں سے کروانا چاہتے ہیں ۔ مسلم قوم نے زور زبردستی اور قتل و غارت کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا ۔ ۱۹۴۷ء میں قتل و غارت کو چھوٹ دی گئی اور خطے کے خطے غرق خون ہو گئے ۔ تقسیم کی لکیریں چونے کی سفیدی سے نہیں ، انہیں شہیدانِ وفا کے خون کی سرخی سے نمایاں ہوئیں ۔

سید جعفر امام نہایت سرجوش ، کم گو ، خاموش اور دبنگ رہنما اپنی ساری زندگی رہے ۔ بلند و بالا قد ، گورا چٹا رنگ ، بڑی بڑی دوراندیش آنکھیں اور بڑی بڑی مونچھیں بھی ، جو سید حسین امام صاحب کی مونچھوں سے کم ، مگر ان سے زیادہ تاؤ میں رہنے والی ۔ بڑے محنتی جفاکش ، سادہ مزاج ، بے باک اور اپنی دھن کے پکے ۔ " چوہٹہ " بانکی پور میں ان کی قیام گاہ پہ یارانِ تازہ دم کا ایک گلدستہ سجا رہتا تھا ۔ علم و ادب سیاست و صحافت اور عدالت و وکالت کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتی تھیں ۔ اب بھی یہی حال ہوگا ۔ ہمیں مدت سے خبر نہیں ہے ۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ بڑھاپے کو انہوں نے اپنے قریب آنے کی اجازت دی کہ نہیں دی ، ان کی قوت ارادی مشکل ہی سے کسی کا دباؤ قبول کرنے پر آمادہ ہوتی تھی ، محبت اور خلوص کی اور بات ہے ۔ آزادی کے بعد ان کو وزارت قانون پیش کی گئی ، وہ قانون داں تھے انہوں نے وزارت قبول کی اور اپنے صوبے کی خدمت جاری رکھی ۔ وہ ان لوگوں میں ہیں جن کو کوئی حکومت آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتی ۔

بات لمبی ہو گئی ، لیکن ان کا نام آ گیا تھا ۔ اور چوہٹہ تک ہم پہنچ چکے تھے ۔ تو ان کی بزم میں داخل ہوئے بغیر پلٹنا بہت مشکل تھا ۔ چوہٹہ سے کبھی کوئی شخص ان سے ملے بغیر کہاں گزر سکتا تھا ۔

ام حبیبہ انہیں سید جعفر امام کی صاحبزادی ہیں اور اسی ماحول میں جس کی طرف ایک سرسری اشارہ ہوا ، ان کی آنکھیں کھلیں ، یہیں انھوں نے تعلیم پائی اور تربیت سے آراستہ ہوئیں ۔ رسمی تعلیم تو کتابوں سے ملتی ہے لیکن اصلی تعلیم وہ ہے جو فکر و نظر کا ماحول اور

مہر نیمروز کراچی۔

اس کے نقش جہات "فراہم کرتے ہیں۔ ام حبیبہ کو دونوں طرح کی تعلیم ملی ہے۔ اور علم و دانش کے ساتھ قوت ارادی اور حوصلہ مندی بھی انہوں نے ورثے میں پائی ہے۔ ان کے والد ماجد نے تحریک آزادی کے دور میں اور اس کے بعد بھی بڑی مشقتیں جھیلی ہیں۔ بڑے مصائب سہے، مگر ہمیشہ مسکراتے نظر آئے کہ زندگی سرد و گرم ہی کا نام ہے۔ ان کی صاحبزادی ام حبیبہ نے بھی اپنے دور میں بڑے بڑے مصائب و آلام کا سامنا کیا۔ شادی کے بعد وہ مشرقی پاکستان چلی گئیں تھیں۔ آگ اور خون کے دریا سے وہ بھی اپنے شوہر سید مظفر جبین کے ساتھ تیر کے نکلیں۔ اور کسی نہ کسی طرح کاٹھمنڈو پہونچیں اور وہاں کے دور ابتلا سے بھی گزریں۔ دونوں میاں بیوی اپنے لئے اور دوسرے ہم نصیبوں کے لئے راستہ بناتے رہے۔ اس کے بعد نہ جانے کہاں کہاں ہوتے ہوئے دونوں مظفر و منصور کراچی پہنچے۔

ام حبیبہ کی نظر برعظیم کی تاریخ پر ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کے نشیب و فراز پر ہے۔ علمائے صادق پور پٹنہ کی تحریک اسلامی پر اور پھر تحریک پاکستان اور قیام پاکستان پر ہے اور پھر ان تجربات پر جن سے ان کا گھرانا اپنی علمی و عملی زندگی میں گزرا، اور وہ خود گزریں۔ اللہ نے ان کو علم دیا ہے۔ نظر دی ہے، جذبہ دیا ہے اور صلاحیتیں بخشی ہیں، وہ بہت کام کر سکتی ہیں۔

مشتاق احمد شبنم

زندگی کشاکش کا نام ہے، آدمی ہزار پریشانیوں اور اذیتوں سے گزرے، اس کی زندگی کی لو بھی مدھم پڑ جائے، لیکن علم و ادب کی لو مدھم نہیں ہوتی۔ عہد حاضر کے مفکر کہتے ہیں کہ زندگی کیا ہے یہ ہم نہیں جانتے لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ایک دانہ اپنی قوت نمو کے زور سے اینٹ پتھر کو بھی پھاڑ کے رکھ دیتا ہے۔ آدمی کے اندر جو قوت نمو اور روح حیات ہے وہ تو سب سے زیادہ ہے۔ خبر نہیں مشتاق صاحب نے اپنا تخلص شبنم کس رعایت سے رکھا تھا۔ شبنم کی تسکین بخش لطیف خنکی مسلّم، مگر غالب کا یہ مصرعہ ان کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا۔ "پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم" اس میں لفظ "فنا" کسی اور ہی "بقا" کی طرف اشارہ ہے۔ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں قیامت کا سورج ان کے سر پر آ گیا تو انہوں نے یہ کیوں سمجھا تھا کہ یہ وہ خورشید ہے جس کی کرنیں شبنم کو لے اڑتی ہیں۔ شبنم صاحب کو "باقی" رہنا ہے۔ انہوں نے ساری اذیت ناکیاں سہیں۔ مصائب جھیلے، زبردست مالی تباہی میں پڑے، ادبی سرمائے اور نادر کتابوں کی بربادی بھی دیکھی جوان کے دل و جگر کے ٹکڑے تھے اور یہ سب کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا۔ ان کی قوت نمو اور جوشِ حیات کا ثبوت ہے کہ سلامت ہیں۔ خدا سلامت رکھے، اور سلامت تو بس وہی رکھتا ہے باقی رہیے۔

پٹنہ سٹی (عظیم آباد) میں پیدا ہوئے۔ محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ میں تعلیم پائی پھر اورنٹیل کالج بمبئی چلے گئے جہاں سے عالم فاضل کی سند حاصل کی۔ مختلف زبانیں جانتے ہیں۔ شعر کہنے کا شوق اسکول ہی سے تھا۔ بمبئی کا ماحول اور زیادہ مددگار ثابت ہوا ہوگا۔ مشاعروں میں شرکت کا چسکا بھی بہت کام کرتا ہے۔ نظمیں اور غزلیں لکھتے رہے۔ نثر میں افسانہ نگاری اور طنز و مزاح کی طرف میلان زیادہ ہے۔ ان کی نظم و نثر ملک کے مختلف اچھے جرائد و رسائل میں شائع ہوتی رہی ہے۔ سنگم، صدائے عام، ساتھی، صبح نو، صنم اور اشارہ جیسے روزناموں اور ماہناموں کے علاوہ عصر جدید کلکتہ اور ہفت روزہ پیام مشرق دہلی نے ان کی کاوشوں کو جگہ دی۔ ۱۹۶۷ء میں ڈھاکے چلے آئے تو وہاں سے فنون لاہور اور راوی کراچی میں بھی ان کا نام اور کلام شائع ہوتا رہا۔ عنفوان شباب ہی سے مصائب و آلام کا سامنا ان کو ہوا جو اور زیادہ حوصلہ مند بنائے گا۔ اب بھی جوان ہیں اور امید ہے کہ ان کے دل و دماغ کی جوانی دنیائے علم و ادب میں اپنی جگہ بنائے بغیر نہیں رہے گی۔

ان کا قلم پہلے بھی چلتا رہتا تھا، اب بھی چل رہا ہے۔

محمد انیس اجمی (ایڈوکیٹ)

شرف الدین احمد شرف (عظیم آبادی)

شرف منانی

مشتاق شبنم

ادارہ

ارول — "کنارِ سوہن"

برعظیم میں بے شمار بستیاں ہیں جو تاریخی حیثیت سے بڑا مقام رکھتی ہیں۔ یہ تاریخی حیثیت بھی ایک طرح کی نہیں بلکہ رنگا رنگ ہے۔ زمانے کے الٹ پھیر نے ان بستیوں میں سے بہتوں کے نام و نشان تک مٹا دیئے۔ یا بستیاں تو باقی ہیں مگر ان کی وہ حیثیت باقی نہ رہی جو پہلے تھی۔ ایسی بستیاں بہار میں بھی بہت تھیں بہار کے ضلع مونگیر میں بھی تھیں، ضلع پٹنہ میں بھی، ضلع شاہ آباد میں بھی اور ضلع گیا میں بھی۔ ایسی ہی بستیوں میں سے ایک ارول ہے، یہ ضلع گیا کی تاریخی بستیوں میں سے ایک ہے۔ کبھی اس کا بڑا نام تھا، یہاں کی اور بہت سی باتوں میں سے ایک بات کاغذ سازی کی صنعت بھی تھی جس کا مدتوں شہرہ رہا۔ ارول کا غذ کا تذکرہ زبانوں پر اب بھی ہے اس لئے کہ بہت سے نادر مخطوطات ہمیں اسی کاغذ پر ملتے ہیں۔ وہ مخطوطات جب بھی سامنے آتے ہیں اور ان پر بحث جب بھی ہوتی ہے ارول اور وہاں کا بنا ہوا کاغذ بھی زیر بحث آتا ہے۔ ارول کا نام تاریخ کے صفحات میں مرتسم ہو چکا ہے۔ ویسے ایک ارول تقریباً بے نوبیل کے فاصلے پر ضلع کانپور میں بھی ہے او مکن پور جانے والی راہ پر ہے جہاں حضرت سید بدیع الدین مدار کا مزار مشہور ہے"۔ ضلع گیا کی یہ بستی ارول "دریائے سون" کے کنارے آباد تھی۔ اب بھی آباد ہے، چاہے وہ رونق اور وہ اہمیت باقی نہ رہی ہو جو کبھی پہلے تھی۔ انگریزوں کے تسلط سے پہلے اس دریا کا نام "سوہن" تھا۔ انگریزوں کے تلفظ نے اس کو سون بنا دیا۔ اب سب کی زبان پر سون ہے۔ ہمارے شعراء کے کلام میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ دریا ضلع شاہ آباد اور ضلع گیا کے مختلف علاقوں میں اپنی راہ بناتا ہوا گزرتا ہے اور اپنی ادا سے ہرا بھرا رہا ہے۔ اس کے کنارے بہت بستیاں آباد رہی ہیں، ان میں سے کچھ کو تو اس کی طغیانی بہا کر لے گئی۔ اور کچھ کو انقلابات دہر نے اجاڑ دیا۔ لیکن اب بھی بہت بستیاں اس کے کنارے آباد ہیں، اس کے آس پاس کی زمینیں بہت سرسبز و شاداب ہیں، اس کا پانی بہت میٹھا اور مفرح ہے۔

ارول اور اس کے گرد و نواح کی بستیاں اس لحاظ سے بھی تاریخی ہیں کہ یہاں بڑے بڑے علماء، صوفیہ، مجاہدین اور قومی و ملی مقتداؤں نے یا تو عارضی بسیرا لیا یا یہیں رہ پڑے اور یہیں پیوند زمین ہوئے۔ بستیاں بستی رہتی ہیں اجڑتی رہتی ہیں۔ ان کی تاریخ ابھرتی رہتی ہے دبتی رہتی ہے بعض بستیاں ایسی ویران ہو جاتی ہیں کہ ڈھونڈیئے تو ان کا نشان نہیں ملتا۔ مگر تاریخ کے صفحات میں ان کے نام محفوظ ہو جاتے ہیں۔ وہ تاریخ میں باقی رہتی ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان "ویرانوں" کی طرف پھر کوئی "آبلہ پا" نکل آتا ہے۔ تو کبھی دشت پھر گلزار بن جاتے ہیں یہ سلسلہ جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔

اسی ارول کے قریب ایک بستی پلاک ہے، جس کے قریب میں حضرت نور الدین شہید کا مزار ہے۔ یہ پلاسی بھی دریائے سوہن کے کنارے واقع ہے اور یہیں سے کچھ دور پر ایک بستی "سنیرا" ہے جہاں مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ کی پوتی بی بی بارکہ کا مزار ہے، اور ان کا بھی بڑا مرتبہ ہے، اسی ارول کے قریب بلکہ قریب تر ایک بستی بھداسی ہے اور یہ دونوں بستیاں ایک دوسرے سے کچھ ایسی وابستہ ہیں کہ اکثر ان کے نام ایک ساتھ ہی لئے جاتے ہیں اور واوِ عطف تک بیچ میں نہیں آتا۔ "مولانا محمد علی شوکت علی" کی طرح یا "علی امام حسن امام" کی طرح "ارول بھداسی" ایک نام

بن کر زبانوں پر آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں بستیاں کبھی ایک ہی رہی ہوں پھر یہاں کی آبادی کا کچھ حصہ اُٹھ کے کسی اور بستی میں چلا گیا ہو اور یوں ایک بستی دو نے جداگانہ حصوں یا بستیوں کی صورت اختیار کر لی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بستی کے قریب ہی ایک اور بستی بس گئی ہو اور اس نے اپنے تعارف کے لئے قریب والی متعارف بستی کا سہارا لیا ہو، اگرچہ واقعہ یہی ہے کہ گاؤں ہمیشہ چھوٹے چھوٹے بسائے جاتے تھے اور ان کی آبادی کو بہت زیادہ بڑھنے سے روکا جاتا تھا، یعنی بڑھتی ہوئی آبادی کو پھیلایا جاتا تھا، اور بستیوں کے درمیان کچھ فاصلے رکھے جاتے تھے۔ ایسی بستیوں کا کبھی ایک ہی نام "خورد و کلاں" کے لاحقے کے ساتھ رکھا جاتا تھا جیسے کیسر خورد اور کیسر کلاں"، "ریناله خورد" اور ریناله کلاں"۔ اور "چھوٹی بلیا، بڑی بلیا" وغیرہ۔ اس کے علاوہ بستیاں بسانے والے پرانے زمانے میں اس کا خاص خیال رکھتے تھے کہ قابل کاشت زمینیں تعمیرات کی نذر نہ ہو جائیں، بستیاں عموماً ایسی زمینوں پر بسائی جاتی تھیں جہاں کاشت نہ ہو سکتی ہو، زمینیں بنجر ہوں، رتیلی ہوں یا پتھریلی ہوں، دیہاتی علاقوں میں کہیں بھی چلے جائیے، بستیاں اکثر چھوٹی چھوٹی اور فاصلے سے پھیلی ہوئی دکھائی دیں گی۔ دوہرے نام سے یاد کی جانے والی بستیاں "ارول بھداسی" کی طرح اور بھی ہیں جیسے "کٹرہ مانکپور"، "فتح پور مسوہ"، "کٹرہ بٹوا"، "حسن پورہ امجھر"، "ارکی جہان آباد"، "مخدوم پور بیلا"، "یا ساییں ہرلا"، "حسین گنج کجوا"، اور "جیلا حسین آباد" وغیرہ۔

ذرا ٹھہرئیے! "سائیں ہرلا" کے نام نے ہمیں سندھ کا رائج لفظ "سائیں" یاد دلایا جو بڑے اعزاز و احترام کا خطاب ہے جیسے آپ کہتے ہیں، "سیّد صاحب"، "جناب والا"، "قبلۂ محترم" یا "عالی جاہ" وغیرہ ــ یہ لفظ "سائیں"، اِدھر سے اُدھر گیا کہ اُدھر سے اِدھر آیا؟ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ سادات قادری سندھ سے پنجاب گئے، یو۔پی گئے، بہار گئے، جہاں پہلے سے اس سلسلے اور خاندان کے لوگ موجود تھے اور ادھر کے لوگ بھی ماضی میں ادھر آئے، صدیوں کی تاریخ کی تفصیلی ورق گردانی کی جائے تو اس کا پتہ مل سکتا ہے۔ کراچی کے قریب ایک مقام ہے جس کا نام ہے "منوڑا"۔ ہم ضلع گیا میں بھی ایک بستی کا نام "منورا" پاتے ہیں، یہ سید حسین امام صاحب کے بزرگوں کی قدیم بستی ہے۔ اب اجڑی ہوئی سی ہے، مگر نام باقی ہے۔ سید حسین امام صاحب "قادری" ہیں۔ ان دونوں ناموں میں کیا رشتہ ہے؟ ایک "منوڑا" ہے ایک "منورا" معنی ہمیں دونوں میں سے کسی کے نہیں معلوم۔ اسی طرح اور بھی کئی چیزیں قابل غور ہیں۔ مثلاً "محمد پور بارد"، "شاہو بیگہ"، "بیتھو شریف" اور "کاکو" جن میں "واو" کا استعمال "گھارو"، "ٹوڈیرو" وغیرہ کی طرح ہے اور ہاں "جالو" کی طرح بھی، جس کا ایک تصور وہاں بھی ملتا ہے۔

یہ باتیں جملہ معترضہ کے طور پر آگئیں مگر اتنی اجازت ملنی چاہئے۔ ہم ڈاکٹر اختر اورینوی کی یاد میں گفتگو کر رہے ہیں جن کو اس قسم کی تلاش و تجسس سے خاص شغف تھا وہ تو رخصت ہو گئے لیکن ان کا انداز تجسس باقی ہے اور ان سے فیض پانے والے باقی ہیں جن میں کچھ ادھر ہیں کچھ اُدھر ہیں، کیا خبر ان میں سے کوئی اپنے استاد کی یاد میں یوں بھی قلم اٹھالے۔

ارول بھداسی، پلاسی، سہار، دیورہ وغیرہ نام کی بستیاں قدیم ہیں اور ان کی قدامت ہمیں ان کے مفہوم و معنی تک پہنچنے نہیں دیتی، نہ یہی جاننا آسان ہے کہ یہ نام اصل میں کیا تھے اور امتداد زمانہ نے ان میں کیا تصرف کیا ہے۔ یہ ساری بستیاں شرفائے قدیم کی ہیں۔

ارول کے شرفاء "کاغذ" بھی بناتے تھے، کارخانہ دار تھے۔ "کاغذی" لیموں بھی پیدا کرتے تھے، باغبان تھے، مگر خود "کاغذی" نہیں تھے، بلکہ آہنی و فولادی تھے، یہ لوگ علوم و فنون کے ماہر تھے، صنعت و حرفت کا کمال بھی دکھاتے تھے، کاشتکاری بھی کرتے تھے اور باغبانی بھی۔ طرح طرح کے پھل پھلیریاں بھی پیدا کرتے تھے، ان کے یہاں تاڑ بھی بکثرت تھے، کھجور بھی اور آم بھی۔ یہ لوگ بے حد جفاکش تھے، کم از کم ماضی میں، صناع بھی تھے اور سپاہی بھی، مسلمان تو پیدائشی سپاہی ہے، ہمارے عہد کے "شرفاء" "کاغذی" ہو کر رہ گئے ہوں تو یہ دوسری بات ہے، غالب نے کاغذ

اور "کاغذی پیرہن" کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اردلی کا غذ کا نہیں۔ ویسے یہ بات کہ "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا"۔ غالب نے دریائے سوہن کا پانی پینے سے پہلے کہی تھی۔ اور اس کا پہلا مصرعہ "نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا"۔ بلکہ پورا شعر اختر اورینوی کی موت کے بعد کہنے کا تھا یا پڑھنے کا ہے۔

دریائے سوہن کی موج کی طرف سے اور اس کے کنارے آباد "پام ولا" کی اجڑی ہوئی فضا کی طرف سے کہ "اختر جو مر گیا ہے تو سوہن اداس ہے"۔

اختر خوش نصیب تھے کہ مدتوں کی اس فراموش شدہ بستی میں پہنچ کر انہوں نے اس کی تاریخی ہما ہمی کو یاد کیا، اس کے نام کو تازہ کیا، اردلی کاغذ کی شہرت، اردلی کاغذ پر مرتسم ہونے والے نقوش، اور اردلی کاغذ پر ابھرنے والی رنگا رنگ تصویریں، جیتی جاگتی چلتی پھرتی، ہنستی بولتی مورتیں بن کر ان کی نظروں کے سامنے سبزہ شاداب پر درختوں کی جھومتی ڈالیوں کے سائے میں متحرک ہوگئیں اور ان کے توسط سے ادبی دنیا نے بھی ان کو دیکھا جنہیں صرف دریائے سوہن کی روانی ہی دیکھتی تھی۔

غالب کو دریائے سوہن کے کنارے اترنے اور قیام کرنے کا موقع تو بہت کم نصیب ہوا۔ مگر اس مختصر قیام نے بھی ان کے دل پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ بہت گہرا اور پائیدار۔ غالب نے بھی سوہن کا پانی پیا ہے اور پی کر یہ عالم ان کا ہوا کہ ایک ایک سے کہہ رہے ہیں۔ ارے بھی کیا تم بھی سکندر کی طرح نادانی کا شکار ہو گئے کہ "آب حیوان" پر جان دے رہے ہو، خدا جانے کہاں ہے اور ہے بھی کہ نہیں مگر سوہن تمہارے سامنے موجود ہے تم زندگی اس سے کیوں طلب نہیں کرتے۔ کچھ پتہ بھی ہے، یہ سوہن وہ ہے کہ اگر ایک غوطہ بھی اس میں کسی نے لگا لیا تو وہ "سراپا جان" ہو کر ابھرا ہے

چوں اسکندر زنادانی ہلاک آب حیوانی ! خوشا سوہن کہ ہر کس غوطہ زد در وے تنش جاں شد

سوہن کا پانی "آب حیات" ہے اور یہ آب حیات وہ ہے جو مرجھائے ہوئے جسم میں بھی زندگی بھر دیتا ہے اور وہ روح کی طرح غیر فانی ہو جاتا ہے۔ "جان" بن جاتا ہے۔ سچ کہا غالب نے اور اختر اورینوی کی زندگی اس پر شاہد ہے۔ وہ مرجھا چکے تھے مگر سوہن نے ایک زندگی ان کے اندر بھر دی اور "سراپا جان" ان کو بنا دیا۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ غالب کو ۱۸۲۹ء میں کلکتے جاتے ہوئے دریائے سوہن کی کسی موج نے اپنی بیقراری کا یہ سبب بتایا تھا کہ "ایک دن یہی کوئی سو سال بعد ایک خوبصورت نوجوان میرے ساحل پر آنے والا ہے۔ کس ساحل پر آئے گا ابھی نہیں معلوم۔ بس اتنی خبر ہے کہ حوادث زمانہ کے ہاتھوں اس کا سینہ چھلنی ہو چکا ہوگا اور خون تھوک رہا ہوگا۔ آخر وہ زندہ کیسے رہے گا۔ مجھے یہی فکر ستا رہی ہے کہ آ جائے تو میں اس کے اندر زندگی بھر دوں۔ اسے جان، بلکہ جانِ جاں بنا دوں۔ بیقرار اس لئے ہوں کہ پتہ نہیں اسی ساحل پر آئے گا جہاں آپ بیٹھے ہیں یا کسی اور ساحل پر؟ بس میں چلی، مجھے اس کی سن گن لینی ہے"۔ کیا واقعی دریائے سوہن کی کسی موج نے غالب سے یہ کہا ہوگا؟ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ غالب کا "یہ نسخہ" اختر کے بزرگوں میں سے کسی نے ضرور دیکھا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ ان کو اردل بھیج دیا جائے۔ جہاں وہ سوہن سے آب حیات لیں اور صرف پئیں ہی نہیں، اس میں خوب غوطے بھی لگائیں۔ غالب نے اس "نسخۂ خاص" کا تذکرہ بار بار و بہ اصرار کیا ہے مثلاً ایک جگہ بصورت رباعی یوں کہا ہے

خوشتر بود آب سوہن از قند و نبات — بادے چہ سخن ز نیل و جیحون و فرات
ایں پارۂ عالمے کہ ہندش نامند — گوئی "ظلمات" و سوہن است "آب حیات"

دریائے سوہن کا پانی؟ قند و نبات سے بھی زیادہ میٹھا اور لذیذ ہے۔ کیا کہا؟ دریائے نیل اور دریائے جیحون اور دریائے فرات؟ کیسی باتیں کرتے ہو بھلا۔ دریائے سوہن کا نام لینے کے بعد پھر کسی اور دریا کا نام لینے کی کوئی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے۔ تمہیں کچھ خبر بھی ہے، دنیا کا

یہ ایک ٹکڑا جس کو لوگ "ہند" کے نام سے یاد کرتے ہیں (اور تم جانتے ہو کہ میں دلّی کا رہنے والا ہوں۔ دلّی پنجاب کا حصہ ہے۔ ہم لوگ دامن دہلی کے حاشئے کے بعد سے شروع ہونے والی سرزمین کو ہند یا ہندوستان کہتے رہے ہیں۔ اسے اچھی طرح یاد رکھنا، ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا کا ایک ٹکڑا جس کو لوگ ہند کے نام سے یاد کرتے ہیں) گویا "ظلمات" ہے (تاریکی میں ڈوبا ہوا ڈھکا ہوا، چھپا ہوا) اور اس میں دریائے سوہن "چشمۂ آب حیات" ہے۔

سکندر نے تو آب حیات کا پتہ کسی کو نہیں دیا کہ "خضر از آب حیوان تشنہ می آرد سکندر را" وہ بیچارہ پیاسا ہی وہاں سے لوٹا تھا، ایک چلو بھی اسے نصیب نہ ہو سکا۔ لیکن غالبؔ پیاسے لوٹنے والوں میں نہیں تھے۔ انہوں نے سیراب ہو کر آب حیات پیا تھا۔ دریائے سوہن کا پانی۔ اور دوسروں کو بھی اس کا پتہ بتایا کہ جاؤ پیو اور خوب پیو۔ خبر نہیں اور کوئی گیا یا نہیں گیا مگر اخترؔ اورینوی ضرور گئے اور واقعی سیراب ہو کے جان بن گئے۔ غالبؔ کے بعد دریائے سوہن سے اخترؔ ہی کا نام وابستہ نظر آتا ہے ؎

وہ سون کے ساحل کے دل افروز نظارے	دامن میں لئے جلوۂ رنگیں کے شرارے
وہ ریت کے ذرّے تھے کہ فردوس کے تارے	کیا حسن تھا جاگا ہوا ندّی کے کنارے
اک بار مجھے اپنے پرستاں میں بلا لے	اس سون کے ساحل کے نظارے
وہ رنگ کا نکھرا ہوا نظارۂ عریاں	ہر سمت تھی مہکی ہوئی خوشبوئے پریشاں
وہ رات کی پریوں کی محبت کے تقاضے	وہ نغمہ سرا پھول، وہ افسانہ خواں تارے
وہ سون کے ساحل کے دل افروز نظارے	اس اخترؔ بیتاب کو سو جان سے پیارے
اے سون بلا لے مجھے پھر اپنے کنارے	اے سون بلا لے۔

ایک بار جاؤ تو بار بار جانے کی آرزو دل میں کروٹیں لینے لگتی ہے۔ غالبؔ کا بھی کچھ یہی حال ہو گیا تھا مگر ان کے پاؤں میں بھاری بیڑیاں تھیں تاہم دیکھئے تڑپ،

گفتمش چوں بود عظیم آباد	گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوشش باشد	گفت خوشتر نہ باشد از سوہن

میں نے ساقی سے دریافت کیا کہ کبھی یہ تو بتا عظیم آباد کیسا ہے تو اس نے کہا عظیم آباد؟ کیا پوچھنا اس کا، وہ تو فضائے چمن سے بھی رنگین تر ہے، اس کی بہار کا کیا کہنا۔ پھر میں نے پوچھا، کچھ سلسبیل کے بارے میں بھی تو کہو، سنا ہے خوب ہی چیز ہے اس سے بڑھ کر لذیذ دنیا میں اور کوئی چیز نہیں۔ اس نے کہا کہ ہاں بہت ہی عمدہ اور بہت ہی لذیذ، جیسے آب سوہن، لذت بخش، فرحت بخش اور زندگی بخش۔

دریائے سوہن کی موج بیقرار نے ساحل ارول پر پہنچ کر اخترؔ کی بلائیں لیں۔ غالبؔ نے شاید ۱۸۲۶ء میں کلکتے کا سفر کیا تھا اور دریائے سوہن کے کنارے، کہیں آرے کے قریب اک ذرا دم لینے کو ٹھہرے تھے، وہ تو خیریت ہوئی کہ "آب حیات سوہن" پی چکنے کے بعد کلکتے پہونچے تھے۔ ورنہ پالیسیت کی جو بھی (ادبی) لڑائی جو وہاں برپا ہوئی تھی، اس سے جانبر ہونا ان کے لئے بہت مشکل تھا، مگر ہوئے اور خوب ہوئے، کلکتے سے واپسی کے بعد دلّی میں ان کو آب سوہن برابر یاد آتا رہا۔ اور کلکتہ بھی۔ کوئی تذکرہ کرتا تو بیقرار ہو جاتے۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں	اک تیر میرے دل پہ مارا کہ ہائے ہائے

اختر نے ۱۹۲۹ء میں ٹھیک ایک صدی بعد، خون تھوکا اور بسیدم ہوگئے۔ آخر سوہن کے کنارے ارول کے "پام ولا" میں جا کے دم لیا اور بہت دم لیا۔ تا آنکہ موج سوہن گنگنا اٹھی ؎

اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی — شاید کہ بہار آئی "زنجیر" نظر آئی

۱۹۲۳ء میں اسی ارول میں اور اسی پام ولا میں اختر کی شادی ہوگئی۔ شکیلہ اسی ارول کے مشہور رئیس جناب سید شاہ محمد توحید صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ اور "پام ولا" انہیں کی کوٹھی۔ شکیلہ خود بھی اہل قلم ہیں۔ ادیب بھی ہیں ادیب گر بھی، شاعر بھی ہیں شاعر گر بھی، افسانہ نگار بھی ہیں اور افسانۂ حیات کا اہم کردار بھی۔ افسانہ نگاری بہت مشکل فن نہیں ہے، ان کے افسانے بہتوں نے پڑھے ہیں۔ ان میں نزاکت احساس اور لطافت جمال بھی پائی ہوگی۔ لیکن افسانہ نگار کی تشکیل و تعمیر اور تزئین کس طرح کی جاتی ہے، اس سے کم ہی لوگ آگاہ ہیں۔ یہ شکیلہ اختر کا خصوصی فن تھا۔ اختر کے اٹھ جانے کے بعد، ان سے اس خصوصی فن کا حاصل کھو گیا۔ ان کے دل پر کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ دریائے سوہن کی موج، پام ولا کے سامنے، اپنے مانوس ساحل پر، بیقرارانہ سر پٹک رہی ہے اور یہ آواز گونج رہی ہے کہ

اے ماتم فراق، اجل سے بچا بچا — رکھا تھا میں نے جان کو کیا تیرے واسطے

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال — ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا — عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تار برشکال — ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

سید اختر اورینوی

ڈاکٹر سید محمد حسنین

فخرالدین محمد شمسی

اختر اورینوی کے ماموں جان

غالباً ۱۹۴۹ء کا ذکر ہے۔ پروفیسر سید شاہ عطاالرحمٰن عطاؔ کاکوی ان دنوں مظفر پور کے جی۔ بی۔ بی کالج (جو اب لنگٹ سنگھ کالج سے نامزد ہے) میں ملازم تھے اور کالج کے احاطہ میں بحیثیت وارڈن مقیم تھے۔

ایک صبح پروفیسر عطاؔ کاکوی کے کوارٹر میں ایک نووارد پہنچا۔ برآمدے سے اس نے پروفیسر عطاؔ کو آواز دی۔ یہ زنان خانہ میں تھے۔ اندر سے پانچ چھ برس کا بچہ دوڑا آیا۔ اس نے نووارد سے پوچھا "آپ کون ہیں ؟"

نووارد نے جواباً خود سوال کیا۔ "بتاؤں میں کون ہوں ؟" بچہ سرتاپا نووارد کے غیر معمولی قد و قامت اور نامانوس ہیئت کو تکتا رہا۔ اس کی معصوم نظریں سامنے کھڑے دراز قد انسان کے گورے چٹے اور رسیدہ مسکراتے چہرے کے ابھرے ابھرے خد و خال، اس کی خوبصورت بھرپور سپید داڑھی، اجلی سے بے داغ سپید ملبوس، اس کے دراز بازوؤں میں لٹکی ہوئی موٹی جریب اور دونوں ہاتھ کی پیوستہ لانبی انگلیوں کا متواتر جائزہ لیتی رہیں۔

بچہ کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور جاتا۔ "مجھے پہچانو۔ میں کون ہوں ؟" نووارد نے تبسم آمیز لہجے سے پھر یہی سوال کیا۔

چند سکنڈ تک بچہ اس اجنبی پرجمال صورت اور پروقار شخصیت کو دیکھتا رہا۔ پھر یک لخت وہ جواباً مسکرایا۔ جیسے اس کی فراست اور قیاس نے صحیح رہبری کردی۔ بولا "پہچان لیا" اور یہ کہتا ہوا وہ تیز قدموں سے پلٹ گیا۔

اندر پروفیسر عطاؔ بال بچوں کے ساتھ ناشتہ کر رہے تھے۔ بچے نے آتے ہی پروفیسر عطاؔ سے کہا۔

"ابا ! باہر خدا آیا ہے"

"دور ہو" ماں نے بچے کو ڈانٹا۔

"کون ہے" پروفیسر عطاؔ نے بچہ سے سوال کیا۔ "خدا" بچّے نے یہی جواب دیا۔ اور بڑے یقین سے کہا۔

"پاگل ہو گیا ہے" بڑے بھائی نے بھی بچّے کو گھُرکا۔

"کہہ رہے ہیں خدا آیا ہے" بچّے نے پھر اسی اعتماد سے جواب دیا "دیکھئے نا باہر کھڑا ہے"

(شاد عظیم آبادی کے شاگرد سابق ڈائرکٹر عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ محقق نقاد اور شاعر تصنیف و تالیف کی خاصی تعداد ہے)

پروفیسر عطا، بیگم عطا، لڑکے اور لڑکیاں سب متعجب تھیں کہ آخر یہ کون شخص ہے؟ یہ بے ساختہ اٹھ کھڑے ہوئے، پروفیسر عطا باہر آئے دیکھا، فخرالدین محمد شمسی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ بچہ کی اس فہم و فراست پر دونوں بہت دیر تک ہنستے رہے۔

فخرالدین محمد شمسی کے جد امجد، عبدالوہاب حنفی المذہب تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ کا نسبی سلسلہ حضرت محمد بمعروف امام تاج[1] فقیہ قدس سرہٗ سے منسلک ہے۔ عبدالوہاب متوطن قصبہ کاکو[2]، جہان آباد گیا کے دو بیٹے محمد یوسف حسین اور عبدالعزیز تھے۔ بڑے بیٹے کو صرف دو اولاد ہوئی۔ فخرالدین اور عائشہ ان کی گولٹ شادی میر وحیدالدین مختار (ابن سید صمصام وکیل ابن سید سلطان علی صدر وامین ابن سید فضل اللہ رئیس قصبہ منیر و خانوادہ مخدوم یحییٰ منیری) کی دوسری بیٹی صالحہ اور دوسرے بیٹے سید محمد رشید سے انجام پائی۔ عبدالعزیز کے پانچ بیٹے محمود شمسی، احمد شمسی، و دود شمسی، حسن امام اور نعیم شمسی تھے۔ ان پانچ بھائیوں میں ایک بہن شمسہ زوجہ سید وزارت حسین تھیں، جو ڈاکٹر سید اختر احمد اورینوی اور سید فضل احمد کی والدہ تھیں۔

نصف صدی پہلے جب مکتبی تعلیم کا رواج عام تھا، بہار کے شرفا کے گھرانے ہیں۔ بچہ کو خوش خطی کی مشق کرائی جاتی تو سرکنڈے سے تختی پر اسے یہ فقرے لکھائے جاتے تھے:۔

"برادرم شمس الدین و زین الدین ظاہراً و باطناً بعد دعائے خیر از جانب شرف الدین یحییٰ منیری۔" یہ مبارک اسماء تاج فقیہ کے گھرانے کے تھے اسی نسبت سے محمد فخرالدین اور ان کے چچازاد بھائیوں نے اپنی کنیت میں شمسی کا اضافہ کیا۔

فخرالدین محمد شمسی کی جائے پیدائش کاکو اور سال پیدائش ۱۸۰۰ تھا۔ ان کا ننہال مہداواں (داناپور) تھا۔ ان کی نانی شیعی مسلک کی پیرو اور ضلع چھپرہ کی متوطن تھیں۔ عہد شاہ عالم بادشاہ میں شمالی بہار کے متمول اور حکام رس اشخاص میں ایک نامور ہستی دیوان ناصر علی خاں کی تھی۔ شمسی صاحب کی والدہ کی نانی دیوان ناصر علی خاں کی نواسی تھیں۔

"مولوی یوسف حسین[3] مرحوم نے اپنے اکلوتے فرزند فخرالدین محمد شمسی کو حافظ بنانے کے بعد تیار تو کیا تھا ڈاکٹری تعلیم کے لئے مگر آنکھوں میں تکلیف عارضی ہونے کے سبب میڈیکل اسکول سے اٹھالیا اور پٹنہ میں شمسی کمپنی کے نام سے ایک پارچہ دوزی کا کارخانہ اس کے سپرد کردیا۔ شمسی صاحب نے کلکتہ اور بمبئی میں فن پارچہ تراشی میں مہارت حاصل کی اور یہ کارخانہ اعلیٰ درجہ کے ملبوسات کے لئے مشہور ہوگیا۔ اسی کے تیار کردہ سوٹ اور شیروانیاں صوبہ بھر میں فیشن بن گئیں۔ مگر مختلف اسباب سے کمپنی چند سال میں فیل ہوگئی۔ شمسی صاحب کاروباری ضرورتوں اور اپنے ادبی سیاسی

---

(۱) تاج فقیہ مدنی الاصل اور ہاشمی النسل تھے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی سے آپ کو بیعت تھی۔ مدینہ منورہ میں ہادیٔ اسلام کی طرف سے بصورت رویا آپ کو سفر ہند اور تسخیر منیر کی ہدایت ملی۔ یہ شہاب الدین محمد غوری کا عہد تھا اور اسلامی عملداری ان دنوں علاقہ اودھ تک محدود تھی۔ امام موصوف نے اپنے دو بیٹے مخدوم اسرائیل اور مخدوم اسمٰعیل نیز چند رفقاء و جاں نثاران کی جمعیت کے ساتھ رخت سفر باندھا ۵۷۶ھ میں راجہ منیر سے جنگ ہوئی اور آپ کو فتح یابی نصیب ہوئی۔ علاقہ مفتوحہ کو زیر انتظام بادشاہ کر کے دونوں صاحبزادوں کو منیر چھوڑ کر آپ نے وطن کو مراجعت فرمائی۔

(۲) پٹنہ اور گیا کے درمیان شرفا بہار کی ایک نہایت قدیم بستی جو مسلم حکمرانوں سے قبل پال خاندان کے کسی راجہ کا گڑھ تھی۔ مخدوم یحییٰ منیری کے چچازاد بھائی مخدوم سلیمان لنگر زمیں اپنی زوجہ بی بی ہدیہ عرف بی بی کمال (یہ حضرت شہاب الدین پیر جگجوت کی تیسری صاحبزادی تھیں اور مخدوم شرف الدین بہاری کی سگی خالہ تھیں) کے ہمراہ بغرض تبلیغ دین اور خدمت خلق کاکو میں مسکن گزیں ہوئے۔ اسی جگہ ان کی وفات ہوئی بستی سے باہر درگاہ بی بی کمال سے موسوم ہے جہاں

ذوق سے رؤسا، عمائدین و اکابر ملک سے ملتے جلتے رہے۔ وہ ایک خوش رو، خوش لباس، خوش اندام بلند و بالا سرخ و سفید جوان تھے اور بڑی دل فریب سیرت رکھتے تھے اس میل جول اور ہر دلعزیزی سے انہوں نے تجارتی منفعت کم اور ذہنی زیادہ کمائی... بالوں زیبا اور اس کے مضر اثرات کے سبب دانت تڑوالے اور داڑھی رکھ لی۔ اپنی خاص پسند کا کھدّر کا لمبا کوٹ اور خاص ٹوپی پہنتے؎

شمسی صاحب حافظ قرآن تھے اور انیسویں صدی کے حاجی۔ جب حاجیوں کو سفر مسافرت میں آج جیسی آسانیاں نصیب نہ تھیں۔ حفظ و حج کی سعادت کے باوجود انہوں نے اپنے نام کے ساتھ حافظ اور حاجی کا الحاق پسند نہ کیا۔ سیاست، مذہب اور شاعری سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی کتب بینی ان کے روز و شب کا ایک اہم حصہ تھا۔ جو آخری وقت تک قائم رہی۔ قرآن حکیم کے بعد ابو الکلام آزاد، عنایت اللہ مشرقی، غلام جیلانی برق، اور غلام احمد پرویز کی کراچی کی تصنیفات کا انہوں نے مطالعہ کیا تھا۔ مصری قائد سید محمد قطب شہید کے انقلاب انگیز خیالات خصوصاً دعوت احیاء اسلام میں مرحوم کے مخصوص زاویہ فکر کے یہ مداح تھے۔

رموز قرآنی کی تفہیم اور اسرار حقائق کی تعلیم میں یہ اپنے حافظہ و استدلال سے اتنا برجستہ اور برمحل معرف لیتے کہ سائل دم بخود رہ جاتا۔ عمر کے ان دنوں بھی جب وہ چلنے پھرنے سے مجبور ہو گئے تھے، قیام کہیں ہو، پٹنہ یا گیا میں۔ مقررہ اوقات میں اقارب و عقیدت مند بلا ناغہ شمسی صاحب کے پاس جمع ہو جاتے، جیسے اور جس قماش کے لوگ ہوتے، اسی انداز سے باتیں کرتے۔ عموماً سیاست حاضرہ لادینیت، معاشرہ کی پستی اور فرقہ واریت کے موضوع پر گفتگو چھڑ جاتی۔ حفظ تکلم اور آداب گفتگو کا انہیں اتنا پاس تھا کہ کہنے سے پہلے کہنے والے کی سنتے۔ خیالات میں ناموافقت اور مخالفت کے باوجود ان کے لب و لہجہ میں درشتی پیدا نہ ہوتی۔ متکلم کو سمجھانے سے پہلے اسے سمجھنے کی کوشش کرتے، باتیں ٹھہر ٹھہر کر کرتے، جذبات سے مغلوب نہ ہوتے۔ نہایت نرمی اور شفقت سے مخاطب یا متکلم کے ذہن سے بے اطمینانی یا فکر و فہم کی بے راہ روی دور کرتے۔ یہ مشفقانہ انداز ان کے خیالات و تاثرات میں تازگی پیدا کر دیتا۔ اور مسلک و معیار میں اختلاف کے باوجود سائل و مجیب کے باہمی تعلق پر کوئی بال نہ پڑتا۔

شمسی صاحب خالق اکبر کے ان ناچیز خلائق میں شمار تھے جو بندگان خدا کی خدمت کو جزو ایمان سمجھتے تھے۔ ان خدمات کی فضل و برکت کے استحصال میں وہ ہر قسم کے اکرام و دشنام سے بے پرواہ رہ کر سرگرم عمل رہتے۔ اقدام اس جذبہ سے کرتے کہ اگر انہوں نے پیش قدمی میں دیر کی تو معاشرہ اور ملت انہیں خائن قرار دیں گے۔

شمسی صاحب کی کارگاہ ہستی میں قرار و ثبات کا گذر نہ تھا۔ وہ زندگی بھر چین سے نہ بیٹھے۔ اور نہ ان کی بلند پیشانی پر کبھی بے چینی کی سلوٹیں دیکھی گئیں۔ از شباب تا شیب ان کی زندگی اس شعر کی تفسیر تھی ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

عمارت وسیع پوکھر کے کنارے بلندی پر واقع ہے، بی بی کمال کی قبر اور لوح آج بھی موجود ہے اور اطراف و جوار سے آسیب زدہ افراد بغرض علاج اس درگاہ میں آتے رہتے ہیں۔ ۳؎ یہ اقتباس پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی مرحوم کے مقالہ "اپنی اور پرائی بیتیاں" مطبوعہ رسالہ صبح نو شمارہ اکتوبر نومبر ۱۹۷۱ء سے ماخوذ ہے۔ پروفیسر مسلم فخر الدین شمسی صاحب کے داماد اور شاد کے شاگرد تھے۔ "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" مطبوعہ انجمن ترقی اردو پروفیسر محمد مسلم کی مرتب کردہ ہے۔

وہ معلم اخلاق و عمل تھے۔ مگر ملک و ملت کے خادم رہے وہ مجاہد تھے اور غازی بھی۔ ۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فساد میں جب بہار کی اچھی مسلم نامور آبادیاں مکان و مکیں سمیت تہس نہس کر دی گئیں۔ شمسی صاحب کے وطن کاکو[۱] پر بھی فسادیوں نے یلغار کی۔ مدافعت کی تیاری پہلے سے کر لی گئی تھی صبح سویرے ہزاروں کی تعداد میں غنڈوں لٹیروں نے کاکو پر حملہ کیا۔

جوان اور نوجوان۔ بچے اور بوڑھے کے علاوہ پردہ نشین مستورات کے ذہنوں کو بھی خطرے سے مقابلے کے لئے تیار کر لیا گیا تھا۔ مورچہ پر سب سے آگے شمسی صاحب تھے۔ "بجرنگ بلی کی جے" میں یہ مرد مجاہد "اللہ اکبر" کی آواز دیتا ہوا تنہا آگے بڑھ گیا۔ وہ مرتعش انگلیاں جن میں قلم پکڑنے کی طاقت نہ تھی اور وہ ناتواں بازو جو چھڑی کے بغیر بے جان رہتے۔ اس سنگین موقعہ پر کاکو کے جری نوجوانوں کے آہنی دست و بازو بن گئے تھے۔ شمسی صاحب کی اس غازیانہ سیادت نے وہ کام کیا کہ فسادی منٹوں میں تتر بتر ہو گئے اور کاکو پر دوبارہ حملہ کرنے کی کسی نے ہمت نہ کی۔

شمسی صاحب ایک تہذیب رفتہ کے مرقع تھے۔ یہ اس تہذیب کے یادگار تھے جس میں قدامت تھی، فرسودگی نہ تھی۔ جدت پسندی تھی، ہوس پرستی نہ تھی۔ ان کے چڑھتے اور ابھرتے دن ریاست بہار کی صاف ستھری ثقافتی زندگی کے سنہری ایام تھے۔ معاشرہ میں پرانے اقدار و آداب کی قندیلیں روشن تھیں، مگر کہیں نئے فانوس مستعمل تھے اور کہیں پرانے فانوس پر نئی رنگ آمیزیاں تھیں۔

اس عہد میں خاک بہار سے مسلمانوں میں کئی مقتدر اور نامور اشخاص پیدا ہوئے۔ چند ایسے بھی تھے جو جاہ و منصب، خیر و برکت اور علم و عمل کے بموجب ہندوستان گیر شہرت و عزت کے مالک بنے۔ سید بادشاہ نواب رضوی، حکیم عبدالحمید پریشاںؔ[۲]، خان بہادر علی محمد شادؔ، شمس العلماء سید سید حسرتؔ عظیم آبادی، شمس العلماء سید امداد امام اثرؔ[۳]، سید شاہ کمال، نواب نصیر حسین خیالؔ[۴]، پروفیسر عبدالغفور شہبازؔ[۵]، شمس العلماء رنجورؔ عظیم آبادی، مولانا مظہر الحق[۶]، سر علی امام، سید ظفر نواب، حافظ محب الحق، مسٹر عبدالعزیز، سر سلطان احمد، خواجہ محمد نور، محمد فخر الدین جیسے ضیا بار ناموں سے بہار کے آسمان تہذیب و ثقافت پر ایک کہکشاں کھل رہی تھی۔ یہ تمام ہستیاں یادگار زمانہ ہو گئیں اور ان کے ساتھ وہ نقشہائے تہذیب بھی مٹ گئے۔ اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے!

نوٹ (۱) فرقہ وارانہ فسادات کے بعد پٹنہ اور گیا کی متعدد لٹی اجڑی بستیوں میں حالات کی سنگینی کا بچشم خود جائزہ لیتے ہوئے خان عبدالغفار خان، سردار عبدالرب نشتر وغیرہ کے علاوہ گاندھی جی بھی کاکو آئے تھے۔ ریاست کے وزیر مالیات رام انگرہ سنگھ گاندھی جی کے ساتھ تھے۔ انہوں نے مولانا مظہر الحق اور راجندر بابو کا نام لیتے ہوئے جب گاندھی جی کو شمسی صاحب سے متعارف کرایا تو گاندھی جی کاکو کی اس ضعیف العمر و جیہہ شخصیت پر گہری نظر ڈالتے ہوئے بڑے تپاک سے ان کی جانب بڑھے۔ گاندھی جی سے ہاتھ ملاتے ہوئے شمسی صاحب کا دل بھر آیا، نہایت غم زدگی سے انہوں نے فرمایا گاندھی جی۔ آپ کی اہنسا پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا۔" (۲) حکیم عبدالحمید معاصرین شاد عظیم آبادی تھے۔ عربی و فارسی کے جید عالم اور اپنے وقت کے طبیب حاذق تھے۔ حکیم ارادت حسین جو بہار میں وہابی تحریک کے قائد تھے اور جنہوں نے ہجرت وطن کر کے مکہ میں سکونت اختیار کی، آپ کے خسر تھے۔ کلیم الدین احمد مشہور زمانہ نقاد کے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد حکیم عبدالحمید کے نواسے تھے (۳) امداد امام اثر عظیم آبادی شاعر، نقاد سخن اور کئی علمی و مذہبی کتابوں کے مصنف تھے۔ اردو کے انتقادی ادب میں بہارستان سخن عرف کاشف الحقائق ان کی مشہور تصنیف ہے۔ ملک کے نامور قانون داں سر علی امام اور حسن امام جو اپنی ذہانت، معاملہ فہمی اور نکتہ رسی کی وجہ سے صف اول کے وکلا میں شمار تھے، امداد امام کے بیٹے تھے۔

یہ جلیل القدر ہستیاں شمسی صاحب یا ان کے خاندان کے لئے اجنبی نہ تھیں ۔ اکثر و بیشتر سے ان کے ذاتی روابط تھے کچھ ان کے مشیر و رہبر تھے اور کچھ ہم نشیں و ہم ذوق کسی سے بزرگانہ ارتباط تھا اور کسی سے یارانہ ۔

جنگ آزادی کی تحریک میں شمسی صاحب عملاً میدان میں نہ آئے ۔ پر اس دور کے قومی اصلاحات اور عصری مطالبات سے انہوں نے اپنے ذہن و ذوق کو دور نہ رکھا ۔ علی برادران کی تقلید میں انہوں نے مغربی لباس ترک کر دیا ، اور کھدر اور موٹیاں استعمال کرنے لگے ۔ جو آخری وقت تک ان کے جسم کے ساتھ رہے ۔ عنایت اللہ مشرقی کی خاکسار تحریک کو انہوں نے حب دل سے قبول کیا تھا ۔ یہ ریاست کے امیر تحریک تھے اور چند دن گیا جیل میں اسیر زنداں بھی رہے ۔

مظہر الحق شمسی صاحب سے عمر میں بڑے تھے ۔ انہوں نے جب اپنا شعار و انداز بدلا اور مسٹر سے مولانا ہو گئے ، تو شمسی صاحب سے تعلق بڑھا ، جذباتی اور ذہنی ہم آہنگی نے آپس کے ارتباط کو دوستانہ بنا دیا ۔ اسی وجہ سے صدر جمہوریہ ہند بابو راجندر پرشاد جو ان دنوں کانگریس کے ابھرتے کارکن تھے شمسی صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے شمسی صاحب کے نام ناظرین کی دلچسپی کے لئے ان دو بزرگوں کے خطوط پیش کر رہا ہوں ۔

۸ راگست ۱۹۳۶ء ۔ پیارے شمسی !

خط آپ کا آیا ۔ جواب لکھنے میں دیر ہوئی ۔ وجہ یہ ہے کہ بمبئی سے ایک کتاب آنے والی تھی جس کا انتظار تھا کہ ایک جلد اس کتاب کی بھی روانہ کر دوں مگر زائد انتظار کرنا فضول ہے ۔ اس لئے آپ کے خط کا جواب دے رہا ہوں ۔

"IS LIFE THE END" ایک نہایت مستند روحانی کتاب ہے جو ابھی امریکہ میں طبع ہوئی ہے منتظر ہوں کہ آپ کی رائے اس کتاب کے بارے میں معلوم ہو ۔ میرا خیال ہے کہ روحانیت جدیدہ کے اکثر مظاہر کا پتہ اس سے لگ جائے گا ۔ میں اس کتاب کے بارے میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتا ۔ آپ اطمینان سے پڑھ کر مجھے رائے دیجئے ۔ یہاں بارش بہت اچھی ہو رہی ہے ۔ ندی نالے کل بھر گئے ہیں ۔ غالباً آپ کے یہاں بھی خوب ہو رہی ہوگی ۔ تین چار سال سے یہاں بارش کا امساک تھا ۔ اس سال گل برسوں کا بدلہ نکل رہا ہے ۔ آشیانے کے باغ اس وقت دیکھنے کے ہیں ۔ کل درخت ہرے بھرے ہو گئے اور بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں ۔ کاش ! آپ بھی ہوتے تاکہ دونوں دوست ساتھ ہو کر لطف اٹھاتے ۔ حسین دلی جا رہے ہیں ۔ چونکہ ۱۱ راگست کو میرے یہاں حسب معمول میلاد شریف ہونے والی ہے اس وجہ سے ٹھہر گئے ہیں ۔ بعد میلاد شریف کے میرا اور بیگم صاحب کا ارادہ ہے کہ ان کو دلی پہنچا آئیں !

آئندہ خدا مالک جو مناسب سمجھے گا کرے گا !

حسین آداب تسلیم کہتا ہے اور بیگم صاحب آپ کو بہت یاد کرتی ہیں ۔

آپ کا دوست ۔ مظہر الحق ۔"

(حواشی نوٹ) (۱) نصیر حسین خیال شاد عظیم آبادی کے بھانجے تھے اپنی ماہرانہ انشا کی وجہ سے "ادیب الملک" سے معروف تھے ۔ مغل اور اردو ، داستان عجم ان کی اہم تصانیف ہیں (۲) نسدن گاندھی بے نظیر کے مصنف تھے (۳) مظہر الحق نے انگلستان سے قانون کی ڈگری پاس کی ۔ پھر بیرسٹری چھوڑ دی اور مجاہدین آزادی وطن کے صف میں شامل ہو گئے ۔ بہار میں کانگریسی تحریک کے روح رواں تھے ۔ گاندھی جی سفر چمپارن میں ان کے یہاں مقیم تھے ۔ ڈاکٹر سید محمود ایم پی اور وزیر تعلیمات (باقی آگے)

۵ر جون ۱۹۳۷ء

"مکرمی مہربان مولوی شمسی صاحب!

بعد آداب تسلیم خیریت ہے۔ آپ کی خیریت چاہتا ہوں۔ آپ کا تاریخی ۲۰ مئی کا خط ملا۔ نہایت خوشی ہوئی! میں نے جان بوجھ کر ہندی اردو کے جھگڑے پر اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔ جس دن مجھ سے کسی اخبار والے نے رائے مانگی تھی اسی دن مسٹر یونس کا بیان اخباروں کو ملا تھا کہ جو گورنمنٹ کمیونک چھپا ہے اور اس میں یہ غلطی ہے کہ سبھی عدالتوں میں سبھی کاغذات ہندی اور اردو دونوں میں کاغذات داخل کر سکتا ہے یعنی کوئی compulsory بات نہیں ہے صرف optional ہے پہلے حکم نامہ سے یہ مفہوم نہیں نکل سکتا تھا۔ میں نے اسی لئے کبھی کہا تھا کہ میں نے اس حکم کے مفہوم کو پوری طرح نہیں سمجھا ہے آپ نے دیکھا ہوگا اب گورنمنٹ کا دوسرا حکم نامہ نکلا ہے جس میں یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ جو چاہے ہندی میں یا اردو میں کاغذات داخل کر سکتا ہے اور پٹنہ میں تو آپ کی رائے کے مطابق رومن میں بھی داخل کرنے کی اجازت ہے۔ اس کے بعد جھگڑا بہت حد تک کم ہو جائے گا۔ رومن کے بارے میں یہ دیکھتا ہوں کہ ملک میں لوگ اسی کو بہت کم جانتے ہیں اور اس کی اشاعت میں اتنا وقت اور خرچ لگے گا کہ اس وقت اس کا منظور ہونا غیر ممکن معلوم ہوتا ہے خیر یہ تو ایک ایسا سوال ہے جس پر غور کیا جا سکتا ہے، لیکن لوگوں میں اسی خیال کو پھیلانا چاہئے تبھی کچھ ہو سکے گا۔ میں تھوڑی اردو لکھ لیتا ہوں اور اسی لئے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں جواب دینا مناسب سمجھا۔"

زیادہ آداب — راجندر پرشاد

ڈاکٹر ذاکر حسین سے شمسی صاحب کے ۱۹۲۲ء کے مراسم تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی تحریک اعانت کے سلسلے میں جب یہ پٹنہ آئے تو شمسی صاحب کے ہمراہ، کاشانہ محلہ بھنورپوکھر میں قیام پذیر ہوئے۔ اس موقعہ پر سوء ہضم کی وجہ سے پٹنہ اسپتال کے ماہر چشم کے زیر علاج بھی رہے۔

۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فسادات سے پٹنہ کے مسلم گھرانے کے بچوں کا نظام تعلیم غیر اطمینان بخش ہو گیا تھا۔ شمسی صاحب نے خاندان کے بچوں کو جامعہ ملیہ بھیج دینے کی رائے دی۔ یہ کام میرے سپرد ہوا۔ چھوٹی بڑی عمر کے نو عدد بچوں کے ساتھ لے کر میں جامعہ نگر پہنچا۔ یہ مارچ ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ جامعہ ملیہ کا تعلیمی سال اکتوبر سے شروع ہوتا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر نے شمسی صاحب کا خط پڑھا۔ ان کی تفصیلی خیریت اور بہار کی حالت پوچھی تجویز سے فرداً فرداً ملے۔ دوسرے ہی دن کل بچوں کو مختلف اقامت گاہوں میں جگہ دلوائی اور ان کا داخلہ ہوا۔

۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر ذاکر بحیثیت گورنر بہار آئے۔ یہ ریاست کے پہلے مسلم گورنر تھے۔ گورنر ہاؤس میں پٹنہ اور گرد و نواح کے متعدد اشخاص جو جامعہ ملیہ یا مسلم یونیورسٹی سے نسبت رکھتے تھے یا وہ لوگ جو ڈاکٹر ذاکر کے دور یا قریب کے شناسا تھے۔ ان سے ملنے جاتے اور ان کے سلوک سے مسرور لوٹتے۔ سرکاری اور پبلک جلسوں کے علاوہ یہ مقامی علمی و ادبی نشستوں میں بھی شریک ہوتے، اکثر سماجی تقریبات کے دعوت نامے بھی بخوشی قبول کرتے اور اپنے منصب اور شخصیت کی حرمت کو خوش اسلوبی سے نبھاتے۔ بہار میں وہ تقریباً چار برس بحیثیت گورنر رہے۔ جن لوگوں سے یہاں ڈاکٹر ذاکر کا ملنا جلنا رہا ان کی تعداد کم نہیں۔ ایک تنہا نام فخر الدین محمد شمسی صاحب کا ہے جن سے ڈاکٹر ذاکر کی ملاقات کبھی نہ ہوئی۔ ایسا نہ تھا کہ بہار میں رہتے ہوئے بھی وہ شمسی صاحب سے بے خبر رہے، یا شمسی صاحب کے دیرینہ مراسم کو وہ بھول گئے۔ وہ شمسی صاحب کی فعال زندگی

(بقیہ نوٹ) ریاست بہار کے خزانچی تھے۔ ریاستی کانگریس کا صدر آفس "صداقت آشرم" مظہر الحق کی سکونت گاہ تھی جسے انہوں نے وسیع باغ سمیت کانگریس کو دے دیا۔ ملک محمد یونس، عہد حکومت برطانیہ میں ریاست بہار کے پہلے وزیر اعلیٰ تھے اور اپنے وقت کے اچھے بیرسٹروں میں شمار ہوتے تھے۔

اوران کے خیالات ونظریات کی پختگی سے ہمیشہ متاثر تھے۔ پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کے نام اپنے خطوں میں انہوں نے شمسی صاحب کی بزرگی اور وسعت نظری کا احتراماً ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو مکاتیب نمبر رسالہ نقوش) حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں اس قدر قریب ہوکر اور رہ کر بھی ایک دوسرے سے کبھی نہ ملے۔ دو بار ایسے مواقع آئے جب ڈاکٹر ذاکر اور شمسی صاحب کے مابین محض چند قدموں کی دوری تھی۔ مگر یہ دوری دیوارِ چین جیسی سدِ راہ رہی۔

ایک بار ۱۹۵۹ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین گیا کالج کی اردو مجلس کی سالانہ تقریب میں بغرض افتتاح گیا تشریف لائے۔ اس موقع پر انہوں نے راقم کی تحریر کردہ تمثیل عالم برزخ کا ایک مشاعرہ بھی دیکھا۔ ان کے اعزاز میں سرکٹ ہاؤس میں آفیشل ڈنر تھا۔ ان دنوں گیا میں فضل احمد سپرنٹنڈنٹ آف پولیس اور سید حسن[1] صاحب ڈسٹرکٹ جج تھے۔ کھانے کے وقت جب ضلع کے کلکٹر ڈاکٹر ذاکر سے ڈسٹرکٹ جج کا تعارف کرانے لگے، تو فضل صاحب نے بطور اضافہ یہ بھی ذکر کر دیا کہ سید حسن صاحب فخر الدین محمد شمسی صاحب کے سگے بھانجے ہیں۔ اس رشتہ کے علم پر ڈاکٹر ذاکر نے غیر رسمی خوشی محسوس کی اور بہت اشتیاق سے شمسی صاحب کی خیریت پوچھنے لگے۔ اتفاق وقت شمسی صاحب اس دن سید حسن صاحب کے کوارٹر میں مقیم تھے۔ سرکٹ ہاؤس اور ڈسٹرکٹ جج ہاؤس کو ایک مختصر دیوار جدا کرتی ہے۔ فضل احمد اور سید حسن صاحب دونوں نے ڈاکٹر ذاکر کو شمسی صاحب کی موجودگی سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر ذاکر نے سنا اور چپ رہے۔ دوسرے دن ہوائی جہاز سے وہ پٹنہ واپس ہوگئے۔

اسی طرح ایک بار محلہ بھنور پوکھر، پٹنہ میں شاہ مشتاق احمد کے مکان کے سامنے ابوالکلام اکیڈمی کا افتتاحی جلسہ تھا۔ ڈاکٹر ذاکر بصدارت کی۔ ڈاکٹر ذاکر، اختر اورینوی اور ڈاکٹر محمد محسن بھی شریک تھے۔ ڈاکٹر ذاکر نے ان سے شمسی صاحب کی خیریت دریافت کی۔ اتفاقاً اس موقع پر بھی شمسی صاحب جلسہ گاہ سے دس پندرہ قدموں کے فاصلے پر "دارالامان" میں موجود تھے۔ محسن صاحب نے ذکر کیا۔ جلسہ ختم ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر سرکاری کار میں روانہ ہوگئے۔ شمسی صاحب نے سنا اور غالب کے اس مصرعہ میں ترمیم کرتے ہوئے حسرتانہ کہا:

"وہ اپنا وضع کیوں بدلیں

ہم اپنی خو نہ چھوڑیں گے"

سر سلطان احمد اور شمسی صاحب عہد طفلی کے دوست تھے۔ کاکو[2] اور پالی[3] کی قربت اس دوستی کی استواری و استحکام کا مزید سبب تھی۔ اب تو وہ دن خواب ہوگئے۔ ایک زمانہ تھا جب پالی اور ہنیورہ بہار کے دو مردم خیز مرکز میں شمار تھے۔ پالی اور ہنیورہ کی خاک سے کئی نامی گرامی ہستیاں ابھریں اور برصغیر ہند پر ستارہ صبح جیسی چمکیں۔ پہلی محرم سے ہی پالی کی آبادی میں ایک رونق آجاتی، مولوی خیرات احمد، مولوی خورشید احمد، سید حسن عسکری، سر سلطان احمد، علی اکبر کاظمی، حسن رضا کاظمی اور دوسرے معزز سرکاری وغیر سرکاری برسرِ خدمت حضرات

نوٹ:۔ (۱) سید اختر احمد اورینوی کے چھوٹے بھائی (۲) راقم کے سب سے بڑے بھائی (۳) راقم کے منجھلے بھائی، صدر شعبہ نفسیات پٹنہ یونیورسٹی، مصنف ادھ کھلی مسکراہٹ (مجموعہ افسانہ)
(۲) کاکو سے چند میل دور پر سادات و شیوخ کی بستی ہے۔
(۳) پٹنہ سے چند میل دور ریلوے لائن کے متصل شرفا کی بستی ہے۔

اپنے اپنے ٹھکانوں سے اٹھ کر پالی میں سمٹ آتے۔

ایک عشرہ تک یہ پالی میں مقیم رہتے۔ اور بستی میں نئی زندگی دوڑ جاتی۔ عظیم آباد کی طرح پالی کی عزاداری میں خاص اہتمام کیا جاتا۔ پالی کا ہر چھوٹا بڑا بلا اختلاف مسلک غم حسین میں عقیدت مندانہ حصہ لیا کرتا۔

شمسی صاحب بھی اس موقع پر پالی جاتے۔ کبھی وہ سر سلطان کے یہاں مقیم ہوتے اور کبھی مجلس عاشورہ میں شرکت کے بعد شام میں کاکو واپس آجاتے۔

پالی کی اس مجلس کا ایک دلچسپ واقعہ راقم کے ذہن میں محفوظ ہے۔ جس ٹرین سے علی اکبر کاظمی[6] پٹنہ سے سفر کر رہے تھے۔ راقم بھی اپنے بھائیوں کے ہمراہ کاکو جا رہا تھا۔ علی اکبر کاظمی نے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اسلم میاں، پالی کا بھی ارادہ ہے؟" میں مرحوم سے شوخ تھا، سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "حسنین نام ہے اور ماتم حسین میں شرکت نہ کروں"۔ علی اکبر کاظمی مسکرائے اور محسن صاحب کی طرف رخ کرتے ہوئے بولے "محسن جانتے ہو اس سے بڑھ کر شیعوں کا کوئی دشمن نہ ہوگا"

میں گھبرایا کہ یہ کون سی بات ہوئی۔ محسن صاحب نے بھی اظہار حیرت کیا۔

میری طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے علی اکبر کاظمی نے اپنے بیان کی توجیہہ کی "رشید چچا نے اس کا نام حسنین رکھا تھا اس نے نام بدل کر اسلم رکھ لیا"۔ اور رکتے ہوئے اقرار طلب ہوئے "بتاؤ یہ عداوت نہیں تو اور کیا ہے"۔ پھر ہنسنے لگے۔

تو پالی کی ایک مجلس میں میں نے بھی خاص طور پر شرکت کی۔ خبر ملی تھی کہ نجم الحسن خود مرثیہ پڑھیں گے کہ ان کی تحت اللفظ خوانی خاص پُر تاثیر ہوتی تھی۔

سر سلطان کے مکان کا ایک وسیع کمرہ سامعین سے بھرا تھا اور ہر شخص دو زانو بیٹھا تھا۔ شمسی صاحب اور سر سلطان ہم پہلو تھے ممبر پر، مگر اتفاقاً نجم الحسن نہ تھے، بلکہ ان کے بڑے بیٹے شمس الحسن تھے جو ان دنوں پٹنہ کالج کے متعلم تھے۔ شمس الحسن میر انیس کے مرثیہ کا وہ حصہ سنانے لگے جو میدان کارزار میں جناب قاسم کی روانگی کا منظر تھا۔ یہ ابھی اس نئی شریک حیات سے رخصت ہو رہے ہیں جو کربلا میں ان کی زوجیت میں آئی تھیں۔

انیس کی زبان، واقعہ کی المناکی، اس پر مرثیہ خواں کا محاکاتی انداز۔ پوری مجلس پر ایک سکوت چھا جاتا۔ جو تھوڑے وقفہ پر آہ و بکا کی دردناک صداؤں سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا۔۔۔

میری نظروں نے اس موقع پر ایک عجیب نقشہ دیکھا۔ ختم مجلس کے بعد کہنا تھا۔ علی اکبر کاظمی میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کی طرف آہستہ سے مخاطب ہوا۔ "ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں"۔

بولے، کیا؟

اور یہ صرف آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی"۔ انہیں چھیڑتے ہوئے میں نے عرض کیا۔ "دیکھئے تبرہ نہ فرمائیے گا"۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے جواب دیا "نہیں نہیں ضرور کہو"۔

بقیہ نوٹ: (۶) انگریزی حکومت کے عہد میں بہار کے صیغۂ تعلیم میں پرنسپل اور ڈائریکٹر کی حیثیت سے ملازم بنے اور اپنی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے انہیں بڑی شہرت حاصل تھی۔ طبعاً نہایت بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ مگر اصولاً نہایت سخت دل۔ (۷) سر سلطان احمد کے متبنیٰ۔

میں نے آہستہ سے کہا: "سر سلطان میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے انداز میں ایک عجیب بات دیکھی۔ یعنی فرطِ جذبہ سے بے اختیار ہو کر وہ زانوؤں پر ہاتھ مارتے ہوئے آہ، آہ کہتے اور پھر انہیں لبوں سے بے ساختہ واہ بھی۔ ایک ہی سانس میں آہ اور واہ کا یہ متضاد ردِ عمل کیا معنی؟"

علی اکبر کاظمی کے چہرے پر ایک تبسم دوڑ گیا۔ اپنا چہرہ میرے کان سے قریب کرتے ہوئے فرمایا، "احمق تم نہ سمجھے؟" اور نہایت سنجیدگی سے کہا "آہ مرثیہ کے لئے تھی اور واہ پوتے کے لئے۔"

میرا مشاہدہ ہے کہ ہر بڑی شخصیت ایک مضبوط حصار میں رہنا پسند کرتی ہے کہ یوں قلعہ بند ہو کر وہ ان بوالہوس آشناؤں سے محفوظ ہو جاتی جو ان کی برکت کو بوٹیوں کی طرح نوچ نوچ کر کھاتے ہیں اور ایسے قزاقوں کی تعداد فی زمانہ مچھر مکھیوں سے کم نہیں۔ یہ بڑی شخصیتیں ہیں واضح کر دوں سیاست بازوں کی مانند وقتی مفاد و منصب کے چکر میں نہیں رہتیں اور نہ یہ مقبولیتِ عامہ کا سودا کرتی ہیں۔ ان کی برتری اور بزرگی میں علم و فضل کا دخل و عمل رہتا ہے۔ یہ کم آمیزی کے باوجود عزلت پسند نہیں ہوتیں۔ ان سے استفادہ دشوار نہیں! لیکن ان پر تصرف امرِ محال ہے — ہاں! یہ بات دوسری ہے کہ اس مضبوط حصار میں کوئی چور دروازہ بھی ہوتا ہے جس کے علم کے بعد حاجت روائی غیر ممکن نہیں رہتی۔

شمسی صاحب بڑے انسان تھے۔ علم و فضل میں یہ برگزیدہ بھی نہ تھے، پر یہ مخصوص شخصیت کے مالک ضرور تھے۔ ان کے ارد گرد بھی ایک حصار تھا۔ یہ اس کُہر کی مثال تھا جس کی دھند میں آس پاس کی چیزیں بعید ہو جاتی ہیں — شمسی صاحب کو استعمال کرنا آسان تھا اپنے وجود کو انہوں نے ڈھانپ کر کبھی نہ رکھا۔ ان کی بزرگی کا ایک قابلِ تقلید وصف صورتِ حال کے تقاضہ کے تحت اپنے وجود کو مسلم رکھتے ہوئے نئے حالات میں خود کو چاق چوبند بنا لینا تھا — معاملہ ذاتی زندگی کا ہو یا قومی زندگی کا۔ مسئلہ اپنے گھر کا ہو یا پرائے گھر کا۔ وہ بڑے ارمان دل اور عزم بالجزم کے ساتھ اپنی کارکردگی شروع کر دیتے۔ جوانوں میں جوان بن جانے اور انہیں راہِ عمل پر تیز گام کرنے کا بڑا سلیقہ تھا۔ ہم کاروں کی صف تیار کر لینا اور ہم خیالوں کی جماعت قائم کر لینا ان کے لئے مشکل نہ تھا۔ نئے کاموں کی قیادت و قیام میں امام وہ خود نظر آتے۔ مگر نعمتِ کامرانی کی تقسیم میں وہ خود دور رہ اور اہلِ جماعت قریب ہو جاتے۔ جیسے سربلندی کی عزت دستِ اہلِ کار ہی کا حصہ تھی!!

شمسی صاحب کے حوصلوں میں پژمردگی کبھی نہ آئی۔ موت سے چند یوم پیشتر تک ان میں چستی اور استواری موجود تھی۔ وہ حقیقت بیں تھے اور وقت کے نبّاض بھی۔ زمانہ کی روش اور رفتار سے انہوں نے اپنی آنکھیں کبھی بند نہ کیں۔ متبدل حالات اور ناگہانی واقعات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کا ان میں بڑا سلیقہ تھا جس سے ان کی دروں بینی کو قوت ملتی۔ ایسے ہر معاملہ اور مہم میں وہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا ایک پیکر بن جاتے۔ کارہائے رفاہِ عام کے اہتمام و انجام میں وہ تلقین و نصیحت سے زیادہ حرکت و جہد پر توجہ دیتے۔ غیر متوقع دشواریوں اور وقتی ہزیمت سے وہ دل برداشتہ نہ ہوتے۔ چٹکی بجاتے ہوئے ان مشکلات کا وہ حل ڈھونڈ نکالتے، اور ہم کاروں کو نئے ولولہ و جوش سے نئی راہِ عمل پر یوں چلا دیتے جیسے جو بیکار گیا اسے اب کارآمد بنا دینا ہے۔ طریقۂ کار میں یہ مدبرانہ نظم ان کی تحریکات کی خوش سلیقگی اور کامیابی کا راز تھا۔ زندگی میں ان کی نامرادیاں کچھ کم نہیں۔ وقت اور معیشت دونوں نے انہیں بار بار آزمایا ہے۔ مگر صبر و ضبط کا مادہ ان میں غضب کا تھا۔ وہ تقدیر کے قائل نہ تھے ہاں صالح و غیر صالح انسانی اعمال کے لازمی نتائج کے دیر یا سویر ظہور کے سخت قائل تھے۔ رسولِ کریم کا معجزہ نما کارنامہ ان کے خیال میں آنحضرت کے نبوت

کے قبل وہ اعمال و اقوال تھے جنہوں نے محمد ابن عبداللہ کو زندگی کے ہر شعبے میں سارے عرب میں یکتا بنا دیا تھا۔ رسول کریم کی سیرت کے اس پہلو پر جب گفتگو ہوتی تو اصغر گونڈوی کے اس شعر کو اس طرح پڑھتے جیسے شاعر نہیں شمسی صاحب سننے والے کو درس عمل دے رہے ہوں:

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو　　　پیکر عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

بلاد اسلامیہ کی زبوں حالی پر شمسی صاحب کی زمانہ شناس آنکھیں غم و حسرت سے بجھ جاتیں۔ دردمندانہ کہتے "اسلام موجود ہے مگر مسلمان ختم ہو گیا۔ شر و فساد کی جڑ ہمارا غیر اسلامی کردار ہے۔ غضب خدا کا!!" یہ کہتے ہوئے وہ بپھر جاتے "مسلمان نے اپنے رب کو بھی پاکستانی اور ہندوستانی بنا رکھا ہے۔ ہائے کیسی بدبختی ہے کہ ہم نے مشرکوں اور ملحدوں کو بندگان خدا کے زمرے سے خارج سمجھ لیا ہے۔ کون سمجھائے اور کیسے سمجھائے۔ خدا رب العالمین ہے۔ کسی قوم یا ملک کا مخصوص نہیں۔ ذرا سوچو۔ دوسرے بندوں کے عروج کا سبب آخر کیا ہے؟" ۔ پھر اس سوال کا جواب اس یقین سے خود ہی دیتے "بابا یہ صرف ان بندگان کا قومی کردار ہے۔ یہ بالکل اٹل بات ہے۔ ہمیں ہمارے رسول نے دینی کردار کی دولت دی تھی۔ اس دستور کو اختیار کرنا کجا ہمارا معاشرتی کردار بھی دو کوڑی کا نہ رہا۔ پھر یہ شکوہ کیا!!؟

شمسی صاحب شاعر نہ تھے، مگر مزاج خالصتاً شاعرانہ رکھتے تھے۔ ان کے جمالیاتی شعور میں وہ شگفتگی بھی جو حسن شعر ہوتی ہے۔ یہ شاعری میں ساحری کے قائل تھے اسے جزو پیغمبری نہ سمجھتے تھے۔ قدما میں حکیم مومن خاں، مرزا غالب، میر تقی میر اور عہد حاضر کے شعرا میں فانی، اصغر، حسرت اور جوش کی خوش کلامی کے یہ بڑے مداح تھے۔ ان شعرا کے چیدہ اشعار اس پر لطف انداز سے تحت اللفظ پڑھتے کہ شعر کا جذبی اور صوتی حسن ابھر آتا اور اسے بار بار سنتے رہنے کو جی چاہتا۔ اکابر بہاری شعرا میں امداد امام اثر، نصیر حسین خیال اور حافظ عبداللہ مشکی پوری سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ جمیل مظہری، عطا کاکوی، کلیم عاجز، بہاء الدین کلیم، اختر کاکوی ان کے عزیز اور پسندیدہ شعرا تھے۔ جمیل مظہری کے نام کے ساتھ "علامہ" کے اظہار پر وہ چیں بہ جبیں ہو جاتے۔ کبیدگی سے کہتے "ایک اچھے شاعر کو کیوں ناس رہے ہو" اور اسی نقطۂ نظر کے تحت حکیم مشرق کی فکری بلندی کے اعتراف کے باوجود اسے شاعر فطرت "نگار" کا پاسنگ نہیں سمجھتے۔ بہار کے مشہور ظرافت نگار نور محمد انجم مانپوری کی خوش طبعی اور مزاح نگاری کے یہ بھی قدرداں تھے۔

ایک بار رتنپور شاہجہان آباد کے سفر میں مانپوری اور شمسی صاحب کا ساتھ تھا۔ سنتے سناتے دوران سفر، شعر و شاعری کی بات چل نکلی۔ گفتگو اس نقطے پر جا لگی کہ شاعری کیا ہے؟ اور اچھے شعر میں کون سا خاص وصف ہوتا ہے؟ موزونیت، پذیرائی، جذب و کشش جیسی اساسی قدروں کی توضیح شروع ہو گئی۔

شمسی صاحب نے دفعتاً ہاتھ اٹھا کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے مانپوری کی توجہ سامنے کھیت کی طرف مبذول کرائی "دیکھئے جناب"

۱؎ اصل نام نور محمد تھا۔ شاعری میں انجم اور نثر میں مانپوری کے نام سے لکھتے تھے۔ رسالہ ندیم کے مدیر و مالک تھے جو اپنے وقت کا ایک معیاری ماہنامہ تھا۔ مانپوری کی کئی تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ "میر کلو کی گواہی" ان کی معروف زمانہ مزاحیہ تحریر ہے۔

انہوں نے مانپوری کے احساس جمال اور رعونت مشاہدہ دونوں کو بیک وقت دعوت دی "یہ شعر ہے۔ ذرا اس عورت کو دیکھئے"!

مانپوری نے پہلو بدلا کر چلتی ٹرین کی کھڑکی سے اپنی نگاہ گزرتی ہوئی سرزمین پر ڈالی۔ کچھ دور پر ایک خوش رو کم سن عورت سر پر دھان کا گٹھا دونوں ہاتھوں سے تھامے پگڈنڈی پر تیز تیز قدموں سے آرہی تھی۔ مانپوری نے اس کے خوبصورت جسم، چہرے کی ملاحت اور چھوتی ہوئی قامت کا جائزہ لیتے ہوئے برجستہ جواب دیا۔ "نہیں حضور، میں آپ سے اختلاف کرتا ہوں" پھر سنجیدہ ہو کر اس عورت کی طرف نظر ڈال کر کہا۔

"یہ تو صرف ایک مصرعہ ہے۔ جب تک دوسرا چسپاں نہ ہو، شعر کہاں؟"

شمسی صاحب کا دماغ چیدہ اردو فارسی اشعار کا کنج گلستاں تھا۔ بیدل عظیم آبادی کے یہ دو اشعار مجھے شمسی صاحب کی زبانی ملے ہیں۔

هر کجا نکہت گل پیرہن رنگ درید ۔۔۔ نیست پوشیدہ کہ از خود سفرے می خواہد

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی ۔۔۔ اے بہار نیستی از قدر خود ہشیار باش

اشعار ذیل شمسی صاحب کے ذوق کے ترجمان ہیں:۔

کوئی پنہاں ہے پس پردۂ سامان بہار ۔۔۔ گل چمن میں نہیں بے وجہ ہنسا کرتے ہیں۔ — بیتر عظیم آبادی

کام کرنے کو بہانہ کچھ نہیں ۔۔۔ کچھ نہ کرنے کو بہانہ چاہیئے — اختر کاکوی

بدل گیا ہے جو اپنی حیات کا مقصد ۔۔۔ بھٹک رہی ہے سر راہ زندگی کیسی — عطا کاکوی

نہ جانے کون سی ساعت چمن سے بچھڑے تھے ۔۔۔ کہ آنکھ بھر کے نہ پھر سوئے گلستاں دیکھا — میر سوز

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی ۔۔۔ آشیاں اپنا ہوا برباد کیا — مومن

وہ عالمگیر جلوہ اور وہ حسن مشترک تیرا ۔۔۔ خدا جانے ان آنکھوں کو ہوا کس پہ شک تیرا — شاد

نہ رہبروں پہ بھروسہ نہ راستوں پہ یقین ۔۔۔ بس ایک جذبۂ بے اختیار باقی ہے — جمیل مظہری

اس تبسم پہ فلق ہو نثار ۔۔۔ دل کی گرہیں جو کھولتا جائے — "

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے ۔۔۔ کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں — اقبال

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے ۔۔۔ اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی — جوش

ہر ایک کانٹے پر سرخ کرنیں ہر ایک کلی میں چراغ روشن ۔۔۔ خیال میں مسکرانے والے تیرا تبسم کہاں نہیں ہے — "

جنوں کا پاؤں پکڑ کر خرد بہت روئی ۔۔۔ تیری گلی سے جو صحرا کی راہ لی میں نے — کلیم

مرثیہ رحلت حضرت فخرالدین محمد شمسی بتاریخ ۲ جنوری ۱۹۷۲ء بمقام کاکو۔ از پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

رہی جاتی ہے گھٹ کر سینے میں فریاد ۔۔۔ نہیں اس کی رسائی تا عظیم آباد

لئے بیٹھے تھے دل پر داغ ہم کیا کیا ۔۔۔ مقدر نے کیا اک چرکا اور ازداد

خبر آئی کہ فخرالدین شمسی بھی ۔۔۔ روانہ ہو گئے سوئے عدم آباد

عزیزوں تک پہنچ جا المدد اے آہ! — کہ ہے مسدود راہ خاک و آب و باد
بتا دے ہم بھی زندہ ہیں برائے نام — علاقے تم سے سارے کٹ گئے جز یاد
ہوئیں غائب وہ کرنیں شمس تاباں کی — منور جن سے تھی خاک کمال آباد
تھا خالص مرد مومن عابد و حافظ — نزاع کفر و ایماں سے مگر آزاد
مفکّر، مخترع، موجد، مگر خاموش — رکھیں گے کارنامے صرف اس کو یاد
جوانی میں قوی جثّہ جیالا شیر — رہی پیری میں بھی جانبازی فرہاد
عدو کو مار رکھتا بے جدال و جنگ — تھا تیر اندازی احساں کا وہ استاد
وہ اپنے دکھ لئے سہتا تھا سب کے دکھ — مگر دل سے نہ آئی تا بلب فریاد
دل اس کا پاک کینے کے شراروں سے — نہ اکساتی اسے اشرار کی بیداد
ضعیفی میں بھی تھا ہر چند وہ پا لنگ — مگر چلتا ہی رہتا بازو امداد
رہا وہ منہمک انساں کی خدمت میں — نہ پروائے صلہ اس کو نہ شوق داد
تکلم یا تبسم حوصلہ افزا — جو ناشاد آتا پاس، اٹھتا تھا وہ دلشاد
تھیں جاں بخش اس کی تعبیریں مسائل کی — تھا آخر حضرت یوسف کی وہ اولاد
غلط فہمی کا ہر پردہ اٹھا دیتا — الٹ دیتا گلوں شکووں کی ہر بنیاد
وجود اس کا وجود جرأت و امید — وداع اس کا وداع عفو و عدل و داد
جو منشا تھا مشیت کا ہوا پورا — دعائیں بے اثر، آہیں گئیں برباد

یہ شمسی کا نہیں آپ اپنا رونا ہے — وہ خود اچھا گیا ہم رہ گئے ناشاد
ابھی رونا ہے بچوں پر جوانوں پر — ستمکش، نیم جاں، بے خورد و نوش و زاد
بہایا خوں مسلمانوں نے مسلماں کا — درندوں سے بھی بدتر نکلے آدم زاد
کیا سب کچھ نثار راہ حق لیکن — گئی قربانی اموال و جاں برباد
کہاں نصرت، مگر اب بھی ہے کانوں میں — صدائے اِنَّہٗ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد
اِدھر مقدار اشک و آہ کی محدود — اُدھر ہیں بسمل مظلوم لا تعداد
نہ لایا تاب سننے کی، غنیمت ہے — نہ دیکھی تو نے یہ نا دیدنی بیداد
غم جانکاہ دنیا سے یہ چھٹکارا — یہ جا ملنا عزیزوں سے مبارکباد
نہ لوٹا جا کے زائر کوئی منزل سے — بتائے اس مہم کی کون روئیداد
عذاب راہ کے سنتے ہیں افسانے — نہیں ہے دفتر رحمت کا جن پر صاد

(بقیہ صفحہ ۲۲۴ پر)

شرف الدین احمد (عظیم آبادی)

میرا اختر

جو

ہمیشہ زندہ رہے گا

میرے احباب کا مجھ پہ اصرار اور مسلسل اصرار ہے کہ میں بھی اختر کے متعلق کچھ ضرور لکھوں اور وہ سب کچھ لکھوں جو شاید صرف میں ہی لکھ سکتا ہوں۔ مجھے خود بھی اپنی اس ذمہ داری کا احساس ہے لیکن اے کاش میں اپنے دوستوں کو یہ یقین بھی دلا سکتا کہ میں اب زندہ نہیں ہوں پھر وہ شخص جو خود مر چکا ہو کسی مرنے والے کے متعلق بھلا کیا لکھ سکتا ہے؟ میں نے اپنی زندگی میں شاید سب سے زیادہ اختر ہی کے متعلق لکھا ہے۔ اس کی تعریف کی ہے۔ اس کو نشتر لگائے ہیں اور خود اس کی فرمائش پر اسے رسوا بھی کیا ہے، چونکہ اس کو اپنی جرأت رندانہ پر ہمیشہ ناز رہا اس لئے اپنی رسوائیوں میں بھی اسے خاص مزا آتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے سب سے بڑے ہمراز تھے۔ شاید اسی لئے جب بھی میں نے کچھ لکھا تو اس نے یہی کہا کہ "کم بخت، تیرے انہی نشتروں کی بدولت تو میں زندہ ہوں اور اب تک مرنے سے انکار کرتا رہا ہوں"۔

بعض حقیقتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو سب کچھ جاننے کے بعد بھی مان لینے کو دل نہیں چاہتا اور واقعی اگر کوئی مان بھی لے تو اس کا کلیجہ نہ پھٹ جائے! میری اور اختر کی کہانی بہت پرانی اور بہت طویل ہے۔ کافی دلچسپ بھی ہے اور بڑی دردناک بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہاں سے شروع کروں اور کب تک سناتا رہوں اور پھر اس میں ایسی باتیں بھی تو آجائیں گی جن کی تشریح صرف اختر ہی کی زبان سے اچھی معلوم ہو سکتی ہے۔ اختر کو میرے خطوں سے ہمیشہ بے حد دلچسپی رہی مگر میں تو کہوں گا کہ ان خطوں میں کوئی بات ہو یا نہ ہو۔ ان پہ اختر کا تبصرہ کہیں زیادہ دلچسپ ہوتا تھا۔

گزشتہ اپریل کی ۱۵/تاریخ کو میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ایک تقریب میں شریک تھا۔ وہاں اختر کے اور بھی احباب موجود تھے میرے بزرگ و محترم پروفیسر محمد مسلم[1] صاحب کے صاحبزادے اسلم میاں سلمہ میرے پاس آئے اور خاموش کھڑے رہے۔ پھر کہا "میں دو روز سے آپ کے پاس آنا چاہتا تھا مگر۔۔۔" نہ جانے کیوں میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہ ان سے کچھ کہا گیا اور نہ میں سننے کے لئے تیار تھا۔ پھر ۱۲/اپریل ۷۷ء کو ایک مقامی اخبار میں یہ منحوس خبر بھی پڑھی۔ اس کے بعد ۱۶/مئی ۷۷ء کے روزنامہ جنگ میں اختر کی ایک شاگرد مہ جبیں ناز کا ایک مضمون شائع ہوا۔ پھر ۳۰/مئی ۷۷ء کے روزنامہ حریت میں اختر کے دوسرے شاگرد محمد ظفر الحسن صاحب سلمہ کا مقالہ نظر سے گزرا۔ اس کے علاوہ ریڈیو پاکستان کے پندرہ روزہ رسالہ آہنگ کی ۱۶ - ۳۰/جون ۷۷ء کی اشاعت میں اختر کا ایک افسانہ

---

(۱) پروفیسر مسلم ہندوستان میں تو محتاج تعارف نہیں تھے۔ لیکن پاکستان میں علم و ادب کی اس عظیم ہستی سے لوگ پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ اگر کچھ اور زندہ رہ گیا تو موصوف کے متعلق بھی کچھ لکھنے کی کوشش کروں گا۔

"شادی کے تحفے" بھی ایک مختصر سے نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔ پھر ۲۲ اگست ۷۷ء کے روزنامہ مشرق میں بھی اختر کے ایک تیسرے شاگرد سید
ابوالفتح سرید کا ایک مختصر سا مضمون نظر سے گذرا۔ چلئے قصہ ختم ہوا۔ اختر کے تین مقامی شاگردوں نے تو اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب رہا پاکستان
کے "دانشوروں" کا طبقہ تو ظاہر ہے ان کو نہ اتنی فرصت ہے اور نہ کوئی خاص دلچسپی کہ وہ بھی اختر کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کے متعلق
کچھ لکھنے کی زحمت فرمائیں۔ "دانشور" کی اصطلاح کم سے کم جو پاکستان میں رائج ہے (ہندوستان کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا) اس کا اطلاق ظاہر
ہے نہ تو اختر کے ان بے چارے شاگردوں پر ہوتا ہے اور نہ خود غریب اختر ہی پر۔ ہمارے ہاں عرصے سے ایک روایت چلی آرہی ہے کہ جب بھی
کوئی ایسا شخص ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتا ہے جس کی ذات اپنی جگہ خود ایک انجمن ہو اور جس کی کمی کبھی پوری ہو ہی نہ سکے تو ہم اس کی
علمی و ادبی خدمات اور ذاتی خوبیوں کو قطعی طور پر نظر انداز کرتے ہوئے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ جغرافیائی اعتبار سے وہ کس خطۂ ارض میں پیدا ہوا تھا
کسی اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھا یا نہیں۔ اس کے عقائد کیا تھے، مالی حالت کیسی تھی۔ خسروانِ مملکت میں کسی سے اس کا دور کا بھی رشتہ تھا یا
نہیں۔ صنفِ ادب میں اگر نثر کو اس نے اپنایا تھا تو اس نے کتنے جاسوسی ناول لکھے ہیں اور فٹ پاتھ کی دکانوں میں ان کی کتنی مانگ ہے اور
پھر اس کے افسانے بھی جنسی مسائل کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں یا محض روزمرہ کی زندگی اور اخلاقیات ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں؟ اسی طرح
اگر وہ شاعر تھا تو کہیں اس کے اشعار آسان زبان میں اور بامعنی تو نہیں ہوتے ہیں؟ اس نے کتنے فلمی گانے اور کتنے فلمی مکالمے لکھے ہیں
اور ہاں، اس نئی اور مقبول صنفِ ادب یعنی نثری نظم میں اس کا کوئی مجموعہ شائع ہو چکا ہے یا نہیں۔ اگر کسی ادیب میں یہ سارے جراثیم
پائے جائیں تو اس کے دانشور ہونے میں کسی کو شبہ باقی نہیں رہتا۔ دانشوری کا یہ معیار کچھ اتنا بلند ہے اور بلند تر ہوتا چلا جا رہا ہے کہ اگر
کوئی اس پر پورا اتر گیا اور اس کے ساتھ اس میں اپنی ذاتی "پبلسٹی" کی صلاحیت بھی موجود ہے تو پھر اس کے مرنے کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا۔
اور اس کے ہر شاہکار کی ٹیلی وژن پر "رونمائی" بھی ہوتی ہے اور اس پر اپنے مخصوص خیالات کا اظہار فرمانے کے لئے کچھ "دانشور" آسانی
سے دستیاب بھی ہو جاتے ہیں جب سے یہ نکتہ میری سمجھ میں آگیا ہے مجھے یہ دیکھ کر اب تعجب نہیں ہوتا کہ ہماری ایک سے ایک
مایہ ناز ہستیاں رخصت ہوتی جا رہی ہیں اور ہم انہیں کیسی بے دردی سے بھلائے چلے جا رہے ہیں۔ محض چند ہی کپے پہلے۔ ابھی
کچھ زیادہ دن بھی تو نہیں ہوئے جب شوکت تھانوی اللہ کو پیارے ہوئے۔ ذوالفقار علی بخاری اور سید محمد جعفری ہم سے جدا
ہو گئے۔ اور حال ہی میں پروفیسر وقار عظیم اور پھر فوراً ہی بعد حضرت استاذی پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اردو کو
محض رسماً یا مجبوراً اپنی قومی زبان کہنے والے اپنے دل سے پوچھیں کہ ان ہمہ گیر شخصیتوں نے جو جگہیں خالی کی ہیں کیا وہ کبھی بھی پر ہو سکیں گی؟ اس
حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ گراں قدر ہستیاں اپنی خداداد صلاحیتوں، اعلیٰ کردار اور ذاتی خوش مذاقی کے لئے آپ
اپنی مثال تھیں لیکن یہ دیکھ کر حسرت بھی ہوتی ہے کہ جو مقام ان کو ملنا چاہئے تھا وہ اب تک نہیں مل سکا ہے۔ خدا کرے ان کی ساری
عمر کی کاوشوں کا قیمتی سرمایہ ہی محفوظ رہ جائے جو شاید کبھی آئندہ نسلوں کے کام آسکے۔ جب ہم سب کے محترم جناب پروفیسر اے۔ بی۔
اے حلیم کا انتقال ہوا تھا تو مجھے امید تھی کہ کم سے کم وہ حضرات جن کا تعلق درس و تدریس سے ہے اور جن میں سے بیشتر خود مرحوم
کے شاگرد بھی رہ چکے ہیں، نہ جانے ان کے لئے کیا کیا کریں گے۔ میں نے اپنے ایک مضمون (اے بی حلیم) میں چند تجویزیں بھی پیش کی تھیں جن
کی محض زبان سے تو بہتوں نے تائید کی لیکن کیا کسی نے بھی کچھ نہیں۔ وہ شخص جس کا تعلیم اور انتظامی صلاحیتوں میں پورے برصغیر میں کوئی ثانی
نہیں تھا۔ اور جو کسی ذاتی منفعت کے لئے نہیں بلکہ محض اسلامی جذبہ کے تحت آیا تھا اور پاکستان کا ہی ہو کر رہا۔ کم از کم اس کا نام زندہ رکھنے

کے لئے یونیورسٹی نے بھی کچھ نہیں کیا۔ بہرحال، پاکستان کی ان مایۂ ناز ہستیوں کو اب کسی نام و نمود کی ضرورت نہیں۔ یہ تو خود ہماری بدقسمتی اور انتہائی احسان فروشی ہے کہ ہم نے ان کے لئے کچھ نہیں کیا اور نہ کچھ کرنے کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ وہ لوگ ہیں جن کے شایانِ شان اگر کچھ نہ بھی کیا جائے تب بھی وہ ہمیشہ زندہ ہی رہیں گے اور ہم انہیں کبھی نہیں بھول سکیں گے۔

قدرت کی اس ستم ظریفی کو کیا کروں کہ میں اب ایک ایسی خبر سننے کے لئے بھی زندہ ہوں جس کو اگر سن بھی لوں تو اسے یقین کرنے کے لئے قوت برداشت کہاں سے لاؤں۔ میں پوچھتا ہوں کیا ستارے بھی کبھی مرتے ہیں؟ وہ تو ہمیشہ سے روشن ہیں اور ہمیشہ روشن رہیں گے۔ اختر بھی ایک ایسا ہی ستارہ ہے جو ہمیشہ روشن رہے گا اور دوسروں کو بھی اپنی روشنی پہنچاتا رہے گا، اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو وہ تو میری زندگی کا ایک بہت ہی اہم جزو ہے، لہٰذا اس کے نہ ہونے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر اختر نہیں ہے تو میں بھی کہاں ہوں! یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے اگست میں جب ہم لوگ آخری بار ملے اور پھر مسلسل تیس سال تک ایک دوسرے سے ملنے کے لئے دن گنتے رہے تو اس طویل مدت میں کبھی بھی میں نے اپنے آپ میں زندگی محسوس نہیں کی اور اپنے ہر خط میں اختر بھی انہی جذبات کا اظہار کرتا رہا۔ بہرکیف اب اگر اختر کے متعلق مجھے ایک بار اور (شاید آخری بار) لکھنا ہی ہے تو اس کے لئے مجھے اب سے ۴۵ برس پیچھے جانا ہوگا کیونکہ وہیں سے یہ کہانی شروع ہوتی ہے۔ تو آیئے پھر وہیں چلتے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں میرے بڑے بھائی (شاہ محمد حامد مرحوم) جہان آباد میں کوآپریٹو بینک کے منیجر تھے اور میں علی گڑھ میں اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد اور ملازمت شروع کرنے سے پہلے انہی کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک روز ان کے ایک قریبی دوست شاہ محمد توحید صاحب مرحوم آئے اور ان کے ساتھ ایک دبلا پتلا خوبصورت سا مگر بیمار نوجوان بھی تھا۔ شاہ صاحب نے یہ کہہ کر اس نوجوان کا تعارف کرایا کہ "یہ لڑکا اختر میرا بہت ہی قریبی عزیز ہے اور ماشاء اللہ بے حد ذہین اور بہت قابل ہے۔ پٹنہ میڈیکل کالج کے تیسرے سال میں تھا کہ بیمار ہو گیا اور اب ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ میڈیکل کالج چھوڑ کر آرٹس لے لو۔ تبدیل آب و ہوا کے لئے مسوری بھی بھیجا گیا مگر وہاں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اب میں اس کو ارول لئے جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ سون کے پانی سے اس کو صحت ہو جائے گی"۔ پھر شاہ صاحب نے مجھ سے خاص طور پر کہا کہ "تو میں تمہارے لئے بہت ہی اچھا دوست لایا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم دونوں کا مذاق بالکل ایک ہی سا ہے اس لئے یقیناً ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوگے"۔ میں ہر شخص سے بہت جلد بے تکلف ہونے کا عادی نہیں مگر اختر کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک اور باتوں میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ ہم دونوں فوراً ایک دوسرے سے بہت ہی قریب ہو گئے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ شاہ توحید صاحب آہستہ آہستہ بھائی جان سے کچھ کہہ رہے ہیں اور وہ کچھ یوں تھا کہ "اس عزیز کو یکایک منہ سے خون آ گیا اور ڈاکٹروں نے تھائسس تجویز کیا ہے۔ ہر بڑے ڈاکٹر کا علاج ہو چکا ہے اور کئی جگہ تبدیل آب و ہوا کے لئے بھی بھیجا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ خدا کرے ارول کی آب و ہوا اس کو راس آ جائے"۔ میں نے جب یہ سب سنا تو مجھے ایک سکتہ سا ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ تھائسس کے معنی تو یہ ہیں کہ بس موت کا پیغام آ گیا (اس وقت ٹی۔ بی کے معنی یہی تھے) تو پھر جو شخص کچھ دنوں کا مہمان ہے اس سے دوستی بڑھانے کا فائدہ ہی کیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہم دونوں خود بخود ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہوتے جا رہے تھے۔ اختر کو صرف ایک رات قیام کرنا تھا اور وہ ساری رات ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ اختر کا اصرار تھا کہ میں بھی ساتھ ہی ارول چلوں۔ لیکن اب تو سوال یہ پیدا ہو چکا تھا کہ کیا اس تھائسس کے مریض کے ساتھ رہنے کی مجھے اجازت بھی ملے گی یا نہیں۔ میں نے اختر سے کہا تم جاؤ۔ میں جلد ہی آتا ہوں۔ چنانچہ ایک ہفتہ کے بعد میں بھی ارول روانہ ہو گیا۔ گیا تھا صرف دو روز کے لئے۔ مگر دو ہفتے کے بعد بھی بمشکل آ سکا۔

ارول بہار کے ضلع گیا کے سب ڈویژن جہان آباد میں دریائے سون کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس کے ساتھ ایک نہر بھی ہے۔

جس کے دونوں طرف شیشم کے اونچے اونچے درختوں کی قطاریں کچھ عجیب دلفریب منظر پیش کرتی ہیں۔ ان کے مناظر کے ساتھ قدرت نے ارول کے رہنے والوں کو بھی جو خوبیاں عطا کی ہیں وہ بس انہی کے لئے مخصوص ہیں۔ میں نے خلوص و محبت، خوش مذاقی اور مہمان نوازی کی جو اعلیٰ مثال وہاں پائی وہ زندگی میں کہیں اور نہ مل سکی۔ ہاں تو جب صبح کو میری بس جہاں آباد اسٹیشن سے چل کر اس چھوٹے سے گاؤں ارول میں شاہ توحید صاحب کی شاندار کوٹھی کے سامنے رکی تو دیکھا کہ دور پہ ایک آرٹسٹ درختوں کے سائے میں بیٹھا کسی پینٹنگ میں مصروف ہے۔ دیکھتے ہی دوڑ کر مجھے لپٹ گیا۔ میں حیران تھا کہ صرف چند ہی روز پہلے جس کے چہرے ہی سے نقاہت اور مایوسی ٹپک رہی تھی اور جو کچھ دن اور زندہ رہنے کی امید موہوم پہ نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے بعد اب ارول میں محض وقت کا انتظار کر رہا تھا اب ایسا بشاش کیسے نظر آ رہا ہے۔ شاید اب وہ زندہ رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میری اس حیرانی کو دیکھتے ہی اختر نے کہا "بھائی، میں بالکل اچھا ہوں، مسلسل سون کا پانی پئے جا رہا ہوں۔ روزانہ اسی میں غوطہ بھی لگاتا ہوں۔ ساری دوائیں بھی اسی میں پھینک دی ہیں۔ ڈاکٹروں نے تو تین چار بار کھانے کو کہا تھا لیکن مجھے آٹھ دس بار کھانے کے بعد بھی بھوک لگی رہتی ہے۔ صبح و شام نہر کے کنارے ٹہلتا ہوں اور باقی وقت میں سون کے کنارے بیٹھ کر پینٹنگ کرتا رہتا ہوں۔" میں نے جب پوچھا کہ کیا یہ سب تم اکیلے ہی کرتے رہتے ہو تو اختر نے کتنا دلچسپ جواب دیا کہ ہاں، بظاہر تو اکیلا ہی یہ سب کرتا رہتا ہوں لیکن ایک لطیف احساس یہ ضرور رہتا ہے کہ جیسے ہر وقت میں آس پاس کی کھڑکیوں سے مسلسل دیکھا جا رہا ہوں۔ جی ہاں، اسی لطیف احساس کے بعد سے تو اختر کو افاقہ ہونا شروع ہوا تھا۔ اختر نے پینٹنگ تو وہیں چھوڑ دی اور مجھے اپنے ساتھ ایک چھوٹے سے شیشم کے درخت کے پاس لے آئے (یہ وہی شیشم کا درخت ہے جس کا ذکر اختر کے افسانوں میں اکثر آیا ہے) اور کہا بس یہیں بیٹھ کر ہم لوگ کتاری کھائیں گے (دیہات میں گنے کو کتاری ہی کہتے ہیں) فوراً کتاری کے کوئی پانچ پانچ فٹ کے دو ٹکڑے آ گئے۔ ایک اختر نے میرے ہاتھ میں دیدیا اور دوسرے کے ایک سرے کو دانتوں سے دبا کر جو کھینچا تو اس کی پوری چھال اتر آئی۔ اس طرح وہ دانتوں ہی سے گنڈیریاں بنا بنا کر کھاتے رہے۔ دوسرا ٹکڑا اب تک میرے ہاتھ ہی میں تھا۔ بے حد اصرار پر میں نے بھی کوشش کی تو میرے سارے ہونٹ چھل گئے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مجھ میں اور اختر میں ایک بنیادی فرق بھی تھا اور وہ یہ کہ میں سات پشتوں کا خالص بلکہ "نخالص" شہری اور وہ اپنی اصطلاح میں "کھانٹی دیہاتی"، اس لئے ہر وقت ساتھ رہنے پر بھی اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اپنی کسی نہ کسی حرکت پہ ایک دوسرے کو کچھ عجیب سے معلوم ہونے لگتے تھے۔ ابھی کتاری کی مہم ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک بڑی سی پلیٹ میں حلوہ اور بہت سے اُبلے ہوئے انڈے سامنے رکھ دئے گئے۔ میں نے کہا "بھئی اس کی اتنی جلدی کیا ہے؟ ذرا میں نہا تو لوں، کپڑے تو بدل لوں۔" اختر نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا "اچھا تو آپ گویا غسل خانہ میں جا کر نہائیں گے اور اس کے بعد کپڑے بدل کر نواب صاحب باقاعدہ ناشتہ کریں گے۔ خیر، پہلے انڈے اور حلوہ تو کھا لو، پھر چلنا میرے ساتھ سون میں نہانے کے لئے۔" اب دیکھا تو سامنے سے شاہ توحید صاحب آ رہے ہیں۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا تو مسکراتے ہوئے لیکن میرے بستر اور اٹیچی کیس کو دیکھتے ہی ان کے تیور بدل گئے۔ پوچھا یہ سب کیا ہے؟ میں نے کہا میرا ہی سامان ہے۔ شاہ صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا بس ملازم کو حکم ہوا کہ یہ سامان سامنے والے کمرے میں بند کر دو، اور ہاں، یہ ان کی شیروانی بھی اور کنجی مجھے دیدو۔" میں کچھ سمجھا نہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اختر نے کہا "تمہاری قید کی میعاد اس وقت سے شروع ہو گئی۔ باقی سزائیں بعد میں تجویز ہوں گی۔ جب شہر سے کوئی جانور یہاں آ جاتا ہے تو اس کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے۔" اب میری حیثیت ایک قیدی کی تھی۔ اختر اپنی حراست میں مجھے سون کی طرف لے چلے اور اس شان سے کہ ہم لوگوں کے جسم پر سوائے ایک لنگی کے کوئی اور کپڑا نہیں تھا۔ بنیائن اور چپل بھی ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ راستہ میں، میں اختر کو سمجھانے کی ناکام کوشش کرتا رہا کہ میں اپنی زندگی میں کبھی بھی اس طرح کھلے آسمان کے نیچے نہیں نہایا ہوں اور نہ تیرنا ہی جانتا ہوں اس لئے للہ مجھے تو اس آزمائش سے معاف رکھو۔ اختر سنتے رہے مگر جب سون کا کنارا آ گیا تو میں نے محسوس کیا کہ جیسے زمین اوپر ہے اور آسمان نیچے اور میں خود پانی کے اندر ہوں۔ جب فوراً ہی میری

گردن پانی کی سطح سے اوپر آئی تو مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ اختر کا ہنسی سے برا حال تھا۔ اور میں پھر فوراً ہی دوبارہ پانی کے اندر۔ بہرحال میں کسی طرح پانی سے باہر نکلا۔ اختر سے کہا تم تولیہ تک تو ساتھ لائے نہیں ہو، کیا اس شان سے گھر چلو گے؟ کہنے لگے "تولیہ کی کیا ضرورت ہے۔ اس ریت پر تھوڑی دیر لیٹ جائیں گے۔ پانی خود بخود خشک ہو جائے گا۔" چنانچہ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ میں تو خیر ریت پر صرف لیٹا رہا مگر اختر لیٹنے کے بعد لوٹتے بھی رہے ہم لوگ گھر کی طرف لوٹ رہے تھے تو جیسا اختر نے کہا تھا، میں نے خود بھی محسوس کیا کہ جیسے سامنے کی مختلف کھڑکیوں سے چاند ماری ہو رہی ہے اور کوئی نشانہ خطا نہیں ہوتا ذرا سوچئے تو سہی کہ ایک شہر کا رہنے والا جس نے بغیر شیروانی اور ٹوپی کے کبھی گھر سے قدم نہ نکالا ہو وہ اس طرح ننگے پیر، ننگ دھڑنگ صرف ایک بھیگی ہوئی لنگی میں لپٹا ہوا چلا جا رہا ہے اور اس پہ یہ کہ ہر طرف سے دیکھا بھی جا رہا ہے مگر کچھ کر نہیں سکتا۔ جب ہم لوگ گھر پہنچے تو اختر کو مجھ پہ شاید کچھ ترس آ گیا کہنے لگے "تمہاری حالت واقعی قابل رحم ہے۔ اچھا اب میں تمہیں تمہارے حجرے میں لئے چلتا ہوں کچھ آرام کر لو تو پھر کھانے کے بعد نہر کی سیر کو چلیں گے۔" اب جو اس حجرے میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ انتہائی ماڈرن قسم کی چیزوں سے آراستہ ایک کمرہ ہے اور مسہری کے صاف شفاف بستر پہ میرے لئے کرتا و پائجامہ تک رکھا ہوا ہے اور ضرورت کی شاید ہی کوئی ایسی چیز ہو جو وہاں موجود نہ ہو۔ میں نے غسلخانہ میں اپنے آپ کو پھر سے پوری طرح دھویا اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر باہر نکلنے والا ہی تھا کہ اختر وہیں پہنچ گئے اور اس شان سے کہ ایک بھٹا خود کھا رہے ہیں اور دوسرا میرے لئے لائے تھے۔ کہنے لگے "ابھی کھانا ملنے میں کچھ دیر معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے آؤ فی الحال بھٹوں ہی کا ایک دور ہو جائے۔" اور ہم لوگ پھر اسی شیشم کے درخت کے نیچے پہنچ گئے۔ سامنے ان کا ہمراز اسمٰعیل جس کو وہ "اُتھیلو" کہہ کر پکارتے تھے اپنے بڑے بڑے دانت نکالے ہنس رہا تھا۔ اس سے کہا "ابے دیکھتا نہیں کہ شہر سے ایک جانور آیا ہوا ہے۔ یہ بھٹا اس طرح تھوڑی کھائے گا۔ جا ایک پلیٹ میں رکھ کر کچھ گرم گرم بھٹے لا اور ہاں نمک، سیاہ مرچ اور لیموں نہ بھولنا" چنانچہ اس کی بھی فوراً تعمیل ہو گئی اور جب تک باقاعدہ کھانے کا اعلان نہ ہوا ہم لوگ پورے انہماک کے ساتھ بھٹے کھاتے رہے۔ لیجئے، کھانے کا اعلان بھی ہو گیا۔ فرش پر ایک بڑا سا دستر خوان بچھایا گیا اور گھر کے بزرگ، بچے اور رکچھ اور اعزا سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ ہم لوگوں کی بھی طلبی ہوئی۔ شاہ توحید صاحب قبلہ نے ہم دونوں کو اپنے پاس بٹھایا اور مجھ پہ بالخصوص اصرار کرتے رہے کہ یہ بھی لو اور وہ بھی لو اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ "بھائی، بس یہی دال دلیا ہے، اپنا گھر سمجھ کر کھانا، تکلف بالکل نہ کرنا۔" میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ محض دال دلیا ہے تو خدا جانے باقاعدہ دعوت میں بیچارے مہمانوں پہ کیا گزرتی ہوگی۔ اختر کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے ہم سنوں کے علاوہ اپنے بزرگوں سے بھی اسی طرح بے تکلف ہو جاتے تھے اور اپنے دلچسپ لطیفوں سے کسی کو بھی سنجیدہ نہیں رہنے دیتے تھے اس وقت ان کا واحد نشانہ میں ہی تھا۔ کہنے لگے "گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی شہری کی شامت آتی ہے تو وہ دیہات کا رخ کرتا ہے۔ اب شرف ہی کو دیکھئے۔ یہ آج صبح سوٹ میں نہاتے وقت بھی شیروانی اتارنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور اب یہ حال ہے کہ کھانا کھاتے وقت بھی ان کی شیروانی اتروالی گئی ہے۔" کھانے کے بعد اختر پھر مجھے اسی شیشم کے درخت کے نیچے لے گئے اور ہم دونوں آرام کرسیوں پہ لیٹ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ایسی باتیں جو اسی عمر میں کی جا سکتی ہیں۔ بس انہی باتوں میں شام ہو گئی۔ اتھیلو چائے کر آ گیا اور اس کے ساتھ اور بھی بہت سے لوازمات چنانچہ وہ بھی ہم لوگ دیکھتے ہی دیکھتے صاف کر گئے۔ اختر کے لئے تو خیر کوئی بات نہیں تھی مگر میں حیران تھا کہ خود مجھے کیا ہو گیا ہے کہ مسلسل کچھ نہ کچھ کھائے جا رہا ہوں۔ مگر بھوک ہے کہ ختم ہونے سے پہلے پھر شروع ہو جاتی ہے۔ اختر کو کچھ یاد آ گیا۔ کہنے لگے "ارے میں نے تم کو کشتی کی سیر تو کرائی ہی نہیں۔" بس یہ کہا اور مجھے کھینچتے ہوئے پھر سوت کی طرف لے چلے۔ وہاں کشتی موجود تھی۔ یہ میرے لئے دوسری آزمائش تھی وہ تو کشتی چلاتے رہے اور میں دعائیں پڑھتا رہا۔ اللہ اللہ کر کے بخیریت واپسی ہوئی۔ اختر نے اسی وقت مجھے بتا دیا تھا کہ رات کے کھانے کے بعد نہر پہ سیر کے لئے بھی جانا ہے۔

شام کے وقت "پام ولا" میں کافی چہل پہل تھی۔ شاہ توحید صاحب کے بڑے بھائی شاہ مجید صاحب آ گئے تھے اور دوسرے اعزا بھی۔ رات کا کھانا

بہت زیادہ پر تکلف تھا۔ ہم سب نے کھانا ساتھ ہی کھایا اور دیر تک بڑی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں جب یہ محفل برخواست ہوئی تو شاہ توحید صاحب یہ کہتے ہوئے کہ "اب تم لوگ بھی آرام کرو"۔ تشریف لے گئے۔ اختر تو اسی کے منتظر تھے، بس کھڑے ہوئے "چلو جلدی کرو۔ دیکھو کس غضب کی چاندنی ہے یہی تو وقت ہے نہر کی سیر کا۔" پام ولا سے نہر تک ایک پرائیوٹ سڑک بنوا دی گئی ہے۔ ہم دونوں اسی پر چل کر کنارے تک پہنچے نہر کے دونوں طرف شیشم کے اونچے اونچے درختوں کی قطاریں اور ان کے اندر سے چاند کا پورا عکس پانی کی سطح پر کچھ اس طرح پڑ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چاند اوپر نہیں بلکہ پانی کے اندر ہے اور ہم لوگوں کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ نہر کے دونوں طرف دور دور تک سوائے ہم دونوں کے اور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ آدھی رات کے سناٹے میں اس دلفریب منظر سے میں بہت زیادہ متاثر تھا اور خاموش چل رہا تھا مگر اختر حسب معمول اپنے پورے موڈ میں تھے۔ کہنے لگے "میں جانتا ہوں تم اس وقت کیا سوچ رہے ہو۔ یہی نا کہ جنت میں جن چیزوں کا وعدہ کیا گیا ہے ان میں اکثر یہاں موجود ہیں۔ مثلاً نہر، پھلوں کے درخت اور حسین وقت جس چیز کو دل چاہے وہ خود بخود سامنے آ جائے وغیرہ وغیرہ۔" میں نے کہا "مگر جنت میں کچھ اور چیزیں بھی تو ہوتی ہیں۔" اختر نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور ہم لوگ آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ مگر فوراً ہی اختر نے ایک اور سوال کر دیا۔ "کیا تم نے کبھی کوئی شعر بھی کہا ہے؟" میں اس کے جواب کے لئے تیار نہیں تھا پھر بھی کہنا ہی پڑا کہ "میں شاعر ہوں تو نہیں لیکن چونکہ شعر و شاعری کے ماحول میں پلا ہوں اس لئے چند اشعار کہے ضرور ہیں۔ لو سنو ایک شعر ؎

میں کہاں سے لاؤں وہ ضبط دل جو پندار کو بھی آ سکے

مرے آنسوؤں کو جو دھو سکے جو کسی کا راز چھپا سکے

لاحول ولا قوۃ! یہ تھا اختر کا ردعمل۔ مجھے کچھ غصہ بھی آیا۔ کہا "تم کتنے بدمذاق ہو۔ کچھ سمجھے بھی؟" اختر نے کہا "اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟ بھائی فرض کرو تمہیں کوئی تکلیف ہے اور تم کسی کو بتانا نہیں چاہتے تو پھر یہ کیا ضرور ہے کہ تمہارا یہ انداز کسی اور کو بھی (جو خدا جانے کون ہے) ضرور پسند ہی آئے۔ اب رہا آنسوؤں کے دھونے اور راز کے چھپانے کا سوال۔ تو میں پوچھتا ہوں آخر رونے دھونے کی ضرورت ہی کیا ہے اور اگر واقعی کوئی راز ہے بھی تو اس کو خواہ مخواہ چھپائے رکھنا کونسی عقلمندی ہے؟ بس جو بات ہو صاف صاف ہونی چاہئے۔ چلو ایک شعر اور سناؤ تاکہ تمہارے مرض کی صحیح تشخیص ہو سکے۔" میں نے کہا لو اسی غزل کا دوسرا شعر ؎

مرے نالے ایسے ہوں کیف زا جسے سن کے دنیا تڑپ اٹھے

مری آہ کو وہ اثر ملے کہ جو عرش کو بھی ہلا سکے

اختر نے پھر منہ بنایا اور کہا "اس میں بھی وہی آہ و نالے کا چکر ہے۔ بھائی، تمہارے نالوں کا جب میں بھی کوئی نوٹس لینے کے لئے تیار نہیں ہوں تو بھلا دنیا کو کیا پڑی ہے جو سن کر تڑپنے لگے گی۔ اور یہی حشر تمہاری آہوں کا بھی ہونا ہے۔ خدا کے لئے یہ عرش کو ہلانے کا خیال چھوڑ دو۔ کل ذرا شیشم کے درخت کے سائے میں بیٹھ کر ایک لمبی سی آہ کر کے تو دیکھو کہ اس کے پتے بھی ہلتے ہیں یا نہیں۔ مجھے تمہاری صحت کی طرف سے اب بہت فکر ہو گئی ہے اس لئے فی الحال تمہارا ارول میں رہنا بہت ضروری ہے۔" بس اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے ہم لوگ گھر واپس آ گئے۔ یہاں ہم دونوں کے بستر ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے مگر سویا کون کم بخت! صبح سویرے جب شاہ توحید صاحب قبلہ نے پوچھا کہ رات کو نیند آئی تھی تو مجھ سے پہلے اختر نے انہیں یقین دلا دیا کہ ہم لوگ ساری رات بالکل بے خبر سوتے رہے۔ بڑی اچھی نیند آئی۔

یہ تو تھی صرف ایک دن اور ایک رات کی سرگزشت۔ اس طرح دو ہفتوں کے قیام میں کیا کیا گذری اور کیسے کیسے انکشافات ہوئے یہ اپنی جگہ خود ایک طویل داستان ہے۔ مگر یہاں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اختر کو اختر بنانے میں ارول اور وہاں کی ایک ایک چیز کو بہت زیادہ دخل ہے۔ وہاں کے دن،

وہاں کی راتیں، وہاں کا دریائے سون، وہاں کی نہر اور پھر "پام ولا" کی اپنی ایک مخصوص دنیا۔ بس ان سب نے مل کر اختر کو دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا بنا دیا۔ اور ہاں "پام ولا" کے احاطہ میں شیشم کے اس تاریخی درخت نے بھی، جس سے نہ جانے کتنی یادیں وابستہ ہیں، اختر کے زندہ رہنے میں بڑی مدد کی ہے۔ میں نے اختر کے سلسلہ میں ارول کا پس منظر قدرے تفصیل سے اس لئے پیش کیا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں کے انتہائی دلکش اور رومانی ماحول نے اختر کو ایک نئی زندگی دیدی تھی اور اس میں پھر (بقول اختر ہی کے) شعر و ادب کے کچھ ایسے خطرناک جراثیم سرایت کرنے لگے جن کے سامنے ٹی۔ بی کے جراثیم نے بھی ہار مان لی۔ اب اختر دیکھنے میں ہر طرح ایک صحیح و تندرست، خوش رو اور زندہ دل نوجوان تھا۔ اس وقت تک اختر کو شعر و شاعری یا مضمون نگاری سے مطلق دلچسپی نہیں تھی، اور ہوتی بھی تو کیسے؟ بیچارہ سائنس کا طالب علم اور پھر کئی سال تک میڈیکل کالج میں سر کھپانا پڑا۔ اسی زمانے میں صحت بھی خراب ہو گئی۔ آبائی وطن اور بین جہاں کی فضا میں شعریت تو تھی مگر وہاں کے "باشندوں" کی اپنی بھاشا شعر و شاعری کے لئے بالکل ہی موزوں نہیں تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ اختر نے میڈیکل کالج چھوڑ کر پٹنہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ جہاں بی اے میں اس کا خصوصی مضمون انگریزی ادب تھا۔ میں بھی اب مستقل طور پر پٹنہ ہی میں تھا اور بہار اسمبلی میں نوکر ہو گیا تھا۔ ہم دونوں تقریباً روز ہی ملتے تھے اور ایک دوسرے کے احساسات سے اچھی طرح واقف تھے۔ مجھے اب یقین ہو چکا تھا کہ ارول کے قیام میں اختر کو اگر ایک مرض سے بظاہر نجات ہو گئی ہے تو وہ غریب ایک دوسرے مرض کا شکار ہو گیا ہے اور یہ مرض ایسا ہے جو ایک کو نہیں بلکہ بیک وقت دو کو ہوتا ہے، اور پھر دونوں ہی کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

اب کہانی کچھ اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ ارول کے مشہور و معروف زمیندار شاہ محمد توحید صاحب کی (جو اختر کے قریبی عزیز بھی تھے) ایک لڑکی تھی جس کا نام تھا شکیلہ۔ اس لڑکی نے آنکھ کھولی دیہات میں اور پورا بچپن بھی وہیں گزرا۔ گھر کی چار دیواری سے باہر جانے کی نہ اجازت تھی نہ ضرورت۔ قرآن شریف اور اردو پڑھانے کے لئے گھر میں مولوی صاحب موجود تھے اور انہی سے تختی پہ اصلاح بھی لے لی۔ چلو تعلیم ختم ہو گئی۔ اس بین لڑکیوں کے لئے پرائمری اسکول تک نہ تھا اور ہوتا بھی تو کیا؟ ایک زمیندار کی لڑکی گاؤں کی معمولی لڑکیوں کے ساتھ کیسے پڑھ سکتی تھی! شکیلہ کے والد اختر کو بہت چاہتے تھے مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے کبھی یہ سوچا بھی ہو گا یا نہیں کہ اختر اور شکیلہ کا جوڑ کیسا رہے گا۔ میرے بڑے بھائی اور شاہ توحید صاحب بڑے عزیز دوست تھے اور اپنے نجی معاملات میں بھی آپس میں مشورہ ضرور کرتے تھے۔ ایک دن شاہ صاحب ارول سے بھائی جان کے پاس جہان آباد آئے اور کہنے لگے "اختر کو تو آپ نے کافی دیکھا ہے۔ ماشاء اللہ بہت ہی ہونہار لڑکا ہے اور جب سے ارول میں آکر رہا اس کو پھر کبھی خون نہیں آیا اور اب تو خدا کے فضل سے ہر طرح پہ تندرست معلوم ہوتا ہے۔" پھر پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے، یہ رشتہ شکیلہ کے لئے کیسا رہے گا؟" بھائی جان نے کہا "لڑکا تو واقعی بہتر ہے، مگر شاہ صاحب، یہ موذی مرض کبھی جاتا تو ہے نہیں۔ کس وقت کیا ہو جائے آپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ لڑکی کی ساری زندگی کا سوال ہے۔ ایسا خطرہ کیسے مول لیا جا سکتا ہے۔ میں تو کبھی رائے نہیں دوں گا۔" شاہ صاحب نے سنا اور بس یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ "جی ہاں، آپ بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔" مجھے کسی طرح صورت حال کی بھنک مل گئی اور میں چاہتا تھا کہ قبل اس کے کہ اس فیصلہ کا اعلان کر دیا جائے اور اختر ایک بار پھر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو جائے کسی طرح اس فیصلہ پہ نظر ثانی کی صورت نکل آئے۔ مگر میں جانتا تھا کہ جب تک بھائی جان خود اپنی رائے واپس نہیں لیں گے شاہ صاحب کوئی فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔ مگر سوال یہ تھا کہ بھائی جان سے کہے کون؟ ان کا مجھ پہ اتنا رعب تھا کہ میں اس قسم کے مسئلہ پر ان کے سامنے زبان بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے ہمت کی اور دوسرے ہی دن ان سے پوچھ بھی لیا کہ "سنا ہے اختر کا رشتہ شکیلہ کے ساتھ طے پا رہا ہے۔ واقعی یہ بہت مناسب رشتہ رہے گا۔" بھائی جان کچھ دیر خاموش رہے، پھر اپنی مخصوص متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بولے "ہاں، تھا تو بہت مناسب مگر اب یہ ممکن نہیں ہے۔ شکیلہ کی زندگی کو بھی تو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہئے۔" کس قدر

مشکل تھا۔ اس کے بعد کچھ بھی کہتا۔ تاہم میں نے ہمت نہیں ہاری۔ اور صرف اتنا کہتا ہوا وہاں سے چلا آیا کہ "ابھی تو صرف اختر کی زندگی خطرے میں نظر آتی ہے لیکن اگر یہ رشتہ نہ ہو سکا تو پھر سب کو اختر اور شکیلہ دونوں ہی کی زندگیوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔" بھائی جان کچھ بولے تو نہیں لیکن چند روز بعد شاہ توحید صاحب سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے ان سے کہدیا کہ "میں نے اس معاملے پر پھر سے غور کیا ہے اور سمجھتا ہوں کہ اللہ کا نام لے کر آپ اسے منظور کر لیں"۔ شاہ صاحب تو یہ چاہ ہی رہے تھے کہ کسی طرح سے بھی اس کی تائید ہو جائے۔ چنانچہ رشتہ کی منظوری دے دی گئی اور جلد ہی نکاح کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ نکاح چونکہ پٹنہ سے دور ایک جگہ ہوا تھا اس لئے اختر کے شدید اصرار کے باوجود میں اس میں شریک نہ ہو سکا۔ نکاح کے چند منٹ کے بعد اختر نے مجھے ایک پوسٹ کارڈ روانہ کیا جو شاید اب بھی میرے پرانے کاغذات میں کہیں پڑا ہوا ہے۔ میں اس دن کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ جونہی اختر کو معلوم ہوا کہ اس ڈرامے میں میں نے اپنا کردار کس طرح ادا کیا تو وہ میرے پاس آہستہ آہستہ اس طرح آیا کہ مجھے بالکل خبر نہ ہوا اور آتے ہی میری پیٹھ پر ایک زبردست گھونسا رسید کیا۔ میں گھبرا کر اٹھا اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے اور دیر تک لپٹے رہے۔ جب الگ ہوئے تو دونوں ہی کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ اس کے بعد ہم دونوں کی دوستی کچھ اور زیادہ مستحکم ہو گئی۔ اہل ذوق جانتے ہیں کہ نکاح اور شادی کے درمیان کی مدت بڑی رومانٹک ہوتی ہے۔ چنانچہ اختر کی شاعری اور افسانہ نگاری کی ابتدا سچ پوچھئے تو اسی زمانہ سے ہوئی جراثیم تو پہلے سے موجود تھے۔ بس ذرا چھیڑنے کی دیر تھی۔

میڈیکل کالج چھوڑنے کے بعد اختر نے پٹنہ کالج میں بی اے (آنرز) میں داخلہ لیا تھا اور مضمون تھا انگریزی ادب۔ قدرت سے چونکہ بے پناہ ذہانت عطا ہوئی تھی اس لئے سائنس اور ڈاکٹری کے اس طالب علم نے انگریزی ادب میں بھی بہت جلد نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ اختر کو مختصر افسانوں اور ڈراموں سے زیادہ دلچسپی تھی اور یہ چیزیں ان کو انگریزی زبان میں کافی مل سکیں۔ اس وقت تک اردو میں اعلیٰ معیار کے افسانے یا کہانیاں (SHORT STORIES) لکھنے والے بہت کم تھے اس لئے اختر کو اس صنف ادب میں جو کچھ ملا وہ انگریزی ہی سے ملا۔ لیکن اپنے اس تجربے کی بنا پر اور خود اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت بعد میں خود اختر نے افسانہ نگاری کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، یہ آج دنیائے ادب کے سامنے موجود ہے۔ اختر اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے بہت اچھے مقرر بھی تھے اور ساتھ ہی ان میں ایک خاص بات یہ تھی کہ جب بھی ان کے سامنے کوئی ایسا واقعہ ہوا جس سے وہ متاثر ہوئے ہوں یا انہوں نے انگریزی میں بھی کوئی افسانہ یا ڈرامہ پڑھا جو ان کو پسند آیا تو وہ اس کو اس طرح بیان کرتے تھے جیسے یہ سب انہی پہ گزرا ہے اور سننے والا بھی یہی محسوس کرتا تھا جیسے وہ خود بھی وہاں موجود تھا۔

اختر کی افسانہ نگاری کی ابتدا بھی بڑی دلچسپ ہے۔ میں ایک دن پٹنہ کالج کے ہوسٹل میں اختر کے پاس بیٹھا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں کہیں میں نے تذکرہ کیا کہ میرے ایک عزیز ہیں جن کو اللہ نے ساری آسائشیں دی تھیں مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ بہت افسردہ رہتے تھے۔ لوگوں نے دوسری شادی کا مشورہ دیا مگر ان کو اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی اس لئے وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ بالآخر ان کی بیگم کو کسی نے اجمیر شریف جا کر دعا کرنے کا مشورہ دیا چنانچہ وہ اپنی والدہ کے ساتھ وہاں گئیں۔ ان دنوں میری چھٹیاں تھیں اس لئے مجھے بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اتفاق سے کچھ ہی دنوں کے بعد اللہ نے ان کو اولاد دی۔ واقعہ تو بہت معمولی سا تھا مگر اس میں جو چند کردار سامنے آتے تھے ان کی آپس میں گفتگو اور پھر بچہ نہ ہونے کے وقت تک گھر کی اداسی اور پھر بچہ ہونے کے بعد وہاں کی چہل پہل، یہ سب چیزیں بہت ہی دلچسپ تھیں۔ اختر بہت غور سے سنتے رہے اور پھر بے ساختہ بولے کہ یہ اردو میں ایک "ایکٹ" (ACT) کا بہترین ڈرامہ ہو سکتا ہے۔ تو بس فوراً "تم کچھ لکھو"! میں نے کہا، میں نے آج تک نہ کوئی ڈرامہ

لکھا ہے اور نہ ڈراموں سے کوئی خاص دلچسپی ہے۔ تم تو انگریزی کے نہ جانے کتنے ڈرامے پڑھ چکے ہو تم ہی کیوں نہیں لکھتے"؟ اختر نے کہا "میں نے پڑھا تو ضرور ہے لیکن اردو میں کچھ لکھا کبھی نہیں، اور پھر اس میں جن افراد کو پیش کیا جائے گا۔ ان کو تم نے اچھی طرح دیکھا ہے اور ان کی گفتگو بھی تم نے سنی ہے۔ اس لئے تم ہی کو لکھنا ہوگا"۔ یہ بات یہیں پر ختم ہو جا سکتی تھی، لیکن اس درمیان میں اختر نے اپنے ذہن میں پلاٹ تیار کر لیا تھا۔ وہ ایک بڑا سا کاغذ لے آئے اور کسی انجینئر کی طرح اس پہ ایک اسکیچ (SKETCH) بنانا شروع کر دیا کہ یہ یہاں پر ایک کمرہ ہے، اس میں اس قسم کا فرنیچر ہے۔ بیگم صاحبہ ایک کرسی پہ خاموش بیٹھی پان کھا رہی ہیں۔ ان کی والدہ سامنے نماز پڑھ رہی ہیں، اور بڑی حاجرہ سے کچھ دعائیں مانگ رہی ہیں، میاں باہر سے آتے ہیں اور گھر کے اس سناٹے کو دیکھ کر خود بھی افسردہ سے ہو جاتے ہیں، پھر یہاں سے اجمیر شریف کی روانگی، وہاں کا قیام۔ کچھ دنوں کے بعد اس گھر میں ایک بچہ کا اضافہ اور اس کے بعد اسی گھر کی چہل پہل، وغیرہ وغیرہ۔ یہ "اسکیچ" بنا کر مجھے دیا اور کہا کہ "بس اب تم اس میں ضروری "فلنگ" کر دو۔ پھر دیکھیں گے کہ اس ڈرامہ کی شکل ہوتی کیا ہے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور وہ واقعی ایک چھوٹا سا دلچسپ ڈرامہ ہو گیا۔ اختر ہی نے اس کا عنوان رکھا "دیکھا بھی دیکھا یہ بھی دیکھا"۔ یہ ڈرامہ شائع بھی ہوا اور کافی پسند بھی کیا گیا یہاں تک کہ جب اختر شیرانی نے مختصر ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع کیا تو اس ڈرامہ کو صرف شامل ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے یہی عنوان اس مجموعہ کے نام کے لئے بھی پسند کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ڈرامہ ان تک پہنچا کیسے۔ ممکن ہے انہوں نے لاہور کے اس رسالہ سے لے لیا ہو جس میں یہ شائع ہوا تھا۔ اختر شیرانی سے میری ذاتی ملاقات نہیں تھی۔ بس وہ مجھے میرے اختر ہی کی وجہ سے جانتے تھے۔ یہ ان کا مجموعہ ۱۹ء میں پہلی بار کتاب منزل لاہور نے شائع کیا۔ مجھے کئی سال بعد کراچی میں کسی نے اس کی خبر کی۔ میں ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اختر شیرانی سے پوچھوں کہ بھائی کم سے کم مجھے اس کی خبر تو کر دی ہوتی مگر اس سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ ایک دن اتفاق سے صدر کے فٹ پاتھ کی ایک دکان میں پرانی کتابوں اور رسالوں کے انبار میں اس کی ایک جلد بہت برے حال میں پڑی ہوئی دیکھی۔ میں نے اسے دو روپے میں خرید لیا۔ اور یہ اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کے بعد میں نے کبھی ڈرامہ لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ میرا یہ واحد ایک ایکٹ" (ACT) کا ڈرامہ بھی تو دراصل اختر ہی کا ممنون منت ہے۔ میں نے تو انہیں صرف ایک واقعہ سنایا تھا۔ انہوں نے اس کا ایک ڈھانچہ تیار کیا اور میں نے پھر اس میں ہر "سیچویشن" کے لحاظ سے محض مکالموں کی "فلنگ" کر دی۔

اختر کے لکھنے کا انداز اوروں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ جو کچھ دیکھتے تھے وہی لکھتے تھے۔ اگر وہ کسی واقعے سے متاثر ہوئے تو اس کی تفصیلات کو وہ اپنے اوپر اس طرح طاری کر لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ان کی ذاتی کہانی ہے اور اس کہانی میں ہر موقع پر مختلف کردار بھی یہ خود ہی ہیں۔ میں نے تو اکثر یہ بھی دیکھا کہ اگر وہ کسی واقعہ سے متاثر ہو کر اس کو افسانے کی شکل دینا چاہتے تو وہ اس کو لکھنے سے پہلے شروع سے آخر تک زبانی بیان کر دیتے اور اس میں جس جس کیریکٹر کو جو کچھ کہنا ہوتا تھا اسے اسی کی زبان اور اسی کے انداز میں خود ہی ادا کر دیتے تھے۔ یہ اختر ہی کا حصہ تھا کہ وہ ہر کیریکٹر کو اس کے مخصوص انداز میں کچھ اس طرح پیش کرتے تھے کہ پڑھنے والے کے سامنے اس کی اصلی تصویر خود بخود آ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اختر کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کا افسانہ جس ماحول کی عکاسی کرتا تھا اس کی ایک ایک چیز کو وہ اس کی اصلی صورت میں پیش کرتے تھے یہاں تک کہ اس کے ہر کردار کی گفتگو اس کی مقامی زبان میں ہوتی اور اس کا انداز بیان بھی وہی ہوتا جس طبقہ سے اس کا تعلق ہے۔ اختر کو جہاں اپنی ذہانت اور وسیع مطالعہ کی بدولت اردو زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ وہاں بنیادی طور پر ایک دیہاتی ہونے کی وجہ سے وہ دیہات کی زبان میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس الفاظ کی جو فراوانی تھی وہ کم سے کم مجھ جیسے عظیم آبادی کو تو کبھی نصیب نہ ہو سکی۔ اختر نے اپنے افسانوں میں دیہات کی زبان اور وہاں کی مخصوص اصطلاحیں جس خوبصورتی سے استعمال کی ہیں اس کی مثال ان کے کسی اور ہمعصر کے یہاں

نہیں پائی جاتی۔ اختر کے ہاں ایسے بے شمار الفاظ ملیں گے جو عام طور پر صرف بہار اور وہاں بھی خصوصاً دیہاتوں میں بولے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان الفاظ میں ایک خاص لطافت بھی ہے اس لئے یہ بہت مقبول ہو گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان الفاظ سے اردو ادب کے قیمتی سرمائے میں کچھ اور اضافہ ہو سکا ہے تو اس کا سہرا یقینی اختر کے سر ہے۔

۱۹۳۲ء میرے اور اختر کی زندگی کا بہت ہی یادگار زمانہ رہا ہے۔ وہ ارول کی آب و ہوا میں پوری طرح تندرست ہو جانے کے بعد اپنے رنگین خوابوں کی تعبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ پٹنہ کالج کے ہوسٹل میں ان کے پاس کام کم تھا اور وقت بہت زیادہ جس کا بیشتر حصہ رومانٹک چیزیں پڑھنے اور ان سے متاثر ہو کر رومانٹک خط لکھنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ میں بھی اسی سال اگست میں اسمبلی میں ملازم ہو کر دفتر کے ساتھ رانچی گیا ہوا تھا اور وہاں وہی کر رہا تھا جو اختر پٹنہ میں کر رہے تھے۔ اسی زمانہ میں نیاز فتحپوری کا ناول "شہاب کی سرگذشت" کا بڑا ہنگامہ تھا۔ ادھر اختر نے اسے پڑھا اور ادھر میں نے اور پھر ہم دونوں نے اپنے لئے ایک مصیبت مول لے لی۔ جس سے محبت ہو اس سے شادی کرنی چاہئے یا نہیں۔ یہ تھا موضوع بحث۔ اختر کو شکیلہ سے محبت تھی اور اب ان کی شادی ہونے والی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کو تو اس خیال کی تائید کرنی ہی تھی کہ جس سے محبت ہو اسی سے شادی بھی ہونی چاہئے۔ لیکن میں ایک ایسے دور میں تھا جب ہر اچھی چیز سے خود بخود محبت ہو جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اچھی چیز بھی محبت کا جواب محبت ہی سے دے رہی ہے اس لئے میرے لئے لطیف نقطۂ نظر یہ تھا کہ جس سے محبت ہو اس سے شادی نہیں ہونی چاہئے۔ چونکہ ہم دونوں کی طبیعتوں میں بہت سی چیزیں (یا بقول اختر کے بہت سی "حرکتیں") مشترک تھیں اس لئے اختر کی دلی خواہش تھی کہ کچھ ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ شادیاں بھی ہم دونوں کی ساتھ ہی ساتھ ہو جا سکیں مگر میں نے ان کو سمجھایا کہ اس قسم کی "حرکت" کے لئے بڑی طویل "پلاننگ" (PLANNING) کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً فریق ثانی کی تلاش پھر اس سے کبھی مراسم بڑھانا، کبھی گھٹانا اور کبھی بالکل ختم کر کے دوبارہ شروع کرنا، وقتاً فوقتاً اپنے اوپر فراق طاری کرنا اور کبھی ادھر بھی فراق کا دیا ساج کا مقابلہ کرنا، کبھی کبھی بیمار پڑنا، کبھی بڑے سلیقہ سے اپنی خودکشی کو ناکام بنا دینا۔ ظاہر ہے کہ اس پروگرام کے لئے کافی وقت چاہئے تھا۔ یہ بات اختر کی سمجھ میں آگئی اور انہوں نے وقتی طور پر تو مجھے معاف کر دیا مگر بعد میں اپنی مہم پھر شروع کر دی اور آخر میں مجھے بھی وہی کرنا پڑا جو وہ چاہتے تھے۔ ہاں، تو وہ "شہاب کی سرگذشت" پہ طبع آزمائی کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ عرصہ تک جاری رہا۔ شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرا ہو جو اختر کا آٹھ دس ورق کا خط میرے نام نہ آیا ہو اور اس کے جواب میں میں نے بھی دس بارہ ورق سیاہ نہ کئے ہوں۔ ادھر اختر کے سارے خطوں کو میں حفاظت سے رکھتا جا رہا تھا اور ادھر اختر بھی میرے خطوں کو جمع کرتے رہے۔ ہم دونوں کے خطوط جن کی تعداد نہ جانے کتنی ہے اب شکیلہ کے پاس محفوظ ہیں۔

۱۹۳۳ء میں اختر اور شکیلہ کی شادی ہوئی اور جس شان سے ہوئی وہ بھی سن لیجئے۔ پٹنہ سے جہان آباد کے لئے بارات کو صبح کی ٹرین سے روانہ ہونا تھا جس میں جہاں تک مجھے یاد ہے اختر کے علاوہ بس صرف ان کے والد اور دونوں بہنوئی تھے۔ دوستوں میں صرف میں تھا۔ اختر کا ایک مخصوص لباس تھا جو وہ اپنے اسکول کے زمانے سے میڈیکل کالج تک پہنتے آئے تھے یعنی ایک چوڑی مہری کا پائجامہ، اس پہ ایک معمولی سی قمیص اور اس پہ ان کا واحد کوٹ جس کی جیبوں میں ہمیشہ بہت سے کاغذ بھرے رہتے تھے۔ اس وقت بھی نوشہ میاں اپنے اسی یونیفارم میں ملبوس تھے۔ جہان آباد اسٹیشن پہ بارات کے استقبال کے لئے لوگ موجود تھے اور کئی موٹریں بھی تیار تھیں۔ ایک گاڑی میں پوری بارات بیٹھ گئی اور دوسری میں صرف اختر اور میں۔ راستہ میں، میں نے اختر سے کہا کہ مجھے یقین ہے یہ بارات واپس کر دی جائے گی اس لئے کہ تم نے آج بھی جو اپنا حلیہ بنا رکھا ہے اسے کوئی بھی برداشت نہیں کرے گا۔ اختر پہ اس کا کیا خاک اثر ہوتا۔ ایک قہقہہ لگایا اور کہا "پھر تو مزا آجائے گا جب خیر سے بدھو گھر کو واپس آجائینگے"

ارول کے سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ شاہ توحید صاحب کی بیٹی شکیلہ بی بی کی بارات آرہی ہے اس لئے جب ہم لوگوں کی گاڑیاں جیسے ہی

ارول کی سرحد میں داخل ہوئیں لوگوں نے دیکھنا شروع کیا۔ "یام ولا" سے متصل یونین بورڈ کے بنگلہ میں بارات کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں تو ہم لوگوں کے لئے استقبال کے لئے سب ہی موجود تھے۔ یہاں تک کہ مستقبل میں اخترؔ کے افسانوں کے چند مخصوص کردار بھی، مثلاً اسمٰعیل (اوتھیلو) غفوروا، شمشیروا، شیخ جھپرو وغیرہ۔ ارول والوں کے معیار میزبانی کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ ہم لوگوں کی عافیت کا ہر ممکن انتظام کیا گیا تھا۔ ادھر اور لوگ تو ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھنے میں مصروف تھے اور ادھر اخترؔ نے اشارے سے مجھے ایک کمرے میں بلایا۔ پہلے اپنا کوٹ، قمیص اور بنیائن تک اتار دی۔ اور پھر میری شیروانی، قمیص اور بنیائن کو اپنی تحویل میں لے لیا اور ایک لنگی اپنے کندھے پر اور دوسری میرے کندھے پر ڈال کر حکم دیا کہ بس اب فوراً سون کی طرف چلو۔ ارول کے چند اور نوجوان اعزا بھی ساتھ ہو گئے جن میں شکیلہ کے بہنوئی غلام واضح صاحب اڈوکیٹ (مرحوم) بھی کافی پیش پیش تھے۔ یہ قافلہ جب سون میں نہانے کے لئے ننگے پیر "یام ولا" کی طرف سے گزرا تو وہاں کی مختلف کھڑکیوں میں ایک خلفشار سا ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں خود ایک کھڑکی کے قریب سے سر جھکائے گزر رہا تھا تو ایک آواز آئی۔ "ہائے بے چارے شرف صاحب!" ہم سب لوگ سون میں غوطے لگاتے رہے۔ کسی ستم ظریف نے اس حال میں ہم لوگوں کی ایک تصویر بھی لے لی۔ اس کی ایک کاپی اور اس گروپ کی بھی جو اخترؔ کی شادی میں لیا گیا تھا۔ مجھ سے ساغرنو کا اختر اور ریوی نمبر نکالنے والوں نے مانگا تھا۔ اور وہ میں نے پٹنہ بھیج دیا تھا۔ سون میں نہانے کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ واپس آئے تھے کہ "یام ولا" سے کھانے کی طلبی ہوئی۔ وہاں کچھ اور اعزہ بھی جمع تھے۔ پر تکلف کھانا ہوا۔ کچھ دیر کے لئے ہم لوگوں کو پھر آرام کرنے کے لئے واپس کر دیا گیا۔ شام ہی سے "یام ولا" میں مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ مجھے پوری طرح یاد نہیں کہ رات کے وقت اخترؔ نے کون سے کپڑے پہنے تھے مگر یہ ضرور تھا کہ اس وقت بھی اگر لوگ پہلے ہی سے ان سے اچھی طرح واقف نہ ہوتے تو کوئی بھی ان کو نوشہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ رات کی دعوت تو بہت ہی پر تکلف تھی ارول میں اس وقت تک بجلی نہیں آئی تھی مگر پھر بھی "یام ولا" ہر طرف جگمگا رہا تھا۔ کھانے کے بعد اب کوئی خاص پروگرام سوائے اس کے نہ تھا کہ دولہا کو اندر بلائے جائیں اور عورتیں ان سے سارے رسوم یکے بعد دیگرے ادا کروائیں۔ شادی اتوار کو تھی اور مجھے دفتر سے چونکہ چھٹی نہیں مل سکی تھی اس لئے مجھے دوسرے ہی روز ۴ بجے صبح کو ارول چھوڑ دینا تھا تاکہ پہلی گاڑی سے پٹنہ پہنچ سکوں۔ میں نے کھانے کے بعد ہی سے اخترؔ کو کہنا شروع کیا کہ تمہیں اندر بلایا جا رہا ہے۔ تم خواہ مخواہ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ جب رات کے بارہ بج چکے تو میں نے زور سے کہا۔ "اب خدا کے لئے تم اندر جاؤ اور جا کر آرام کرو۔" اخترؔ نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا مگر اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں یکایک آبدیدہ ہو گئیں۔ جس کا ڈر تھا وہی ہوا۔ اب میں اخترؔ سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ آنسو کے یہ بیش بہا موتی ان بہت سی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے کافی تھے جو ہم دونوں کی زندگی کا بہترین سرمایہ رہی ہیں۔ ہاں، تو سارے مہمان رخصت ہو چکے۔ گھر والے بھی اب آرام کرنا چاہتے تھے۔ بس صرف شکیلہ کو معلوم تھا کہ اخترؔ مجھے چھوڑ کر کیوں نہیں آ رہے ہیں۔ "یام ولا" کی جگمگاتی روشنی میں آج وہ شمیم کا درخت کچھ اور زیادہ خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں پھر اس کے سائے میں آ بیٹھے اور اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک جہان آباد اسٹیشن جانے والی بس مجھے لینے نہ آ گئی۔ یہ تھی اخترؔ کی شادی کی پہلی رات اور یہ تھی ایک سچے دوست کی بے پناہ محبت! صبح ۴ بجے میں نے اخترؔ کو خدا حافظ کہا مگر اخترؔ مجھے صرف دیکھتا رہا اور کچھ نہ کہہ سکا۔ میری بس روانہ ہو گئی۔

۱۹۳۳ء اچھا خاصا گزر رہا تھا۔ میں دفتر سے واپسی پر تقریباً ہر روز ہی اخترؔ سے ان کے ہوسٹل میں ملتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ یکایک ارول چلے جاتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ شکیلہ یکایک پٹنہ آ جاتیں۔ دونوں ہر فکر سے آزاد اپنے اپنے خیال میں مگن تھے یہی وہ زمانہ ہے جب اخترؔ نے ارول کی نشو و نما میں اپنی پوری صلاحیتیں صرف کر دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے "یام ولا" میں شعر و ادب کی حکومت قائم ہو گئی۔ مگر ساتھ ہی اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اخترؔ کو جس نے اخترؔ بنا دیا وہ بھی تو ارول ہی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے بھی کچھ خوبصورت مقامات

دیکھے ہیں۔ مختلف جگہوں کے اچھے لوگوں سے بھی ملا ہوں اور اکثر سے متاثر بھی ہوا ہوں، لیکن مجموعی طور پر جو مقناطیسی کیفیت میں نے ارول کی ہر چیز میں پائی وہ کہیں بھی نہیں ملی۔ نہ جانے اس چھوٹے سے گاؤں میں کونسا جادو ہے کہ جو بھی ایک بار یہاں آجاتا ہے وہ پھر تمام عمر اسے کبھی نہیں بھولتا۔ مجھے پرانے کاغذات اور پرانے خطوط کو سینے سے لگائے رکھنے کا خبط ہے، ابھی جب میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں مجھے اپنے پرانے کاغذات میں ایک چھوٹا سا پرزہ ملا جس میں ۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء کو ارول میں لکھے ہوئے ارول ہی کے متعلق چند اشعار ہیں۔ اختر سے میری ملاقات فوراً ہی ہوئی تھی اور میں انہی کے اصرار پر پہلی بار ارول گیا تھا۔ شاہ توحید صاحب کے علاوہ سب ہی لوگ میرے لئے اجنبی تھے۔ جہان آباد سے ارول تک ایک سڑک تھی تو ضرور اور اس پر ایک بس بھی چلتی تھی لیکن برسات میں اور برسات کے بہت دنوں بعد تک راستہ بالکل بند رہتا تھا۔ بس سب سے قابل اعتبار ذریعۂ مواصلات بیل گاڑی تھی جو بہرحال رات بھر چلتے رہنے کے بعد منزل مقصود تک پہنچ جاتی تھی۔ اس وقت تک نہ تو وہاں بجلی تھی نہ پائپ تھا، نہ ڈاکخانہ تھا نہ کوئی ہائی اسکول۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں "بام ولا" کو "تاج محل" کی حیثیت حاصل تھی۔ بس فرق صرف اتنا ہی تھا کہ تاج محل کے احاطہ میں سرو کے درختوں کی قطاریں اس کے حسن کو اور دوبالا کردیتی تھیں اور یہاں "بام ولا" کے سامنے تاڑ کے اونچے اونچے درختوں کی ایک لمبی قطار نے اس کو بے حد رومانٹک بنا دیا تھا۔ وہاں کی ساری سیاست اور ساری ثقافت اسی کے گرد گھومتی رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ باہر سے کسی آنے والے کی اور وہ بھی جو شہر سے آرہا ہو یہاں کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ اس وقت تک نہ اختر شاعر تھے اور نہ میں (میں تو خیر اب بھی نہیں ہوں) اور نہ ارول کے کسی شخص کو شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی تھی۔ پھر بھی نہ جانے اس ماحول میں وہ کونسی کیفیت تھی جس میں چند سیدھے سادے اشعار میری زبان پہ خود بخود آگئے اور آج ۵۴ سال کے بعد بھی کاغذ کا یہ چھوٹا سا پرزہ اب تک میرے پاس اسی طرح محفوظ ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے مختصر سے قیام کے دوران جب ایک اجنبی کے یہ احساسات ہوسکتے ہیں تو پھر وہ جس نے اپنے شباب کے بہترین دن اور بہترین راتیں وہاں گذاری ہوں وہ آخر اختر نہ ہوجاتا تو اور کیا ہوتا؟ ہاں، تو وہ چند سیدھے سادے اشعار یہ تھے۔

رشکِ کشمیر ہے واللہ مقامِ ارول ورنہ میں اور کہاں شوقِ قیامِ ارول

معدنِ جود و کرم شاہ محمد توحید بس اسی نام سے ہے شوکتِ نامِ ارول

اختر "بام ولا" یوں تو منور ہے بہت کاش کچھ اور بڑھے رفعتِ بامِ ارول

گرچہ مداح ہوں میں "شامِ اودھ" کا لیکن مجھ کو کچھ کم نہیں مرغوب ہے شامِ ارول

یوں تو ہر چیز یہاں قابلِ زیارت ہے شرف
ہاں مگر ایک تماشہ ہے یہ "بامِ ارول"

۱۹۳۴ء کے جولائی میں میں اپنے دفتر کے ساتھ رانچی گیا اور اختر کے ساتھ یہ پروگرام بنا کر گیا تھا کہ اکتوبر میں واپسی پہ سیدھا ارول آؤں گا اور ایک ہفتہ وہاں رہ کر پھر اختر اور شکیلہ دونوں میرے ساتھ پٹنہ آجائیں گے۔ اب مجھے سرکاری کوارٹر مل گیا تھا جس میں میں اکیلا رہتا تھا۔ اس لئے ہنگامہ آرائی کے لئے اس سے بہتر جگہ اور کیا ہوسکتی تھی۔ نہ جانے ہم لوگوں کو کس کی نظر لگی کہ جو کچھ سوچا تھا وہ کچھ بھی نہ ہوسکا۔ میں ایک دن صبح اپنے دفتر میں کام کررہا تھا کہ یکایک شکیلہ کے چچا زاد بھائی کرنل قمر الہدیٰ، جو اس وقت میڈیکل کالج میں طالب علم تھے، میرے پاس آئے اور یہ پریشان کن خبر دی کہ اختر کو امتحان کے آخری پرچہ کے روز امتحان دیتے وقت پھر خون آگیا اور حالت بہت ہی نازک ہے۔ ان کو بے ہوشی کے عالم میں اسپتال کے سینا ٹوریم پہنچا دیا گیا اور شکیلہ باہر گاڑی میں بیٹھی ہیں۔ میں نے کام چھوڑا اور بدحواسی کے عالم میں ان لوگوں کے ساتھ ہولیا۔ اگلی

سینا ٹوریم رانچی سے پچیس تیس میل ہے وہاں پہنچا تو دیکھا اختر نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑے ہیں اور حالت اتنی نازک ہے کہ ڈاکٹر ان کو داخل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بڑی کا بڑی کوششوں اور سفارشوں کے بعد داخلہ ہوا لیکن اب سوال یہ تھا کہ اسپتال کے قواعد کے مطابق مریض کے ساتھ کوئی رہ نہیں سکتا تھا اور شکیلہ ایک منٹ کے لئے بھی وہاں سے الگ ہونے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ دن ڈھل چکا تھا، تیز بارش ہو رہی تھی اور اس میں شکیلہ اور میں اسپتال کے باہر کھلے میدان میں کھڑے دور سے اختر کو دیکھ رہے تھے۔

اختر کی کہانی کا یہ حصہ بہت ہی دردناک ہے ایک ہونہار اور بے پناہ صلاحیتوں کا نوجوان موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کی شادی صرف چند ہی ماہ پہلے تو ہوئی تھی۔ اس کی جوان بیوی جس کی ساری تمناؤں اور خوشیوں کا مرکز صرف اس کا شوہر تھا کچھ عجیب بے کسی کے عالم میں تڑپ رہی تھی۔ اس کا وہ دوست جو اس کے لئے اپنی ہر چیز قربان کرنے کو تیار تھا وہ بھی بالکل مجبور ایک سکتے کے عالم میں یہ نقشہ دیکھ رہا تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کیا کیا ہوا اور کیسے ہوا اس کی تفصیل کئی بار لکھی جا چکی ہے۔ شکیلہ نے نقوش کے شخصیات نمبر (۱۹۵۶ء) اور میں نے ساغر تو کے اختر اور رضوی نمبر (۱۹۶۵ء) میں کافی لکھا ہے۔ مہر نیمروز کا یہ خاص شمارہ جن لوگوں کے پاس جائے گا، انہوں نے ممکن ہے وہ مضامین پڑھے بھی ہوں میں نے کوشش کی اس وقت بھی اٹکی سینی ٹوریم میں اختر کے قیام کا چشم دید حال ایک بار پھر پڑھنا چاہا، لیکن یہ بھی نہ کر سکا۔ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا اور پھر میں نہ جانے کہاں کھو گیا۔ بس اس وقت صرف اتنا عرض کروں گا کہ آزمائش کے ان دنوں میں اختر کی اور بھی بہت سی خوبیاں نکھر کر سامنے آگئیں۔ یوں تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہی تھا کہ جس مریض کی زندگی کی میعاد ڈاکٹروں کے نزدیک صرف ۴۸ گھنٹے باقی تھی، اس کو انہی ۴۸ گھنٹوں کے اندر نمایاں افاقہ شروع ہو گیا مگر اس میں خود اختر کی قوت ارادی اور مشیت کے ہر فیصلہ پر سر تسلیم خم کرنے کا جذبہ بھی پوری طرح کارفرما رہا۔ مجھے یاد ہے کہ اسی زمانہ میں میرے اور اختر کے ایک دوست فصیح الدین بھی سینی ٹوریم میں لائے گئے جن کی حالت اختر سے کہیں بہتر تھی لیکن وہ جب تک رہے ان کو یہ خیال ستاتا رہا کہ اگر وہ مر گئے تو پھر ان کے بال بچوں کا کیا ہوگا، اور پھر وہ واقعی چند دنوں کے اندر ختم بھی ہو گئے۔ لیکن ادھر اختر تھے کہ ہوش آنے کے بعد ہی خود کو ایسا بنا لیا جیسے وہ محض تفریح کے لئے سینی ٹوریم میں آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے ان کے متعلقین اور تیمار داروں کے بھی حوصلے بلند رہے اور سب کو اختر کی صحت کا یقین سا ہونے لگا۔ کیا کسی نے کبھی یہ سنا ہے کہ جس مریض کو ڈاکٹروں نے بولنا تو درکنار ہلنے کو بھی منع کیا ہو وہ بستر پر لیٹا ہی لیٹا اور ڈاکٹروں اور نرسوں کی نظریں بچا کر ایک پورا ڈرامہ لکھ ڈالے۔ "یہ سینی ٹوریم کا فقیر" اسی شان سے تو لکھا گیا تھا۔ مجھے چونکہ صحت اور بیماری دونوں ہی حالت میں اختر کی تمام حرکتوں کی خبر رہی تھی اس لئے ایک روز اٹکی میں میں نے ان کو ڈانٹا بھی کہ کہاں تو ڈاکٹروں نے تمہیں اتنی احتیاط کرنے کی تاکید کی ہے اور کہاں تم کو آغا حشر بننے کا خبط سوار ہوا ہے تو جواب ملا کہ "ڈاکٹروں نے بولنے کو منع کیا ہے، لکھنے پر تھوڑی ہی پابندی ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اچھا ہونے کے بعد میں اپنے ساتھ اٹکی سینی ٹوریم کو تو نہ لے جانے سے رہا۔ میرے ڈرامہ کی ساری "سٹنگ" (SETTING) یہیں کی ہے۔ اور بیشتر کردار بھی یہیں موجود ہیں۔ یہ خون تھوکنے والے ساتھی پھر کہاں ملیں گے اور ہاں (چند نرسوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ اینگلو انڈین یہ ڈولی۔ یہ ٹی۔ بی، یہ گھٹو، یہ بھی میرے ساتھ کیسے چل سکیں گی؟ مختصر یہ کہ یہ ڈرامہ وہیں مکمل ہوا اور اختر ہی کے ڈائرکشن (DIRECTION) میں وہیں اسٹیج بھی ہوا۔ دو اور ڈرامے "مریض" اور "کلیاں اور کانٹے" بھی ہسپتال ہی میں لکھے گئے۔ مجھے اس وقت بے ساختہ اٹکی کا وہ دن یاد آرہا ہے جب اختر کو دیکھنے گیا اور ان کو بے حد افسردہ پایا۔ میں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے اپنے تکیہ کے نیچے سے نکال کر ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا جس پر یہ چند اشعار لکھے ہوئے تھے:۔

یہ بیماریاں ہیں یہ لاچاریاں ہیں ۔۔۔ یہ غربت کا عالم، یہ مجبوریاں ہیں

چھما چھم ہے برکھا تڑپتی ہے بجلی
یہاں وادیاں اور بیتابیاں ہیں

مرے دل کی حالت نہ پوچھو نہ پوچھو
کہ میں ہوں، الم اور ویرانیاں ہیں

کہاں زندگی کی ہے اب آگ روشن
یہی باقی دو چار چنگاریاں ہیں

تمنا پہ جوبن چمن میں بہاراں
ہے حسرت ہی حسرت یہ مجبوریاں ہیں

مجھ سے نہیں رہا گیا اور ایک گھنٹے کے لئے جب مریضوں کے لئے "ریسٹ" (REST) کا وقت آگیا تو میں نے باہر جا کر اسی وقت یہ چند اشعار لکھ لئے اور جب واپس آتے وقت ان کو دکھایا تو اختر آبدیدہ ہو گئے۔

کہو تو یہ کیسی پریشانیاں ہیں؟
بتاؤ تو کیوں ایسی بے تابیاں ہیں؟

تمہیں کیا ہوا ہے مرے پیارے اختر؟
یہ کیوں خود بخود ایسی مایوسیاں ہیں؟

بہت ناز کرتے تھے تم اپنے دل پر
یہ پھر کس لئے ایسی ویرانیاں ہیں؟

یہ کس نے کہا ہے کہ بیمار ہو تم؟
نہ لاچاریاں ہیں نہ مجبوریاں ہیں

یہ غمزے ہیں سارے کسی خوش ادا کے
جنہیں تم سمجھتے ہو خاموشیاں ہیں

ذرا سے تغافل پہ یوں روٹھ بیٹھے
وہاں تو بہت سی اداکاریاں ہیں

خموشی سے اس کی نہ تم یہ سمجھ لو
کہ رحمت پہ بھی اس کی حد بندیاں ہیں

بھلا اپنے ذرے وہ بھلا دوں گا پھر سے
سراسر تمہاری غلط فہمیاں ہیں

چمن میں دوبارہ بہار آ رہی ہے
مسرت بنیں گی جو رنجوریاں ہیں

تمناؤں سے دل بھی سرسبز ہوگا
ادھر دیکھنا پھر وہی شوخیاں ہیں

طبیعت بدل دے گی خود رنگ اپنا
وہی بادہ خواری وہی مستیاں ہیں

کبھی راحتیں ہیں کبھی آفتیں ہیں
یہی سب زمانے کی نیرنگیاں ہیں

یہ سچ ہے کہ ساری دواؤں سے بہتر
شکیلہ کی پیاری وفاداریاں ہیں

شرفن تیری خدمت کو حاضر ہے اختر
ہزاروں مگر اس کو پابندیاں ہیں

اختر نے انہی آنسوؤں میں ڈوبا ہوا ایک اور شعر بڑھا دیا۔

ترے دل کی قیمت مرا دل ہے حاضر
شرفن بے بہا تیری غم خواریاں ہیں

ان اشعار کی کوئی ادبی حیثیت تو نہیں ہے لیکن ان سے یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ ہم دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے کیسی تڑپ تھی۔

اختر ۱۹۳۵ء میں اٹلی سے واپس آئے اور تفریحاً اردو میں ایم اے کی تیاری کرنے لگے۔ ان دنوں وہ کبھی اپنے آبائی گاؤں اورین میں رہتے جہاں بقول انہی کے ان کا زیادہ وقت گائے، بھینسوں اور بیلوں کے ساتھ گزرتا تھا یا اروں میں جہاں ان کو مستقل راجہ اندر کی حیثیت حاصل تھی۔ یا پھر میرے ہاں پٹنہ میں جہاں ان کے پہنچتے ہی ایک مستقل ہنگامہ شروع ہو جاتا تھا۔ میں آج بھی ان دنوں کو یاد کرتا ہوں تو بے چین ہو جاتا ہوں۔ میرا گھر دلی باغ کا سرکاری کوارٹر

ہر قسم کی ادبی شرارتوں کا مرکز تھا اور ہم لوگوں کا گروپ جس کا نام بعد میں "پنچایت" رکھدیا گیا تھا۔ اور جس میں اطہر، یحییٰ نقوی، تمنائی، رضا نقوی سہیل عظیم آبادی اور سب کے پیرِ مغاں اختر تھے۔ اس وقت کے دانشوروں کے لئے ایک مصیبت بن گیا تھا۔ اس زمانے میں سب سے بڑا مشاعرہ پٹنہ سائنس کالج میں ہوتا تھا جس میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں اور بہترین نظم کو انعام ملتا تھا۔ ہم لوگ ہر موقع پر ایک بے معنی نظم کہتے اور ہمیشہ اسی کو انعام ملتا۔ اس صنعت کی ابتدار اس طرح ہوئی تھی کہ میں اپنے ایک عزیز کی بارات میں ایک دیہات گیا ہوا تھا جہاں کافی پڑھے لکھے لوگ رہتے تھے۔ رات کو چند سہرے پڑھے گئے جن کی بڑی تعریف ہوئی مگر ان سہروں کا ایک شعر بھی اس قابل نہیں تھا جسے شعر کہا جا سکتا اس زمانے میں بارات کا کم سے کم دو روز قیام بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی رات کو ایک مسدس لکھی اور دوسرے روز کی دعوت کے بعد اسے سنایا۔ عالم یہ تھا کہ ہر بند پر چھت بلٹ رہی تھی اور "مکرر، سکرر" کی فرمائش ہو رہی تھی۔ جب میں پڑھ چکا تو صاحب خانہ جو ایک رئیس ہونے کے علاوہ کافی پڑھے لکھے بھی سمجھے جاتے تھے میرے پاس تشریف لائے اور مجھے گلے سے لگایا اور دیر تک ماشاءاللہ، ماشاءاللہ کہنے کے بعد فرمانے لگے کہ "میاں اللہ تم کو زندہ رکھے۔ کیا طبیعت پائی ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ انشاءاللہ علامہ اقبال کی جگہ تم ضرور لوگے۔ میں اس طویل مسدس کا صرف ایک بند نمونتاً لکھے دیتا ہوں:۔

پلادے ساقیا نقشِ شراب و جامِ شراب
کہ جمائے ہو دلِ مےکش میں انتقامِ شراب

ضیا رنقش تبسم ہو انتظام شراب
شراب ناب سے بڑھ کر ہو احتشام شراب

نشہ ہو ایسا کہ دنیا خمار ہو جائے
کبھی ہو "جبر" کبھی اختیار ہو جائے

میں نے یہ واقعہ اپنی "پنچایت" کو سنایا تو اختر نے کہا کہ "جب خداوند کریم نے ہم لوگوں کو ایسی غیر معمولی صلاحیت عطا کی ہے تو کیوں نہ اسے ایک فن کے طور پر پیش کیا جائے"۔ چنانچہ اس کے بعد نہ جانے کتنی نظمیں پڑھی گئیں اور برابر انعام ملتا رہا۔ ایک بار انعام کا فیصلہ کرنے والے جج صاحبان کو کسی نے کہدیا کہ یہاں چند نوجوانوں کا ایک گروپ ہے جو بے معنی نظمیں پیش کر کے انعام لیتا رہتا ہے۔ چنانچہ ایک مشاعرے میں ہر نظم بڑی سختی سے جانچی گئی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بامعنی نظم پر بے معنی ہونے کا شبہ ہو گیا اور وہ مسترد کر دی گئی اور انعام اس بار بھی اسی نظم کو ملا جو واقعی بے معنی تھی۔ انعام میں جو کپ "(CUP)" ملا اس پر اختر نے بنام حماقت کتم نامزد" کندہ کرایا تھا۔ تاکہ سند رہے۔ اس فراق کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ نظمیں سنانے کے لئے ہمارے پاس ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جس کی آواز اتنی سریلی تھی کہ سننے والے دم بخود ہو جاتے تھے۔ "چھوٹا سا لڑکا"۔ اب کراچی یونیورسٹی میں انگریزی کا پروفیسر ڈاکٹر منظر نقوی ہے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ہمارے پاس تعریف کرنے والے ماہرین بھی موجود تھے۔ مثلاً سہیل عظیم آبادی جو نہ اس وقت محتاج تعارف تھے اور نہ اب ہیں یا طفیل احمد خاں جو اس وقت شاید فرسٹ ایر کے طالب علم تھے اور اب پاکستان "فیڈریشن آف چیمبرس آف کامرس" کے سکریٹری جنرل ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ وہی نظم ہے جس کا عنوان تھا "تعویق عمل" اور جو مشترک تخلیق تھی یحییٰ نقوی اور رضا نقوی کی۔ اس نظم پر جج صاحبان کو شبہ تھا کہ یا تو یہ بے معنی ہے یا علامہ اقبال کے غیر مطبوعہ کلام میں سے چرائی گئی ہے کیونکہ رنگ بالکل اقبال کا ہے، لیکن اختر نے جواب پٹنہ میں اردو کے لکچرر ہو چکے تھے جب اس کے ایک ایک شعر کی تشریح کی تو ججوں کی بھی آنکھیں کھل گئیں اور وہ لوگ بھی تعریف کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ یہ نظم اپنی اصلی ہیئت میں نہ جانے کیسے اب تک میرے پاس محفوظ رہ گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

تعویقِ عمل

قمار خانۂ اقوام ہے بساطِ فرنگ
جہاں پہ ربطِ ملل کی دلیل ہے ادراک

شعور و منع مراعاتِ ایشیا نہ رہا ۔۔۔ کہ آج مغربی عیار ہو گئے چالاک
وہ سوز و ضبط جو تھے طرۂ مہ و پرویں ۔۔۔ برنگ کفر ہوئے جا رہے ہیں آج ہلاک
رہا اگر یہی تہذیبِ مغربی کا اصول ۔۔۔ بنائے جائیں گے تصویرِ ایشیا کے بلاک
وہ حسن جس کا مقدر تھا ماہ و اختر ہیں ۔۔۔ برائے ہدیۂ نظارگی ہوا غم ناک

غرض فرنگ کی تہذیب عامری کا اثر
بنا رہا ہے دلِ نازِ شرق کو ناپاک

کہاں تلک مگر اے تنگِ نالۂ ذوقِ نظر ۔۔۔ فسردگی نمائش ربودگی خرد و ہوش
کہاں تلک یہ تحکم کی ناز برداری ۔۔۔ کہاں تلک یہ لباط آفرینیِ خاموش
اٹھ اور اٹھ کے رگِ ایشیا کو کر بیدار ۔۔۔ خمار خانۂ اقوام کو بنا مدہوش

یہ ذوقِ صید زبوں شد ہوائے ہوش و خرد
کہ حافظا نہ شود ایں صدائے سروش

اسی زمانے میں لکھنؤ کے ایک مشہور شاعر نانک چند پٹنہ تشریف لائے۔ رضا نقوی نے شاعر تو کے اختر آور ینوی نمبر میں جس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ انہی کے الفاظ میں سن لیجئے:۔

"ایک بار لکھنؤ کے ایک شاعر نانک چند تشریف لائے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ اردو نہیں جانتے۔ ہندی رسم الخط میں اشعار لکھتے ہیں اور ہندوستان شہرت کے مالک ہیں۔ ان کے اعزاز میں ایک مشاعرہ ہوا۔ ہم لوگ بھی مدعو کئے گئے۔ چلتے وقت رائے ہوئی کہ نانک صاحب کی شان میں اسی قسم کا قصیدہ لکھا جائے۔ چنانچہ مشاعرہ گاہ تک پہنچتے پہنچتے میں نے، اختر اور دو سرے دو دوستوں نے مل کر بتیس بتیس اشعار کا ایک قصیدہ لکھ مارا۔ اختر نے تشبیب کے اشعار لکھے اور میں نے مدحیہ۔ مطلع تھا ے

خوشا وہ موسم رنگیں جو ہو بیگانۂ فطرت ۔۔۔ خوشا وہ منتظر گیتی بنے جو خانۂ فطرت

اختر نے اس قصیدے کو بھرے مجمع میں بڑے آب و تاب سے پڑھا۔ ہم لوگوں کا یہ عالم تھا کہ منہ پہ رومال رکھے گردن جھکائے ہنسی ضبط کئے بیٹھے تھے اور ہر ہر شعر پر مجمع جھوم رہا تھا۔ خود نانک صاحب کے وجد کا یہ عالم دیکھ کر ہم لوگوں کو خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ شادیٔ مرگ نہ ہو جائے۔ قصیدہ کے اختتام پر انہوں نے اٹھ کر اختر کو گلے سے لگا لیا۔ اور آبدیدہ ہو کر کہنے لگے کہ "اہل عظیم آباد نے آج میری جتنی قدر کی، ہندوستان کے کسی مقام پر اتنی عزت مجھے کبھی نہیں بخشی گئی۔"

بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ جب نانک صاحب شکریہ ادا کر رہے تھے تو اختر نے آہستہ سے مجھ سے کہا کہ جلدی سے ایک رباعی تو کہو اور خود ان کو باتوں میں پھنسائے رکھا۔ پھر بڑے ادب سے کہا کہ حضور، آپ تو ہم لوگوں کو کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو ایک رباعی بھی عرض کروں جو آپ کو خوش آمدید کہتے کے لئے عرض کی تھی۔ نانک صاحب اور بھی خوش ہو گئے۔ اس مختصر وقفہ میں مجھ سے رباعی کے صرف تین مصرعے ہو سکے۔ میں نے وہ کاغذ اختر کو دے دیا اور اشارے سے بتا بھی دیا کہ چوتھا مصرعہ تم خود ہی فٹ کر لو۔ مجھ سے تو نہیں ہو رہا ہے۔ ہم لوگ بہت ہی منتظم

طور پر تعریف کر رہے تھے۔ اختر نے بڑی شان سے وہ تین مصرعے پڑھے جو یہ تھے:۔

ہاتف نے کہا پٹنہ میں نانک آ سئے ۔۔۔۔۔ آئے بھی تو کچھ ایسے اچانک آئے

افسوس ہے کچھ ان کی "سواگت" نہ ہوئی

اور پھر واہ واہ کے ہنگامہ میں چوتھا مصرعہ بھی اپنی طرف سے جوڑ ہی دیا وہ چوتھا مصرعہ تھا "مجبور تھے ہم بھی کہ بھیانک آئے!" حد تو یہ ہے کہ اس رباعی نے نانک صاحب کو اور زیادہ متاثر کر دیا۔ وہ اس کے ہر مصرعہ پر جھک جھک کر سلام کئے جا رہے تھے اور کہتے تھے یہ سب آپ حضرات کی ذرہ نوازی ہے۔

ایک اور تماشہ بھی اسی زمانہ میں ہوا۔ ہندوستان میں گاندھی جی کی "ہندوستانی" زبان کی تحریک چل رہی تھی اور اس سلسلہ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے ان سے ٹکر بھی لی تھی۔ بظاہر اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں ایک ایسی زبان رائج ہونی چاہئے جسے سب لوگ باسانی سمجھ سکیں۔ اور بول سکیں۔ اسی تحریک کے تحت "سہتیا سمیلن" کے نام سے ایک ادبی قسم کی کانفرنس ہر صوبہ میں ہو رہی تھی۔ چنانچہ ایک جلسہ بہار کے سب ڈویژن حاجی پور میں بھی ہوا جس میں ہندی اور اردو کے لکھنے والے اور شعراء بلائے گئے۔ ہم لوگوں کا گروپ بھی مدعو تھا چنانچہ میں اطہر اور ان کے ایک بہت ہی دلچسپ دوست مرزا محمد تقی (مرحوم) جو بعد میں پاکستان میں انفارمیشن افسر ہوئے۔ اور پھر یونائیٹڈ نیشنز میں چلے گئے۔ اور اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اختر اور رہنمائی معہ طفیل احمد خاں سلمہ حاجی پور کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں کے سب ڈویژنل افسر مسٹر ال۔ بی سنگھ آئی۔ سی۔ ایس تھے جو خود بھی ادیب تھے اور بعد میں مرکزی حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پہ کام کرتے رہے۔ ان کی لیلی الہ آباد کے ایک مشہور ایڈیٹر کی صاحبزادی تھیں اور خود بھی بڑا اچھا ادبی ذوق رکھتی تھیں ان دونوں کی وجہ سے کانفرنس کے انتظامات بہت ہی شاندار تھے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا اخیر بھوردی اور بسمل الہ آبادی اور ہندی کے مشہور شاعر دینکر بھی آئے ہوئے ہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ ہماری پارٹی وہاں کر سکتی کیا؟ ہم میں سے کوئی بھی تو پائے کا ادیب یا شاعر نہ تھا۔ مجبوراً آپس میں یہ طے کیا گیا کہ چونکہ ہم میں کم سے کم دو اعلیٰ قسم کے مقرر تو ضرور ہیں یعنی اطہر اور اختر۔ تو امداد باہمی کے اصول پر ان دونوں کی خطابت کا پورا مصرف لینا چاہئے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ رات کو جب جلسہ شروع ہوا تو اطہر نے اختر کا تعارف کچھ اس طرح کرایا جیسے ایسا بے مثال مقرر، ایسا ادیب۔ ایسا شاعر اب تک نہ پیدا ہو سکا ہے نہ مستقبل قریب میں ہونے کا امکان ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ بسمل الہ آبادی ہنسی کے متعلق رباعیوں کے لئے بہت مشہور ہیں۔ اختر نے احتیاطاً دو چار رباعیاں اپنی اسی "صنعت" میں کہہ کر رکھ لی تھیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت وہ رباعیاں میرے پاس موجود نہیں ہیں۔ صرف ایک کے چند قافیے یاد رہ گئے ہیں اور آخری مصرعہ۔ قافیے تھے چراغ ہستی دماغ ہستی، وغیرہ اور مصرعہ تھا "آخر نہ ملا تم کو سراغ ہستی" جس وقت اختر اپنی رباعیاں پورے اعتماد کے ساتھ سنا رہے تھے۔ سامعین پر وجد کا عالم طاری تھا اور حد تو یہ ہو گئی کہ بسمل الہ آبادی اور اخیر بھوردی صاحب نے بھی ہر رباعی کو کئی بار سنا اور بے حد تعریف کی۔ اس کے بعد میرا تعارف کراتے اختر کھڑے ہوئے اور اس میں میرے متعلق ایسی ایسی باتیں کہیں جو مجھے خود نہیں معلوم تھیں۔ مقصد کہنا یہ تھا کہ حاجی پور والوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے درمیان ایک اتنا بڑا ادیب موجود ہے جس کی مثال ہندوستان تو کیا دوسرے ممالک میں بھی شاید ہی مل سکے۔ چونکہ اس کی طبیعت میں انکسار بے حد ہے اور اپنی "پبلسٹی" (PUBLICITY) کبھی نہیں پسند کرتا اس لئے شاید آپ لوگوں نے اب تک اس کا نام نہ سنا ہو۔ بہر حال۔ جو چیز اس وقت یہ صاحب پیش کریں گے اسے ذرا غور سے سنئے گا اور سمجھنے کی بھی کوشش کیجئے گا۔ وہ تو بڑی خیریت ہوئی کہ میں نے "ہندوستانی زبان" کے متعلق پہلے ہی ایک مضمون لکھ لیا تھا جس کا عنوان تھا "چوں چوں کا مربہ"۔ یہ چار دوستوں کی گفتگو تھی جس میں ایک دوست ایسی زبان بھی استعمال کرتا ہے جو سب کی سمجھ میں

آسانی سے آجاتی ہے۔ اختر کی اس تعارفی تقریر نے کچھ ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ جب میں اپنا مضمون پڑھنے کھڑا ہوا تو دیر تک تالیاں بجتی رہیں اس میں چار مختلف مکالمے تھے اور اختر ہر مکالمہ کے بعد مجھے روک کر کھڑے ہو جاتے اور سامعین سے کہتے "لیجئے اب سنئے"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں نے مضمون ختم کیا تو نہ جانے کب تک تالیاں بجتی رہیں۔ لوگوں نے زندگی میں پہلی بار میرا آٹوگراف لیا اور مسٹر سنگھ نے مجھ سے درخواست کی کہ "اگر آپ اجازت دیں تو میں اس "ڈائلاگ" (DIA LOGUE) کو یہاں کے اسکول کی ڈرامیٹک سوسائٹی میں اسٹیج کرا لوں"۔ اختر نے فوراً مجھے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ "آسانی سے اجازت نہ دینا"۔ چنانچہ میں نے ایک منجھے ہوئے دانشور کے انداز میں جواب دیا کہ "میں اپنی چیزوں کی تشہیر پسند تو نہیں کرتا لیکن جب آپ کی یہ خواہش ہے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے"۔ اس رات کی نشست میں ہم لوگوں کا ایسا رنگ جما کہ دوسرے روز پھر ہم لوگوں کے اعزاز میں ایک دریائی مشاعرہ کیا گیا یعنی کئی کشتیوں کو ملا کر ایک اسٹیج سا بنا لیا گیا تھا اور وہ بجرہ دریا میں گھومتا رہا۔ اور شاعری ہوتی رہی۔ اس کانفرنس کے بعد ہم لوگ بڑی شان سے رخصت کئے گئے اور دوبارہ تشریف لانے کی فرمائش بھی کی گئی جسے ہم لوگوں نے بڑی سنجیدگی سے قبول بھی کر لیا۔ واپسی میں "اسٹیمر" میں جب ہم لوگ دریائے گنگا پار کر رہے تھے تو اختر نے اپنے وفد کے اراکین کی فرداً فرداً پیٹھ ٹھونکی اور پھر اپنی پیٹھ پیش کرتے ہوئے بولے کہ اب تم سب مل کر ٹھونکو۔ میں نے ایک گھونسہ رسید کیا اور کہا کہ اگر کبھی پکڑے گئے تو خود بھی پٹو گے اور ہم سب کو بھی پٹواؤ گے۔ یہ صنعت کچھ اتنی کامیاب ہوتی جا رہی تھی کہ اب غزلوں اور نظموں کے علاوہ نثر اور روزمرہ کی گفتگو میں بھی استعمال کی جانے لگی۔ خصوصاً ایسے موقع پر جب ہماری بے تکلف صحبتوں میں کوئی "بخیر مینش" ٹپک پڑتا اور ہماری سمع خراشی شروع کر دیتا تھا تو ہم لوگ فوراً ایسے مسائل چھیڑ دیتے تھے جیسے "نیٹشے کا نظریہ مابعد الطبیعات" اور پھر وہ غریب کچھ ایسا احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ اس کے بعد کبھی ادھر آنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں اختر پٹنہ کالج میں اردو کے لکچرر ہو گئے۔ ان کی ملازمت کا پیش منظر اور پس منظر دونوں ہی کافی دلچسپ اور یادگار ہیں۔ میں ان کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا اس لئے کہ پھر اس سے بہت سی یادیں تازہ ہو جائیں گی جو میرے آنسوؤں کو نہ روک سکیں گی۔ اس زمانے میں اختر میرے گردنی باغ کے تاریخی کوارٹر میں ایک طویل عرصہ تک مقیم رہے، وہیں سے ہم لوگ ان کی بارات لے کر پٹنہ کالج گئے تھے۔ تقرری کے بعد بھی وہ کچھ دنوں میرے ہی ساتھ رہے اور وہاں شکیلہ اور ان کی چھوٹی بہن رضیہ رعنا جو اپنی خداداد موزونی طبع کی وجہ سے ہم سب کو بہت عزیز تھیں، اکثر آ کر رہتی تھیں۔ وہ قیام اب تو ایک خواب ہی ہے لیکن میں اسے بھلانا چاہوں بھی تو نہیں بھلا سکتا۔ اس زمانہ میں اختر کی زندہ دلی پھر اپنے شباب پر تھی۔ وہ برابر کہتے تھے کہ "میں نے اپنی زندگی میں کئی منصوبے بنائے تھے جن میں بعض تو خاک میں مل گئے اور بعض کامیاب ہوئے۔ اب زندگی کا صرف ایک مشن (MISSION) باقی رہ گیا ہے اور وہ ہے تمہاری پھانسی یا قید عمر با مشقت یعنی شادی"۔ میں نے اس کا فیصلہ اختر ہی پر چھوڑ رکھا تھا اور انہوں نے بالآخر اسے سنہ ۱۹۴۲ء میں پورا کر کے چھوڑا۔

میری شادی ۳۰ نومبر سنہ ۱۹۴۲ء کو ہوئی۔ "انتخاب مقتل" اور "پھانسی" سے پہلے کے مراحل اختر ہی کے مشوروں سے طے پائے مگر یہ بھی اتفاق ہے کہ وہ میری بارات میں لکھنؤ نہ جا سکے تھے حالانکہ اس سے پہلے وہ وہاں کے چکر لگا چکے تھے۔ میں شادی کے دوسرے روز پٹنہ واپس آیا۔ رات کے تقریباً ۸ بجے ہم لوگ گردنی باغ کے کوارٹر میں پہنچے تھے اور دو گھنٹے کے بعد ہی یعنی آدھی رات گئے دروازے پہ ایک "ٹم ٹم" (پٹنہ کی بہت مقبول سواری) رکا اور اس میں دو ستر پوش صورتیں معہ چار شریر آنکھوں کے نظر آئیں۔ یہ اختر اور رضا کے سوا کون ہو سکتا تھا! میں بھاگتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔ ان دونوں نے صرف ایک مختصر سا سوال کیا اور "اسی ٹم ٹم" پہ واپس چلے گئے۔ سوال لاجواب ہو یا نہ ہو ناقابل جواب ضرور تھا۔ شادی کے بعد ہم لوگوں کا زیادہ وقت اختر اور شکیلہ ہی کے ساتھ گزرتا تھا۔ یہی دونوں ہم دونوں کو ۱۰ جنوری سنہ ۴۳ء کو ایک فوٹو گرافر کے پاس لے گئے۔ چاروں کا ایک گروپ لیا گیا، وہی گروپ جو

مہر نیمروز کے اس شمارے میں آپ کو کہیں پہ نظر آئے گا۔ مجھ میں تو اب اس تصویر کو دیکھنے کا بھی حوصلہ نہیں رہا!

شادی کے بعد ہی ایک غضب یہ ہو گیا کہ صوبائی حکومت سے مرکزی حکومت کے لئے میرا انتخاب ہو گیا اور میں جنوری ۱۹۴۳ء میں کلکتہ چلا گیا یہ انتقال مکانی سچ پوچھئے تو میرے اصلی انتقال کا سبب بھی بن گیا۔ گردنی باغ کا وہ تاریخی کوارٹر چھوٹا۔ میری بوا جنہوں نے بچپن سے مجھے کھلایا تھا اور ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہتی تھیں اور جو میرے اس مخصوص گروپ کی ایک ضروری کردار تھیں اور جس کا ذکر اختر اور شکیلہ کی اکثر تحریروں میں بھی آیا ہے مجھ سے چھوٹ گئیں۔ میرے احباب جن کے سہارے میں زندہ تھا مجھ سے دور ہو گئے۔ اسمبلی آنس کے دلچسپ اور پر سکون ماحول اور پٹنہ کی ادبی صحبتوں سے نکال کر میں کلکتہ کی ہنگامہ خیز دنیا اور وہاں سپلائی ڈیپارٹمنٹ کے انتہائی غیر شاعرانہ جنگل میں پھینک دیا گیا۔ اس سے پہلے اس قسم کا سانحہ شاید حضرت آدم علیہ السلام ہی کے ساتھ پیش آیا ہو گا۔ پھر بھی میرے احباب نے مجھے بھلایا نہیں۔ سب ہی کلکتہ آتے رہتے تھے جس سے میں زندہ رہ سکا مگر اختر نے تو حد ہی کر دی۔ ایک روز کلکتہ میں مجھے ان کا تار ملا کہ میں کل صبح کی ٹرین سے آ رہا ہوں۔ میں بھاگتا ہوا اسٹیشن پہنچا۔ یہ اپنے ڈبے سے اکیلے نمودار ہوئے۔ میں نے پوچھا "اور شکیلہ؟" کہنے لگے "ان کا ٹکٹ ہی نہیں ملا۔" میں نے کہا "یہ کیا؟" بولے "گھر چلو تو بتاؤں گا"۔ جب میں نے پوچھا تمہارا سامان کہاں ہے تو ان کو یاد آیا کہ ان کے ساتھ ایک اٹیچی کیس بھی تھا مگر ڈبہ خالی ہو چکا تھا اور ایک دوسری فیملی کا سامان اسی جگہ پلیٹ فارم پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا دیکھو اسی میں ممکن ہے تمہارا بھی اٹیچی کیس ہو، تو کس معصومیت سے جواب دیا کہ "مجھے کیا معلوم کہ میرا اٹیچی کیس کون سا ہے۔ وہ تو شکیلہ نے زبردستی ساتھ کر دیا تھا"۔ مجھے کچھ تو ہنسی بھی آئی اور اس سے زیادہ غصہ۔ میں نے کہا اب خدا کے لئے انہی لوگوں سے پوچھو تو سہی کہ ان کے سامان میں جو اٹیچی کیس ان کا نہیں ہے وہ کون سا ہے۔ ممکن ہے وہی تمہارا ہو۔ چنانچہ وہی ہوا۔ ایک بہت ہی بھولی بھالی بنگالی لڑکی جو اپنے شوہر کے ساتھ اسی ڈبہ میں سفر کر رہی تھی مسکراتی ہوئی آئی اور کہا "لیجئے یہ آپ کا اٹیچی کیس ہے"۔ پھر اس نے ہندوانہ انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "نمسکار"۔ اختر نے خلاف معمول محض سر ہلا دیا اور کچھ بولے نہیں۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک طرف اور ہم دونوں دوسری طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے اختر سے پوچھا، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ بس اتنا چھیڑنا تھا کہ وہ شروع ہو گئے "تم جانتے ہو کہ میں پھول کے ساتھ کانٹوں کی موجودگی کو تو نظر انداز کر سکتا ہوں لیکن ایک خوبصورت ہرن کے ساتھ کسی گینڈے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ بل ڈوزر (BULL-DOZER) قسم کی چیز اس غریب کا شوہر ہے"۔ میں نے پوچھا پھر تمہیں کیا تکلیف ہے؟ کہنے لگے "تم تکلیف کو پوچھتے ہو؟ بھائی، ساری رات یہ جانور خراٹے لیتا رہا لیکن خراٹے کے بھی کچھ اوزان ہوتے ہیں اس کے بھی کچھ مخصوص سُر ہیں۔ تمہیں یاد نہیں اردو میں مقبول عالم صاحب کا خراٹا؟ وہ کبھی سُر سے نہیں اترتے تھے۔ مگر اس کم بخت کے خراٹے کی تو ہر تان صرف بے تُکے سر پہ ٹوٹتی تھی"۔ میں نے کہا خیر! اس سانحہ کو بھول جاؤ۔ اختر نے کہا "ہاں بس صرف ایک نظم کہہ دوں گا، اور کیا کر سکتا ہوں"۔ میں نے پوچھا وہ نظم کیا خراٹے پر ہو گی؟ جواب ملا "نہیں، احمق۔ نمسکار پر"۔ شعریت اختر کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ کسی بدمذاقی کو چاہے وہ فطرت ہی کی کیوں نہ ہو، برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ گھر پہنچنے پر میں نے اختر سے ان کا غاط نزول دریافت کیا کہنے لگے "ادھر کافی دنوں سے تم سے ملا نہیں تھا اس لئے کچھ ناموزوں سا ہوتا جا رہا تھا۔ مگر کلکتہ آنے کے لئے پیسے نہیں تھے یکایک اخبار میں دیکھا کہ محکمہ خزانہ میں ایک استاد کی جگہ خالی ہے جس کا انٹرویو کلکتہ میں ہو گا اور امیدوار کو سکنڈ کلاس کا ٹکٹ بھی دیا جائے گا۔ میں نے سوچا یہ موقع بہترین ہے۔ مگر خطرہ صرف یہ تھا کہ اگر اس جگہ پر لے لیا گیا تو کہیں کا نہیں رہوں گا۔ پھر بھی میں نے درخواست بھیج دی اور ایک ہفتہ کے اندر انٹرویو کا خط اور ٹکٹ آ گیا۔ چنانچہ کل ہے میرا انٹرویو۔ مگر کوئی ترکیب سوچو اس میں فیل ہونے کی"۔ میں نے "یہ چیز اوروں کے لئے تو آسان ہے مگر تمہارے لئے

۱؎ بہار شریف کا ایک مشہور محلہ

بہت مشکل اس لئے کہ تمہیں ہر امتحان میں فرسٹ ہو جانے کی بڑی بری عادت ہے"۔ اختر دوسرے روز انٹرویو میں گئے اور منہ لٹکائے واپس آئے۔ معلوم ہوا چند امیدواروں کو دوسرے انٹرویو کے لئے بھی بلایا گیا ہے اور یہ علامت ہے منتخب ہونے کی۔ بات تو واقعی پریشانی کی تھی۔ میں نے اسی وقت ان کو بیمار ہو جانے کا مشورہ دیا، اسی روز ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ بے چارے نے صرف پانچ روپے میں ایک ایسے مرض کا سرٹیفکیٹ دے دی جس کا دورہ کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس انکشاف کے بعد دفاع کے کسی بھی شعبہ میں ایسے مریض کو کیسے لیا جاتا۔ اس طرف سے جب اطمینان ہو گیا تو ہم لوگوں نے کلکتہ کی تفصیلی سیر شروع کی اور ایک ہفتہ تک بس گھومتے پھرتے رہے۔ واپسی کے وقت میں نے اصرار کیا کہ کچھ روپے ساتھ رکھ لو، راستہ میں شاید ضرورت ہو تو اختر نے مجھ ہی سے سوال کیا کہ "پہلے تم یہ بتاؤ کہ مجھے کس وقت اور کیوں پیسوں کی ضرورت ہوگی؟ کلکتہ میں تمہارے ساتھ رہا اور اچھی طرح گھوم بھی لیا۔ واپسی کا ٹکٹ میری جیب میں موجود رہنے۔ اسٹیشن تک تم پہنچا ہی دوگے۔ رات کا کھانا تمہارے یہاں سے کھا کر جاؤں گا۔ راستہ کے لئے تم میرے ساتھ پھل کی ایک ٹوکری ضرور رکھ دوگے۔ میں پٹنہ صبح سویرے پہنچ جاؤں گا۔ اسٹیشن سے گھر تک رکشا پر جاؤں گا جس کا کرایہ شکیلہ ادا کریں گی اور ہاں، اس پر اگر تم مجھے کچھ پیسے دینے کے لئے پریشان ہو تو سن لو کہ راستہ میں جو بھی شخص مجھے خود مجھ سے زیادہ مفلس نظر آئے گا اس کو وہ سارے پیسے اگر میں دے دوں تو پھر شکایت نہ کرنا۔ میں نے اپنی پیش کش واپس لے لی۔ اور ہم لوگ اسٹیشن روانہ ہوئے۔ وہاں اسی ٹرین سے ایک اور بنگالی جا رہا تھا جو ان کے ساتھ پہلے انٹرویو میں شریک ہوا تھا۔ اس نے اختر کو دیکھتے ہی کہا کہ دوسرے انٹرویو کے روز سب لوگ بہت افسوس کر رہے تھے کہ آپ کا نام سب سے اول تھا مگر آپ عین وقت پہ بیمار ہو گئے۔ اختر نے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا "جان بچی لاکھوں پائے"۔ میں نے کہا دوسرا فقرہ بھی تو کہہ دو، کہنے لگے وہ گھر پہنچ کے شکیلہ تو کہے گی ہی۔ تو یہ تھا اختر کا اصلی رنگ۔ ہے کسی اور کا اتنا پیارا دوست؟

اختر کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور ہم دونوں بہت زیادہ ساتھ بھی رہے ہیں اس لئے میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اپنی ادبی صلاحیتوں کے علاوہ جو خلوص، جو محبت، جو ایثار، جو سادگی، جو معصومیت، جو زندہ دلی اور جو مکمل شرقیت میں نے اختر میں پائی اس کی مثال کسی ایک شخص میں بیک وقت کہیں اور نہ مل سکی۔ شکیلہ کی تحریروں میں اکثر اس کا ذکر آگیا ہے کہ کس طرح اختر اپنے عزیز دوستوں کے علاوہ غیروں کے بھی آڑے وقتوں میں کام آجاتے تھے۔ ان کو اچھے اور قیمتی لباس میں جو کسی نے کبھی نہیں دیکھا اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کو اس کا موقع نہیں تھا۔ بلکہ ہوتا یہ تھا کہ اچھا لباس ان کے جسم پر ٹھہرنے کب پاتا تھا۔ بقول شکیلہ کے جب یہ اپنے کوٹ کے سارے بٹن تمام بند کئے رہتے تو پتہ چل جاتا تھا کہ ان کی نئی قمیص کسی اور کے ننگے جسم کی زینت بنی ہوئی ہے۔ یہ تھی میرے اختر کی شان قلندری!

اب ذرا اختر کی فطری شرقیت ملاحظہ ہو۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے جب میں گمرونی باغ کے کوارٹر میں تنہا رہتا تھا اور رہائش مغربی طرف ارعد تک تھی کہ میرے گھر میں کھانے کی ایک میز بھی تھی جس پہ صاف و شفاف چادر بچھی رہتی تھی۔ اختر اور شکیلہ میرے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب کھانا میز پہ لگایا گیا اور میں نے ان دونوں کو آواز دی تو اس وقت اختر اپنے ٹھیٹھ دیہاتی انداز میں بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے جب اس ٹیبل کے لوازمات کو دیکھا تو اپنے مخصوص انداز میں زور سے ایک نعرہ لگایا "ہت تیری میز کی ایسی تیسی" اور پھر میری مغفرت کی دعا کرتے ہوئے سب سے پہلے ٹماٹر کے سلاد کی پلیٹ اٹھالی اور کھانا شروع کر دیا۔ شکیلہ ان کو جھڑکتی بہت تھیں۔ کہنے لگیں "شرف صاحب کیسے خوش سلیقہ ہیں اور ایک آپ ہیں۔ اب میں بھی اپنے گھر میں میز ہی پر کھانے کا انتظام کروں گی"۔ اختر نے کہا "ہاں، ہاں، نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے"۔ میں نے شکیلہ سے وعدہ لے لیا کہ میز پہ کھانے کی افتتاحی تقریب میں مجھے مہمان خصوصی بنایا جائے گا۔ چنانچہ دو تین ہی روز کے بعد وہ وقت آگیا۔ واقعی شکیلہ نے بڑے سلیقہ سے میز سجائی تھی۔ انگریزی قاعدے کے مطابق میز کے ایک سرے پہ اختر کی کرسی رکھی اور دوسرے پہ اپنی اور بیچ میں مہمانوں کے لئے۔ پھر شکیلہ نے میز پہ کھانے کے کچھ ضروری آداب بھی بتائے یعنی پہلے

کیا کھانا چاہئے اور اس کے بعد کیا۔ اور اس کے بعد کیا۔ اختر یہ سب ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے اور سنتے رہے۔ کھانا شروع ہوا ہی تھا کہ اختر ایک ڈرامائی انداز سے اٹھے اور اپنے بستر سے ایک کمبل کھینچ کر وہیں زمین پر بچھایا اور اپنے دیہاتی لہجہ میں زور سے کہا۔ "آ بھیا اشرف آ۔ ہم دونوں ایہی جا بجر کوٹ کریں"۔ چنانچہ میز کی یہ ساری آرائشیں اب کمبل پہ منتقل ہوگئیں اور اس طرح کھانے کے بعد اختر نے اطمینان کی سانس نہیں بلکہ اطمینان کی ڈکار لی۔

یہ تو تھی ان کی شرقیت۔ اب ذرا ان کے خلوص و معصومیت کا بھی ایک واقعہ سنئے۔ ایک دن یہ شام کو رکشا پر یکایک میرے کوارٹر پہنچے۔ بڑی خیریت ہوئی کہ میں گھر پہ موجود تھا۔ رکشا ہی پر بیٹھے ہوئے مجھے پکارا اور یہ بھی کہا کہ کچھ پیسے لیتے آنا۔ میں نے پوچھا "خیریت تو ہے؟ کہاں سے آرہے ہو؟" کہا "بالکل خیریت ہے، مگر یہ نہ پوچھو کہ کہاں سے آرہا ہوں۔ یہ پوچھو کہ کہاں سے نہیں آرہا ہوں"۔ بہرحال، رکشا والے نے جو کرایہ مانگا وہ میں نے اس کو دے دیا اور پھر اختر سے تفصیل پوچھی، انہوں نے بتایا کہ "میری جیب میں صرف چھ آنے تھے جس سے میں نے انگور خرید کر کھایا اس کے بعد اس رکشہ پر رضا کے ہاں گیا۔ وہ کم بخت غائب تھا۔ پھر وہاں سے سیّد[1] کے ہاں گیا۔ یہ بھی نہ جانے کہاں گیا ہوا تھا۔ اس کے بعد محسن[2] بھائی کے ہاں پہنچا مگر معلوم ہوا کہ وہ بھی گھر پہ نہیں ہیں، اور نہ جانے کب تک آئیں گے۔ رکشہ کا کرایہ چڑھ رہا تھا مگر میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ کرایہ کہاں سے دیتا؟ تمہارا مکان وہاں سے کافی دور تھا، مگر کیا کرتا کہیں تو جانا ہی تھا۔ خیر تم مل گئے۔ یہ اچھا ہوا"۔ میں نے پوچھا کہ "فرض کرو میں بھی نہ ہوتا تو تم کیا کرتے؟" کہا پہلے تو میں تو اسے امداد طلب کرتا۔ لیکن اگر وہ بھی انکار کر دیتیں تو ان کی آنکھ بچا کر تمہاری وہ ٹائم پیس گھڑی جو سامنے رکھی ہے رکشہ والے کی نذر کرتا کہ بھائی یہ میری یادگار رکھے اور اب حشر میں کرایہ نہ مانگنا"۔ میں نے ایک نکتہ کی مزید وضاحت چاہی یعنی "جیب پاس میں صرف چھ آنے تھے تو انگور کھانے کی کیا ضرورت تھی؟" ہنستے ہنستے جواب دیا "کتنے بے وقوف ہو تم بھی۔ ارے میاں ڈاکٹر نے پھل کھانے کی تاکید جو کی ہے"۔ ایک سوال اور رہ گیا کہ جب انگور کھانے کے بعد ایک پیسہ بھی نہ بچا تو پھر دوستوں کی ملاقات کو کیوں چلے تھے؟ مگر اس کا جواب مجھے معلوم تھا اور وہ یہ کہ ایسا تو اختر اور صرف اختر ہی کر سکتا تھا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو ہمیشہ یاد آ آ کر خون کے آنسو رلاتی رہیں گی۔

یہ تو ان بے شمار یادوں میں سے محض چند تھیں۔ جو میں نے اس لئے لکھ دیں کہ کچھ تو دل ہلکا ہو جائے۔ "تڑپ لے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے"۔ ورنہ واقعہ تو یہ ہے کہ جب بھی آنکھیں بند کرتا ہوں نہ جانے کتنے ایسے ایسے نقشے سامنے آجاتے ہیں جو بھلائے نہیں بھولتے اور میں انہی خوابوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ ہم لوگ جب تک ساتھ رہے کوئی دن بھی تو ایسا نہیں آیا جس کی یاد نہ ستاتی ہو۔ اختر سے پہلی ملاقات۔ پھر ارول میں ہم دونوں کا، بقول اختر کے، "ایک دوسرے کے لئے ایک قیمتی دریافت" ثابت ہونا۔ اختر پہ رومانیت کا شدید حملہ اور اس کا انجام شادی، پٹنہ کالج کے ہوسٹل میں اختر کی ہنگامہ آرائیاں۔ پھر یکایک حضرت عزرائیل علیہ السلام کی غلطی پہ ان کا اٹکی سینی ٹوریم جانا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی مایوسیوں کو دلچسپیوں میں بدل دینا صحت کے بعد پٹنہ کے وہ خوشگوار دن، ہر سفر میں ہم دونوں کا ساتھ رہنا۔ اختر کی ملازمت، میرے کوارٹر میں اختر کا مسلسل قیام اور وہاں کی ادبی گرمیاں، اور غیر "ادبی" ہنگامے۔ اختر کی ملازمت کے بعد ان ساری ہنگامہ آرائیوں کا خود ان کے مکان میں منتقل ہو جانا اور وہاں کی وہ یادگار صحبتیں۔ ان میں سے کوئی یاد بھی تو ایسی نہیں جو بھلائی جا سکے۔ اب دیکھئے انہی گزرے ہوئے دنوں کی چند اور یادیں بھی بے ساختہ چلی آرہی ہیں اور میں ان کو بھی لکھنے کے لئے مجبور ہوا جا رہا ہوں۔

۱۹۳۶ء میں ساغر نظامی پٹنہ آئے ہوئے تھے اور ڈاکٹر سید محمود (مرحوم) وزیر تعلیم کے ہاں مقیم تھے۔ انہی دنوں اختر میرے ہاں ٹھہرے ہوئے

---

[1] پروفیسر سید حسن [2] ڈاکٹر سید محمد محسن

تھے۔ دوستوں کی رائے ہوئی کہ ایک دن ساغر کو اچھی طرح سنا جائے چنانچہ اطہر اور بابائے کانگریس مولانا مظہر الحق مرحوم کے صاحبزادے حسین مظہر مرحوم نے جو میرے دوست بھی تھے اور عزیز بھی، ساغر صاحب کو میرے ہاں آنے کی دعوت دے دی۔ اس روز سارے احباب جمع ہوئے اور یہ پروگرام ساری رات کا تھا۔ یہ محفل ایک لطیفے کے ساتھ شروع ہوئی۔ میری بُوا کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ ان سے میرا وعدہ تھا کہ وہ گھر میں جس جگہ چاہیں رہیں اور جو چاہیں کریں کوئی ان کے معمولات میں مخل نہیں ہوگا۔ چنانچہ وہ ان دنوں میرے ڈرائنگ روم کے صوفے پر مستقل تشریف فرما رہتی تھیں۔ یہ محفل اسی کمرے میں ہونے والی تھی اور میں پریشان تھا کہ بُوا کو کس طرح اس پر راضی کروں کہ وہ اس رات کسی اور جگہ بیٹھ جائیں۔ اختر نے کہا میاں کچھ نہیں، آج کے مشاعرے کی صدارت بُوا ہی کریں گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ میرے احباب تو خیر بُوا کی اہمیت سے واقف ہی تھے، لیکن جب ساغر نے یہ نقشہ دیکھا تو فوراً پوچھا۔ "آپ کی تعریف؟" اختر نے کہہ دیا کہ آج کی محفل انہی کی صدارت میں ہو رہی ہے۔ بُوا اپنی رضائی اور پیتل کا چھوٹا پاندان لئے صوفے پر سمٹی جمی بیٹھی تھیں اور ہم لوگ غزلیں سنا رہے تھے۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس روز بھی جو غزلیں ہم لوگوں نے پیش کیں ان میں زیادہ تر ہماری ایجاد کردہ "صنعت" ہی میں تھیں اور جو ساغر صاحب نے بھی کافی پسند کیں۔ آخر میں جب ساغر نے خود جھوم جھوم کر ترنم میں پڑھنا شروع کیا تو محفل اور بھی جم گئی اور ہر طرف سے واہ واہ کا شور ہوا۔ بُوا نے کبھی شعر و شاعری کی محفل تو دیکھی نہیں تھی اس لئے پریشان تھیں کہ آخر یہ سب لوگ اتنا شور کیوں کر رہے ہیں چنانچہ ساغر کے کسی شعر پہ جب ہم لوگوں نے کچھ زیادہ واہ واہ کا ہنگامہ کیا تو بُوا نے وہیں سے ڈانٹا کہ "تم لوگ اتنا چیخ کیوں رہے ہو؟ کیسے مزے میں تو یہ لڑکا گا رہا ہے تم لوگ چپکے سے سنتے کیوں نہیں؟" میرے خیال میں ساغر کی ایسی تعریف اس سے پہلے کسی نے نہیں کی ہوگی جس کا خود ساغر نے بھی اعتراف کیا۔ ساری رات محفل مشاعرہ گرم رہی اور بُوا نے کئی بار اٹھ اٹھ کر باورچی خانہ سے چائے بھجوائی۔ ساغر اور دوسرے مہمان تو صبح ہونے سے پہلے چلے گئے لیکن ہماری ورکنگ کمیٹی نے صبح ناشتہ کے بعد رات کی محفل اور خصوصاً ساغر کے کلام پہ تبصرہ شروع کیا۔ ساغر کے کسی شعر کا ایک مصرعہ تھا "دائیں بھی جوانی ہے بائیں بھی جوانی ہے"۔ ظاہر ہے اس کی بلاغت کو صرف ہم ہی لوگ سمجھ سکتے تھے پھر بھی میں نے "پنچایت" کے سامنے یہ سوال چھیڑ ہی دیا کہ "دائیں اور بائیں کی اصطلاح طبلہ کے سلسلہ میں سنی تھی لیکن یہ دائیں والی جوانی کا کیا مطلب ہوا؟" اختر نے اس کی بڑی عالمانہ تشریح کی۔ کہنے لگے۔ "آخر شاعری ہے کیا؟ موسیقی ہی کا دوسرا نام تو شاعری ہے۔ تو پھر جب موسیقی شاعری ہے اور شاعری موسیقی تو ظاہر ہے کہ جہاں موسیقی ہوگی وہاں طبلہ کا ہونا ضروری ہے اور جب طبلہ کا تصور شاعر کے ذہن میں آئے گا یا یوں کہو کہ جب اس کے تصور پہ طبلہ کی نقاب پڑے گی تو وہ اس سے متعلق دائیں اور بائیں کی اصطلاح استعمال کرنے کے لئے مجبور ہو جائے گا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ اس شعر میں شاعر اپنے محبوب کا سراپا پیش کرنا چاہتا ہے اور وہ اپنے محبوب کو جس طرف سے دیکھتا ہے اس کی جوانی ہی نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف ایک مصرعہ میں چاروں طرف کی جوانی تو سمانے سے رہی، اس لئے شعر میں دو مصرعے ہوتے ہیں تاکہ ایسے نازک مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کر کے آدھا ایک مصرعہ میں اور آدھا دوسرے مصرعہ میں پیش کیا جا سکے۔ شاعری میں بعض مضامین اور بھی وسیع ہوتے ہیں اور وہ دو مصرعوں میں بھی نہیں سما سکتے تو اس کے لئے ہمارے ہاں رباعی کی صنف موجود ہے یا پھر اگر کوئی مضمون بہت زیادہ پیچیدہ آجائے تو اس کو نظم میں پیش کیا جا سکتا ہے یا اس کی گتھیوں کو مسدس میں سلجھایا جا سکتا ہے۔ اس شعر میں شاعر نے اپنے محبوب کی چوطرفی پیش کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ناکامیاب رہا۔ اس کو دائیں اور بائیں تو جوانی نظر آئی مگر اس کا مشاہدہ اتنا محدود تھا کہ اس نے آگے بڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی حالانکہ شعر کا دوسرا مصرعہ اس کا انتظار ہی کرتا رہا۔ اختر کا لیکچر ابھی اور جاری رہتا مگر میں نے کہا کہ بھائی خدا کے لئے اب دوسرا مصرعہ بھی کہہ ہی ڈالو تاکہ محبوب کا سراپا تو مکمل ہو جائے۔ اختر نے جواب دیا۔ سبحان اللہ! اب یہ کام بھی میں ہی کروں؟ کیا تم کم بختوں سے ایک مصرعہ بھی نہیں کہا جاتا؟ اچھا تو پھر لو ایک بار بھارت ماتا کی جے اور اس شعر کو یوں پڑھو ؎

"دائیں بھی جوانی ہے، بائیں بھی جوانی ہے — آگے بھی جوانی ہے پیچھے بھی جوانی ہے"

وہ بھی ہم لوگوں کی زندگی کا کچھ عجیب ہی دور تھا کہ آپس میں جب کوئی مذاق بھی ہوتا تھا تو وہ ایک ادبی یادگار چھوڑ جاتا تھا۔ اسی ... یحیٰی نقوی کی شادی ان کے آبائی گاؤں کھجوہ میں ہوئی۔ اس میں تمنائی ہم لوگوں کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے اور تہنیت کا ... ایک سہرا بھی ساتھ لیتے گئے۔ اس سہرے میں ہم سب نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق حصہ لیا مگر مجموعی طور پر اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اشعار تو لکھے تو جاسکتے تھے مگر پڑھے نہیں جاسکتے تھے۔ تمنائی نے وہ سہرا نوشہ کو پرائیوٹ طور پر دے دیا تھا اور نوشہ نے بھی اس کو سب سے اور بالخصوص اپنی دلہن سے چھپا کر پڑھا اور پھر اسے بڑی حفاظت سے ایک بکس میں بند کر دیا۔ مجھے اس کے چند اشعار اب تک یاد ہیں مگر ان کو لکھنے سے اس لئے قاصر ہوں کہ کہیں کوئی انہیں پڑھ نہ لے۔ یحیٰی نے اس کا بدلہ "تہنیت" سے لیا مگر چونکہ اس کے بعد ہی میری شادی ہوئی اس لئے نشانہ مجھ ہی کو بننا پڑا۔ اس موقعہ پر ایک یادگار مثنوی لکھی گئی جس کا عنوان تھا "مثنوی جاروبِ سخن معروف بہ غبارِ عشق"۔ ہم سب کی آپس میں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کا ثبوت یہ ہے کہ جن دوستوں نے یحیٰی کا وہ سہرا کہا تھا انہی نے اس مثنوی میں بھی دلچسپی لی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مشترک شاہکار یحیٰی نقوی اور رضا نقوی کا ہے۔ گرچہ یہ ہے خود میری ہجو میں مگر بخدا میرے پاس اس کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ قدرت سے ان دونوں نقویوں کو کچھ ایسی غیر معمولی صلاحیت عطا ہوئی ہے کہ جس عنوان پر بھی یہ لکھنے آتے ہیں تو کم سے کم وقت میں کچھ ایسی چیز پیش کر دیتے ہیں جو اپنی جگہ پہ ایک شاہکار ہی ہوتی ہے یہاں پوری مثنوی تو پیش نہیں کی جا سکتی بس نمونتاً صرف ایک شعر لکھے دیتا ہوں جو میری زندگی پہ بہت ہی لطیف طنز ہے ؎

کاؤنسل میں وہ کام کرتے ہیں — عمر یوں ہی تمام کرتے ہیں

ایک بار اختر نے رضا نقوی کو اپنے ہاں بہت اصرار سے بلایا اور اس وقت خود کہیں غائب ہوگئے۔ رضا وقت پہ پہنچ گئے اور اختر کو نہ پاکر کھڑے وقت پنسل سے فی البدیہہ ہجو لکھ ماری اور جو بعد میں اپنی اصلی شکل میں مجھے یہاں بھیج دی۔ اس کا عنوان ہے "مثنوی عتاب سخن المعروف بہ تنبیہ الاختر" اور تصنیف کی تاریخ ہے ۱۰ر جنوری ۱۹۴۹ء روز دوشنبہ۔ یہ رضا کی ذہانت، زود گوئی اور شوخیٔ طبع کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کا بھی صرف ابتدائی شعر لکھے دیتا ہوں ؎

"مرحبا اے پروفیسر صاحب — آدمی ہو کہ جانور صاحب"

ایسی ایسی نہ جانے کتنی یادگار چیزیں ہم لوگوں کے پاس جمع ہوگئی تھیں مگر ان میں سے بیشتر تو ہندوستان ہی میں رہ گئیں اور جو چند میرے ساتھ آگئیں ان کو میں اب تک اپنے سینہ سے لگائے پھرتا ہوں اور اب یہی میرے اثاث البیت کا سب سے قیمتی حصہ ہیں۔ انہی میں کچھ خطوط بھی ہیں اختر کے اور کچھ رضا کے بھی (یہ بھی مکتوب نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے) اور اب میرا اگر کوئی عزیز ترین مشغلہ ہے تو بس یہی کہ "گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را"!

خطوں کا ذکر آگیا ہے تو یہ بھی لکھ دوں کہ میں نے اور اختر نے ایک دوسرے کو اپنی زندگی میں جتنے خطوط لکھے ہیں وہ شاید بہت کم دوستوں نے لکھے ہوں گے۔ ایک عرصہ تک یعنی ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۰ء تک ہم دونوں نے سوائے اس کے کچھ کیا ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے پاس ہزاروں نہیں تو سینکڑوں خطوط جمع ہوگئے۔ وہ تو خیریت تھی کہ اس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی اور اختر کو شکیلہ جیسی بی بی مل گئی تھی جن کو خود بھی ہم دونوں کے خطوں سے بڑی دلچسپی تھی اور میرے سارے خطوط ان کے پاس تاریخ وار محفوظ تھے۔ ایک عرصہ ہوا انہوں نے مجھ سے اختر کے خطوط بھی لے لئے اور کہنے لگیں "دل چاہتا ہے میں ان کو اب چھپوا کر آپ دونوں کو خوب رسوا کروں"۔ میں نے ان سے اس وقت مذاقاً سے کہا تھا کہ بڑے لوگوں کی سوانح حیات یا ان کے خطوط ان کے مرنے کے بعد ہی

چھپتے ہیں۔ مانا کہ غالب کے بعد خط لکھنے والوں میں یا تو آپ کے شوہر نامدار ہیں یا میں ہوں لیکن ابھی تو ہم دونوں ہی سے بیٹے کئے دندناتے پھرتے ہیں۔
اس کے جواب میں شکیلہ نے یہ کہا تھا کہ "جہاں تک اختر صاحب کا تعلق ہے تو انہوں نے تو ملک الموت سے کچھ ایسے تعلقات قائم کر لئے ہیں کہ وہ اسی وقت تک شاید ان کے پاس نہ آئیں جب تک یہ خود نہ ان کو دعوت دیں۔ اب رہے آپ تو اختر صاحب آپ کو مرنے کب دینگے۔ آپ نے بھی تو ان کو اب تک ان کو مرنے نہیں دیا۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ آپ دونوں کے اعمالنامے اب چھپ ہی جائیں"۔ نہ جانے وہ کونسی ساعت تھی جب شکیلہ نے یہ کہا تھا اور کس دل سے کہا تھا کہ ابھی چند روز پہلے ان کا جو خط مجھے ملا ہے اس کے آخری الفاظ یہ ہیں :۔

"پیارے بھائی، مجھے اپنے اختر کا بہت کام کرنا اور کرانا ہے۔ یہاں یادگار کمیٹی بنائی گئی ہے جو تین لاکھ میں اختر اور نیوی اردو ہال بنا رہی ہے۔ اشاعت کے لئے بہت سا پروگرام ہے۔ آپ دونوں کے خطوط بھی میں شائع کرا رہی ہوں۔ پیارے بھائی، مجھ کو خط لکھتے رہئے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی"۔

اختر کے جو چند پرانے خطوط میرے پاس یہاں موجود تھے اور وہ جو ۵ اگست ۱۹۷۰ء کو انہوں نے آخری خط شکیلہ سے لکھوا کر بھیجا تھا اور اس کے علاوہ ان کی علالت اور اس کے بعد کے چند دل ہلا دینے والے شکیلہ کے خطوط یہ سب میں نے ادارہ ماہنامہ روز کو دے دیئے ہیں ان میں سے متعدد خطوں کی عکسی تصویر یا نقل اس خاص شمارے میں شامل ہیں۔ پھر بھی میں دو خطوں کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو ۲۵ جون ۱۹۷۱ء کا خط جس نے مجھے کچھ عجیب الجھن میں مبتلا کر دیا۔ میں نے بھی شکیلہ کو ۲۵ جون کو ایک دستی خط روانہ کیا تھا اور اُدھر سے انہوں نے بھی اسی تاریخ کو مجھے ایک دستی خط بھیجا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک نہ میرا خط ان کو ملا تھا نہ ان کا مجھ کو مگر جو دیکھا تو دونوں خطوں کا مضمون، یہاں تک کہ الفاظ تک، تقریباً ایک سے ہیں، ہو سکتا ہے کہ محض اتفاق ہو مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اختر ہی کی محبت کا ایک کرشمہ ہے۔ ویسے تو یہ سارا خط ہی تڑپا دینے والا ہے۔ لیکن جب میں نے اس کا یہ حصہ پڑھا تو ضبط نہ کر سکا۔

"میرے بھائی، تمہارے اختر کو بنگلہ دیش کے المیئے نے مارا۔ وہ بڑا حساس اور غیور تھا۔ تین مہینے تک وہ ساری ساری رات تڑپ کر جاگتا رہا۔ اختر نروس بریک ڈاؤن میں مبتلا ہوگیا۔ وہ کبھی بھی فالج کے مرض میں گرفتار رہ ہوا تھا۔ ہلکہ لو بلڈ پریشر ہی رہا۔ پھر فالج کیسے آتا؟ کلکتہ، دہلی، پٹنہ اور مدراس کے نیورو اجی انسٹی ٹیوٹ میں سینکڑوں جانچ پر بھی کوئی مرض نہ نکلا، مرض وہی تھا بنگلہ دیش کا المیہ۔ پیارے بھائی مجھ کو تمہارے اختر کا بہت سا کام کرنا ہے۔ میرا ساتھ دو۔ تمہارے اختر کے نام سے تین لاکھ روپے میں یادگار بنائی جا رہی ہے۔ بہت سے کام کرنے کا ارادہ ہے۔ انجمن اردو اور اردو اکیڈمی مل کر کر رہی ہے۔ تم اپنے اختر کے بہت پیارے شریک ہو۔ تم مجھے بھول نہ جانا۔ اب اور کیا لکھوں۔ بدنصیب تمہارے اختر کی شکیلہ"۔

کیا واقعی بنگلہ دیش کا المیہ اختر کے لئے جان لیوا ثابت ہوا؟ اٹلی سینی ٹوریم میں اختر کو جب میری غم خواریوں کی ضرورت تھی تو میں نے اس کا ساتھ دیا مگر اب جبکہ اس کے ادبی مشن کی تکمیل کے لئے شکیلہ نے اپنی زندگی وقف کرنے کا عہد کیا ہے اور وہ مجھے ساتھ دینے کے لئے پکار رہی ہے تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میرے لئے تو یہ بھی ایک المیہ ہی ہے!

شکیلہ کا دوسرا خط پہلی اگست ۱۹۷۱ء کا ہے جس میں ان کے چند اشعار بھی ہیں جو بقول انہی کے "ایک بدنصیب بیوی کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں دل کے ٹکڑے ہیں"۔ میں پھر یہ یاد دلا دوں کہ یہ ایک گاؤں کی اس لڑکی کے جذبات ہیں جس نے کبھی پرائمری اسکول کی بھی شکل نہیں دیکھی اور نہ گھر ہی میں جس کی تعلیم کا کوئی مخصوص انتظام تھا۔ یہ کہنا اور سمجھنا بالکل غلط ہوگا کہ شکیلہ کو ادبی دنیا میں اس کا نمایاں مقام محض شکیلہ اختر ہونے کی وجہ سے ملا۔

جی نہیں، ایسا نہیں ہے۔ شکیلہ کو قدرت ہی سے کچھ ایسی غیر معمولی صلاحیت عطا ہوئی ہے جو باوجود اس کی زندگی کی لا محدود بے کیفیوں کے خود بخود پروان چڑھتی رہی، ہاں، اختر کی بے مثال رفاقت سے اس کی حوصلہ افزائی ضرور ہوتی رہی ۔ میں اکثر اختر سے کہتا تھا کہ یہ سمجھو کہ شکیلہ کو شکیلہ آختر بنانے میں تمہاری اپنی شخصیت کو بھی دخل ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ تم خود اپنا نام بجائے محض اختر کے "اختر شکیلہ" رکھ لو اور اگر اس سے تمہاری شخصیت کے متعلق کسی غلط فہمی کا اندیشہ ہو تو پھر اختر اورینوی کی جگہ "اختر شکیلوی" لکھا کرو۔"

اختر اور اس کے دوستوں میں بالخصوص میرے لئے ایک وقت بڑی آزمائش کا بھی آیا یعنی وہ وقت جب ہم لوگوں کو ایک نامعلوم مدت کے لئے جدا ہونا پڑا۔ یہ ۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا۔ اگر اس وقت یہ معلوم ہو جاتا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے تو شاید کلیجہ پھٹ جاتا۔ اور آج میں گزری ہوئی ساعتوں پہ خون کے آنسو بہانے کے لئے موجود نہ ہوتا۔ میں کراچی آنے سے پہلے دلی سے لکھنؤ گیا اور وہاں سے پٹنہ۔ مقصد اختر سے ملنا ہی تھا۔ مگر اس مختصر سی ملاقات سے کسی کی بھی سیری نہیں ہو سکی۔ میں واپس لکھنؤ آیا اور دوسرے روز بعد اختر بھی وہیں پہنچ گئے تاکہ آخری وقت تک میرے ساتھ ہی رہیں۔ ان کے ساتھ ہم دونوں کے عزیز ترین اور قدیم ترین مشترک دوست سید حسن[1] بھی تھے، دو تین روز کے بعد کراچی کے لئے روانگی تھی۔ لکھنؤ اسٹیشن کا وہ حسرت ناک سماں اب تک یاد ہے۔ اختر کی آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔ اس نے کس محبت سے مجھے پیار کیا اور کرتا رہا۔ ریل روانہ ہو گئی اور ہم لوگ دور تک حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے اور بس دیکھتے رہے۔ میں تو اب تک اسی طرف دیکھ رہا ہوں کیونکہ ہم دونوں کو اس کے بعد پھر کبھی ملنا نصیب نہ ہوا۔

اختر یوں تو ہر شخص سے محبت کرتے تھے، خواہ ان کو کسی سے نقصان ہی کیوں نہ پہنچا ہو، لیکن ان کو اپنے استادوں اور دوستوں سے اور اس کے بعد اپنے شاگردوں سے بھی بے انتہا محبت تھی۔ میں نے ان کو سب سے زیادہ پروفیسر کلیم الدین احمد کا مداح پایا۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ مجھ کو جو کچھ ملا ہے وہ سب کلیم صاحب ہی سے ملا ہے اور واقعی یہ بہت حد تک صحیح بھی ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کی گراں بہا شخصیت پہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی کو بجا طور پر ناز ہے۔ خدا ان کی عمر میں برکت دے۔ اختر کا ان کے ساتھ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن ہم لوگ ان کے والد ماجد حضرت استاذی جناب ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم و مغفور کے "دربار" میں حاضر تھے اور وہ دنیا کی مشہور عمارتوں کے متعلق بڑی دلچسپ گفتگو فرما رہے تھے۔ اسی سلسلہ میں خود ان کے مکان کا ذکر آ گیا جو دیکھنے میں واقعی بہت خوبصورت نظر آتا تھا۔ ہم سب ہی اس کی تعریف کر رہے تھے۔ لیکن اختر نے ایک نئی بات پیدا کی یکایک بولے "حضور، آپ کو اللہ تعالیٰ نے طور بھی عطا کیا ہے اور کلیم بھی۔" ڈاکٹر صاحب قبلہ نے اختر کی طرف دیکھا اور بے ساختہ مسکرا دیئے مگر کچھ بولے نہیں۔

پٹنہ چھوٹنے کے بعد میں مستقل طور پر "ستم ہائے روزگار" ہی کا شکار رہا۔ کلکتہ میں رہا، کچھ دن دلی میں۔ پھر کراچی۔ یہاں سے لندن اور بہت دنوں باہر رہنے کے بعد پھر کراچی۔ زندگی کی یہ طویل مدت کافی بے کیف گزری اور اب تو موت و زیست میں کوئی فرق بھی محسوس نہیں کرتا ہوں۔ ایک بار اختر ہی نے کسی خط میں لکھا تھا کہ "اب تو دنیا بھی عنقی ہی نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی اس خیال سے زندہ رہنے کو دل چاہتا تھا کہ میرے کچھ عزیز ترین احباب پٹنہ میں کم سے کم زندہ تو ہیں مگر اب جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد اپنے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں معلوم ہوتا۔ آخر کس لئے زندہ رہوں اور کیوں زندہ رہوں؟ مگر پھر بھی قسمت میں جو جینا ہے جئے جاتا ہوں۔" میں نے اس طرح شکیلہ کے ایک خط کے جواب میں جب خود اپنی اس کیفیت کا اظہار کیا تو انہوں نے اپنے دوسرے خط میں (جو اس شمارے میں کہیں پہ آپ دیکھیں گے) مجھے لکھا ہے کہ "آپ ابھی نہ جائیں میں وہاں جا کر سب ٹھیک کر لوں گی تب آئیے گا۔

---

(۱) پروفیسر سید حسن - صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی ۔

ابھی نہیں۔" کیا خوب! یہ تو مجھے کہنا چاہئے تھا جو صرف اس لئے زندہ ہے "زندگی کی بندگاری بے غنیمت سمجھو"۔

ان دنوں میں جب اختر کے لئے کچھ لکھ رہا ہوں یا یوں کہئے کہ بس لکھے جا رہا ہوں، میرے ایک بہت ہی عزیز دوست اور بہت ہی پرانے ساتھی محسن (یعنی ڈاکٹر سید محمد محسن جو اس وقت ہندوستان کے ممتاز ترین ماہر نفسیات سمجھے جاتے ہیں) کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد حسین سلمہ جو ماشاء اللہ علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں) کراچی آئے ہوئے ہیں۔ ان سے مل کر بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔ محسن کی معصوم سی صورت نظروں کے سامنے آگئی اور جب محسن کی تصویر سامنے ہو تو اختر کا تصور ناگزیر ہے "کاشانہ" کی ہنگامہ آرائیاں یاد آگئیں۔ پروفیسر مسلم مرحوم اور جناب عبدالباری محمد ساقی مرحوم کے ساتھ اختر کی وہ بھکڑ یاد آگئی۔ وہ دعوت بھی یاد آئی جو اختر نے محسن کی تقرری کی خوشی میں کی تھی اور جس میں انہوں نے شکیلہ سے وعدہ کیا تھا کہ صرف چار پانچ دوست مدعو کئے جائیں گے مگر آئے تقریباً پچاس اور پھر وہ بھی ایسے جو کھانے کے معاملہ میں تکلف کے بالکل قائل نہیں تھے شکیلہ نے اس دن لقمہ گئی خیر تو لی مگر عزت بھی رکھ لی۔ اسی کے بعد ہماری قوم نے شکیلہ کو "شاہی باورچن" کا خطاب دیا تھا۔ چاہتا ہوں کہ اب یہ ساری باتیں بھول جاؤں، لیکن کیسے بھول جاؤں؟ "انہی کی یاد میری زندگی ہے!" جب حسین سلمہ اپنے وطن واپس جائیں گے (جہاں وہ وطن تو اب انہی کا ہے) تو محسن اور میرے احباب سے یہ تو ضرور کہہ دیں گے میں یہاں بظاہر ابتک زندہ ہوں اور یہ بھی کہ "آنا ہو تو آجاؤ ایسے میں ابھی..." ایک عرصہ سے یہ خوشخبری بھی سنائی دے رہی ہے کہ ان شاء اللہ سید حسن بھی عنقریب آنے والے ہیں۔ وہی سید حسن جو لکھنؤ اسٹیشن پر میری اور اختر کی آخری ملاقات کے عینی شاہد ہیں۔ یہ آئیں گے تو یہ بھی اپنے ساتھ یادوں کی ایک بارات لے کر آئیں گے۔ یہ اختر کے ۱۹۲۳ء کے ساتھی ہیں اور میرا ساتھ ۱۹۲۶ء میں ہوا ہم لوگ بھی اب آثار قدیمہ ہی میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ایسی عمارت جو کبھی شاندار ضرور تھی مگر اب اس کے صرف کھنڈرات باقی ہیں!

یہ بھی عجیب بات ہے کہ میں نے اس مضمون میں ابتک اختر کی تخلیقی صلاحیتوں یا ان کی کسی ایک تصنیف پر بھی تبصرہ نہیں کیا۔ میں نے یہ خدمت ان لوگوں کے لئے چھوڑ دی ہے جو اختر کو کم اور ان کی تصانیف سے زیادہ واقف ہیں۔ میں نے پہلے بھی اور اب بھی اختر کو ایک غیر معمولی انسان اور ایک بہت ہی پیارے دوست کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کے سارے افسانے خود ان کی ذاتی زندگی اور راہنی کے دور کی عکاسی کرتے ہیں اختر تو خود ایک کتاب ہیں جو میں نے شروع سے آخر تک پڑھی ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ اسی ضخیم کتاب کے مختلف ابواب کے تھوڑے سے اقتباسات ہیں۔

ادھر بہت دنوں سے اختر کے متعلق بہت ہی بھیانک خبریں آتی رہیں مگر میں نے ان کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ مجھے تو انکی سینی ٹوریم کے زمانہ کی ڈاکٹر موتھو کی وہ رپورٹ یاد تھی جس میں انہوں نے اختر کے متعلق لکھا تھا کہ "یہ اس لئے نہیں مرے کہ انہوں نے مرنے سے انکار کر دیا۔"

(HE DID NOT DIE BECAUSE HE REFUSED TO DIE)

میں نے خود بھی ان کو بارہا موت سے آنکھ مچولی کرتے دیکھا تھا اس لئے کیسے یقین کر لیتا کہ کسی موسم کے سامنے وہ اتنی آسانی سے اپنی ہار مان لیں گے؟ پھر ۱۹۵۳ء میں جب اختر نے اپنی ایک تصنیف "سراج و منہاج" مجھے بھیجی تو اس کے پہلے ورق پر مجھے ایک مختصر سا خط بھی لکھا جس کا آخری فقرہ یہ تھا کہ "موت سے پہلے انشاء اللہ ایک بار تم سے ضرور ملوں گا۔" اس خط کی عکسی تصویر بھی اس شمارے میں کہیں نہ کہیں نظر آجائے گی اس کے بعد بھی میں کیسے یقین کر لیتا کہ وہ اپنا وعدہ بھول جائے گا؟ بہر حال قدرت نے اختر کی قوت ارادی سے انتقام لینے کی ٹھان لی تھی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئی۔ غضب تو یہ ہوا کہ اسی قدرت نے جو اس کو قیمتی نعمتوں سے نوازا تھا یعنی قوت بیان اور زور قلم اس نے اس سے یہ دونوں اثاثے واپس بھی لے لئے وہ دیکھتا تھا مگر بول نہیں سکتا تھا۔ وہ سوچتا تھا مگر لکھ نہیں سکتا تھا۔ مجھے ان حسرتناک تبدیلیوں کی خبریں ملتی رہتی تھیں مگر دل نے کبھی ان کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دی۔ آخر کار وہ وقت بھی آگیا جس کے لئے خود وہ تو تیار تھا لیکن دوسرے نہیں تیار تھے۔ اس طویل کہانی کا انجام آخر یہ ہوا کہ ؎

نالوں کی کشاکش سہہ نہ سکا، خود تار نفس بھی ٹوٹ گیا
اک عمر سے تھی تکلیف جسے کل شب کو وہ قیدی چھوٹ گیا

عکسِ تحریر

۱۰- دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء

عکسِ محبت

(شرف الدین احمد شرف عظیم آبادی)

اختر اورینوی

اختر کے چند خطوط

۱۹ مارچ [illegible]ء

پیارے شرف! السلام علیکم!

تمہارا نہایت ہی دل فریب خط تین صدیوں سے گزر کر مجھے گزشتہ صدی میں ملا تھا۔ بھائی ہم لوگ اصحاب کہف سے کم نہیں۔ ان پر بھی صدیاں گذری تھیں اور ہم لوگوں پر بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آج کل مہینے صدیوں کے قائم مقام ہیں۔ الاماں! زمانہ کی برق رفتاری سے فریاد!

تم نے دسمبر کی صدی میں ابتدائے تحریر کی تھی اور ختم کلام ہوا فروری کی صدی میں۔ میں تو بس ایک ہی صدی بعد تمہیں جواب دینے بیٹھ گیا شرف! لکھنؤ کے پلیٹ فارم پر تمہارے رخسار پہ میں نے ایک بوسۂ وداعی ثبت کیا تھا۔ اس بوسہ سے لے کر اس دم کی ٹھنڈی سانس تک کیا کیا نہیں بیت گیا کیسی گذری۔ اس کے مقابلہ میں پرانی تاریخ ہند تو محض ایک مضمحل سا دیباچہ معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایک سکنڈ ایک طوفان بلا کی طرح گذرا ہے، اور لمحہ لمحہ اسی انداز کے امکانات لئے گذر رہا ہے۔

شدت غم ہو مستقل کاش تو صبر کیجئے　　　دیکھئے کون سی بلا آتی ہے اس بلا کے بعد

اطہر اس طرف لاپتہ ہیں۔ جنوری کے اواخر میں آئے تھے تو پابہ رکاب سے معلوم ہو رہے تھے۔ عزم قیلہ تھا۔ غالباً وہ مئی کے اواخر میں پر تولا ہید اہل اور یں اور اہل پام ولا اٹل ہیں بفضل سلمہ بھاگلپور میں مقرر ہوئے ہیں۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ اس سلسلہ میں خط و کتابت میں نہایت ہی احتیاط برتو۔ تم لوگ "کبوتر بام حرم" ہو۔ "مرغ رشتہ برپا" کی حالت کو بھول جاتے ہو۔ اشارہ کنایہ، دعوت، سب سے پرہیز کرنا چاہئے نظر کراچی ہے۔ اللہ بس باقی ہوس! ہم لوگوں کے لئے دعائے خیر کرتے رہو۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔

میں گزشتہ دنوں دو بار پٹنہ سٹی بلایا گیا۔ ایک بار ۱۱ مارچ کو عین صدر گلی سے ہوتا ہوا کشمیری کوٹھی گیا۔ انجمن میں سیرت رسول کریم پر تقریر کی بہت سے جانے پہچانے ہوئے لوگ ملے۔ تم بہت بہت یاد آئے۔ کیسی قیمتی ساعتیں گذر گئیں شرف! کیسے پیارے دن! کیسی انمول راتیں!

دوسرے دن چھوڑ کر تیسرے روز پچھم دروازے میں نواب اسمٰعیل صاحب کے در دولت پر اینگلو کے طلبا نے ذکر رسول صلعم کا جلسہ کیا تھا۔ کار ڈ دیکھنے کے قابل ہے۔ "پٹنہ سٹیٹ نمایاں۔ گیا گذرا بھیر عظیم آباد ہے! دیکھنا میرا کیا حشر کیا ہے" ملاحظہ ہو "سلطان الذاکرین... الخ" میں نے بہت ہی سمجھایا کہ خدا کے لئے آئندہ تو کسی بھلے مانس کو "بن مانس" مت بنایا کیجئے۔ بہر کیف میں نے عمدہ تقریریں فرمائیں، کاش تم ہوتے!

بزرگوں کو سلام کہو اور بچوں کو دل دعائیں ——— تمہارا اورینوی

پٹنہ ۱۱ر نومبر ۵۴ء

شرف پیارے ، سلام و رحمت !

تم گئے ، اطہر گئے ، تمنائی روانہ ، سوز وہاں کی ہو رہیں ، مشرف گومتی کو بھول گئیں ، شمیم جا کے آئیں ۔ مگر نگاہیں اُدھر اور پر تولنے کو تیار ۔ آج پرواز کر گئیں ۔ کل عظیم آباد وہ وریس اور اس پر یہ ستم کہ خطرناک خاموشی ! کبھی کبھار تو یعنی کشت زعفران تحریر بنو ۔ بعض دفعہ تم دردناک طور پر یاد آتے ہو ۔ اطہر سے ملاقات گرمیوں میں ہو گئی تھی ۔ تمنائی بھی ان دنوں تھے ۔

آج تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا ۔ مگر تم نے میرے دو خطوں کو خالی دیا اسی ڈر سے جی بھر کے بات کرنے کی ہمت نہیں ۔

سب پیاروں کو پیار ، اور پیاریوں کو ؟

والسلام تمہارا اختر

پٹنہ ۲۴ر جون ۱۹۵۵ء

شرف پیارے ! سلام و رحمت !

میں تمہاری سرزنش کیا کروں جبکہ خود بھی برابر کا مجرم ہوں ۔ یا شاید مجرم زمانہ ہے ۔ ہم لوگ اس قیامت خیز دور کے ہاتھوں ، اس طرح بچھڑے کہ [illegible] کی پناہ ۔ انقلابات ہیں زمانے کے ۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تم مع مال عرب ، لندن پر آ بجے ، مگر ہم لوگ ایسے گھوسٹ کیوں ہو گئے کہ آدھی ملاقات بھی نہ [illegible] کرتے ۔ معلوم نہیں اب تمہارے سر میں کتنے بال حاشیہ نشین ہیں ۔ میں پھر سبک سر ہوا جاتا ہوں مگر ابھی تمہارا مقام حاصل نہیں ہوا ۔ اللہ [illegible] ۴۷ء کے بعد تم سے ملاقات نہیں ہوئی ۔ لکھنؤ کا اسٹیشن یاد آتا ہے کیا ہم اس طرح رخصت ہوئے تھے کہ بالکل ایک دوسرے کے لئے انجانی [illegible] پریشان گمان بھی نہ تھا ! شرف ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم مر چکے ہیں اور اب عالم ارواح میں ہیں ۔ میری اور تمہاری ۲۱ برس ، ۲۲ تک کی زندگی [illegible] لیکن پھر وہ اندر سے کسک کیوں پیدا کرتی ہے ؟ خاکستر وقت کے اندر سے چنگاریاں کیوں پھوٹنے لگتی ہیں ؟

پیارے شرف ! ہم اور شکیلہ تمہیں بے حد یاد کرتے ہیں ۔ اردو تو لٹ گیا ۔ اس کی بہار ساری تمہارے ہی ارض مقدس سدھارے ۔ بس [illegible] بام ولا استار خدیجہ کی طرح ہے اور ہم ہیں نقش بر دیوار ۔ عظیم آباد بھی بدل رہا ہے ، بدل گیا ہے ۔ اور ویسا ہی بھی ہے ۔ لیکن ہمارے لئے تو [illegible] عظیم آباد نہ جانے کہاں گیا ، وہ ہماری صحبتیں ! شرف ! کبھی ملو ، کہیں ملو اور خوب دل کھول کر لپٹ کر رو لیں ۔ اظہار جذبات کے لئے یہ کال [illegible] کافی نہیں ، اُجلے آنسوؤں کی ضرورت ہے ۔ ہمارے دل سمندر کی طرح گہرے ہیں !

کچھ لکھو تو پھر اور حالات لکھوں ۔ شکیلہ آرول گئی ہیں ۔ میں کام کے سلسلہ میں یہیں ہوں ۔ کالج ۶ر جولائی کو کھلے گا ۔

آفاق اور بچوں کو بہت بہت پیار ! مشرف کہاں ہیں ؟ اسد سلمہ سے تمہارا پتہ معلوم ہوا ۔

تمہارا ۔ اختر

پٹنہ ۱۸ر جنوری ۱۹۶۰ء

شریر شرف !

تم خاموش کیوں ہو گئے ؟

مجھے بتاریخ ۱۳ر جنوری بروز اتوار ۵ بجے شام ریڈیو پٹنہ سے سنو ! مشاعرہ راج بھون سے ۵ بجے شام کو نشر ہوگا ۔ گھنٹہ بھر !

سب کو پیار !

تمہارا اختر اورینوی

۲۵ر اکتوبر ۱۹۶۳ء

بہت پیارے شرف! السلام علیکم!

ایک زمانہ گزر گیا کہ تمہیں خط لکھا تھا اور تمہارا خط آیا تھا لیکن صدیاں بھی بیت جائیں تو بھی جب تمہیں لکھنے بیٹھوں گا تو ایسا محسوس ہوگا کہ تم سے رسم و راہ تازہ و شگفتہ ہے۔ تمہارے رخساروں پر لیا ہوا ہر بوسہ بوسے کی طرح شاداب و دلربا ہوتا ہے۔ رضا بھاگتا ہوا آیا، بدحواس، تمہارا پیارا خط لئے ہوئے، اسے خط ملا، اس نے تین بار پڑھا، اسے وجد و حال آنے لگا۔ اب مسرت کا مارا میری طرف دوڑ پڑا۔ یہ تو خیر گزری صحرا کی راہ نہ لی۔ ان دنوں حضرت پے در پے بڑے رہے ہیں، نمبر نکال رہے ہیں، فرماتے ہیں، روپوں کا سامان نہ ہوا تو اپنا خون بلڈ بنک میں جا کر بیچ لوں گا۔ اب وہ منزل آگئی ہے کہ انہیں زنجیر پہنائے اور ایک طبیب کو ہر وقت ان کے ساتھ رکھے۔ فی نفسہ یہ خود کھلوانے پر تلے ہوئے ہیں، طبیبِ طبیعتے ذمہ دارانہ طور پر صرف دوسرے لوگوں کو متنبہ کیا کرے گا کہ اب بھی لوگوں کو جنون ہوتا ہے۔ تو خیر رضا میرے ہاں نہایت غلط وقت پر نازل ہوئے، سیدھے کمرے میں وارد ہوئے، فرمایا۔ وہ مارا شرف کا خط آ ہی گیا، کیا ظالم ہے۔ وہ بے تحاشا خوش ہو رہا تھا۔ میں نے کہا شرف کا قصیدہ پڑھنے سے پہلے اس قائل کا خط تو پڑھو۔ نشتر دل میں پیوست کرو۔ ایک میر درد ہوا کرتا تھا اور ایک شرف عظیم آبادی ہے۔ نشتریت ان دونوں میں ہے ایک شعر میں نشتر چھپاتا ہے اور دوسرا نثر میں۔ دونوں سہل ممتنع لکھتے ہیں۔ تو تمہارا خط پڑھا گیا۔ ایک ایک سطر پر ہم لوگ ہنسے، روئے، پھر ہنسے، پھر دل کوٹ کر اور پھوٹ پھوٹ کر روئے اور تمہیں بے محابا گالیاں دیں۔ تاریخ کو کوسا۔ سیاست کو صلواتیں سنائیں اور ایشیا والوں کی عقل کو روئے ہائے ماؤنٹ بیٹن نے کیا "مس ہاشن" کیا!

ع – "رو مہیلا کس قدر ظالم، جفا جو، کینہ پرور تھا!"

بہت دیر میں خط ختم ہوا۔ ہم لوگ روتے پیٹتے، ہنستے، قہقہے لگاتے رہے۔ میرے سر میں درد تھا۔ اچھا ہو گیا۔

ڈھاکہ سے غلام عبدالواسع صاحب وکیل درزی ٹولہ "اتفاقاً" آئے ہوئے تھے۔ ہم لوگ ان سے ملنے گئے۔ تمہیں اور عہد ماضی کو بہت بہت یاد کیا گیا۔ اس روز عجیب عالم رقت طاری رہا۔ گداز دل کا عالم نہ پوچھئے۔

مگر تم موذی ہو تمہیں اپنی صحت کی فکر نہیں۔ تم جتنے اچھے ہو اپنے معاملہ میں اس سے زیادہ برے ہو۔ نامعقول!

تو رضا اختر نمبر نکال کر مجھے، تمہیں، اپنے کو رسوا کرنا چاہتے ہیں اور شکیلہ و گوپیاں اردو کو بدنام۔ اب انہیں کون سمجھائے۔ جو رسوائی ہیں ان کا ہاتھ نہ بٹائے اسے کاٹنے دوڑتے ہیں۔ انہیں اپنے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مضامین مع تازہ ترین فوٹو کے بھیج دو۔ حکم ہے رجسٹری بھیجو ورنہ بھوت کی طرح سر پر سوار ہوں گے۔ اور تمہاری مع تمہاری مہر اور کے، عزت اتار لیں گے۔ دوسرا حکم ہے کہ "شرف، تمنائی، اطہرؔ کی اکٹھی تصویریں بھیجی جائیں۔ اور تیسرا یہ کہ سکھی، نسیمہ سوز، مرزا ادیب اور آفاق بیگم سے میرا کچا چٹھا لکھوا کر میرے خلاف مقدمہ دائر کرایا جائے۔ چوتھا یہ کہ تمنائی، اطہر بھی بانگ دیں اور اسے ٹیپ ریکارڈ کر کے ضبط تحریر میں لایا جائے۔ غرض یہ کہ تم پر عذاب نازل ہوا ہے رستگاری کی دعائیں کرو۔

کم بخت! میں اب عہد کرتا ہوں کہ تمہیں ہر مہینہ ایک عتاب نامہ لکھوں گا۔ اور تم کیا کرو گے؟

سنو! میں تمہیں اپنی کئی کتابیں بھیجنی چاہتا ہوں بھیجوں؟ نظموں کا مجموعہ دلی میں چھپ رہا ہے۔ اس میں کنواری چاندنی، گوپیاں اور سوتی اور لکھنو اور ... بہت کچھ ہے۔ 'سکھ جھوڑ' افسانہ تم نے پڑھا؟ ادھر ہی بہت چھپا تھا۔ اس میں غفور میاں ہیں۔ اختر نمبر کے لئے علیموا

اور غفورا کے خوٹو بھی نکلوا رہے ہیں۔ اب کے وہ اردل چلے گئے تھے۔ اب موسم خزاں ہیں۔ اپنے اپنے نصیب!

بچوں کو دعائیں! بیگم کو پرشوق سلام۔ شکیلہ اور رضا تم سب لوگوں کو سلام و کلام و بدکلام لکھواتے ہیں۔ زندہ رہو۔ ارے یار کبھی آدشاہ کی املی اور پچھو باغ، میں بھی آؤں، وضو کر چکا ہوں، نیت باندھ لوں گا۔

تمہارا اختر

پٹنہ ۹ جنوری ۱۹۶۵ء

پیارے شرف! السلام علیکم!

رضا نقوی نے وصال ذہنی کی فضا پیدا کر دی اور ہم لوگ سینکڑوں ہزاروں میل دور بسنے والے بھی پھر ایک بار بغل گیر ہوئے، ٹوٹ کر ملے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ خوب بھیجا تم، رضا، یحییٰ، اطہر، تمنائی، ہیں، شکیلہ اور آفاق۔

چند دن ہوئے تمہیں اور آفاق کو خواب میں دیکھا۔ بالکل جوان اور رعنا، تر و تازہ، گزرے ہو زمانہ کے حسن میں نہائے ہوئے تم دونوں ٹے، میں نہال نہال تھا۔ اور تمہاری زبان میں "گارڈن گارڈن" میں تم سے بار بار لپٹا۔ بہت ڈھیر سی باتیں کیں اور ہنستے رہے، صبح کو نیند ٹوٹی تو مسرت کی خوشبو میرے وجود پر طاری تھی۔ اس خواب کی لذت نہیں بھولتی۔ میں نے فارم منگوا لئے اور اب پروانہ راہداری کے لئے درخواست دے رہا ہوں فراق اب برداشت نہیں ہوتا۔ ممکن ہے تم سے وسط جون میں آکر گلے مل لوں اور بے قراری بڑھ گئی تو ہولی کی چھٹیوں میں ہی بھاگ کھیل لوں۔

کیا مضمون لکھا تم دونوں نے! ارے واہ! ارے واہ! تم سے بہتر آفاق نے اور ان سے اچھا تم نے اور سب سے اعلیٰ تم دونوں نے۔ آفاق میں بڑے امکانات تخلیق پوشیدہ تھے۔ اس مضمون کی پیدائش نے نئی رونقیں پیدا کر دیں۔ لگے ہاتھوں بی مشرف صاحب بھی کان میں کچھ کہنا نقارہ بھی کھلیتیں اور مجھے رسوا کرتیں۔ اور سکھی کیوں خاموش ہوگئیں؟ دامن یوسف چاک ہوتا ہی ہے تو سب مل کر اس کی دھجیاں اڑائیں، اس جہنم کی ساری زلیخائیں۔

رضا دن رات جٹے ہوئے ہیں۔ خوب خوب مضامین ملک بھر سے جمع کئے ہیں۔ ہند پاک کلچرل اتحاد کی مثال قائم کرنا چاہتے ہیں۔

جن کرسمس میں آرہ اور اردل گیا۔ فضل سلمہ نے تمہارے اردلی کرداروں عفو رعلیہ کے فوٹو کھینچ لئے، رسول، پام والا، اور بن کی پہاڑی اور کاکو میری جائے پیدائش کی تصویریں بھی اتروائی گئی ہیں۔ رضا مجھ پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ جلیئے جی عرس کرنے کے کیا معنی د

کاش تم یہاں ہوتے شرف! رضا کی وحشت دیدنی ہے، تم بھی باؤلے ہو جاتے۔ آؤ نا فروری میں، پھر ہم ساتھ چلیں گے، یا مارچ میں آؤ۔ ہولی ساتھ کھیلو، تم اور آفاق آجاؤ۔ میں نے تمہارے آنے کا خواب جو دیکھ لیا ہے، اب خواب کو حقیقت بناؤ۔ اور مجھے بچا کر دکھاؤ۔ شکیلہ بھی تم لوگوں کو بلاتی ہیں۔ وہ ایک قوم کی خانہ داری میں بے حد مشغول ہیں۔ قوم کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اُن کی بیٹیں اور بھاوجیں بار ور ہیں ماشاء اللہ!

آفاق سے شروع کرو اور براہ تمنائی و اطہر، یحییٰ تک سلسلہ بوسہ و معانقہ دراز کرو۔ میری اور شکیلہ کی دعائیں بچوں کو کہو، اور ہماری طرف سے پیارے کو پیار کرو۔ اچھے شرف! خدا حافظ! تمہارا اختر

پٹنہ، ۵ اگست ۸۵ء

پیارے شرف السلام علیکم

تمہارا پرلطف خط ملا اور مضامین کے تراشے بھی، تم واقعی جوان ہوتے جارہے ہو۔ میں مُسلم بھائی کے قول کے خلاف نہیت بوڑھا ہوچکا ہوں۔ چارسالوں سے مسلسل بیمار ہوں کوئی پارکنسن بتاتا ہے اور کوئی سایئکلوجیکل مگر نتیجہ واحد ہے یعنی بیکاری و مجبوری۔ پھر میری آنکھ کی روشنی بھی خراب ہوگئی ہے ہاتھوں کے لرزنے کی وجہ سے خود بھی خط نہیں لکھ سکتا، شکیلہ سے لکھواتا ہوں سچ مچ مرحومین میں داخل ہوچکا ہوں۔

تم نے بہت اچھا کیا جو اپنا مکان بنالیا، پھر پنشن کے بعد تو تم وہیں چلے گئے ہوگے، میں نے بھی ایک مکان باٹلی پتراکولونی میں بنایا مگر وہاں جانے کی توفیق اب تک نہیں ملی، ججو باغ ہی میں پڑا ہوا ہوں محسن بھائی نے بھی اپنے آبائی مکان ہی میں مکان بنالیا ہے اور اسی میں رہتے ہیں وہ بھی ریٹائر ہوچکے ہیں لیکن یونیورسٹی گرانٹ کمیشن میں کام کر رہے ہیں ماشاء اللہ سے بڑے ایکٹو ہیں خوب خوب غزلیں لکھ رہے ہیں، میں تو بالکل ناکارہ ہوں، پنشن تو مجھے مل چکی ہے۔ یو۔ جی۔ سی میں بھی نام آیا لیکن بدقسمتی سے اب تک کام کرنے کی صلاحیت نہ پاسکا ہوں۔

ارول کی یاد دلاکر تم نے ستم کردیا، اب ارول میں کیا رکھا ہے؟ بس وہاں ایک خورشید ہیں، وہ شیشم کا درخت ہی کٹ گیا جس سے لپٹ کر تم نے رونے کو لکھا ہے اور جس کے نیچے بیٹھ کر ہم تم تازہ تازہ کتاری کھایا کرتے تھے اور جس کا کھانا تمہارے بس کی بات نہ تھی۔ کراچی کا ارول ماشاء اللہ زیادہ آباد ہے، پچھلے سالوں عزیزہ نگار کراچی جاتے ہوئے میرے اس غریب خانے پر آئی تھیں معلوم تم سے ان کی وہاں ملاقات ہوئی یا نہیں، سون میں تمہارے بغیر نہانے کا کیا لطف ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اب تو دو قدم چلنے کی بھی طاقت ہی نہیں ہے۔ ارول دادی اور نانی بنکر بھی بہرحال ارول ہے اور یہ بھی تو دیکھو کہ تم خود بھی تو دادا اور نانا بن چکے ہو۔ آفاق، اطہر، تمنائی، یحیٰی وغیرہ تم کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ یہ بھی خوب کرتے ہو کہ مزاحیہ اشعار لکھتے رہتے ہو۔ چنڈال چوکڑی کے دوستوں کو میری یاد دلاؤ گے اور میرا سلام پہنچاؤ گے۔

رضا نقوی اب راہی کے نام سے زیادہ مشہور ہوگئے ہیں وہ بھی ریٹائر ہوچکے ہیں اور اپنے اسی کوارٹر میں براجمان ہیں۔ مجھ سے سالوں سے ملاقات نہیں ہوئی ہے بس اک دوسروں کو چپکے سے یاد کرلیتے ہیں۔ ان کو رکشا پر چڑھنے سے گیس کی تکلیف ہوجاتی ہے، پرانا اختلاج دم گھوٹنے لگتا ہے پیٹ پھول جاتا ہے اور میں تو سالوں سے خانہ نشیں ہوں، تشنج نے کہیں کا نہ رکھا ہر کام کے لئے دوسروں کا محتاج ہوں۔ بس یہی سمجھو کہ زندہ درگور ہوں۔

مشرف نے شادی کے بعد کوئی کارنامہ پیش کیا یا نہیں، میں تو آفاق کے ساتھ انہیں بھی یاد رکھتا ہوں۔ پیارے شرف، میری طرف سے اپنے آپ کو پیار کرلوگے اور آفاق کو بھی پیار کرلینا۔ تم نے تو ماشاء اللہ بچوں کی تعلیم و تربیت بہت اچھی کی ہے ان کی خبریں سن کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ فضل کا بڑا لڑکا نمی جو کہ میرے پاس تھا بفضلہ ڈاکٹر ہوکر کناڈا گیا ہوا ہے وینک اُور کے ایک بڑے ہوسٹل میں اُبن ہارٹ سرجن ہے۔ اللہ تعالیٰ سب پیاروں کو اپنی حفاظت میں رکھے آمین

والسلام تمہارا اختر

(اختر کے خط کے ساتھ ہی شکیلہ آختر کا یہ خط بھی منسلک تھا)

پیارے بھائی اشرف ! السلام علیکم

آپ کا پیارا خط ملا۔ آپ یقین نہیں کریں گے کہ ہم لوگوں کی تاریک دنیا میں آپ کی یاد، آپ لوگوں کی محبت اور آپ لوگوں کے ساتھ گذری ہوئی زندگی کے لمحات کتنے درخشاں نظر آتے ہیں۔ پیارے بھائی اب ہماری زندگی میں کیا رکھا ہے؟ آپ گواہ ہیں کہ شروع سے لے کر آج تک ہماری زندگی کیسی کیسی قیامتوں سے ہو کر گزر رہی ہے۔ اس وقت تو آپ لوگوں کی محبتوں کا سہارا ابھی تھا، آسمان سے ٹوٹ کر برستے ہوئے پانی میں آپ کی چھتری کی پناہ بھی تھی مگر اب کیا ہے؟ کاش آپ کے اختر کو پھر سے ٹی۔ بی ہو جاتی وہ کسی سینی ٹوریم میں پڑا رہتا مگر اس کا اپنے جسم پر قابو تو رہتا، اس کی انگلیاں چار سالوں سے قلم پکڑنے سے محروم ہیں۔ اس کی زبان تشنج سے ہر گھڑی تھرتھراتی رہتی ہے۔ آہ! میرے بھائی تمہارے اختر کا انجام کتنا بھیانک ہوا ہے؟ اور قدرت کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ۷۴ء سے اب تک ساری قیامتوں کو تمہارے اختر پر ٹوٹتے ہوئے دیکھتے رہنے کو میں زندہ بیٹھی ہوئی ہوں۔ میرے بھائی میں کیا کروں اب تک تمہارے اختر کے علاج میں ۸۵ ہزار روپے خرچ کر چکی ہوں اور اب بھی اپنا سب کچھ بیچ کر ان کا علاج کرانے کو تیار ہوں۔ میرے دکھ درد میں شریک میرے بھائی تم ہر کسی سے پوچھ لینا کہ میں نے تمہارے اختر کی خدمت میں علاج میں کبھی کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی ہے۔ میں ہی بدنصیب تھی شرف صاحب جو آپ کے اختر کو کوئی خوشی اور کوئی مسرت نہ دے سکی۔ مگر خدا گواہ ہے کہ میں نے ساری زندگی انہیں اپنی ہتھیلیوں پر رکھا ہے۔ اب اپنی اس کراہتی ہوئی زندگی سے تھک کر چین کی نیند سو جانا چاہتی ہوں۔ مگر یہ بھی قسمت میں نہیں ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ آپ لوگوں کے پاس آجاؤں آپ لوگوں سے ملوں اور جی بھر کے رو لوں۔ شاید انہی آنسوؤں میں ڈوب کر اس زندگی سے چھٹکارا ملے گا۔

میری طرف سے آفاق کو بہت بہت مبارک باد کہہ دیجئے گا۔ رضیہ کی چھوٹی بچی زرین کی شادی ابھی ۲۷؍جولائی کو ہوئی۔ برات بجنور سے آئی تھی۔ عزیز کی بڑی لڑکی نسرین کی شادی بھی اسی جگہ سے، ۲؍جون کو ہوئی ہے۔ وہ بیاہ کر بنگلور گئی۔ شرف صاحب اب تو ڈاک کھل گئی ہے اب کیوں نہیں ڈاک سے خط لکھتے ہیں۔ طبیعت بہت گھبراتی رہتی ہے۔ آپ کو اپنا پتہ لکھ رہی ہوں۔

اچھا خدا حافظ آپ کی بدنصیب بہن شکیلہ

جوابی آہ

پٹنہ ۱۵؍جون ۱۹۸۱ء

میرے پیارے اختر کی پیاری شکیلہ، سلام و دلی دعائیں!

اس وقت آپ کا آخری خط مورخہ ۵؍اگست ۸۰ء اور آپ ہی سے لکھوایا ہوا دوسرا خط اختر کا میرے سامنے موجود ہے۔ جواب دینے کی اپنے آپ میں ہمت نہیں پاتا تھا اسی لئے اب تک نہ دے سکا۔ ایسے خطوں کا جواب آنسوؤں سے لکھا جاتا ہے۔ لیکن میرے آنسو بھی تو خشک ہو چکے ہیں اور جو تھے بھی وہ ان خطوں کو پڑھتے پڑھتے ختم ہو گئے۔ مگر اس وقت آپ کو خط لکھنے کے لئے مجبور ہو گیا ہوں۔ اختر سے میں خفا ہوں اس لئے اس کو نہیں لکھوں گا بلکہ اس کے خط کا جواب میں اسے زبانی ہی دینا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے ملنے نہ آیا یا نہ آسکا تو میں اب خود اس سے ملنے جاؤں گا۔

اختر کے متعلق عرصے سے عجیب عجیب بھیانک خبریں یہاں آتی رہتی ہیں مگر جب بھی میں نے کچھ سنا تو اسے یقین نہیں کیا اور یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ اختر کے متعلق دوسرے کون ہوتے ہیں جو ایسی ایسی منحوس افواہیں پھیلاتے رہیں؟ جو بھی ہوگا وہ مجھے خود لکھے گا یا آپ سے لکھوا کر بھیجے گا اور اگر کچھ کرنا ہوگا تو وہ مجھ سے پہلے مشورہ ضرور کرے گا۔ آپ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ اس ۴۵ سال کے ساتھ میں ہم دونوں نے کوئی کام بھی تو ایسا نہیں کیا جس میں ایک کو دوسرے کی خوشی مدنظر نہ ہو، یہاں تک کہ اختر کی شادی میں بھی اختر سب سے اہم کردار کس نے ادا کیا تھا اور خود میری شادی میں بھی کس کی خوشی کارفرما تھی؟ ہم لوگ ہمیشہ ہنسے بھی ساتھ اور روتے بھی ساتھ۔ نہ جانے کتنے مضامین ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر لکھے۔ پلاٹ اس کا ہوتا تھا اور زبان میری۔ وہ برابر یہی کہتا رہا کہ "کم بخت، تیری زبان میں نہ جانے کتنے نشتر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ تو خود تو روتا ہے اور دوسروں کو ہنساتا ہے اور جب دوسرے بھی رونے لگتے ہیں تو پھر تو انہی پہ ہنستا ہے" خیر یہ تو اس کی محبت کے الفاظ تھے حالانکہ اس آرٹ کو اس سے زیادہ اور کون جانتا تھا!

ہاں تو یہ بھی سن لیجیے کہ ۱۵ اپریل کو میں ایک تقریب میں گیا ہوا تھا۔ وہاں پروفیسر مسلم مرحوم (جی ہاں، علم و فضل کا یہ گراں بہا ہیرا بھی رخصت ہوگیا) کے صاحبزادے میرے پاس آئے اور خاموش کھڑے رہے۔ پھر کہا "میں دو روز سے آپ کے پاس آنا چاہتا تھا مگر" نہ جانے کیوں میں نے خود ہی محسوس کر لیا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میں نے سن تو لیا مگر اس کو یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر دوسرے اور ایک مقامی اخبار میں بھی کچھ اسی قسم کی خبر شائع ہوئی۔ اس کے بعد کراچی کے روزناموں میں مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ ان میں سے جس مضمون نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا ہے اس کا تراشہ آپ کو بھی بھیج رہا ہوں۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور ہو رہا ہے اور ابھی ہوتا ہی رہے گا، مگر اب میں کس کس کو بتاؤں کہ یہ لوگ جو سمجھ رہے ہیں ویسا کبھی نہیں ہو سکتا، کم سے کم میری زندگی تک تو نہیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے وعدہ کر رکھا ہے کہ جب تک زندہ رہنا ہے ساتھ ہی زندہ رہیں گے اور جب مرنے کو دل چاہے گا تو ساتھ ہی مریں گے بھی۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ انکی سیناٹوریم میں جب ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اختر ۴۸ گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا تو اس نے میری خوشی کی خاطر مرنے سے انکار کر دیا تھا؟ مجھے بھی اپنے اس وعدے کا پورا پاس رہا ہے۔ دوستوں سے چھوٹنے کے بعد اب زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی ہے اور نہ اس کا کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ بس "قسمت میں جو جینا ہے جئے جاتا ہوں"۔ اور وہ صرف اس لئے کہ مجھے یقین ہے کہ اختر نے اس بار بھی میری خاطر مرنے سے ضرور انکار کر دیا ہوگا۔

شکیلہ، میں ان دنوں ایک عجیب کرب میں مبتلا ہوں۔ جو لوگ اختر کو جانتے ہیں وہ مجھے بھی تو جانتے ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اختر اور شرف دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ "ایک جان دو قالب" سنتے ضرور آئے ہیں مگر ہم دونوں کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ ہم لوگ تو ہمیشہ ایک ہی جان اور ایک ہی قالب بن کر رہے۔ اسی لئے تو ۴۶ء میں جب ادب لطیف کے ایڈیٹر فکر تونسوی صاحب نے اپنی کسی تصنیف کے لئے اختر سے خود اپنا ہی اسکیچ لکھنے کی فرمائش کی تو اس نے لکھ دیا تھا کہ "مجھ کو اگر واقعی جاننا ہے تو شرف سے کہیے۔ وہ مجھ کو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔" چنانچہ جب مجھ پر اصرار ہوا تو مجھے اپنا شاہکار "دیوار قہقہہ" لکھنا پڑا اور جن لوگوں نے ساغر نو کے "اختر اورینوی نمبر" میں اسے پڑھا ہے وہ یہی کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ اختر کی مکمل تصویر نہیں ہو سکتی۔ ہاں تو اب تقاضا یہ ہے کہ اختر کے فدائیوں کا ہر طرف سے مجھ پر شدید اصرار ہے کہ میں اختر کے متعلق پھر لکھوں اور وہ سب کچھ لکھوں جو دوسرے نہیں لکھ سکتے۔ میں سب سے کہتا ہوں کہ بھائیو اور بہنو، آپ

لوگ تو جانتے ہی ہیں کہ میں اب تک اُس شخص کے متعلق جس کو آپ اختر کہتے ہیں نہ جانے کتنی بار وہ سب کچھ لکھ چکا ہوں جو بقول اُنہی کے اس کی رُسوائیوں کے لئے کافی ہے۔ تو پھر اب رہا کیا ہے جو کچھ اور لکھوں؟ اب تو خود اختر ہی کی باری ہے کہ وہ مجھے مزید رُسوا کرے۔ یہ لوگ پھر بھی اپنی فرمائش پر تو اصرار کئے جاتے ہیں مگر میری تجویز کو سنکر سر جھکا لیتے ہیں اور بس چپ ہو جاتے ہیں۔ شکیلہ، آخر یہ لوگ چپ کیوں ہو جاتے ہیں؟ میں نے مجبور ہو کر ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۰ء کی وہ تاریخی تصویر نکالی جس سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ وہی گروپ جو میری شادی کے بعد اختر کے اصرار پر لیا گیا تھا جس میں ہم دونوں کھڑے ہیں اور آگے آپ اور آفاق انتہائی مغرورانہ انداز میں کرسیوں پر براجمان ہیں جیسے بقول اختر کے ہم دونوں کو محض خانساماں سمجھ رکھا ہے اور کوئی لفٹ ہی نہیں دیتیں۔ میں نے اس تصویر والے اختر سے بھی پوچھا کہ ارے او شریر، یہ لوگ مجھ کو تیرے متعلق اب پھر سے لکھنے کے لئے کیوں مجبور کر رہے ہیں۔ لیکن اس میں بھی وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتا رہا۔ بس صرف دیکھتا رہا۔

اچھا تو اب میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ اس کے اُن بے شمار خطوں میں سے جو چند یہاں میرے پاس موجود ہیں ان سب کا جواب ایک بار پھر وہ خط اور اپنے اختر کو براہ راست نہ بھیجوں بلکہ اس کے کچھ حصے یہاں کے اخباروں میں چھپوا دوں اور پورا خط کراچی کے مہر نیم روز کو دیدوں جس کا اختر کے لئے ایک خصوصی نمبر نکالا جا رہا ہے۔ اس کی کاپی اختر اور آپ کے عزیز (اور اس لئے میرے بھی) دوست طفیل صاحب کو بھی نقوش کے لئے ضرور جائے گی اور میرا دل کہتا ہے کہ اگر اختر نے کہیں یہ خط پڑھ لیا تو اپنے مخصوص انداز میں مجھے جواب ضرور دے گا۔ یہ تو خیر میں یہاں کروں گا۔ لیکن ایک درخواست میری آپ سے بھی ہے۔ آپ میری ہی نظر میں نہیں بلکہ ہر اس شخص کی نظر جس کو اختر سے وابستگی رہی ہے، ایک عظیم عورت ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کبھی جھوٹ بول سکتی ہی نہیں لیکن یہ کام تو آپ کو میرے لئے کرنا ہو گا۔ یہ جو ایسی ایسی منحوس خبریں آپ کے اور میرے اختر کے متعلق مسلسل آ رہی ہیں۔ ان کے متعلق آپ کہہ دیں کہ یہ جھوٹ ہیں۔ بالکل جھوٹ ہیں۔ میری خاطر ایک بار تو آپ جھوٹ بول لیجئے۔ خدا آپ کو اس کا نیک اجر دے گا۔ آپ جب آخری بار کراچی آئی تھیں تو اختر نے آپ کو تار پہ تار دینا شروع کر دیا تھا کہ "جلد آ جاؤ، میں بیمار ہوں"۔ لیکن آپ ہنستی رہیں اور نہ گئیں۔ میں نے کہا بھی کہ یہ شخص بڑا تپاکی ہے، کہیں واقعی بیمار نہ ہو گیا ہو۔ کیوں نہ آپ چلی جائیں۔ جس پہ آپ نے کہا تھا کہ ابھی تو کئی تار اور آنے باقی ہیں۔ مثلاً "میری حالت نازک ہے۔ میں بستر مرگ پر ہوں۔ مجھے دیکھنا ہو تو آ جاؤ۔ میرا کہا سنا معاف کرنا، وغیرہ وغیرہ"۔ مگر میں ابھی ہرگز نہیں جاؤں گی۔ کس مصیبت سے تو قید بامشقت سے چھوٹی ہوں۔ واقعی وہ سارے تار جھوٹے تھے، تو پھر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ بھی ایسا ہی ایک جھوٹ بول لیں؟ بس صرف ایک بار! اس سے میری بہت بڑی مشکل آسان ہو جائے گی۔ صرف اتنا کہہ دیجئے کہ اختر حسب معمول بیمار تو ہے لیکن زندہ ہے اور اب کے پھر اس نے مرنے سے انکار کر دیا"۔ آپ کو چھوڑ کر وہ کہاں جا سکتا ہے؟ آپ کے بغیر اس کا دل بھی کہاں لگ سکے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اب کے وہ کہیں دور گیا ہو۔ آخر ابھی امریکہ اور کینیڈا بھی تو علاج کے لئے گیا تھا۔ تو اس کا پتہ ہی مجھے لکھ دیجئے۔ میں اس کو ڈاک سے خط نہیں بھیجوں گا۔ وہاں تو آپ تو ہوں گی نہیں جس سے وہ جواب لکھوا سکے۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنا خط لے کر شاید مجھے خود ہی جانا پڑے گا مگر کب تک؟ یہ بھی تو نہیں جانتا۔ جب دم گھٹنے لگتا ہے تو شاد کا یہ شعر پڑھ لیتا ہوں ؎

اپنی ہستی کو غم و رنج و مصیبت سمجھو
موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو

آپ ہی دونوں کا

شرف

آہیں اور کراہیں

۲۵، جون ۷۰ء

اپنے اختر کے پیارے شرف! سلام و رحمت!

تمہارا اختر چلا گیا۔ مجھ کو ہمیشہ کے لئے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ اور تم نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ "اختر تمہیں چھوڑ کر چلا بھی جا سکتا تھا"؟

تم تو ہماری بے نا بانہ محبتوں کے گواہ تھے۔ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ تمہارے اختر کو ہماری دعاؤں نے موت کے منہ سے چھینا تھا۔ پیارے بھائی! اب سوچتی ہوں کہ تمہارا اختر اور میرا تارہ اُسی وقت اس دنیا سے چلا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ شاید میں اتنا زیادہ نہ تڑپتی۔ بس تمہارے ساتھ مل کر تھوڑی مدتوں تک ہم اُسے یاد کرتے ہوئے آنسو بہا لیتے۔ مگر وہ خون اگلتے ہوئے بھی زندہ رہ گیا شاید اسی لئے کہ اللہ تعالیٰ کو اسے سنوارنا تھا۔ سجانا تھا۔ وہ ایک بڑی اہم شخصیت بننے والا تھا تو پھر وہ اتنا جلدی کیوں چلا گیا۔ آہ! وہ میری زندگی کا اک ٹوٹا ہوا کھلونا تھا۔ ہمیشہ اس کا کوئی نہ کوئی پرزہ ٹوٹتا ہی رہتا تھا اور میں اس کی مرمت میں لگی رہتی تھی اور اپنے رب العالمین کے قدموں پر گڑگڑا کر اس کی درستگی کے لئے دعائیں کرتی رہتی تھی۔ مگر اب میں کیا کروں گی؟ اب میری زندگی کا مقصد ہی کیا رہ گیا ہے نہ؟

میرے بھائی! سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا لیکن میں کچھ نہ کر سکی۔ بس یہی کیا کہ اس کو بڑے پیار کے ساتھ خدا حافظ کہا۔ یاد ہے نہ؟ جب ہم لوگ انکی سینی ٹوریم میں اُسے چھوڑ کر غم زدہ سے روتے ہوئے رانچی واپس جانے لگتے تھے تو وہ اسٹور روم کے دریچے کے پاس کھڑا بڑی حسرتوں سے ہم لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا اور کبھی کبھی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ اس وقت ہم بار بار پلٹ پلٹ کر اس کو دیکھتے چلے جاتے تھے۔ مگر اس دفعہ میرا تارا ہی خود ہی چلا گیا۔ بڑی خموشی سے اچانک چلا گیا۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں میرے بھائی کہ میرا تارہ کتنا حسین لگ رہا تھا۔ کتنا پیارا نظر آ رہا تھا۔ مگر یہ سب کیسے ہو گیا۔ میں تو یقین کئے بیٹھی تھی کہ چھوٹا ناگپور کے جنگلوں میں اللہ تعالیٰ نے جو بھیک میری جھولی میں ڈالی ہے وہ کبھی مجھ سے نہ چھینی جائے گی۔ مگر اتنی بڑی قیامت سے بھی مجھے گزرنا تھا میرے بھائی۔ اب سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ زندگی کے یہ دن کیسے گزاروں گی۔

میرے بھائی، تمہارے اختر کو بنگلہ دیش کے المیہ نے مارا۔ وہ بڑا احساس اور غیور تھا۔ تین مہینے تک وہ ساری ساری رات تڑپ تڑپ کر جاگتا رہا تھا۔ آخر نروس بریک ڈاؤن میں مبتلا ہو گیا۔ وہ کبھی بھی فالج کے مرض میں گرفتار نہ ہوا تھا ہمیشہ لو بلڈ پریشر رہا پھر فالج کیسے آتا! کناڈا، دہلی، پٹنہ اور مدراس کے نیورولوجی انسٹی ٹیوٹ میں سینکڑوں جانچ پر بھی کوئی مرض نہ نکلا، مرض وہی تھا بنگلہ دیش کا المیہ۔ پیارے بھائی تجھ کو تمہارے اختر کا بہت سا کام کرنا ہے، میرا ساتھ دو، تمہارے اختر کے نام سے تین لاکھ میں یادگار بنائی جا رہی ہے، بہت سے کام کرنے کا ارادہ ہے، انجمن اردو اور اردو اکیڈیمی مل کر کر رہی ہے۔ مگر کاش کہ یہ سب وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا، میرے بھائی تم اپنے اختر کے بہت پیارے شرف ہو تم مجھے بھول نہ جانا۔ اب اور کیا لکھوں۔

بدنصیب!

تمہارے اختر کی شکیلہ

یکم اگست ۱۹۷۶ء

پیارے بھائی شرف! السلام علیکم

ابھی ابھی آپ کا تڑپا دینے والا خط ملا ہے۔ یہیں بیٹھ کر آپ کو چند سطور لکھ رہی ہوں۔

پیارے بھائی ایک خط اپنی دیوانگی کی حالت میں آپ کو لکھا تھا۔ خدا کرے کہ آپ کو مل گیا ہو۔ میں کس حال میں ہوں۔ میرا ایک ایک لمحہ کیسے گزر رہا ہے بس ایک آپ ہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ شرف صاحب، میں نے چار مہینوں سے اپنے تارو کو نہیں دیکھا ہے اور اس حال میں جئے جا رہی ہوں۔ انسان بھی کتنا مجبور ہے۔ نہ اپنی خوشی سے جی سکتا ہے اور نہ اپنی خوشی سے مر سکتا ہے۔

میں جس کرب کی حالت میں جی رہی ہوں اس کا اندازہ کوئی لگا ہی نہیں سکتا ہے۔ پیارے بھائی۔ میری دنیا تو صرف میرا تارہ ہی تھا۔ میں نے اس کی ذات کے سوا کبھی کسی اور چیز کی حسرت ہی نہیں کی تھی۔ مگر اب وہ بھی میرا نہ رہا۔ شاید میں نے اس انمول دولت کی قدر نہیں کی تھی۔ اسی لئے مجھ کو میرے خدا نے ایسی سخت سزا دی ہے۔

وہ ایک معصوم بچے کی طرح چپکے سے اچانک چلا گیا میرے بھائی میں نے جھک کر اسے پیار کیا اور کہا۔ تارو! تم مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے؟ اب میں کیا کروں گی؟

بس! ہمارا انجام یہی تھا میرے بھائی!۔ میرے تڑپتے ہوئے دل سے جو چند کراہیں نکل رہی ہیں انہیں آپ کے پاس بھیج رہی ہوں۔ ساری رات تڑپتے ہوئے گزرتی ہے۔ اور سارا دن ایک قیامت بن کر بیتا ہے۔ اب میں کیا کروں گی؟ کس کے لئے جیوں گی شرف صاحب۔ آپ لوگوں کی بد نصیب شکیلہ اختر۔ تارو کا بہت سا کام مجھے کرنا ہے خدا کرے کہ جلد سے جلد سارے کام ختم کر کے اس کے پاس چلی جاؤں۔ وہ اکیلا ہے نا۔ آپ ابھی نہ جائیں میں وہاں جا کر سب ٹھیک کر لوں گی تب آئیے گا ابھی نہیں۔

ابھی میں اسی کوارٹر پر چھجو باغ میں ہوں۔ رضیہ نے بورنگ روڈ میں اپنا مکان بنوا لیا ہے اور وہیں رہتی ہیں۔ میں اکیلی اپنے گھر میں ہوں لوگوں نے بہت ساتھ دیا مگر آخر کب تک اور میں کسی کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں ہوں۔ پیارے بھائی مجھ کو اپنے تارو کا بہت کام کرنا اور کرانا ہے یہاں ایک یادگار کمیٹی بنائی گئی ہے جو تین لاکھ میں اختر اورینوی اردو ہال بنا رہی ہے۔ اشاعت کے لئے بہت سا پروگرام ہے۔ آپ دونوں کے خطوط بھی میں شائع کرا رہی ہوں۔ پیارے بھائی مجھ کو خط لکھتے رہیے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔

(۱)

تو چلا گیا مجھے چھوڑ کے
میں تجھے پکارتی رہ گئی
ترا نقشِ پا بھی کہیں نہ تھا
تری راہ کیسے میں ڈھونڈتی

وہ مرا شریک سفر بھی تھا
وہ مرا رفیق حیات تھا
مرا ہاتھ چپکے سے تھام کے
مرا راہبر کہیں کھو گیا

اک اندھیری رات ہے زندگی
یہاں اب نہ آئے گی چاندنی
مرا نام لے لے کے پیار سے
نہ مجھے بلائے گا اب کوئی

میرے دل کے ٹوٹے مزار پر
نہ کبھی جلے گا کوئی دیا
جسے ڈھونڈتی ہیں مری نظر
وہ کبھی پلٹ کے نہ آئے گا
وہ کبھی پلٹ کے نہ آئے گا

باسمہ

ہوئی ختم عجب رات بھر کی کہانی
تو پھر زندگی کا سویرا نہیں ہے
اندھیری ہیں راہیں قدم کانپتے ہیں
ترے بازوؤں کا سہارا نہیں ہے
امیدوں کی کشتی جو ڈوبی تو سمجھا
بھنور ہی بھنور ہیں کنارا نہیں ہے
تمناؤں کے سب دیے بجھ چکے ہیں
کہیں بھی خوشی کا اجالا نہیں ہے
زمانے کے ہر موڑ پر ٹھوکریں ہیں
کہاں جاؤں اب کوئی سایا نہیں ہے
نگاہیں جسے ہر جگہ ڈھونڈتی ہیں
وہ الفت کا پیارا نظارا نہیں ہے
مری زندگی جس سے روشن ہوئی تھی
وہ علم و ادب کا ستارا نہیں ہے
فضا جگمگائی، خزاں مسکرائی
تم ہی نے تو شاید پکارا نہیں ہے

باسمہ

جو لرز رہے تھے اب تک در و بام زندگی کے
وہ کھنڈر ستا رہے ہیں بڑے درد کا فسانہ
وہ بہت تھکا ہوا تھا اسے نیند آ گئی ہے
نہ سلا سکی تھی جس کو کبھی گردش زمانہ
بڑے غم کی داستاں تھی، بڑے کرب کی کہانی
دل درد میں تڑپ کر جو بنا تھا اک ترانہ

جو بھنور سے کھیلتا تھا، جو غموں میں مسکراتا
جو جلا تھا آندھیوں میں، وہ چراغ بجھ چکا ہے

یہ فضاء دھواں دھواں ہے کہ جلا ہے آشیانہ
جہاں بجلیاں گری ہیں، وہ چمن سلگ رہا ہے

مرا کعبۂ محبت، مری ہر خوشی کا مرکز
مرا کاروانِ الفت سرِ شام ہی لٹا ہے

. . . .

پیارے بھائی! میرا تو شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا اب اندھیری راتوں میں تڑپ تڑپ کے یہ چند اشعار ہو گئے ہیں۔ آپ انہیں ٹھیک کر لیں گے۔ یہ ایک بدنصیب بیوی کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں دل کے ٹکڑے ہیں۔

غم نصیب شکیلہ اختر

نسیمہ سوز کے نام

پٹنہ۔ ۱۰ر جون ۷۷ء

بہت پیاری بہن نسو! السلام علیکم

میری چھوٹی سی بہن تمہارا محبت میں ڈوبا ہوا خط مجھ کو ملا تھا۔ جی چاہا کہ تم سے لپٹ کر جی بھر کے روؤں مگر ایسی قسمت کہاں تھی۔ پیاری بہن صرف تم ہی نے اپنے پیارے اختر بھیا کو اتنے پیار سے یاد کیا ہے اور اپنی بدقسمت بہن کے دکھوں میں شریک ہوئیں۔ روحی شہلا اور محسن سہیل زبیر تڑپ اٹھے، تم چیخ اٹھیں۔ میری بہن تیرا اختر بھیا چلا گیا۔ وہ ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ اب میں اسے کبھی نہ دیکھ سکوں گی نسو! دنیا کے کونے کونے سے غم سے بھرے تار اور خطوط اتنے آتے رہے کہ ایک ڈھیر لگ گیا۔ سارا ہندوستان تڑپ اٹھا۔ بہار میں اس کی یادگاریں منائی جا رہی ہیں۔ پٹنہ میں اختر اورینوی ہال تین لاکھ میں بنایا جا رہا ہے۔ اختر اورینوی اسکالر شپ جاری کی جا رہی ہیں۔ اور میری چھوٹی سی بہن تیری یہ بدنصیب آپا حیران ہو کر یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے کہ میرا تارہ اتنی بڑی شخصیت کا حامل تھا؟ پھر میں اس کو صرف اپنا شوہر ہی کیوں سمجھتی رہتی تھی۔ اس کو ایک انمول ہستی سمجھ کر اس کی ویسی قدر کیوں نہیں کرتی رہی تھی۔ میری بہن! میں تو ساری عمر اس کو صرف اپنا ایک ٹوٹا ہوا کھلونا ہی سمجھتی رہی اپنی زندگی کا ہر ایک دن تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنے اسی ٹوٹے ہوئے کھلونے کی مرمت ہی کے لئے دعائیں مانگتی رہی تھی۔ اور اب؟ میری چھوٹی سی بہن میرا وہ ٹوٹا ہوا کھلونا بھی مجھ سے چھن گیا ہے۔ اب میں کس کے لئے زندہ رہوں گی۔ اب میری زندگی کا مقصد ہی کیا باقی رہا ہے؟ اب تو ایک ایک لمحہ مجھے کاٹے نہیں کٹ رہا ہے۔ میری بہن تم اپنے اختر بھیا کی خوشیوں کی ساتھی رہ چکی ہو۔ وہ جتنا خوبصورت تھا۔ نسو! اس سے کہیں

زیادہ اس کا دل حسین تھا۔ ساری انسانیت کی محبت سے بھرا ہوا تھا۔ گزری ہوئی خوشیوں اور تم سب لوگوں کی یاد میں اکثر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے تھے۔ پیاری بہن تم تو بہت چھوٹی سی تھیں۔ شاید تمہیں کچھ یاد ہو کہ موت کے فرشتے نے بار بار اس کی زندگی پر حملے کئے تھے اور ہر بار اللہ تعالیٰ نے اس کی زندگی کو بچا لیا تھا اور اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ میرے لئے کتنا عزیز تھا۔ میں تمہیں یہ کیسے بتاؤں۔ آخری بار پانچ سالوں سے اس کی زندگی موت سے مسلسل جنگ کرتی رہی تھی۔ اور میری بہن میری بد نصیبی پر دیکھو کہ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تارو مجھ کو اکیلا چھوڑ کر چلا بھی جا سکتا ہے۔ اگر میں دم بھر کے لئے بھی اس قیامت کو اپنے سے قریب محسوس کر لیتی تو اپنے تاری کو ہر ساعت اور ہر لمحہ اپنے کلیجے سے لگائے رکھتی نسو! لوگ کہتے تھے کہ میں نے مثالی خدمت کی ہے مگر اب لگتا ہے کہ یہ سب جھوٹ تھا میں نے اپنے تارو کا کوئی حق ادا نہ کیا۔ میں نے اس کی کوئی خدمت نہ کی۔ میں تو اسے پہچان بھی نہ سکی تھی نسو! کہ میرا تاری اتنی بڑی شخصیت کا مالک تھا۔ پیاری بہن! تیرے اختر بھیا کے لائق میں نہ تھی لیکن اس نے مجھ کو کتنے پیار کتنے آرام اور کتنی عزت کے ساتھ رکھا تھا۔ ۱۴ سال کی اتنی لمبی زندگی میں مجھ کو اس نے اپنے ہاتھوں سے سنوارا۔ بنایا۔ مجھے لکھنے لکھانے کا شعور سکھایا۔ مجھے شہرت دلائی اور مجھ کو اپنے گھر میں بہت عزت بخشی کیا میں اتنی نوازشوں کے لائق تھی۔ نہیں۔ میری بہن نہیں۔ کبھی اس کی حق دار نہ تھی۔ اور اب جب کہ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکا ہے، میں کس طرح اس کے اتنے احسانوں کا شکریہ ادا کروں میری گڑیا!

بس کبھی کبھی ایک وقتی تسکین سی مل جاتی ہے کہ میں نے اس کے علاج، دعاؤں اور صدقات میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر حصہ لیا تھا ؎

کون سی کی نہ دوا، کون سی مانگی نہ دعا

ہم نے کیا کیا نہ کیا تیرے سنبھلنے کے لئے

مگر کچھ نہ ہوا نسو! کچھ بھی تو نہ ہوا۔ اور وہ ایک تھکے ہوئے معصوم بچے کی طرح چپکے سے سو گیا۔ میں نے جھک کر اس کی حسین پیشانی چومی اور کہا۔ تم چلے گئے تارو؟ اور پھر اپنا سر بڑے صبر کے ساتھ اپنے آقا کے قدموں پر جھکا دیا۔

منو صاحب کو سلام علیک۔

تمہاری بد نصیب آپا

شکیلہ اختر

مشتاق شبنم

وہ شخص

ناقدِ فن ، صاحبِ فکر و نظر وہ شخص تھا
حلقۂ شعر و ادب میں معتبر وہ شخص تھا

نام ادب سے آج بھی لیتے ہیں اس کا اہلِ فن
برگزیدہ ، محترم اور نامور وہ شخص تھا

زندگی افروز تھے اس کے خیالاتِ حسیں
روح پرور فکر کا پیغامبر وہ شخص تھا

آفریں صد آفریں اے خطۂ خاکِ بہار
تیرے دلکش حسن کا افسانہ گر وہ شخص تھا

اس کو بھولیں گے نہ ہرگز شاعرانِ نکتہ رس
نکتہ داں تھا شاعرِ جادو اثر وہ شخص تھا

نام اختر اور سورج سے ملاتا تھا نظر
فکر و فن کی مملکت میں با اثر وہ شخص تھا

اس کی باتیں اس کی گھاتیں یاد آئیں گی ہمیں
خوب تھا کیا خوب تھا کیا خوب تر وہ شخص تھا

پروفیسر آل احمد سرور

اختر — ایک انسان

اختر اورینوی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ وہ علی گڑھ میں اردو کے ایک لکچرر کی جگہ کے انٹرویو کے لئے آئے تھے۔ اس وقت لکچرر درجہ اول کی جگہ خالی تھی جس کے لئے میں امیدوار تھا۔ لکچرر دوم کی دو جگہیں خالی تھیں۔ ان میں سے ایک جگہ کے لئے اختر بھی امیدوار تھے۔ انٹرویو سے پہلے بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں وقار عظیم، حامد حسن بلگرامی، اختر اورینوی اس وقت یاد آتے ہیں۔ ایک جگہ پر اختر کے لئے جانے کا خاص امکان تھا، مگر اتفاق سے امیدواروں میں ایک صاحب کے بھائی کا انتقال ہو گیا تھا جو علی گڑھ کے ممتاز اولڈ بوائے تھے۔ چنانچہ ان کے خاندان کی سرپرستی کے لئے ان صاحب کو لے لیا گیا۔ دوسرے دن اختر میرے گھر آئے تو ان کے ماتھے پر شکن تک نہ تھی، بلکہ وہ ان حالات میں دوسرے صاحب کے انتخاب کو حق بجانب قرار دے رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اختر کو بجا طور پر اس کی شکایت ہوگی مگر ان کا یہ رویہ دیکھ کر ان کی شرافت نفس کا میرے اوپر بہت اثر ہوا۔ یہ اثر آج تک قائم ہے۔

انتخاب سے پہلے اختر اپنے ساتھ اپنے سارے مطبوعہ مضامین کا ایک فائل لائے تھے۔ ہر مضمون سلیقے سے سارے کاغذوں پر چپکا ہوا تھا اور ایک ہی نظر میں اختر کے کام کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ میں ان معاملات میں بہت سست ہوں کبھی اس طرح اپنے مضامین کا فائل مرتب نہ کر سکا لیکن اختر کے پاس اس قسم کی چیز دیکھ کر ان کی باقاعدگی اور چستی کا اندازہ ہوا۔ باقاعدگی اور چستی مارے مجھے پسند ہیں، مگر میں نہ باقاعدہ ہوں نہ چست، لیکن جہاں سلیقہ، نفاست، باقاعدگی، تنظیم و ترتیب دیکھتا ہوں اس کی داد ضرور دیتا ہوں۔ اختر کے یہاں مجھے یہ خوبی اب تک بھاتی ہے۔

کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ اختر پٹنہ کالج میں اردو کے لکچرر ہو گئے ہیں۔ ابتدا میں جب پٹنے جانے کا اتفاق ہوا تو ان سے ملاقات ضرور ہوئی۔ گو میں ٹھہرا مرزا اختر حسین اور پھر کلیم الدین کے یہاں، مگر انہیں قریب سے دیکھنے اور ان سے تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع ضرور ملا۔ میں نے دیکھا کہ وہ صرف اردو کے استاد ہی نہیں، طلبا میں ہر دلعزیز بھی ہیں، ان کی ہر طرح مدد کرتے ہیں، نصاب کے باہر کی سرگرمیوں سے بھی انہیں دلچسپی ہے خصوصاً ڈرامے سے۔ کالج کی اقامتی اور تہذیبی زندگی میں ان کی خاص جگہ ہے۔ دو تین دفعہ کے بعد ایسا ہوا کہ میں گیا تو اختر کے ساتھ ہی ٹھہرا۔ ان کے ساتھ جو وقت گزرتا تھا وہ دل و دماغ دونوں کے لئے لطف و انبساط کا باعث ہوتا تھا۔ اب تو اگر پٹنے جاؤں تو کہیں اور ٹھہرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اختر کے گھر کو میں اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ ان کی علمی و ادبی صلاحیت، ان کی ذہانت، ان کی خطابت، ان کی انتظامی استعداد، ان کے خلوص اور محبت کا قائل ہوں۔ وہ صرف اردو کے پروفیسر ہی نہیں ہیں، بہت اچھے معلم ہیں، علم کے منصب کو پہچانتے ہیں۔ طلبا کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں۔ انہیں علمی کاموں میں لگاتے ہیں، ان کے ذوق کو بلند کرتے ہیں، ان میں زندگی کی اچھی قدروں کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ انہیں جہد حیات کے آداب سکھاتے ہیں، انہیں انسان بناتے ہیں۔

اختر صاحب شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی ناولسٹ بھی اور نقاد بھی۔ ان کی شاعری میں سنجیدگی اور گہرائی ہے، گو شاعری ان کے یہاں ایک ذہین اور حساس طبیعت کا کبھی کبھار کا جلوہ ہے۔ شاعری کے لئے جس دیوانگی اور سپردگی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اختر کے بس کی بات نہیں، میرے بس کی بات نہیں لیکن افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا درجہ بلند ہے، ان کے افسانوں میں زندگی کا گہرا مطالعہ ہے۔ اس کے معنی خیز پہلوؤں کا احساس ہے۔ کردار نگاری کا سلیقہ ہے، زبان میں تاثیر اور کیفیت ہے اور یہ افسانے ہمیں گردوپیش کی زندگی کے متعلق ایک بصیرت ضرور عطا کرتے ہیں۔ ایک طویل بیماری کی وجہ سے انہیں اسپتال اور سینی ٹوریم کی فضا کے مطالعے کا موقع ملا اس سے انہوں نے بڑا کام لیا ہے۔ اردو کے اچھے افسانوں کا کیسا ہی انتخاب ہو ان کے کسی نہ کسی افسانے کو اس میں ضرور شامل کیا جائے گا۔ لیکن دراصل اختر کا اصل میدان تنقید ہے۔ ان کے ڈی لٹ کے مطالعے سے قطع نظر جس میں تحقیق اور تنقید دونوں کی طرف توجہ ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے، ان کے ادب کے مطالعے اور اس کی پرکھ کے بڑے اچھے نمونے ہیں۔

اختر ہمارے ناقدوں میں ایک امتیازی صفت رکھتے ہیں، ان کی تنقید صرف تشریح نہیں ہوتی بلکہ کسوٹی بھی ہے۔ ان کے یہاں ادب کی اعلیٰ قدروں کا احساس ہے اور فن پاروں کو ان قدروں کی رو سے پرکھنے کی کوشش بھی ہے۔ میں دوستوں کے کارناموں پر تنقید کرنے کا اپنے آپ کو اہل نہیں پاتا۔ تعریف کی جائے تو لوگ اسے دوست نوازی سمجھتے ہیں۔ اگر ذوق کے اختلاف کی بنا پر کچھ پہلوؤں کی نشاندہی کی جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آدمی اپنے وجود کے ایک حلقے پر اعتراض کر رہا ہے۔ یہ بات ممکن ہے اچھی نہ ہو، لیکن اس معاملے میں میں بھی مجبور ہوں۔ اختر کے میرے اوپر کئی احسانات ہیں۔ ان کی وجہ سے میں دو ایسی شخصیتوں سے متعارف ہوا جن کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ ان میں سے ایک تو اب اس دنیا میں نہیں۔ میری مراد ایوب مرحوم سے ہے۔ مجھے بہت لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے میں آسانی سے لوگوں سے متاثر نہیں ہوتا لیکن ایوب جیسے کھرے اور محبت کے پتلے میں نے کم دیکھے ہیں۔ کتنے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو تہی مایہ ہیں مگر اپنا ڈھول ہر وقت پیٹتے رہتے ہیں۔ مرحوم ایوب علم و عمل اور جذب و جنون کی بہت بڑی پونجی لئے بیٹھے تھے مگر درویشانہ زندگی گزارتے تھے اور دوستوں کے سامنے اس طرح بچھ جاتے تھے گویا وہ خاک پا ہوں، حالانکہ وہ سر پر بٹھانے کے قابل تھے، دوسری شخصیت جمیل مظہری کی ہے۔ خدا انہیں عمر خضر عطا کرے، یہ بہت بڑے شاعر ہی نہیں بڑے اچھے اور سچے آدمی بھی ہیں، ایک دفعہ بدحواسی کی وجہ سے جلتے ہوئے سگریٹ سے میرا ہاتھ جلا بھی چکے ہیں لیکن بڑے پیارے آدمی ہیں اور مجھے بہت بھلے لگتے ہیں۔

اختر اور جمیل مظہری سے ادبی گفتگو مسرت ہی نہیں بصیرت کا بھی باعث ہوتی ہے۔ جمیل مظہری میں گہرائی ہے اختر میں وسعت، جمیل مظہری شاعر ہیں اور پسند و ناپسند کے فنکار۔ اختر ناقد ہیں اور کثرت میں وحدت کے دیکھنے کے عادی۔ جمیل مظہری سے عشق کیا جا سکتا ہے مگر اس عشق میں خطرہ یہ ہے کہ جدید دور کی بہت سی بصیرتوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اختر تمہارے ساتھ دور تک جا سکتے ہیں۔ ان میں نئی کروٹوں میں پرانی وادیاں مل جاتی ہیں اور پرانی فضاؤں میں نیا پن بھی نظر آتا ہے۔

اختر کی یاد آئے تو ان کی رفیقۂ حیات شکیلہ اختر کا خیال بھی ضرور آتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو عرصہ دراز سے جانتے ہیں مگر ملاقات حال ہی میں ہوئی۔ اختر کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں شکیلہ اختر جیسی رفیقۂ حیات ملیں، جن کی دلنواز شخصیت اور ذوق سلیم دونوں کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

اختر اورینوی کی ایک اور حیثیت بھی ہے جس کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ بہار میں اردو کی تحریک میں وہ سامنے نہیں آئے۔ مگر

(بقیہ صفحہ ۱۱۱ پر دیکھئے)

ڈاکٹر کلیم عاجز

اختر صاحب سے میری جان پہچان

جس سال جنگ عظیم چھڑی تھی میں مسلم اسکول پٹنہ سے پرائیویٹ طور پر نویں کلاس کا امتحان دینے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ لال باغ لیلی کالج میں قیام تھا۔ کم عمری کی وجہ سے میرے رشتے کے ایک بھائی بطور نگراں میرے ساتھ مقیم تھے۔ ابھی شعر و سخن کا کچھ مذاق تھا اور نہیں۔۔۔ ؟

شاید یہ بات کچھ حیرت کے ساتھ سنی جائے کہ نو سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے نانا جان سے جو ایک قدیم ساخت و مزاج اور تبحر کے مولوی تھے قاعدہ بغدادی سے آغاز کر کے آمدنامہ، نسخہ تعلیمیہ، رقعات عزیزی، گلستاں بوستاں، انشائے خلیفہ وغیرہ ختم کر کے حضرت حاجی کی مثنوی شروع کی تھی کہ ۱۹۳۴ء کا زلزلہ ٹوٹ پڑا۔ بعض حالات کے نتیجے میں میری تعلیم رک گئی۔ پھر نانا جان کا بھی انتقال ہو گیا اور ان کی نجی لائبریری کی تمام اردو فارسی کتابیں میرے بڑے بھائی صاحب مرحوم کے تصرف میں آئیں جنہیں مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ ان کی صحبت میں یہ شوق مجھ میں بھی ابھرا۔ اور میں اکثر تمام دن اور رات گئے تک نانا جان کی کھجور کی چٹائی پر بیٹھ کر کتابوں میں آنکھیں گڑائے مطالعہ میں مشغول رہتا۔ اور یہ کتابیں الف لیلہ، داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا، طلسم نوز افشاں، فسانۂ خورشیدی، ایرج نامہ، تورج نامہ، دیوان آتش، دیوان رند، دیوان صبا، دیوان انشاء اللہ خاں، داغ دہلوی، امیر مینائی، دیوان غالب، سخن شعرا، ناسخ، تذکرہ گل رعنا وغیرہ تھیں، اور میں نے تقریباً تمام کتابیں پڑھیں اور داستانیں تو بعض ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھیں۔ مثلاً طلسم ہوش ربا کی ساتوں جلدیں دو دو تین تین مرتبہ پڑھ ڈالیں۔ اس میں تقریباً دو سال کا عرصہ گذرا اور پڑھنے کے دوران ہی گھر کے دوسرے لڑکوں کے درمیان دو ایک شعر فخریہ اس طرح کے موزوں کئے تھے۔

شاہ ہوں بغداد کا ہارون رشید انام ہے   خواجہ ہے مسرور جعفر کا وزیری کام ہے

(داستان الف لیلہ میں ہارون رشید کی شب گشتی کے دوران خواجہ سرا مسرور اور وزیر جعفر ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے)

جی ہاں تو مقصد اس تمہید کا یہ ہے کہ جب میں نویں کلاس کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا تو میرے ماموں زاد بھائی جو میرے نگراں تھے ان کے ایک دوست عبدالخلاق جو اس زمانے میں پٹنہ کالج کے طالب علم تھے ملنے آیا کرتے۔ مجھ سے بھی مانوس ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی شعر و شاعری بھی ہوتی۔ ناسخ اور غالب کے اشعار پڑھے جاتے ٹوٹے پھوٹے مصرعے ہم لوگ بھی جوڑتے۔ انہی دنوں پٹنہ کالج بزم ادب کے سالانہ مشاعرہ کا اعلان ہوا مصرع طرح بھی تھا۔ "درد منت کش دوا نہ ہوا"

طلبہ کے لئے جس پر رنگ کپ بھی تھا۔ خلاق بھائی کی تحریک ہوئی کہ طرح پر غزل کہنی چاہئے۔ دو ایک مصرع خلاق بھائی نے

ہے ۔ دو ایک شہاب الدین بھائی نے کہے اور چند اشعار میں نے کہے ۔ جوڑ جاڑ کر اور ادھر اُدھر سے کچھ چوری کچھ سرقہ کر کے آٹھ نو اشعار کی ایک غزل تیار ہوئی ۔ غزل میری ہی رکھی گئی اور میرا تخلص تجویز ہوا شعلہؔ ۔ مطلع یہ تھا ۔

یوں تو دنیا میں اور کیا نہ ہوا ۔ پر جو اپنا تھا مدعا نہ ہوا
ہم تو اب دہر کو چلے شعلہؔ ۔ بُت تو ہونگے اگر خدا نہ ہوا

مقطع میرؔ کے مقطع میں تصرف تھا ۔

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ ۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا

بہرحال غزل تیار ہوئی ۔ اور خلاق بھائی نے کہا کہ بھئی اس پر اصلاح ہونی چاہئے ۔ سب سے پہلا نام پروفیسر عبدالمنان بیدل صاحب عظیم آبادی کا آیا ۔ مگر خلاق بھائی ان سے بہت ڈرتے تھے ۔ پھر پروفیسر حافظ شمس الدین صاحب کا نام آیا ۔ پھر یک بیک خلاق بھائی اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو میں ایک جگہ لے چلتا ہوں ، میں بھی تیار ہو گیا ۔ غزل صاف کر کے جیب میں رکھی اور پٹنہ کالج سے ہم لوگ روانہ ہوئے ۔ جگہ ٹھیک سے حافظے میں نہیں ہے ۔ غالبًا کالج کے سامنے ٹھٹھری بازار میں کہیں تھی ۔ ایک پختہ مکان میں ہم لوگ پہنچے ۔ سیڑھیوں سے چل کر اوپر کی منزل میں ایک کمرے کے پاس پہنچے ۔ میں تو دروازے پر رہ گیا ۔ خلاق بھائی اندر داخل ہو گئے ۔ غالبًا زمین پر فرش تھا اور چار یا پانچ صاحبان کسی کتاب پر یا چند کتابوں پر سر جھکائے مصروف گفتگو تھے ۔ خلاق بھائی جب قریب پہنچے تو ایک صاحب جن کی پشت میری طرف تھی گرم کوٹ پہنے اور مفلر لپیٹے چشمہ لگائے ، سر اٹھا کر خلاق بھائی کی طرف متوجہ ہوئے ، فرمائیے کیا ہے ؟

" ایک طالب علم ہیں اپنی غزل پر اصلاح کے خواہش مند ہیں ۔

کون صاحب ہیں ؟

وہ کیا پیچھے دروازے کے پاس کھڑے ہیں ۔

انھوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا بھی نہیں ، اسی طرح خلاق بھائی سے خشک لہجے میں بولے ۔ میں اس وقت طلبہ کو پڑھا رہا ہوں فرصت نہیں ہے معاف کیجئے ۔

اور سر جھکا کر بدستور کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں خلاق بھائی کا انتظار کئے بغیر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے کی طرف بھاگ چلا ۔ پیچھے سے تیزی سے خلاق بھائی پہنچے اور ڈانٹ کر بولے ، کیا تیزی سے بھاگے جا رہے ہو ؟

یہ آپ کون ماسٹر صاحب کے پاس مجھے لے آئے تھے ۔ کسی شاعر کے پاس چلنا چاہئے ۔

شاعر کے اور کیا سینگ ہوتے ہیں ؟ یہ ماسٹر نہیں پروفیسر ہیں ۔

کون پروفیسر ۔

پروفیسر اختر اورینوی ۔

کون پروفیسر اختر اورینوی ۔

ارے تم پروفیسر اختر اورینوی کو نہیں جانتے ۔ بات دراصل یہ ہے کہ تم ٹھہرے دیہاتی اور دیہات بھی ایسا کور دہ جو مارٹن کمپنی

کے ریلوے اسٹیشن سے بھی تین میل دور، تم بھلا کیا اور تمہاری عمر ہی کیا۔ اور تمہاری واقفیت ہی کیا اور تمہاری شاعری ہی کیا بس تم گلستاں بوستاں پڑھتے رہو۔ مکتب سے نکلو اور ایک دم سے نائنتھ کلاس کا امتحان دیتے چلے آئے۔ پروفیسر اختر اورینوی کو تم نہیں جانتے اور شاعری کرنے کو آگے بڑھ گئے۔ یہ پٹنہ کالج میں پروفیسر ہیں۔ شاعر ہیں، ادیب ہیں، افسانہ نگار ہیں، اور افسانہ نگار بیوی بھی رکھتے ہیں۔

اچھا ان کی بیوی بھی افسانہ نگار ہیں؟

جی ہاں مشہور افسانہ نگار ہیں۔ شکیلہ اختر۔

جی ہاں کیا نام لیا؟

شکیلہ اختر،

جب میں اپنے بڑے بھائی مرحوم کے ساتھ نانا جان کی لائبریری کی کتابیں پڑھا کرتا تھا، اس میں رسالے بھی تھے، یہ رسالے بھائی صاحب منگواتے تھے اور پابندی سے منگواتے تھے، نیرنگ خیال، عالمگیر، ساقی، ادبی دنیا، رومان (اختر شیرانی) کلیم (جوش) نگار وغیرہ وغیرہ۔ اور انہیں میں سے کسی پرچے میں یا بعض پرچوں میں دو نام کئی بار میری نظروں کے سامنے آئے۔ جمیلہ خاتون ارول اور شکیلہ خاتون ارول۔ یہ دو نام خصوصیت کے ساتھ متوجہ کرتے کہ ارول گویا میرے دیہاتی وطن کے جوار میں تھا۔ ان کا نام نہیں بلکہ ارول کا نام مجھے متوجہ کرتا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے ایک رشتے کے بھائی سید ظفر امام مرحوم کی دادھیال بھداسی تھی۔ ارول بھداسی دونوں متصل ہیں۔ بھداسی گاؤں کسی دوسری جگہ بھی تھا۔ اس لئے اس گاؤں کا نام ارول بھداسی ہی لیا جاتا تھا۔ ظفر امام بھائی اپنے دادا نواب وصی امام عرف گھسو مرحوم کے تذکرے میں برابر ارول بھداسی کا نام لیتے۔ چونکہ وہ بھی ستھرا ادبی ذوق رکھتے تھے اس لئے پرچے وغیرہ بھی پڑھتے۔ جمیلہ خاتون ارول اور شکیلہ خاتون ارول کا نام مضمون نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے دیکھ کر وہ اکثر بڑے فخر سے مجھے مخاطب کرتے کہ جانتے ہو یہ میرے دادھیالی لوگ ہیں۔

ان ناموں سے ایک طرح کی قربت اور اس کے اسباب یہی دو تھے۔ خلاق بھائی کی زبان پر یہ نام آتے ہی ذہن سے پردہ سا اٹھ گیا۔ کیا شکیلہ خاتون ارول۔

ہاں وہی اب شکیلہ اختر کہلاتی ہیں۔

کمرے سے بھاگتے پر افسوس ہونے لگا۔ ایک تجسس بار بار اکساتا پھر واپس چل کر مل لو۔ لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ خلاق بھائی پروفیسر حافظ شمس الدین صاحب کے یہاں لے کر آئے۔ وہ اوپر کوٹھے پر تھے نیچے برآمدے میں تشریف لائے۔ میری غزل پیش کی گئی۔ غزل پڑھی۔ پھر میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔

کیا واقعی یہ غزل انہی کی ہے؟

جی ہاں انہیں کا تخلص مشغلہ ہے۔

اگر ان کی ہے تو بہت اچھی ہے۔

پھر کچھ اصلاح فرمائی گئی۔ وہ غزل سینٹ ہال میں پڑھی گئی۔

دوسرے سال جب میں میٹریکولیشن میں تھا (نویں کلاس کے امتحان میں نمبر اچھے آئے اور میرا ڈبل پروموشن ہوا تھا) تو ایک دن

خلاق بھائی کے ساتھ لان کی طرف سے واپس آتے ہوئے مراد پور میں جہاں اس زمانے میں سڑک بہت تنگ تھی۔ ایک کھلی ہوئی فٹن پٹنہ کالج کی طرف سے آتی ہوئی ٹریفک کی بھیڑ کی وجہ سے ہم لوگوں کے قریب رکی۔ اس پر ایک صاحب کو میں نے دیکھا۔ حلیہ صورت گندمی رنگ، سیاہ بال، کشادہ پیشانی۔ آنکھیں عینک کے شیشے کے پیچھے سے چمکتی ہوئی اور کسی ایک طرف کا شانہ کسی حد تک جھکا ہوا، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ملاکر گود میں رکھے ہوئے، بالکل سامنے کی طرف دیکھ رہے تھے، خلاق بھائی نے کہا۔

دیکھو یہی پروفیسر اختر اورینوی ہیں۔

وہی شکیلہ خاتون اختر اورینوی کے شوہر؟

پروفیسر اختر اورینوی یہ ہیں۔ پروفیسر اختر اورینوی پہلے ہیں، بعد میں وہ بھی جو تم کہہ رہے ہو۔

اتنے میں گاڑی روانہ ہوگئی۔ اور اختر صاحب اسی طرح سامنے کی طرف دیکھتے رہے۔ یہ خصوصیت ان کی نشست کی اب تک ہے، رکشہ ہو، یا فٹن یا پاپیادہ ہوں وہ عموماً سامنے کی طرف دیکھتے ہیں یا نیچی نگاہیں رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت نمائش میں نہیں ہے اور نہ ان کے مزاج میں تجسس ہے۔ ہوس، کرید اور ڈھونڈ میں معمول سے زیادہ اعتدال ہے۔ اس لئے راہ چلتے اِدھر اُدھر دیکھنا عادت نہیں۔ بس قدم کے آگے یا راستے پر نگاہ رہتی ہے۔ سامنے سے گزر جایئے اگر اشارے سے سلام کیجئے تو قرینہ اغلب ہے کہ جواب نہ ملے۔ ان کی عینک کا شیشہ مائنس ہونے کی وجہ سے بہت چمکدار ہوتا ہے۔ آنکھیں بخوبی نظر نہیں آتیں اور چہرے کا رخ اس طرح رہتا ہے کہ بقول شاعر۔

بنے ہوئے ہیں وہ محفل میں صورت تصویر ہر ایک کو یہ گماں ہے ادھر کو دیکھتے ہیں

چنانچہ اس "گماں" میں اکثر نے اشارے سے سلام کیا اور جواب میں خود ہی وعلیکم اسلام کہنا پڑا۔

میں نے میٹرک پاس کیا اور پھر چھ سال تک مجھے دیہات رہنا پڑا۔ فساد کے بعد پھر مستقل طور پر شہر منتقل ہونا پڑا۔ لیکن زندگی لوگوں سے دور دور الگ الگ، گوشہ گیری، اضمحلال، شوریدہ مزاجی اور آشفتہ حالی میں گذرتی رہی۔ شاید ۱۹۴۹ء میں دماغی توازن درست ہوا۔ انجمن اسلامیہ ہال میں ایک بڑے مشاعرے کا اعلان تھا۔ میرے ایک دوست زبردستی مجھے مشاعرہ سننے کے لئے لے گئے۔ اسٹیج پر جوش ملیح آبادی، بسمل شاہجہاں پوری، واقف مراد آبادی، پرویز شاہدی اور دوسرے شعراء تھے۔ کچھ دیر بعد ایک صاحب سیاہ شیروانی پہنے، ننگے سر، عینک لگائے اٹھے اور مائک کے پاس آئے، یہ اختر صاحب تھے۔ اُن تک میرے تعارفی سفر کی یہ تیسری منزل تھی پہلے دن صرف کوٹ اور مفلر دیکھا تھا۔ دوسری مرتبہ دور سے ان کا چہرہ دیکھا تھا، اس دن گفتگو سنی، انہوں نے مائک کے پاس آکر کہا۔

حضرات! اب میں ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر سے گزارش کلام کر رہا ہوں۔ اور میں انہیں ہندوستان ہی کا بڑا شاعر کیوں کہوں، میں انہیں ایشیا کا سب سے عظیم شاعر کیوں نہ کہوں؟ کون ہے آج برما میں؟ کون ہے آج انڈونیشیا میں؟ کون ہے آج جاپان میں؟ کوئی نہیں۔ آج ہندوستان ہی میں ایشیائی ادب کا آفتاب چمک رہا ہے اور وہ آفتاب جوش ملیح آبادی ہیں۔"

آج ایشیا کا یہی آفتاب سپہر ادب ہے جس کے قبائے فن پر اختر صاحب کی مقراض نقد یوں چلتی ہے جس طرح سطح سمندر کو چیرتی ہوئی شارک مچھلی گذر جاتی ہے۔

پھر میں نے بھی شاعری شروع کی اور غالباً ۱۹۵۱ء میں پہلی مرتبہ بزم ادب پٹنہ کالج کے مشاعرے میں جب میں یہ غزل پڑھ

رہا تھا۔

غناں بھی جب کسی کی طبع نازک پر گراں گزرے — ہم ایسی بیکسی کی زندگی سے مہرباں گزرے
مبارک برق تجھ کو لالہ و گل کی نگہبانی — کہ اب تو گلستاں سے درِ منزلِ گلستاں گزرے

تو اختر صاحب نے جو میرے بالکل مقابل بیٹھے ہوئے تھے، مجھے دیکھتے ہوئے اپنی داہنی طرف جھک کر پروفیسر نواب کریم صاحب سے پوچھا کہ "یہ چنگاریاں کہاں سے آرہی ہیں؟ نواب کریم صاحب نے جواب دیا۔ "تیلہاڑہ" (میرا گاؤں)

اس کے بعد چند بار مشاعروں میں ان کی توجہات مبذول ہوتی رہیں۔ التفات اور شفقتیں گہری ہوتی گئیں۔ ۱۹۵۳ء میں دس گیارہ سال بعد میں نے پھر تعلیمی سلسلہ کا آغاز کیا اور پرائیوٹ آئی اے کر کے ۵۳ء میں بی اے آنرز کلاس میں داخلہ لیا اور جب پہلی مرتبہ ان کے آنرز کلاس میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ آیا تو وہ مجھے طالب علم کی حیثیت سے دیکھ کر متعجب ہوئے۔

بہر حال کلاس کا سلسلہ چلا تو انہیں لکچرر کی حیثیت سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا۔ اور انھیں کے لکچروں میں رومان اور ادب کا رشتہ واضح ہوا۔ ادب کس طرح ایک کروٹ میں رومان کی سرحدوں سے گزر جاتا ہے۔ اور دوسری کروٹ لے کر حقیقت کی دنیا میں واپس چلا آتا ہے۔ ایک کمرہ حقیقت بھی ہے اور رومان بھی، ایک بنچ حقیقت بھی ہے اور رومان بھی، ایک لکچرر حقیقت بھی ہے اور رومان بھی، ایک پروفیسر حقیقت بھی ہے رومان بھی۔

اختر صاحب کے کلاس کا کمرہ، جب ہم پہنچے تو ایک اوسط درجے کا کمرہ نظر آیا۔ ایک بڑا ٹیبل، چند بنچ، چند کرسیاں، دو تین الماریاں، دو دروازے، دو کھڑکیاں، چند تصویریں، چند طلبہ، اور ایک لکچرر۔ ہم لوگ خود ہی حاضری بناتے اور اختر صاحب سبق شروع کر دیتے۔ نام سبق کا ہوتا۔ دراصل شروع ہوتی پہلے گفتگو، اس کے بعد شاعری، اس کے بعد طلسم ہوشربا کا دروازہ کھلتا، مثال کے طور پر یہ سمجھئے کہ اختر صاحب یوں شروع کرتے ہیں۔

"ہم لوگوں نے اقبال پر گفتگو کی تھی۔ ہم اقبال کی نظم مسجد قرطبہ پر گفتگو کریں یا ساقی نامے پر۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ پر یا خدا کی درگاہ میں لینن کے استغاثے پر... ضرب کلیم کی حکیمانہ مگر خشک اور سپاٹ نظموں پر یا بال جبریل کی رنگین فلسفیانہ غزلوں پر ....ہمیں... الفاظ کی تہوں کو چھید کر مشاہدات اور تجربات کی گہرائیوں میں اترنا ہوگا۔ تلمیحات استعارے اور کنائے کی راہ سے، شاعر کے جذبات کی لہروں، ان کی فکری موجوں کے سہارے اس کے شعور کی تنگ اور پیچیدہ گلیوں میں داخل ہو کر اس کے ذہن کی کشادہ اور فراخ شاہراہوں سے گزر کر اس کے نہاں خانۂ دل میں پہنچنا ہوگا اور ان دریچوں اور ان کے بے شمار روشن دانوں سے جھانکنا ہوگا جن سے مشاہدات اور تجربات کی کرنیں چھپ چھپ کر داخل ہوتی ہیں۔

اختر صاحب کی کرسی جہاں رہتی تھی اس کے دائیں جانب بالکل متصل ایک کھڑکی تھی۔ جو کالج کے مختصر سے خانہ چمن کی طرف کھلتی تھی۔ یہ کہتے کہتے اختر صاحب کی نگاہیں کھڑکی کی طرف اٹھ جاتیں اور آہنی سلاخوں سے گزر کر اقبال ہوسٹل کی بلند دیواروں کو پھاند کر آسمان کی طرف خلا میں معلق ہو جاتیں۔

.. اور ... اور شاعر کے ذہن اور فکر کے گوشے گوشے کو منور کرتی ہیں... یہ زمین، یہ آسمان یہ مہر درخشاں اور یہ ماہ نور افشاں، یہ آنکھ مچولیاں کرتے ہوئے ستارے یہ کہکشاں، یہ شہاب ثاقب... یہ ماہ کامل کے چہرۂ منور پر کبھی نقاب

عینک کے شفاف شیشوں کے پیچھے ان کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوتی نظر آتی۔ ۔ ۔ پلکیں سمٹتے اور پھیلنے لگتی اور انسانی چہرے پر تعلقات ارضی کے نتیجے میں جو ایک عمومی تناؤ اور بھاری پن ہوتا ہے وہ ان کے چہرے سے غائب ہونے لگتا۔ اس کی جگہ آسودگی، شگفتگی اور سبک رنگی نمایاں ہونے لگتی اور حرکت کرتے ہوئے لب ایسی ساخت اختیار کرتے لگتے جس طرح معصوم بچوں کے ہونٹ بولنے کی کوشش کرتے ہوئے الفاظ پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے ہونے لگتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ دل میں خیالات کا ہجوم اور الفاظ کی کم مائگی یا دل کا جوش اور کیفیت کا بھرپور اٹھان۔ شفاف ساکن جھیل پر ان کا عکس، یہ اشارے یہ کنائے یہی شاعر کے ہمراز و ہمنوا ہیں، یہی ہم نفس اور ہم جنس ہیں۔ ۔ ۔ یہ بل کھاتے ہوئے دریا یہ انگڑائیاں لیتے ہوئے آبشار یہ گنگناتے ہوئے چشمے، یہ سرگوشیاں کرتی ہوئی سبک ہوائیں، یہ پیغمبران فطرت، یہ شاعر کے رازداں۔ ۔ ۔ یہ صحرائے نجد، مجنوں کے ہم صحبت آہوان صحرائی۔ ۔ ۔ یہ زمین، یہ آسمان، یہ پورا نظام شمسی یہ کائنات کی تمام پہنائیاں۔ ۔ ۔

اور یہ کہتے ہوئے اختر صاحب اپنے دونوں لمبے ہاتھوں کے ذریعے خلا میں ایک مکمل دائرہ بناتے اور اس دائرے میں اختر صاحب کا کمرہ، کرسیاں، ٹیبل، الماریاں، دروازے، کھڑکیاں، پردے تصویریں، کتابیں، قلم پنسل کاپیاں سب کھو جاتے۔ اور اختر صاحب ولیم بلیک کی "مارتھا" بن جاتے۔ اور ہم سب بچوں کی طرح "مارتھا" کے افسانوی رومان میں گم ہو جاتے۔ کانوں میں آبشاروں کی اور چشموں کی گنگناہٹ گونجنے لگتی۔ ستاروں کی آنکھ مچولیاں نظر آنے لگتیں، شہاب ثاقب ٹوٹتے اور غائب ہوتے لگتے اور ہم لوگ اختر صاحب کے ساتھ شاعر کی ہمرکابی میں اس پوری کائنات میں پرواز کرنے لگتے کہ ٹناٹن، ٹناٹن، ٹناٹن، کلاس ختم ہونے کا گھنٹہ زور سے قریب ہی بجتا۔ اور ہم سب کے پر پرواز یک بیک ٹوٹ جاتے اور دھم سے اپنے اپنے بنچوں پر گر پڑتے۔

اختر صاحب کو فن نقد میں تجزیہ کلام کا اتنا اچھا سلیقہ اور اس میں اتنی مہارت اور اتنی دسترس ہے جو موجودہ چوٹی کے تنقید نگاروں کو بہت کم حاصل ہے۔ تجزیاتی تنقید میں ان کے حریف اور مدمقابل بہت کم ہیں۔ اس سلسلے میں محاکاتی پہلو کا جب تجزیہ کرتے ہیں تو تصویر نگاری پیکر تراشی تماشی بندی، مجسم سازی، ماحول کشی، فضا آفرینی وغیرہ اصطلاحات پر بڑی حسین گفتگو کرتے۔ لیکن جب لیکچر شباب پر آتا تو تمام حسین اصطلاحات شاعر کے کلام سے پرواز کر کے اختر صاحب کی گفتگو کا جزو بن جاتے اور اگرچہ ہم شاعر کو کھو دیتے ہیں مگر شاعر کو پا جاتے ہیں، شاعر کی فکر، شاعر کا فن اور شاعر کا پورا تخلیقی وجود، اختر صاحب کا وجود اختیار کر لیتا ہے اور ہم انہیں میں سب کچھ دیکھنے لگتے ہیں۔ اور اختر صاحب ہمیں لے کر شہر شہر، صحرا صحرا، کوہ کوہ، دریا دریا، وادی وادی پھرتے ہیں۔ پہلے پہل تو ہم بہت پیچھے رہ جاتے تھے اور وہ کسی گلی میں گھس گئے۔ کسی شاہراہ پر نکل گئے، کسی دریا میں غوطہ لگا گئے، کسی پہاڑ پر چڑھ گئے، کسی وادی میں اتر گئے۔ ہم ہکا بکا انہیں ڈھونڈتے پھرتے۔ پھر رفتہ رفتہ ان گلیوں، شاہراہوں، دریاؤں اور وادیوں سے ہم بھی آشنا ہونے لگے۔ پھر تو وہ جب باتیں کرنے کو آمادہ ہوئے تو ہم بھی گوش برآواز ہو گئے۔ وہ جب اٹھے تو ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ وہ جب چلے تو ہم لپکے، وہ دوڑے تو ہم بھی سرپٹ ہوئے، انہوں نے پر تولے تو ہم نے بھی بازو پھیلائے، وہ اڑے تو ہم بھی اڑے، پھر تو آگے آگے شہباز ہے اور پیچھے پیچھے بچگان شہباز، پھر وہ شکار کرنے لگے اور ہم کھانے لگے اور ہضم کرنے لگے۔

کچھ دن ہوئے بزم ادب پٹنہ کالج یوم شاد میں ایک دن شاد پر مقالے، مضامین اور تقریریں تھیں، پروفیسر اجتبیٰ رضوی صدر تھے۔ پروفیسر سید حسن صاحب پروفیسر عطاء الرحمٰن صاحب، پروفیسر حافظ شمس الدین صاحب اور اختر اورینوی صاحب وغیرہ نے مقالے پڑھے اور تقریریں کیں۔ اختر صاحب کی تقریر شاد کے فکر و فن پر تھی، اور اگرچہ مختصر تھی مگر بڑی حد تک سیر حاصل تھی اور ان کے مخصوص انداز میں تھی۔ آخر میں پروفیسر اجتبیٰ رضوی صاحب جو خود بھی فضا آفریں تھی، ماحول نگاری اور پیکر تراشی میں مخصوص و منفرد انداز رکھتے ہیں۔ تمام مقالوں اور تقریروں کو SUM - UP کرتے ہوئے اختر صاحب کی تقریر کے متعلق بولے کہ میں ان کی تقریر کا بھرپور جائزہ نہ لے سکا، وہ اتنے بلند گئے کہ ہم تو انہیں تھامتے ہی رہ گئے۔ میں نے اپنے جی میں کہا "یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا" اور پھر کہا

راز و نیاز بلبل و گل ہم سے پوچھئے نرگس کی آنکھ بن کے رہے ہیں چمن میں ہم

ہمارے اساتذہ میں موضوعات تقسیم تھے۔ کبھی کبھی کوئی استاد نہ ہوتے تو وہ موضوع کسی دوسرے کے کلاس میں لے لیا جاتا۔ عروض و بلاغت کا پرچہ استاذی جناب ڈاکٹر پروفیسر صدر الدین پڑھاتے تھے۔ ایک روز صدر الدین صاحب تشریف نہیں لائے۔ ہم لوگ چونکہ عروض سے بالکل بے بہرہ تھے اس لئے اس موضوع کو بہت اہم سمجھتے تھے۔ سب لوگ اختر صاحب کے کلاس میں گئے اور کہا کہ صدر الدین صاحب تشریف نہیں رکھتے۔ آج آپ ہی عروض کا کلاس لے لیں۔ اختر صاحب نے کہا ضرور میں پڑھاؤں گا، اور بیشک پڑھاؤں گا۔ اور یقینی پڑھاؤں گا۔ آپ لوگ بیٹھیں، اور اس کے بعد اختر صاحب نے بس یہ سمجھئے کہ یوں لکچر شروع کیا۔

آپ لوگوں نے عروض کے متعلق صرف یہ سمجھ رکھا ہے کہ یہ مصرعوں اور شعروں کے ناپنے کا پیمانہ ہے، ماشہ، تولہ، چھٹانک، ادھپئی، پوّا، ادھ سیرا، سیر، ادھ منا، منہا وغیرہ اور قاعدے کے مطابق ان اوزان کو آپ مصرعوں کے الفاظ پر شطرنج کی گوٹی کی طرح بٹھاتے ہیں اور تول تول کر ٹکڑوں کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ بس مسئلہ ختم ہو گیا، عروض بھی ختم اور عروض کی بحث بھی ختم۔ آپ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ ٹیبل جسے آپ اپنی کتابوں سے کاپیوں سے اور اپنی کہنیوں سے گھستے رہتے ہیں۔ یہ چھ فٹ تین فٹ سائز کا لمبا چوڑا ٹیبل یہ بھی ایک مصرع ہے اور یہ اپنے اندر عروض و قواعد پوشیدہ رکھتا ہے یہ کرسی جس پر آپ بیٹھے ہیں اسے گویا آپ عروض اور قاعدے کی دولت سے محروم سمجھتے ہیں۔ یہ میرا چھ فٹ کا بھاری بھرکم جسم اور یہ آپ کے جناب ضیا صاحب (میرے ایک ہم سبق) کا ساڑھے چار فٹ کا نحیف جسم یہ بھی عروضی مصرعہ ہے اور ان پر بھی اوزان و بحور کی چھاپ ہے اور انہیں عروض اور قاعدے کی رو سے جانچ سکتے ہیں اور پرکھ سکتے ہیں صحت اور عدم صحت کا فیصلہ کر سکتے ہیں،

وہ دیکھئے وہ آپ کے پیچھے جو دروازہ ہے جسے آپ سینکڑوں بار قدموں سے ٹھکراتے ہوئے آتے ہیں۔ اور کواڑ جو بارہا آپ کی ٹھوکروں سے نوازی جا چکی ہے، یہ چوکھٹ اور قلابے اور یہ کھٹکے اور یہ زنجیر اور یہ زنجیر اور یہ چٹخنی اور یہ جھلملی اور یہ جھلملی کی پتلی پتلی نازک تختیاں اور یہ اس کی سلاخیں اور ان میں یہ انگوٹھیاں اور کڑے اور یہ فریم اور ان پر یہ رنگ اور یہ پالش اور یہ وارنش، یہ سب مل کر ایک چابکدست فنکار کی غزل بنتے ہیں۔۔ ان میں کوئی مطلع ہے، کوئی حسن مطلع، کوئی شعر ہے کوئی مقطع ہے، کوئی قافیہ کوئی ردیف۔۔۔ اور یہ سب عروض اور قاعدے کی بنیاد پر تخلیق کئے گئے ہیں۔ آپ عروض کو صرف شاعری سے متعلق سمجھتے ہیں، عروض موسیقی میں بھی ہے۔ اور مصوری میں بھی اور معماری میں بھی اور سنگ تراشی میں بھی، اور صرف انہیں میں

نہیں ۔ ... جوتا بنانے میں بھی عروض کی ضرورت ہے، اور شیروانی بنانے میں بھی، اصطبل بنانے میں بھی پارک بنانے میں بھی، چولہا بنانے میں بھی اور "دیوان او" کی شاندار عمارت بنانے میں بھی۔

اور جن لوگوں نے عروض بنایا ہے وہ خود بھی عروض اور قاعدے پر بنائے گئے ہیں اور سب سے بڑا عروض داں اللہ تعالیٰ ہے جس کی غزلیں، نظمیں، قصیدے، رباعی، قطعے، مخمّس، مثلث، مسدس، مستزاد یہ کائنات میں پھیلی ہوئی تمام اشیاء ہیں، جو مصوّر بھی ہے اور شاعر بھی۔ جس کی شاعری کو جاننا سمجھنا اور شعر کی طرح لطف لینا چاہتے ہو تو نکالو قرآن مجید اور لے لو کوئی سورہ۔ اور مثال کے طور پر لے لو سب سے آسان سورہ جسے تم سب لوگ پڑھتے ہو اور تم میں سب کو یاد بھی ہو گی۔ انا اعطینٰک الکوثر...

عروض اور قواعد فصاحت اور بلاغت، تشبیہ، استعارہ، کنایہ مجاز اور جتنی شاعری کی اصطلاحیں تم جانتے ہو، اور دنیا جانتی ہے سب کو ذہن میں لاؤ اور ان سب کو الگ الگ اور ایک ساتھ اس سورہ میں ڈھونڈو، اس میں تمہیں وہ سب کچھ ملے گا، وہ سب کچھ ہے جو بڑے بڑے عروض داں اور فصیح و بلیغ اور شاعر و فنکار کہتے آئے اور اس کے بعد بھی اتنا کچھ ملے گا کہ آنے والے موجدین اور ماہرین قیامت تک سوچتے سمجھتے اور سر دُھنتے رہیں گے"......

پچاس منٹ تک ہم لوگ محو ہو کر لکچر سنتے رہے، لکچر ختم ہوا تو اٹھے اور اختر صاحب بولے کہ جانئے میں نے عروض پر لکچر دیدیا۔ حالانکہ عروض بالکل نہیں جانتا۔

اختر صاحب نے اپنی آپ بیتی مطبوعہ نقوش آپ بیتی نمبر میں فرمایا ہے کہ "مجھے بچے پیارے ہیں، دوست عزیز ہیں اور صنف نازک بہت محبوب ہے"۔ یہ حقیقت ہے، اللہ نے انہیں کسی مصلحت سے اولاد نہیں دی اس کا ردّ عمل دونوں صورتوں میں ہوتا ہے۔ دوسروں کے بچوں سے نفرت یا غایت محبت۔ اختر صاحب پر دوسرا ردّ عمل ہے۔ وہ بچوں کو واقعی بیحد پیار کرتے ہیں، ان کے بھتیجے بھتیجیاں بھانجے بھانجیاں، ان سے اس قدر مانوس اور قریب ہیں کہ اپنے والدین سے بھی نہیں اور دوستوں کا کیا حال

عرض کروں، دنیا یزداں و اہرمن کی داستان کشمکش ہے یہاں ہر زندگی کی راہ میں ایک طرف کانٹے ایک طرف پھول، ایک طرف شاخ گل ایک طرف تلوار، ایک طرف رہنما، ایک طرف رہزن، ایک طرف دوست ایک طرف دشمن ہیں، انسان ٹھوکریں کھاتا ہے، کبھی کانٹوں پر گرتا ہے کبھی پھولوں پر، کبھی شاخ گل کی آغوش میں، کبھی تلوار کے سائے میں، گرنا شکست نہیں، ہمت ہار دینا شکست ہے۔ اختر صاحب کی زندگی کی دو نمایاں خصوصیتیں رہی ہیں۔ انہوں نے زندگی کی ٹھوکر پر کبھی ہمت نہیں ہاری اور ٹھوکر لگانے والے کو ٹھوکر سے کبھی بدلا نہیں دیا۔ شخصیت کی صالح تعمیر کے لئے اس سے اچھا اسلوب اور انداز اور کیا ہو گا۔ اختر صاحب کے دوست بھی ہیں اور دشمن بھی جس طرح ہر انسان کے ہوا کرتے ہیں۔ چاہنے والے بھی اور بد دعائیں دینے والے بھی۔ آگے بڑھانے والوں کا ہمیشہ احسان مانا۔ اور پیچھے کھینچنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ دشمنوں کی دشمنی کا اعتبار کرنا اسے طاقتور بنانا ہے اور اس سے بے اعتنائی برتنا اس کے قوائے عداوت کو کمزور اور مفلوج کر دینا ہے۔ اختر صاحب دوستوں کو بے حد عزیز رکھتے ہیں، اور ان کا اعتماد بعض صورتوں میں اعتدال سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے، لیکن وہ دشمنوں کو بھی بہت عزیز رکھتے ہیں، میرا ان کا ساتھ کلاس کے باہر بہت کم رہا ہے لیکن اکثر نازک موقعوں پر اتفاقاً میری موجودگی بھی رہی ہے۔ جب انسان حزم و احتیاط سے عموماً غافل ہو جاتا ہے اور جذبات کے بہاؤ میں لغزشیں کر بیٹھتا ہے، یہ حادثات بڑے بڑے صاحب مقدور حضرات کو پیش آتے ہیں۔ جس طرح وہ لطیفہ مشہور ہے کہ کلکتہ میں اتفاق سے چند

ارباب کمال صاحبان علم وفن کا کسی جلسے میں مجمع ہو گیا۔ مشہور مقامات کے مختلف علوم وفنون کے علماء اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک صاحب اڑلیسہ کے بھی تھے، جو اپنے صوبے کی پسماندگی کا بڑا احساس رکھتے تھے۔ اور اس ندامت سے اپنا وطن کبھی اڑیسہ نہیں بتاتے تھے۔ جلسہ میں سب ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ کہاں سے تشریف لائے۔ کہاں وطن ہے کہاں تعلیم حاصل کی وغیرہ وغیرہ۔ سبھوں نے اپنی اپنی جو حدی بتائی مگر یہ اڑیا صاحب بہادر یونہی بات ٹالتے گئے کہ میں تو بچپن سے مختلف ملکوں میں رہا۔ بمبئی میں تعلیم حاصل کی، دہلی میں پڑھا۔ حیدرآباد میں کچھ سیکھا۔ لندن سے پی ایچ ڈی کیا وغیرہ وغیرہ، میرا کوئی خاص وطن نہیں، میں تو آوارہ گرد ہوں۔ میری زبان انگریزی ہے اور میرا موضوع فلاں فلاں ہے وغیرہ وغیرہ۔ لوگوں نے ہر ممکن طریقے پر بہلا پھسلا کر ان کے وطن کا پتہ لگانا چاہا۔ مگر بات کھل نہ سکی۔ لوگوں نے ایک ترکیب کی۔ ایک مکان میں انہیں بڑی آرزو منت سے کھانے کی دعوت دی اور مکان کے دروازے کے اندر کمرے سے متصل ایک مقام پر ذرا سا گڑھا کھود کر نیلے کاغذی بورڈ سے چھپا کر اوپر فرش کر دیا۔ وہ معزز مہمان بلا تکلف دروازے سے داخل ہوئے اور فرش پر قدم رکھا ہی تھا کہ گڑھے میں گرے اور گرتے ہوئے حالت اضطرار میں ان کے منہ سے ایک لفظ نکلا "گڑیبو شالا" جو اڑیا زبان کی مشہور مرکب گالی ہے۔ لوگ سمجھ گئے کہ اڑیا بھائی ہیں۔ اختر صاحب کا ظرف اتنا وسیع اور ان کا اخلاص اتنا مستحکم اور ٹھوس ہے کہ نازک مواقع پر بھی ان پر کیفیت اضطرار طاری نہیں ہوتی اور وہ دشمن کے ہاتھ میں کبھی تلوار نہیں دیتے۔

صنف نازک انہیں کس قدر محبوب ہے اور اس کی مظلومیت کا انہیں کس قدر احساس ہے ملاحظہ فرمائیے کہ جس سال میں نے بی اے آنرز میں داخلہ لیا۔ ہم لوگ آٹھ نو ہم سبق تھے۔ اور سب کے سب بدقسمتی سے صنف قوی ہی کے زمرے میں داخل تھے۔ اقبال پر گفتگو کرتے ہوئے اقبال کے تصور عورت سے اختر صاحب اختلاف کرتے اور اکثر ہم سب کو کہتے کہ ہاں جناب آپ حضرات تو بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ قرآن نے بھی فرمادیا ہے کہ "الرجال قوامون علی النساء" لیکن معاف فرمائیے میں قرآن پر دل وجان سے ایمان رکھتے ہوئے اقبال کے اس تصور سے ضرور اختلاف رکھتا ہوں۔ آپ "قوامون" اس لئے نہیں ہیں کہ کما کما کے کھلاتے ہیں لہذا جیب چاہیں لکڑی لیکر بے چاری کی مرمت کر دیں۔ کیونکہ آپ کما کر کھلاتے ہیں تو وہ بھی آپ کو پکا کر کھلاتی ہے۔ آپ "قوامون" اس لئے ہیں کہ آپ اس کی نسائیت کے محافظ ہیں۔ اس لئے آپ کی حیثیت خادم کی تو ہو سکتی ہے آقا کی ہرگز نہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایم اے کے اول سال میں ہماری جماعت میں ایک طالبہ کا اضافہ ہوا۔ کالج کی طالبات کی طبعی شوخی اور بے باکی کے برعکس ہماری ہم سبق کے مزاج میں اعتدال سے بھی زیادہ متانت سنجیدگی خاموشی اور علیحدگی پسندی تھی۔ اس لئے ہمارے ساتھیوں نے "تعزیہ" کا خطاب دے رکھا تھا۔ بایں ہمہ ان کی موجودگی کلاس میں فلسفۂ نسائیت وجمالیت کو اکثر زیر بحث لاتی اور اختر صاحب کے بقول کلام اقبال میں صنف نازک کے ساتھ انصاف کی جس حد تک کمی رہ گئی تھی، تشریح کلام اقبال کے دوران اختر صاحب اس کمی کو حتی الامکان پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اتفاق سے جس دن سال اول اور سال دوم کا کلاس مشترک ہو گیا جس میں ایک خاتون ایسی تھیں جن پر "تعزیہ" کا اطلاق ممکن نہیں تھا اس دن اختر صاحب کا لکچر سن کر غالب کا مصرعہ بار بار ذہن میں آتا تھا کہ ؏ پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار۔

اور ہمارے ایک سال نیچے جو جماعت آرہی تھی اس میں تو اقبال کے تصور عورت سے جنگ آزمائی کے لئے نصف درجن سے زیادہ جیتی جاگتی، چلتی پھرتی، مزین مرصع اور مرقع شمشیریں تھیں، اقبال کیا افلاطون کے تصور عورت کے بھی پرخچے اڑانے کے لئے کافی تھیں۔

اختر صاحب کا کمرہ صرف ادب وشاعری کا کلاس نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر کسی نہ کسی حیثیت سے گفتگو آئی۔ یہ کلاس

کا عمومی نقشہ ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی ہنگامی صورت حال کے اثرات بھی رینگ رینگ کر کلاس میں پہنچ جاتے۔ لیکن اس ہنگامی صورت حال پر گفتگو ہوتی بھی تو کلاس کے آداب و احترام اور ادب و زبان کے دائرے سے بہت دور نہیں جا پڑتی۔ اور بہر حال ان کا رشتہ کسی نہ کسی مقام پر تعلیمی موضوع سے جڑ جاتا۔ ہاں کبھی کبھی "رسم و آداب" کے دائرے سے بات نکل بھی گئی ہے اور جب بھی ایسا ہوا ہے اختر صاحب کی شخصیت کا کوئی نیا پہلو نمایاں ہوا ہے۔ مثلاً ایک دن کا واقعہ سن لیجئے:۔

اختر صاحب نے بحیثیت انسان یا بحیثیت فنکار مرجی کہ زندگی کرنے کا فن سیکھ لیا ہے۔ یہ فن اکثر فنکاروں کے دسترس میں نہیں آیا ہے۔ اب اختر صاحب کی زندگی میں کوئی طوفان نہیں ہے۔ فضا ڈھلی ڈھلائی ہے۔ ان کی زندگی ایک ساختہ پرداختہ، چیدہ و تراشیدہ آراستہ و پیراستہ خانہ باغ ہے جس میں صبح و شام ایک ایک شاخ کو موزوں اور سڈول بنایا جاتا ہے۔ اس خانہ باغ میں خودروئی نہیں ملے گی۔ ان کا کیرکٹر سمندر کے سبک بہاؤ سے مشابہ ہے، جس پر پہلی نظر میں ٹھہراؤ کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس میں دریا کا جوش نہیں ہے، اعتدال اور توازن مزاج کی بنیادی خصوصیت ہے۔ غم و غصہ خوشی مسرت ہر چیز پر یکساں توازن اور اعتدال کی چادر پڑی ہوتی ہے جس کی سطح میں ہر طرف ایک عمومی ہمواری ہے۔

برطانیہ اور فرانس نے نہر سویز پر حملہ کیا۔ اور پوری عرب دنیا میں ایک تلاطم برپا ہو گیا۔ سویز پر بمباریاں ہوئیں، جہاز ڈوبے۔ کشتیاں تباہ ہوئیں۔ جانیں تلف ہوئیں۔ لوگ بے گھر ہوئے، عورتیں بیوہ ہوئیں بچے یتیم ہوئے، چیخ پکار، آہ و کراہ جو کچھ بھی ظالم و مظلوم کی کشمکش کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ وہ ہوا، ہمدردیاں بھی خانوں میں تقسیم ہوئیں۔ کسی نے جبر ستمگاراں کو آفریں کہی، کسی نے جبر ستم زدگان کو مرحبا کہا اس جبر اور صبر کی آواز بازگشت نہر سویز کے نزدیک و دور تمام سنائی دے رہی تھی۔ ایک دن پٹنہ کالج کلاس میں بھی اس جبر اور صبر کی داستان چھڑ گئی۔ ادب و شاعری کی نزاکتوں اور رنگینیوں سے بات نکل کر جنگ آگ خون اور دھواں تک پہنچ گئی۔ ایڈن کے وجیہ اور خوبصورت جسم کے اندر قلب سیاہ کی بات نکلی اور جنرل ڈیگال کی دراز قامتی اور پست ذہنی کا تذکرہ بھی آیا۔ ناصر کی آزاد خیالی کے ساتھ اس کے حوصلے عزم ارادے اور استقلال کی گفتگو بھی آئی۔ اور پھر قاہرہ کے عوام سامنے آئے، اسکندریہ کے مزدور ملاح اور ماہی گیر بھی قریب آئے۔ ان کی جفاکش فطرت، مشقت کی تراشی ہوئی زندگی اور ریگستان کی منوں اڑتی ہوئی ریت میں اٹے ہوئے ان کے جسم ان کے پیرہن اور ان کی پسینوں سے چمکتی ہوئی پیشانیاں بھی نظر آئیں۔ اور بمباری سے بھاگتی گرتی چیختی اور کراہتی ہوئی مخلوق، پرچھے اڑتے ہوئے اعضا زخموں سے لڑکھڑاتے ہوئے مرد، ٹھنڈی اور گرم لاشیں، ماتم کرتی ہوئی مائیں، اور مردہ سینوں سے چمٹے ہوئے بے زبان بے سمجھ بچے سب آنکھوں کے آگے متحرک ہو گئے۔ اور پھر ہم نے دیکھا کہ جوش میں باتیں کرتے ہوئے اختر صاحب یک بیک خاموش ہو گئے اور وہ ہوا جو ہم نے تین چار سال کی مدت میں کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ ان کے مزاج اور طبیعت میں اس اچانک انقلاب کی توقع تھی، اس متوازن اور معتدل مزاج کے انسان، اس آہنی عزم اور ارادے کے انسان سے وہ بات ہوئی جو ہم جیسے کمزور طبعوں سے ہوتی ہے، اختر صاحب یک بیک خاموش ہو گئے۔ ان کے دونوں ہاتھ پہلے تو مضبوطی سے کرسی کے دستوں پر جم گئے پھر چہرہ اک دم سرخ ہو گیا، اور پھر اختر صاحب کی ٹھوڑی اور زور سے کانپنے لگی، ہونٹ تیزی سے تھرانے لگے۔ ضبط کی ساری طاقتیں سپر رکھ دینے پر مجبور ہو گئیں۔ اختر صاحب کا سر جھک گیا اور ان کے دونوں ہاتھ کرسی کے دستے سے اٹھ کر منہ پر آ گئے۔ اختر صاحب زور سے روئے۔

اختر صاحب کے جسم، ان کے قد و قامت ان کی وجاہت میں اور ین کی کوہستانی مٹی کا خمیر تھا۔ اور بڑی حد تک ان کے مزاج پر

بھی کوہستانی ہی فضا کا پرتو تھا ... ارول کی رومانی فضا بے شک ان کی زندگی کو اک موڑ دے چکی تھی اور بہت ممکن ہے کسی زمانے میں ان کے مزاج اور طبیعت کا جزو خاص رہی ہو اور اس کے اثرات ان کی زندگی میں بہت نمایاں رہے ہوں۔ میں نہ ان کی پوری زندگی سے واقف ہوں نہ ان کی شخصیت پر جو مضامین نقوش میں نکلے ہیں انہیں پڑھ سکا ہوں۔ میرا ذاتی مطالعہ یہی ہے کہ اختر صاحب پر مرض سل کا اتنا قابل ذکر حملہ اگر نہ ہوتا تو وہ جو کچھ اس سن و سال میں بھی مجھے نظر آتے ہیں اس سے بھی بہت کچھ آگے نظر آتے۔ ارول کے رومان نے ان کے مزاج کو ایک ہلکی سی لچک بخش دی تھی۔ اودین کی پتھریلی اور ٹھوس فضا نے ان کی رگوں میں حقیقت پسندی کا بڑا گاڑھا لہو دوڑا دیا تھا جو سل کی راہ سے بھی خارج نہ ہو سکا۔ میں تو اس حد تک بھی نہیں جا سکتا کہ ان کی طبیعت کو حقیقت اور رومان کا سنگم یا حسین امتزاج کہوں۔ لکھنے والے کے لئے آسان اور محتاط طریقہ یہی تھا۔ میں تو کہتا ہوں کہ رومان بس اختر صاحب کی زبان پر ہی تھا۔ گفتگوؤں ہی میں تھا لکچروں ہی میں تھا۔ اور اس کے بعد ان کی شاعری میں۔ چونکہ شاعری ارول کے پام ویلا میں پروان چڑھی۔ اس لئے اس وضعداری کو نباہتی رہی۔ بس میں تو اسے وضعداری ہی وضعداری سمجھتا ہوں۔ اور میں خوب سمجھتا ہوں کہ حقیقتوں نے دریائے سون، پام ویلا، اور وہاں کی چاندنی راتوں کی یاد کو کسی بہت قدیم قافلے کے دھندلے دھندلے نقوش قدم سے زیادہ حیثیت باقی نہیں رکھا ہوگا حقیقت پسندی ان کے دل میں، ان کے ذہن میں اور ان کے رگ و ریشے میں انگڑائیاں لیتی رہی اگر وہ سل کے مریض نہ رہے ہوتے تو وہ اس سن و سال میں بھی زیادہ چاق و چوبند، زیادہ جفاکش، زیادہ باہمت مجاہد اور جان پر کھیل جانے والے ہوتے۔ میری اپنی رائے ہے کہ رومان انسان کو بیشتر حالات میں بزدل بناتا ہے۔ مشقت اور مجاہدے سے گریز اور خطرات سے فرار کی تعلیم دیتا ہے۔ اسے زندگی کی قدروں سے کم لیکن زندگی سے زیادہ پیار کرنا سکھاتا ہے۔ اور زندگی سے اس پیار کے لئے ہمیشہ زندگی کی قدروں کو قربان کرنا سکھاتا ہے۔

اختر صاحب میں، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، بزدلی نہیں رہی، مشقت اور مجاہدے سے پرہیز ان کے قدیم مرض سل کا ردعمل ہے، خطرات سے وہ نہیں گھبرائے اور زندگی سے زیادہ زندگی کی قدروں کو عزیز رکھا۔

نسائیت اور حسن ظاہر بیشک ان کی کمزوری رہی لیکن یہ زندگی کے چٹخارے ہی کی حد تک ، دسترخوان حیات پر ان کا وجود چٹنی، اچار، مربے سے زیادہ نہیں، لیکن حقیقت کا حسن، سیرت کا حسن، اقدار کا حسن، اصول کا حسن تو دال روٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اختر صاحب غالب کے محبوب کو پسند کرتے رہے۔ میر کے محبوب کو چاہتے رہے اور اقبال کے محبوب پر جان دیتے رہے۔ آٹھ نو سال قبل پٹنہ کالج بزم ادب کے جلسے میں جب روش صدیقی نے یہ غزل پڑھی ؎

یہ حقیقت کوئی ارباب خبر سے پوچھے — کس قدر مرحلۂ بے خبری مشکل ہے
عارض گل کو بھی ہے غازۂ شبنم درکار — حسن ہو رسم تکلف سے بری مشکل ہے

تو اختر صاحب گردن ہلا ہلا کر واہ واہ سبحان اللہ، بہت خوب بھئی بہت خوب کی تکرار کر رہے تھے اور بیحد تعریف کر رہے تھے اور بیحد پسند فرما رہے تھے ... لیکن جب ایک شخص نے سیدھی سادی بات غزل میں کہی ؎

ہمارا حال اے ساقی ہوا جو کچھ کہ ہونا تھا — تری محفل اگر اجڑی، ترا انجام کیا ہوگا
تمہارے چاہنے والے مبارک ہوں تمہیں لیکن — جو ہم نے کر دیا وہ دوسروں سے کام کیا ہوگا

تو اختر صاحب نہ واہ واہ کر رہے تھے نہ سبحان اللہ، لیکن آنکھیں چمک رہی تھیں، چہرے پر ایک تمتماہٹ تھی، اور جوش، حیرت اور مسرت

کے غلبے سے ہونٹ سکڑ رہے تھے اور پھیل رہے تھے۔ در انحالیکہ اس شخص کے اشعار میں نہ رومان کا حسن تھا نہ شاعری کا فن، وقت کی سیدھی سادی باتیں اور سپاٹ حقیقتیں ہیں۔

چند سال پہلے اشٹ گرہ کا بھوت جب دنیا کے سر پہ سوار تھا اور میں دیکھتا تھا کہ مکان کے آگے جھونپڑے پڑ گئے ہیں، لوگ مکانوں سے نکل کر پھوس کے جھونپڑوں اور خیموں میں زندگیوں کو چھپائے پھرتے تھے۔ اور شہر کے لان میں میدانوں میں اور فٹ پاتھ پر سر شام ہی سے بستروں کی قطاریں لگ جاتی تھیں اور پورے گاندھی میدان میں رات کو سونے والوں کو جگہ نہ ملتی تھی۔ اسکولوں اور کالجوں میں کلاس غیر مطمئن فضا میں ہوتے تھے۔ اور بیشتر اساتذہ خود ہمارے شعبے کے اساتذہ، کھلے میدان میں کلاس لینے پر مصر تھے اور کلاس کھلے میدان میں لیتے تھے۔ اختر صاحب کا کمرہ اعتماد یقین ہمت اور استقلال کی تبلیغ واشاعت کا مرکز تھا۔

چند دنوں پہلے جب جمشید پور، اوڑکیلا اور رانچی کے فسادات کی آگ بس ابھی بجھی ہی تھی، ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی، میں اختر صاحب کے گھر پران کے کمرے میں بیٹھا تھا اور موضوع گفتگو حالات حاضرہ ہی تھے۔ اتنے میں ان کے چھوٹے بھائی فضل احمد سپرنٹنڈنٹ پولیس آئے کچھ بات نکلی، اس پر اختر صاحب نے کہا کہ میں آج شام گویا کل صبح مگدھ یونیورسٹی کے بورڈ کی میٹنگ میں گیا جا رہا ہوں فضل صاحب نے انگریزی میں کہا "میرے محافظوں میں سے ایک آپ کے ساتھ جائے گا۔" ONE OF MY ARMED GUARDS WILL GO WITH YOU تو اختر نے انگریزی ہی میں جواب دیا "میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔" I DONT REQUIRE IT مگر فضل صاحب کا اصرار تھا۔ ممکن ہے محافظ ان کے ساتھ گیا ہو۔

بقیہ، اس خرابے میں — اختر: ایک امتیاز

پس پردہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس تحریک کی ہر منزل پر اختر کی رہنمائی ہمیں حاصل رہی ہے، حکومت سے اردو کے حقوق کو منوانا ہو یا تعلیمی اداروں میں اردو کی حیثیت کو تسلیم کروانا، عوام کے سامنے اردو کے مسئلے کو قومی نقطۂ نظر سے پیش کرنا ہو یا نظم کے پیچ وخم کو ہموار کرنا ہر وقت اور ہر منزل پر ایسی مدد کرتے رہے ہیں جو دوسروں سے ممکن نہیں تھی۔ انہوں نے صرف زبان کے تحفظ کے لئے کوشش نہیں کی، بہار میں نئے لکھنے والوں کی ایک نسل کی بھی تربیت کی ہے۔ آج بہار میں اچھی نثر لکھنے والے اور اچھا شعر کہنے والے کسی اور علاقے سے کم نہیں ہیں۔ پھر انہوں نے بہار کے کتنے ایسے شعراء پر قلم اٹھایا ہے جن کی اہمیت کا اردو دنیا میں مناسب احساس نہ تھا گویا تاریخ ادب اردو میں اختر اور ان کے رفیقوں نے کئی ابواب کا اضافہ کیا ہے۔۔۔

ڈاکٹر معز الدین
ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی لاہور

پروفیسر اختر اورینوی - ایک یاد ایک تاثر

پروفیسر اختر اورینوی کے سانحۂ ارتحال کی خبر مجھے نقوش کے ایڈیٹر جناب محمد طفیل نے دی۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ان کی علالت اور شدید علالت کی خبر ادھر کئی برسوں سے مل رہی تھی۔ اس درمیان میں کبھی روبہ صحت ہونے کا مژدہ بھی آتا پھر یہ سنتے کہ الٹی ہوگئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ ڈھارس بندھی کہ آخر ان کو بیماریٔ دل، تو نہیں کہ جانبر نہ ہوسکیں گے۔ البتہ اس خبر نے رحشت سی تھی کہ بولتے بہت کم ہیں۔ قوت گویائی ایک حد تک سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ میں قدرت کی ستم ظریفی پر حیران ہوتا کہ کہاں وہ کھلکھلاتے اور رطلتے سے پرلنے والی باغ و بہار شخصیت اور کہاں یہ صُمٌ بُکمٌ بستر پر ذی فراش مجبور محض انسان۔ میں اس تصور سے لرز اٹھتا کہ اگر ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور وہ ٹک ٹک دیدم سی کیفیت کا مجسمہ بنے بیٹھے رہے تو مجھ پہ کیا گزرے گی۔ دعا کرتا کہ اے کاش میں جب ملنے جاؤں تو اپنے کلاس روم میں چہکنے والے بلبل طرار کو دیکھوں۔ بلبل بیمار کو نہیں۔

قدرت کا عجب نظام ہے۔ جب خدا دیتا ہے تو بہت کچھ دیتا ہے۔ جب لیتا ہے تو یکدم لے لیتا ہے۔ زور تقریر بخشا تو ایسا کہ سننے والے عش عش کریں۔ اور کہاں ایسا ہوا کہ زبان جیسے تھک گئی ہو۔ کبھی خیال گزرتا کہ کیا اختر صاحب کو قدرت نے تحریر و تقریر کی جو صلاحیت ودیعت کی تھی انہوں نے اپنی فیاضانہ طبیعت سے بہت پہلے سب صرف کر ڈالا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بولتے تو بے تحاشا، ہنستے تو بے تکان۔ ہنستے تو دیوار قہقہہ۔ محفل کو اپنی ظرافت و بذلہ سنجی سے زعفران زار بنا دیتے پھر یکایک خاموش جیسے رات بہت تھے جاگے۔ صبح ہوئی آرام کیا!

پروفیسر اختر اورینوی کے شاگرد تو بے شمار ہیں، مگر مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ میں ان کے خاندان میں داخل ہوگیا یعنی پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کی صاحبزادی اور جناب شمسی کاکوی کی نواسی سے شادی کے بعد ان سے میری سسرالی جہت ہوگئی یعنی وہ میرے اختر ماموں اور بیگم شکیلہ اختر، شکیلہ ممانی ہوگئیں۔ اور اس طرح میں ان سے اور قریب ہوگیا۔

۱۹۵ء تک تقریباً چھ سال تک پروفیسر پٹنہ کالج میں پروفیسر اختر اورینوی کو مجھے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ شاگرد کی حیثیت سے بھی اور تھوڑے عرصے تک پٹنہ کالج میں لکچرار رہنے کے طفیل بھی۔ میرا کیریئر بنانے بلکہ ایک حد تک میری زندگی سنوارنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ پہلے کیریئر کی بات کرلوں۔ جب میں پٹنہ کالج میں بی اے کے طالب علم کی حیثیت سے ۱۹۴۵ء میں داخل ہوا تو پہلے انگلش آنرز میں داخلہ لیا۔ پروفیسر کلیم الدین احمد سے پڑھنے کے شوق میں، مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد انہوں نے ہماری جماعت کو پڑھانا چھوڑ دیا۔ دوران جنگ ان کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ جی ٹوٹ گیا۔ پھر پروفیسر اختر اورینوی سے بات کی کہ میں اردو میں آنرز لینا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے۔ اب مضمون بدلنے کا وقت نہیں رہا۔ پھر انٹرمیڈیٹ کے مضامین پوچھے۔ وہاں میں نے فارسی لے رکھی تھی۔ دشواری اور بڑھ گئی۔ صدر شعبہ حافظ شمس الدین شمس تبریزی

مرحوم تھے، وہ کچھ تیار تھے مگر دوسرے اساتذہ نے حوصلہ افزائی نہ کی۔ کیونکہ انٹر میں میرا اختیاری مضمون اردو نہ تھا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ میاں انگریزی آنرز میں داخلہ مشکل سے ملتا ہے۔ پھر اردو کا مستقبل نہیں۔ میں نے کہا کہ مضمون سے کیا ہوتا ہے۔ آدمی کی اپنی صلاحیت ہوتی ہے۔ غرضکہ مجھ میں ضد پیدا ہوگئی اور تہیہ کر لیا کہ اردو آنرز لے کر رہوں گا۔ اختر صاحب کے پاس گیا پہلے تو انہوں نے وجہ پوچھی۔ میں نے کہا شوق۔ فرمایا۔ انگریزی پڑھ کر بھی تو اردو کا شوق جاری رکھ سکتے ہو۔ میں نے جواب دیا تو پھر آپ کیوں انگریزی سے اردو کی طرف آئے۔ غور سے دیکھا۔ کہنے لگے کل کلاس میں آؤ۔ اس طرح دیگر اساتذہ کی مخالفت کے باوجود اختر صاحب کی سفارش پر مجھے اردو آنرز میں داخلہ مل گیا۔ پروفیسر نجم الہدیٰ نے یہ شرط لگا دی کہ اگر پہلے امتحان میں رزلٹ اچھا نہیں آیا تو آنرز ختم کر دیا جائے گا۔ میں اس پر راضی ہوگیا۔ حالانکہ پھر انگریزی کی طرف لوٹنا ناممکن تھا۔ جب امتحان ہوا تو خود نجم الہدیٰ صاحب نے مجھ سے کہا کہ تمہارا پرچہ میں نے دیکھا، اچھا تھا۔ یہ اختر صاحب کی کامیابی تھی۔ جب انہیں میرے مارکس معلوم ہوئے تو بے حد خوش ہوئے۔ یوں تو ان کے نزدیک ہر شاگرد عزیز تھا وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ پدرانہ شفقت اور دوستانہ اخلاص رکھتے تھے۔ میں نے آنرز اور ایم اے دونوں امتحانوں میں نمایاں کامیابی اور گولڈ میڈل حاصل کر کے ان کے انتخاب کی لاج رکھ لی۔ وہ دونوں بار میری شاندار کامیابی پر بے حد شاداں و فرحاں تھے۔ جب میرا تقرر پٹنہ کالج میں اردو کے لکچرار کی حیثیت سے ہوا تو ان کو ایسی خوشی تھی جیسے یہ ملازمت انہیں کو ملی ہے۔ بے حد خوش تھے۔ یہاں تک کہ سائنس کالج میں آئی۔ ایس سی کے طلبا کو جنہیں وہ خود پڑھانے جایا کرتے تھے میرے سپرد کر دیا۔ وہ بے حد مقبول استاد تھے۔ ان کی جگہ جانے سے میں گھبراتا تھا، مگر انہوں نے حوصلہ بڑھایا۔ ساتھ ہی کہنے لگے کہ ہوشیار رہنا، سائنس کے لڑکے تیز بھی ہیں اور شریر بھی۔ میں گھبرایا۔ مگر اس بات پر نازاں تھا کہ اختر صاحب کی جگہ پڑھانے جا رہا ہوں اور خود ان کے ایما اور اصرار پر۔

کالج کے زمانے کی اختر اورینوی صاحب کی ذات سے متعلق کتنی ہی یادیں وابستہ ہیں۔ کلاس روم میں ان کی پرکشش اور باوقار شخصیت سے ایک پرسکون اور خوشگوار ادبی ماحول سا رہتا۔ اور کلاس سے باہر بھی ہم لوگوں کو اس بات کی تقویت تھی کہ اگر کوئی ضرورت پیش آئی تو ان کی ہمدردی ہمارے شامل حال تھی۔ کسی جھجک کے بغیر ان کے یہاں پہنچ جاتے۔ خواہ کیسے ہی پیچیدہ مسائل ہوں وہ غور سے سنتے اور مدد کو تیار رہتے۔

پٹنہ کالج کی بزم ادب کی جانب سے ہر سال نہایت شاندار اردو ڈرامہ اسٹیج کیا جاتا۔ اس کے روح رواں اختر اورینوی صاحب ہوتے۔ ان ڈراموں میں "روحوں کا مشاعرہ" اور "ابلیس کی مجلس شوریٰ" یادگار ڈرامے تھے۔ اور ان کی شہر میں دھوم مچی تھی۔ دونوں کی ڈرامائی تشکیل اور ہدایت اختر صاحب نے کی تھی۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ کے لئے جب کردار کا انتخاب ہونے لگا تو اس وقت کے طلباء کے درمیان کئی ریہرسل اور ٹسٹ ہوئے۔ آخر میں ان کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی۔ اور قرعۂ فال بھی میرے نام نکلا۔ کچھ لوگوں نے مخالفت کی کہ اتنے اہم رول کسی بھاری بھرکم جسم والے کو دینا چاہئے۔ یہ دھان پان سا طالب علم اسے نہیں نبھا سکتا۔ اختر صاحب نے میری حمایت اور حوصلہ افزائی کی اور جواب دیا کہ ریہرسل میں کرا رہا ہوں، میرا انتخاب غلط نہیں۔ جب آپ ڈرامہ دیکھنے آئیں گے تو اس کی کامیابی کا اندازہ ہوگا۔ میں اپنی تعریف کرنا نہیں چاہتا۔ اسٹیج پر اپنی توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ ناظرین نے بے حد پسند کیا۔ بہترین اداکاری پر مجھے صدر شعبہ حافظ شمس الدین کی طرف سے ایک میڈل ملا۔ اور اردو روزنامہ "صدائے عام" اور انگریزی اخبار سرچ لائٹ نے خاص طور اپنے کالموں میں ابلیس کی اداکاری کی تعریف کی۔ یہ در اصل اختر صاحب کی توجہ، دلچسپی اور ہدایت کا نتیجہ تھا۔ جب میں بزم ادب کا سکریٹری منتخب ہوا تو ادبی علمی اور شعبے کے دیگر امور میں دلچسپی لینے اور اختر صاحب سے قربت کا زیادہ موقع ملا۔ ان کی دلآویز شخصیت ہر کام میں رہنمائی کرتی۔ ان کی ذات ایک انجمن تھی۔ ایک درسگاہ جہاں ذہنی تربیت کے بھی مواقع تھے اور علمی مشاغل کے بھی۔

۱۹۴۶ء میں بہار میں ہندو مسلم فساد کے وقت اختر صاحب کی شخصیت اور ان کے کردار کا ایک اور رخ دیکھنے کا موقع ملا۔ مصیبت یا سفر میں

اگر کسی کا ساتھ ہو تو اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے اس کے کردار کے مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔ چھٹیوں کا زمانہ تھا۔ چند مسلم طلبا، پٹنہ کالج مسلم ہوسٹل میں رہ گئے تھے۔ ان چند مسلمان طلبا میں ایک ہندو طالب علم بھی تھا جس وقت ہم لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ ہوسٹل پر دریائے گنگا کی طرف سے ہندو حملہ آور ہونے والے ہیں تو ہمارے درمیان سراسیمگی پھیل گئی۔ جب اختر صاحب کو معلوم ہوا تو فوراً ہوسٹل آئے اور صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد اپنے کوارٹر میں بلا لیا وہ اس وقت ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور ہمارے نگراں۔ ہم لوگ چپکے سے اختر صاحب کے کوارٹر میں منتقل ہو گئے۔ ہم لوگوں نے ان سے کہا کہ ایک ہندو طالب علم بھی ساتھ ہے۔ اب نہ وہ باہر جا سکتا ہے نہ ہم اسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں اس کی وجہ سے اور پریشانیوں میں نہ مبتلا ہو جائیں۔ اختر صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ رہے گا۔ خواہ ہمارا جو حشر ہو۔ کسی نے کالج کے پرنسپل گور کھ ناتھ سنہا سے جا کر یہ کہہ دیا کہ اسے مسلمان لڑکوں نے مار ڈالا اور خود اختر صاحب کے یہاں منتقل ہو گئے ہیں۔ پرنسپل کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ طیش کے عالم میں اختر صاحب کے گھر پر ہاتھ میں پستول لئے آیا۔ دروازے پر زور سے دستک دی۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر ہم لوگوں کی ہمت نہ تھی کہ دروازہ کھولیں۔ مگر اختر صاحب دروازہ کھول کر خود باہر آ گئے اور اپنے ساتھ اس ہندو لڑکے کو بھی لے کر نکلے جب پرنسپل کو اطمینان ہوا کہ انہوں نے ہندو اور مسلم طلبا میں فرق نہیں کیا ہے تو وہ مہربان ہو گیا اور ہم سب کو اپنے ساتھ اپنے بنگلے پر لے گیا اختر صاحب اپنی فیملی کے ساتھ وہاں چلے گئے۔ اور ہم سب ان کے ساتھ رہے جیسے سب ان کے خاندان کے افراد ہوں۔ ہم لوگوں نے وہاں جوں توں رات گزاری۔ بعد میں ہم لوگ کرنل محبوب کے یہاں ولی منزل میں آ گئے۔ جہاں اور لوگ بھی پناہ گزین تھے۔ ہم لوگ دن کو فسادات سے متاثر لوگوں کی مختلف کیمپوں میں مدد کرتے اور رات کو باری باری سے پہرہ دیتے۔ کیونکہ ہر وقت بلوائیوں کا ڈر تھا۔ اس وقت اختر صاحب ہم لوگوں کے لئے ایک بہت بڑا سہارا تھے۔ مسلمانوں کے قتل عام کی خبر سے یہ ہر وقت مضمحل اور مضطرب رہتے۔ اور وہاں کی سیاسی فضا سے سخت آزردہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو اپنی تنگ نظری سے پاکستان بنوائیں گے۔ مگر مسلمانوں کے لئے دونوں صورتوں میں پریشانیوں کا سامنا ہوگا۔ "بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ"۔ خود پاکستان نہیں آئے مگر شاگردوں اور عزیزوں کو آنے سے نہیں روکا۔ کیونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی بدحالیوں کا ان کو اندازہ تھا۔

ان کی شاگردی کے درمیان دو بار ان کی خفگی کا مزہ بھی چکھنا پڑا تھا۔ جس کی تفصیل یوں ہے کہ ایک بار ہم چند دوست ہوسٹل میں ایک صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ دیکھا کہ ان کے گھر سے کھانے کی کچھ چیزیں آئی ہیں۔ مگر وہ ٹفن کیریر میں تالہ ڈال کر چھپائے ہوئے تھے۔ ہماری نظر پڑی۔ ادھر سے اصرار، اُدھر سے انکار بڑھتا گیا۔ اور وہ صاحب کسی ضروری کام کا بہانہ بنا کر باہر جانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ہم لوگوں نے کہا کہ آپ جا سکتے ہیں۔ ہم یہیں گپ کے موڈ میں ہیں۔ ان صاحب کو کیا سوجھی کہ غصے میں کمرے سے باہر نکل آئے اور باہر سے تالہ لگا دیا۔ ہماری تو مراد بر آئی۔ جھٹ اندر سے کنڈی لگا دی۔ اور ٹفن کیریر پر ٹوٹ پڑے۔ جب کھڑکی سے ان کی نظر ہم لوگوں پر پڑی تو غصے سے بے قابو ہو گئے۔ تالہ کھول کر دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ کبھی کھڑکی کے قریب آ کر دھمکی دیتے۔ ہم لوگ اطمینان سے حلوے کا مزہ لوٹ رہے تھے۔ ناچار وہ اختر صاحب کے کوارٹر کی طرف فریاد کرتے ہوئے دوڑ پڑے۔ ہم لوگوں نے دیکھا کہ اختر صاحب غضب ناک انداز سے آ رہے ہیں۔ دروازہ کھول کر اطمینان سے جس کے ہاتھ میں جو تھا لئے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ٹفن کیریر خالی دیکھ کر وہ صاحب تو آبدیدہ ہو گئے اور اختر صاحب جوش میں آ کر تقریر کر رہے تھے۔ "یہ ہوٹل میں ہوتا ہے۔ ہندوؤں کا شیوہ ہے۔ خنزیریت ہے، بہیمانہ حرکتیں ہیں۔" پتہ نہیں غصے میں کیا کیا فقرے ان کے منہ سے نکل رہے تھے۔ اور ہم لوگ بھیگی بلی بنے سن رہے تھے۔ اچانک وہ کمرے سے یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ "ہم اپنے یہاں ایسی لغو حرکتیں برداشت نہیں کر سکتے۔ مسلمان طلبا کو ڈسپلن کا آئیڈیل پیش کرنا چاہئے۔" تھوڑی دیر کے بعد جب حافظ شمس الدین صاحب کی کلاس میں ہم لوگ گئے تو دیکھا کہ اختر صاحب ان سے اسی واقعے کو دہرا رہے ہیں۔ حافظ صاحب نے ہمیں دیکھ لیا تھا ہمارے دو ساتھی تو وہاں سے کھسک گئے۔ مگر میرے لئے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کا سماں تھا۔ ڈر تھا کہ دیکھئے کیا سزا ملتی ہے۔ اختر صاحب کی نظر

مجھ پر پڑی۔ میں اور مضطرب ہوا۔ وہ حافظ صاحب سے کہہ رہے تھے، حضور! تمام سینئر طلبا بامنادید عثمنگ موجود تھے۔ میں کیا کہتا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ انڈے کا حلوہ اور مٹھائیوں کو دیکھ کر تو میرے منہ میں بھی پانی آگیا تھا۔ حافظ صاحب ہنس پڑے۔ اختر صاحب کا غصہ کافور ہوچکا تھا ایک بادل تھا جو گھر کے آیا۔ گرجا، برسا، مطلع صاف تھا۔ ان کی طبیعت کا یہی انداز تھا جذبات میں آنے تو گھنگھور گھٹا کا سماں پیدا کرتے مگر تھوڑی ہی دیر میں برسے ہوئے بادل کی طرح خاموش۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ جس زمانے میں میں مس (mess) انچارج یعنی داروغۂ مطبخ تھا تو جن لوگوں کے یہاں پیسے باقی تھے ان سے سختی سے پیش آتا تھا جن کے بل دو تین ماہ سے ادا نہیں ہوئے تھے۔ ان کے یہاں کھانا بند کروایا تھا۔ ایک خان صاحب تھے۔ نفیس سوٹ پہنتے اور کمرے کو اچھے پردے اور قالین سے مزین رکھتے مگر کھانے کا بل مہینوں ادا نہیں کرتے۔ میں نے نوٹس لگادیا کہ دو ماہ سے زائد کا بل جس نے ادا نہیں کیا ہے اسے مس (mess) سے کھانا نہیں ملے گا۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو نوکر کو آواز دی اور کھانا لانے کو کہا۔ اس نے گردن جھکا کے نوٹس پیش کردی۔ یہ بھی نہایت خوددار اور اکڑفوں والے تھے۔ اسی طنطنے سے کہا۔ اچھا ایک گلاس پانی لاؤ۔ اور خاموشی سے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے نکل گئے۔ لڑکوں میں بے چینی پھیلی۔ اور چند ایک میرے خلاف ہوگئے۔ اختر صاحب تک میری سخت گیری کی شکایت پہنچی۔ ستم یہ ہوا کہ باورچی بھی پیسے لے کر روپوش ہوگیا۔ جن لڑکوں نے پیسے دئے تھے ان کے لئے میں ہوٹل سے کھانا منگواتا رہا، مگر انہیں تکلیف نہ ہونے دی۔ کچھ لوگ میرے حسن انتظام کے مداح بھی ہوگئے۔ دو تین روز کے بعد جب باورچی صاحب تشریف لائے تو شرمندہ ہونے کی بجائے اور اینٹھنے لگے۔ میں نے ان کی مرمت کردی۔ اس کی حمایت میں ایک چپراسی نے جو جنگ سے واپس آیا تھا اور ہر وقت وردی میں رہتا تھا۔ مجھ پر رعب ڈالنے کی کوشش کی۔ میں غصے سے بھرا ہوا تھا ہی اس کی بھی ٹھکائی کردی۔ اب تو ہوسٹل میں کھلبلی مچ گئی۔ اختر صاحب کو خبر ہوئی اور جائے واردات پر فوراً آپہنچے اور لکچر دینے لگے "یہ فرعونیت ہے، اپنے ماتحت پر ہاتھ اٹھانا مسلمانوں کی شان کے خلاف ہے۔ فرض کرو تم ڈپٹی مجسٹریٹ ہوا ور کمشنر تم پر سختی کرتا ہے تمہیں کیسا محسوس ہوگا۔" ویغرہ ویغرہ میں تو جلال میں تھا ہی۔ جواب دے بیٹھا، معاف کیجئے حضور، اگر میں گستاخی کروں اور اپنے فرائض منصبی میں کوتاہی تو یقینی سزا کا بھی مستحق ہوں گا۔ وہ خاموش ہوگئے۔ مجھے اپنی حماقت پر ندامت ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ڈرتے ڈرتے گیا کہ اصل واقعہ بیان کرکے ان سے معذرت کرلوں۔ ان کا غصہ فرو ہوچکا تھا کسی قسم کی خفگی کا اظہار کئے بغیر کہنے لگے۔ "شفقت اور محبت کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ سختی اور ظلم سے لوگ نفرت کرتے ہیں، تمہارا اصول اپنی جگہ پر درست مگر یاد رکھو نرم خوئی سے انسان دلوں میں جگہ پیدا کرتا ہے۔ شعلہ خوئی سے انسان دوسروں پر رعب و دبدبہ تو رکھتا ہے مگر جب وہ اپنے عہدے سے نیچے اترتا ہے تو لوگ اسے اچھے نام سے یاد نہیں کرتے۔ فراخ دلی میں مسرت کا راز ہے۔" مجھے حضور اکرمؐ کا قول یاد آیا کہ "زور آور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے"۔ میں نے اختر صاحب سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

پہلے لکھ چکا ہوں کہ میری زندگی کے بنانے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب پروفیسر محمد مسلم صاحب کی صاحبزادی اور جناب شمسی کاکوی کی نواسی سے میری شادی کی بات چلی تو مسلم صاحب نے رازدارانہ طور سے اختر صاحب کو خط لکھ کر میرے بارے میں دریافت کیا اختر صاحب نے لکھا کہ جن صاحب نے یہ رشتہ تجویز فرمایا ہے انہوں نے آپ پر احسان کیا ہے، کامیاب زندگی کا راز اچھی شریک حیات کا ملنا بھی ہے اور گھر کا پرسکون ماحول بھی، میں اس لحاظ سے خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ اگر وہ میری سفارش نہ کرتے تو پتہ نہیں میری قسمت کہاں کس سے ٹکراتی۔ اور اس وقت میرا اور میرے بچوں کا مستقبل کیا ہوتا۔ میں ان کا ممنون ہوں۔ خداوند تعالیٰ انہیں ابدی سکون بخشے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

جب کالج سے نکلا تو اختر صاحب سے ایک سرٹیفکیٹ لینے گیا۔ انہوں نے اسی وقت قلم برداشتہ انگریزی میں پورے فل اسکیپ

کاغذ پر لکھ کر دیدیا کہ جاؤ ٹائپ کرالو۔ میں نے اسے لیا۔ اب تک میرے پاس محفوظ ہے مگر بہت کم ایسا موقع آیا کہ کسی کو دکھلایا ہو کیونکہ ازراہ شفقت ایسے جملے بھی لکھ گئے تھے جو دوسروں کو کیا مجھے خود تسلیم کرنے میں تامل ہے تعریف کرتے کرتے لکھ گئے کہ [illegible] آخری بار ۱۹۶۸ء میں لندن میں ان سے ملا۔ اس وقت میں لندن جارہا تھا۔ ہندوستان بھی گیا۔ اختر صاحب کے یہاں بھی شرف نیاز حاصل کرنے حاضر ہوا۔ فوراً اندر بلوالیا۔ محترمہ شکیلہ اختر بھی تھیں کہنے لگے خوب آئے۔ چند روز پہلے میں تمہیں یاد کر رہا تھا۔ ہوا یوں کہ ارشد کاکوی نے اپنا رسالہ "ندیم" ڈھاکے سے بھیجا تھا۔ ایک چھوٹا سا افسانہ پڑھنے کے بعد ایک انشائیہ "ماما میں" پڑھنے لگا۔ جوں جوں آگے بڑھنے لگا بڑا لطف آیا۔ شکیلہ کو بلالیا۔ ہم دونوں نے مل کر پڑھا بعد میں جب تمہارا نام دیکھا تو اور خوشی ہوئی۔ لکھتے رہو۔ بہت ہی اچھا مضمون تھا۔ چند خوبیاں بیان کیں۔ اور انسانی نفسیات اور انسان کی محرومی پر ایک لکچر دے ڈالا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ کلاس روم میں ہوں۔ بہت محبت سے ملے اور شفقت سے رخصت کیا۔ ہندوستان جانے کا پھر اتفاق نہ ہوا۔ میں خود ہی ستم ہائے روزگار رہا۔ کیا پتہ تھا کہ یہ آخری ملاقات تھی۔ جب میں لندن سے واپس آیا تو شکیلہ ممانی سے ڈھاکے میں ملاقات ہوئی۔ ایک روز ہم لوگ بیوی بچوں کو لے کر ان کے ساتھ تاریخی شہر سونار گاؤں گئے۔ ان کی چھوٹی بہن شہلا اور ان کے بچے بھی تھے۔ بڑا لطف آیا۔ شکیلہ ممانی کے افسانے اور ان کی گفتگو دونوں میں گلوں کی خوشبو ہے۔ اختر اورینوی کے نام کے ساتھ شکیلہ اختر کا نام جز ولاینفک ہے۔ سوچتا ہوں کہ اختر صاحب کے بغیر شکیلہ ممانی پر کیا گزرتی ہوگی۔ آدمی ہے تو مرنا ہے۔ مگر اختر اورینوی تو ابھی اور زندہ رہ سکتے تھے۔ قدرت کا بھید کون جانے۔ کالج کے زمانے میں اکثر مشاعروں میں اپنی ایک نظم پڑھتے تھے۔ جس کا عنوان تھا "جنت سے انکار" خود ہی کہتے جنت سے انکار جنت کا انکار نہیں۔ ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے

قدسیوں ہی کو مبارک ہو یہ جنت تیری
مجھ کو تو چاہیے لے جان محبت تیری

جنت کا انمول تحفہ لئے آج قدسیوں کے درمیان وہ جنت الفردوس میں زمزمہ سنج ہوں گے اور ہم سب کو سوگوار چھوڑ گئے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

پروفیسر شاہ عطاء الرحمن
عطا کاکوی

چہکتا ہوا بلبل

افسوس چہکتا ہوا بلبل نہ رہا
رونق گئی گلزار ادب کی صد حیف

اختر جو ادب کا اختر تاباں تھا
نقاد ذہن رسا جس کا، زباں جس کی سیف

تنقید بھی، تحقیق بھی، افسانہ بھی
اشعار بھی ہوتے تھے نہایت پُر کیف

فکر تاریخ میں تھا افسردہ قلم

آئی یہ صدا غیب سے "حیف اختر حیف"

۱۳۹۷ھ

بیٹھے ہوئے دائیں سے:- اقبال معین الدین اسسٹنٹ سکریٹری بزم ادب پٹنہ کالج، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر حافظ شمس الدین شمس منیری، پروفیسر حسن، سید عبدالرحمن

پروفیسر سید شہاب الدین احمد
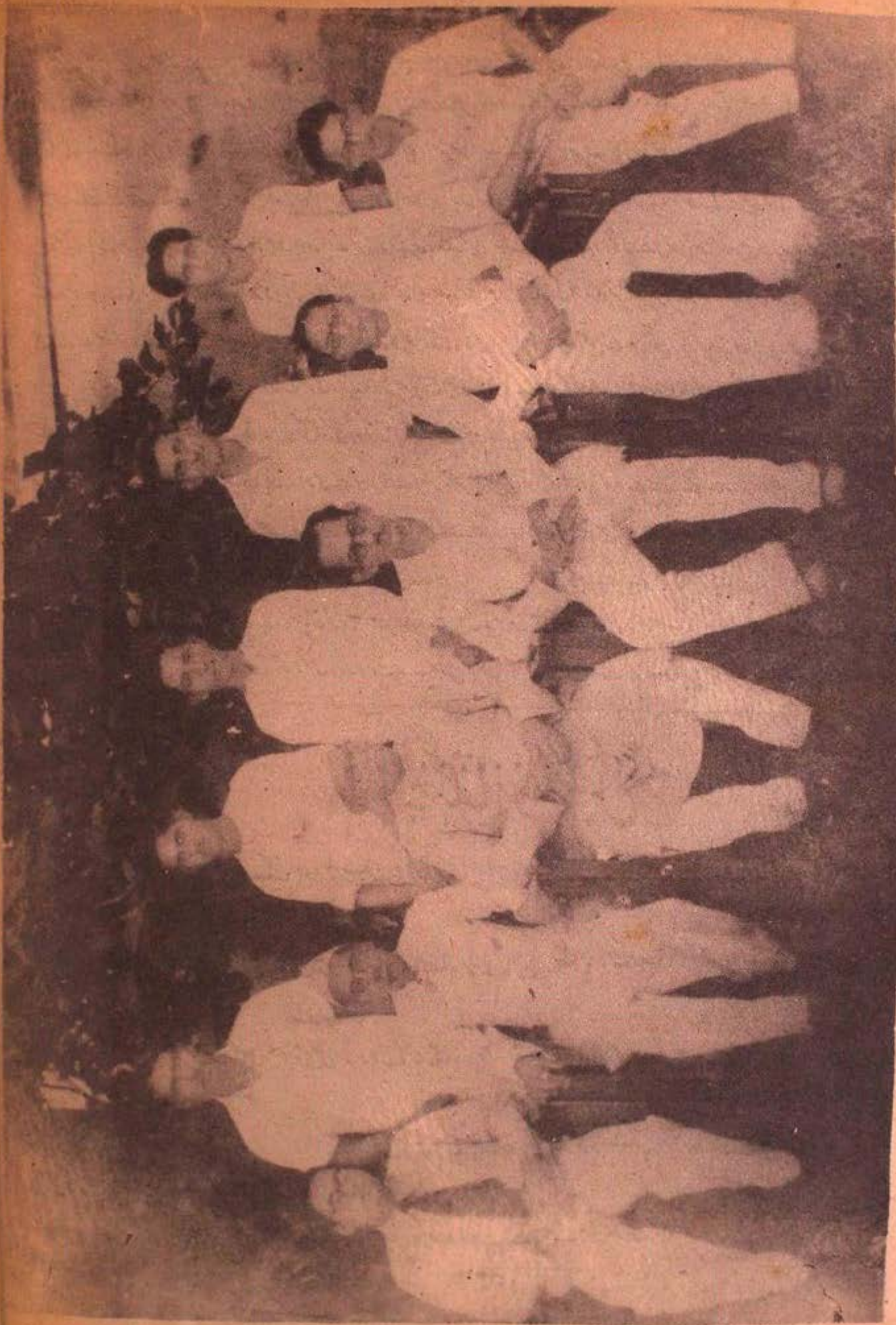
اختر اورینوی اور اُن کا نظریۂ حیات

الامرُ لایحال ولایحتال . ایسے ہیں، میں اپنے مخلص دوست محمد ظفیر الحسن کے حکم کے ساتھ حیلہ سازی کس طرح کرتا اور منکر امر بالمعروف ہونا کس طرح گوارا کرتا . قلم خیال خوابیدہ کا سہارا لینا ہی پڑا . کیف نعاس بیدار ہو گیا اور پھر معاً ایک بولتی ہوئی تصویر اختر کچھ اس انداز دلربائی کے ساتھ مسکراتی ہوئی نظروں کے سامنے آگئی کہ خود مجھے اپنا ایک شعر دیرینہ یاد آگیا ۔

کھیچ جاتی ہے ہر ایک کی تصویر ہو بہو ۔ بیٹھا ہوا یہ کون مصور نظر میں ہے

اور پھر ایسا محسوس ہوا کہ میں تقریباً پچاس سال قبل کے صاف ستھرے مہذب اور پر خلوص ماحول میں گھر گیا . بھولی بسری یادیں تازہ ہو گئیں . تہذیب و تمدن ماضی کا غنچۂ پژمردہ از سرِ نو سرسبز و شاداب ہو گیا . ایک نجی علمی و ادبی نشست کا مرقع کھیچ گیا . استاد محترم جناب ڈاکٹر عظیم الدین مرحوم صدر محفل تھے . تقریباً اکثر اساتذہ کرام پٹنہ کالج . بی . ان کالج اور دیگر ممتاز شعرائے عظیم آباد جمع تھے . میں اور اختر اورینوی آخری نشست پر بہ صد احترام سر جھکائے بیٹھے تھے . شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ مہذب اور پر مغز گفتگو بھی ہو رہی تھی . ہم دونوں محو خوشہ چینی تھے . ہم دونوں کو جو منصب عطا ہوا تھا وہ بلا تصنع اعلیٰ و ارفع تھا . مجلس برخواست ہوئی تو میں نے اپنے استاد محترم مرحوم سے اجازت لے کر شاد عظیم آبادی کا یہ شعر پڑھا ۔

صف اولیں تو ہے خاص صف وہاں پاؤں جا یہ کہاں شرف ۔ صف آخریں سے بھی دور تر جو اشارہ ہو تو وہیں سہی

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخصوص مربیانہ انداز میں مسکرا کر فرمایا اختر ! سنو تو سہی ، شہاب کیا کہہ رہا ہے . اور پھر ناصحانہ انداز میں فرمایا . اختر ذرا اپنا خیال رکھا کرو . تم مجاہد فطرت ہو ، منفی نہیں ، مثبت ہو . اللہ اللہ کیا بلیغ ارشادات تدریسی تھے . غور کریں ، تشریح کریں اور سبق حاصل کریں . ساتھ ہی ساتھ دورِ حاضر کی تہذیب و تمدن اور خصوصاً نظریۂ امتہ الفجوہ پر بھی نظر رکھیں اور پھر فیصلہ کریں کہ کون قائم کون دور ہے اور کون لائق کون ۔

ان ارشادات کی روشنی میں اگر اس مجاہد فطرت کی زندگی کا مختصر ترین جائزہ بھی لیا جائے تو اس کی شخصیت کچھ اس منفرد انداز سے ابھرتی ہے کہ لامحالہ کہنا پڑتا ہے

ع وہ زندۂ جاوید بہ انداز دگر ہیں "

عجب طرفہ تماشا ہے کہ عہد طفلی ہی سے موت اختر کی تاک میں تھی . صیاد ازل نے حیلہ سازی کے سو سو جال بچھا دیئے مگر اس ذی فہم مرغ جانباز نے تمام تانے بانے توڑ مروڑ کر رکھ دئے . رزم ٹائیفائیڈ میں سرخ رو ہوئے تو شاہ ناسور نے رخسار پر ضرب لگائی مگر شاطر البساط

فطرت نے شاہ کو پیدل مات دیدی۔ دشمنی پھر دشمنی ہے۔ اب جو مکھی ہونے لگی۔ ایک طرف وجع المفاصل نے آلیا تو دوسری طرف سرطان الدم جو کمین گاہ میں وقت کا منتظر تھا۔ بیچ آخر میں داخل ہو گیا۔ مگر اس امیر الجیش نے ہمت نہ ہاری اور بچتا بچاتا کرٹک پالٹ لگاتا ہوا اور ہنوٹ کے ہاتھ دکھاتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی رہا اور بالآخر اپنے مقصد سے ہم کنار ہو گیا۔

اور رضوی مرحوم کی منزل حصول علم تھی۔ جب سقم طاغوتی نے قلب الطب والجراحت کو ملول کر دیا تو بہ ظاہر منزل ژولیدہ نظر آنے لگی مگر اس مجسمۂ عقل و خرد نے جد و جہد کا ایک نیا باب کھولا، علوم عامہ میں امتیازی تعلیم حاصل کر لی۔ مقصد سے ہمکنار ہوا اور انسان کو انسانیت کا درس دینے لگا۔

ڈاکٹر اور رضوی مرحوم سراپا جد و جہد تھے۔ وہ جواں فکر قوم کو درسِ عملِ پیہم دیا کرتے تھے۔ وہ تعلیم کو پیغامِ عمل غیر طامع سے تعبیر کرتے تھے جس میں نہ متروکات کی گنجائش ہے اور نہ مفروضات غیر طبعی کی۔ یہ ایک نظام عسکری ہے۔ ربط و ارتباط، اخلاص و محبت اور انہماک اس کے عناصر غیر مبوطی ہیں۔ اس میں نہ تناقص ہے اور نہ تناقض، ہجوم مہاجمہ سے بے خوف ہو کر مدافعت مسلسل کرنا عین زندگی ہے۔ راستے کج و کاواک اور پیچیدہ تو ہو سکتے ہیں لیکن اگر مقصد مستقل ہو تو منزل تک رسائی محال نہیں۔ موت انسانیت کی منزل نہیں، کارزار حیات میں ایک گرتا ہے تو دوسرا ابھرتا ہے۔ دوسرا گرتا ہے تو تیسرا قدم جما لیتا ہے۔ از آدم تا ایں دم یہ عمل جاری و ساری ہے۔ اگر منزل صدق و صفا متعین ہو مبہم نہ ہو تو پھر شکست کہاں، انہدام کہاں، سب کہاوت ہی کہاوت ہیں۔ درحقیقت موت قصاص ہے اور قصاص میں حیات مضمر ہے۔

اس مہتم بالشان نظریہ کو ڈاکٹر اختر مرحوم نے اپنایا اور گلے لگایا۔ درس و تدریس، تحریر و تقریر، نظم و نثر اور شعر و سخن کے ذریعہ اس نظریہ کی ترویج ہمہ دم کرتے رہے۔

کبھی کبھار ہم لوگوں کی ادبی نشست ہوتی تھی۔ موضوع انسان اور علم ہوتا تھا۔ ایک بار کہنے لگے۔ بھئی شہاب! تمہارا یہ نظریہ کہ زندگی کو یاسیت سے دور کا بھی تعلق نہیں بالکل درست اور جاں پرور ہے۔ مزید برآں جب تم "کزرع اخرج شطأہ فآزرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بہم الکفار" کی منفرد انداز میں تشریح و تفسیر اور تجزیہ کرتے ہوئے ازمنۂ ماسبق و حال کی تاریخ سامنے رکھتے ہو تو میں اپنے جسم نحیف کو دیکھتا ہوں اور پھر دل و جگر کی توانائی کو اور اپنی کامرانی کو، حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے جو کچھ ملا اس آیت کریمہ نے دیا۔ اسی نے مجھے سہارا دیا اور سب کچھ سکھا دیا۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔'

باتوں باتوں میں ایک دفعہ مسلمانان ہند کی زبوں حالی پر بات چل نکلی اور اس کا دائرہ برصغیر کے احاطہ سے کچھ اور دور نکل گیا۔ اختر بے حد متاثر نظر آ رہے تھے۔ پھر کہنے لگے تمہارے مشورہ پر میں نے تاریخ اسلام سے تاریخ عالم کا موازنہ کیا اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ اہل اسلام کبھی تھکتے نہیں۔ ہاں! کچھ دیر آرام تو کر لیتے ہیں لیکن پھر منزل مقصود کی طرف نئے جذبۂ عمل کے ساتھ رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ اور میں اسی نظریہ حیات کا حامل ہوں۔

شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اختر مرحوم کے نظریۂ زندگی کو حیات رافعہ سے تعبیر کیا جائے تو بہتر ہے۔ اس کے حصول کے لئے وہ جستجوئے پیہم سے نہ تو گھبراتے اور نہ شکست سے خوف زدہ ہوتے۔ بلکہ مجسمۂ رقص شوق بن کر دوری منزل کو جدائی سے تعبیر کرتے ہوئے رخ تمنا کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بیتاب رہتے۔ خود ہی فرماتے ہیں۔

ہمہ رقصِ شوقِ اخترؔ نوازشِ جدائی   ~~ غمِ آرزوئے دائم رمِ جستجوئے پیہم

ڈاکٹر اختر مرحوم حضرت خواجہ شیرازیؒ سے از حد متاثر تھے۔ اسی لئے وہ زندگی کو تواردِ عادہ تعبیر نہیں کرتے بلکہ حیات ابن آدم کو ایک مسلسل دور جام سے موسوم کرتے ہوئے ساقی بے پروا، کو اپنی طرف عالم وارفتگی میں حصول آرزوئے حیات حقیقی کی طرف منعطف کرنے کی سعی پیہم میں لگے رہتے اور خواجہ حافظ شیرازی کا سہارا لیتے ہے

الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا   کہ عشق آساں بود اول ولے افتاد مشکلہا

میرے خیال میں ڈاکٹر اختر مرحوم کے نظریۂ حیات میں درج ذیل شعر نے ایک روح تازہ پھونک دی تھی۔

~~ بیا جاناں تماشا کن کہ در انبوہ جاں بازاں   ملامت می کند خلقے و من بر دار می رقصم

آئیے اب ذرا اختر مرحوم کو بہ انداز دگر دیکھیں اور پرکھیں۔

کسی کے کلام پر چاہے نثر ہو یا نظم تنقید از حد مشکل اور صبر آزما مرحلہ ہے۔ ناقد کے لئے تنقید، تنقیح اور تنقیب اور پھر تجیب کے معیار کا تعین کارے دارد کے مترادف ہے۔ ناقد کو حسن بے پروا کی طرح تغافل شعاری سے الگ ہو کر معیار حسن و قبح کے لئے ایک ایسا متوازن میزان تعبیر بنانا چاہئے جو بصیرت افروز بھی ہو اور کشاکش و آویزش سے الگ بھی۔ کہنے والا تو اپنے خیالات و افکار کو لباسِ الفاظ سے ہم آہنگ کر دیتا ہے وہ جو کچھ بھی کہتا ہے اس کے دل کی آواز اور پکار ہوتی ہے۔ اپنے خیال میں وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے خیال میں بہتر یہی ہوتا ہے اور دوسروں کے احساسات سے ہم آہنگ۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ ہو۔ کوئی معاشرہ کو سدھارنے کا شیدائی ہے کوئی تاریخ ماضی و حال کی گتھی سلجھانے میں مگن ہے تو کوئی صرف حسن و عشق کا پرستار، کوئی سیاسی تو کوئی سماجی پرچم لہرا رہا ہے، کوئی دنیا کی گا رہا ہے تو کوئی دین کی تابانی سے دلوں کو گرما رہا ہے۔ الغرض ہر مفکر صاحب قلم جداگانہ فکر و خیال کا حامل ہے۔ اب ان محیر العقول افکار پریشاں منتقضیہ و مثبتیہ پر نقاد راست باز کا قلم کس نہج سے اٹھے۔ اگر بالفرض وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر کچھ کوشش بھی کرے تو پھر پیچیدگی فکر و عمل کا تانا بانا کس طرح سلجھائے کہ خود حامل کلام بھی مطمئن ہو جائے ہے

پھیلائے کیا نیاز محبت کی داستان   سمٹی سی اک نگاہ جو خود ناتمام ہو

اختر اورینوی مرحوم کے کلام میں محاسن بھی ہیں اور تشنگی بھی مگر ایک خصوصیت یگانہ ان کے کلام نظم و نثر میں طرۂ امتیازی حیثیت کی حامل ہے اور وہ ہے اعتبار وجودیت انسانی۔ یہ اعتبار اتنا مستحکم اور مستقیم ہے جو کبھی نگار خانۂ دنیا کی فریب نگاری کا شکار نہ ہوا اور تخیلِ شکست کو بے معنی بناتا ہوا منزل کی طرف بڑھتا ہی رہا۔ حصول نصب العین کے لئے اختر مرحوم نے ایک طرف شعر و سخن کو اپنایا تو دوسری طرف نثر نگاری کو گلے لگایا۔ خود اپنے آپ کو، سننے والوں اور پڑھنے کو درس محبت و استقلال دیتے رہے۔ مرحوم کی فطرت متحرک، افکار متوازن اور اعتبار و یقینِ حصول منزل کی اگر تصویر کشی کی جائے تو میرے خیال میں یوں بنتی ہے۔

مکرٍّ، مفرٍّ، مقبلٍ، مدبرٍ معاً   کجلمود صخر حطہ السیل من عل

میں جب ڈاکٹر اختر مرحوم کے شعری اور نثری ماہیت پر غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں اصناف ادب علت و معلول سے الگ ہو کر، اسرار حیات، ارادت قلبی اور سعی پیہم کے مبلغ ہیں۔

سعی پیہم میں بصد شوق گذارے اک عمر   تب میسر ہو کفِ خاک کو انساں ہونا   (ڈاکٹر عظیم الدین مرحوم)

میں سمجھتا ہوں کہ جناب دلؔ عظیم آبادی مرحوم نے بھی اخترؔ مرحوم کی ہمت بڑھائی اور وہ شمع عمل کو روشن رکھنے میں کامیاب ہوگئے

اہل ہمت کو تمنا ہے ترقی اس کی   پست ہمت ہی کوئی چاہے گا یاں پستی عشق[1] (دلؔ عظیم آبادی مرحوم)

اخترؔ مرحوم کبھی کبھار خاموش ہو جاتے مگر چہرہ خموش نہیں تھا بلکہ کسی آنے والے طوفانی عمل کا پیش خیمہ تھا اور وہ ایک خاص انداز مفکرانہ سے شادؔ عظیم آبادی کا یہ شعر پڑھتے ۔ ؎

خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے   تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

میرزا غالبؔ مرحوم کو اپنے فارسی کلام پر ناز تھا اور "غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد" کہہ کر شاید اپنے اردو کلام کا دل دکھا دیا مگر دربار شاہ جہاں میں پروان چڑھنے والی اس وفا شعار نے آنکھیں نہیں چرائیں اور میرزا نوشہ کی طرف نگاہ دزدیدہ سے دیکھ کر صرف مسکرا دی اور پھر دنیائے شعر و ادب نے اسداللہ خاں کو وہ مقام اعلیٰ بخشا کہ ان کا اردو کا کلام ہندوستان کی الہامی کتاب سے ملقب ہوگیا۔

بہر حال اس وقت میں اخترؔ مرحوم کا ایک فارسی کلام پیش کرتا ہوں۔ اس کو اسی نہج سے پرکھیں کہ اس نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اپنے تنظریجیات کو کس طرح پیش کیا ہے۔ کیا یہ کمال نہیں ؟ کیا یہ جرأت استقلال نہیں ؟

به جمال جاں فزائی به کمال دل ربائی   مرِ من مگر نه دانی ره و رسم آشنائی

ز شعاعِ حسنِ تاباں دل و دیده زخم خورده   ز پئے نشترِ نظاره چه فروغ دل کشائی

به جلال آفتابی به جمال ماهتابی   چه خبر ترا که دارم غم عشق و نارسائی

تو نگار نو بهاری من و عجز و خاکساری   به غرور و ناز جلوه، به سرورِ بے نوائی

ز حریم ناز بیروں دمے کرد کج نگاهی   چه عجب که چشم تشنه بکند ز دل گدائی

چه سراب عقل و حکمت چه حجاب دین و ایماں   چه نقاب ناز و عشوه همه سو شکسته پائی

نظرے شراب آگیں به ادائے کافرانه   در میکده سلامت، چه عذاب پارسائی

بنگر حریم جاں را ز تجلی جمالت   همه شعلهٔ محبت بمقام کبریائی

غم آرزوئے دائم، رم جستجوئے پیہم
همه رقص شوق اخترؔ ز نوازش جدائی

پروفیسر اخترؔ ہم سے روٹھ گئے۔ مجلس ادب سونی ہوگئی، اپنے ساتھ ساتھ شعر و سخن سے کئے ہوئے وعدوں کو میٹھی نیند سلا دیا۔ اب اگر کسی طرح محفل خیال ہی میں سہی ان وعدوں کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کی بھی جائے تو غالباً وہ یہی فرمائیں گے کہ :

گفتم که وعدها به تو دارم به خنده گفت
میلی بیرو برو که تو بسیار ساده ای

---

[1] دیوان دلؔ مرتبہ محمد ظفر الحسن، مطبوعہ مکتبۂ مہر نیمروز کراچی (ص۔ ۶۳)

ڈاکٹر سید مجتبیٰ رضوی
(ایم اے پی ایچ ڈی (لندن)

اختر اورینوی

ڈاکٹر اختر اورینوی کی ذات اور ان کے ادبی کارناموں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔ میں یہاں ان کی شخصیت کے وہ پہلو اجاگر کرنا چاہتا ہوں جو ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھ کو ان کے اندر نظر آئے۔

میں ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۶ء میں بی اے آنرز اردو کا طالب علم تھا۔ اس وقت بی اے آنرز میں صرف چھ طلبا تھے تین "بی این کالج" کے تھے اور تین "پٹنہ کالج" کے۔ آنرز کی تعلیم کا انتظام اس زمانے تک صرف پٹنہ کالج میں تھا۔ لہٰذا بی این کالج کے طلبہ فنون کے چند مضامین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے پہلے گھنٹے میں یعنی دس بجے سے گیارہ بجے تک پٹنہ کالج آجاتے تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب تحریکِ پاکستان اپنے شباب پر تھی اور "شعبۂ اردو" کو "پاکستانی شعبہ" سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت یہاں تین اساتذہ تھے۔ جناب حافظ شمس الدین صاحب صدر شعبہ ــــ دوسرے جناب نجم الہدیٰ صاحب گیلانی ــــ جو کافی ضعیف العمر ہو چکے ہیں اور اب شرف آباد کراچی میں ہیں۔ تیسرے جناب سید اختر احمد اورینوی ــــ اختر صاحب لکچرار تھے اور ہم لوگوں کو تاریخ ادب اردو پڑھایا کرتے تھے۔

اختر صاحب اپنی رفتار گفتار اور کردار ہر لحاظ سے محبوب تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اپنا ہمراز و دمساز اور ہم سفر سمجھتے تھے۔ ان سے ہر قسم کی گفتگو ہو سکتی تھی، اور اس میں وہ کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے تھے۔ خدا نے ان کو قد و قامت اور رنگ روپ کی خوبیوں سے بھی نوازا تھا، اونچی پیشانی، گورا رنگ، کھڑی ناک، عینک کے شیشوں سے جھانکتی ہوئی صاف شفاف آنکھیں اور ان آنکھوں میں تابانی، مسکراتا ہوا چہرہ، تازگی اور شگفتگی سے مالا مال، آواز میں بھی ایک خاص انداز کی کھنک، ان کے اندر بڑی کشش اور بڑی جاذبیت تھی۔ اردو کے لکچر میں انگریزی کتابوں کے حوالے بھی بہت دیتے تھے اور موضوع خواہ کچھ بھی ہو بات کھینچ کر شعر و شاعری تک ضرور لاتے تھی، وہ خود بھی شاعر تھے۔ ان کے انداز بیان کا عالم یہ تھا کہ جب وہ لکچر شروع کرتے تھے تو کلاس میں ایک خاموشی چھائی رہتی تھی۔ صرف ان کی آواز تھی جو گونجتی رہتی تھی اور طلبہ ان کی تقریر کی لذت میں کھوئے رہتے تھے۔

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں یہ تاریخ ساز دور تھا۔ اس دور میں ہم لوگ صرف اردو ادب کے طالب علم بن کر نہیں رہ سکتے تھے۔ خود اردو زبان تحریکِ پاکستان کے اہم عناصر میں سے ایک تھی، لہٰذا شعبۂ اردو کے اساتذہ اور طلبہ کو اپنی اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا۔ ہم میں سے بیشتر طلبہ نے قائد اعظم کے حکم پر امتحانات چھوڑ دیئے تھے۔ اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ممبر کی حیثیت سے ۱۹۴۶ء کے الکشن کے زمانے میں صوبے کے طول و عرض میں پھیل گئے تھے۔ سینگ بھوم اور مان بھوم کے علاقوں میں بنگلہ زبان بولی جاتی تھی اور ہم لوگوں نے خاص طور پر مولانا اکرم خاں اور دوسرے بنگالی لیڈروں کی تائید و حمایت اور سرپرستی حاصل کی تھی۔ ان کو لے آئے تھے۔ ہمیں اپنے

خوابوں میں بھی سلہٹ اور سرحد کا ریفرنڈم نظر آتا تھا۔

بہار میں فسادات تو ہوتے ہی رہتے تھے۔ اور صرف بہار ہی میں کیا، کوئی صوبہ مشکل ہی سے ایسا ہوگا جہاں فتنے کی آگ نہ بھڑکائی جاتی ہو، اور خون خرابہ نہ ہوتا ہو۔ اس مرتبہ ۱۹۴۶ء میں نہایت سنگین اور نہایت ہولناک فسادات ہوئے۔ تیس ہزار سے زائد مسلمانوں کو شہید کیا گیا لیکن مسلمان اس کے باوجود خوفزدہ نہ ہوئے بلکہ ان کا جذبۂ حریت اور شدید ہوگیا۔ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ اب پاکستان کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں ہے۔ قائدِ اعظم نے اسی زمانے میں کہا تھا کہ مسلمانانِ بہار کی قربانیوں نے پاکستان قائم کر دیا۔

حصولِ پاکستان کا عزم سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا یہ قومی آزادی کی تحریک تھی۔ اور آزادی کی تحریک ہمیشہ جان و مال کی قربانی چاہتی ہے۔ آزادی کی بے شمار تحریکیں دنیا کے مختلف خطّوں میں چلی ہیں، ان کی تاریخ ہمارے سامنے تھی۔ جذبے کی شدت اور مقصد کے جنون ہی نے ان کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ آزادی کی تحریک کا سب سے بڑا سرمایہ یہی تھا۔ ہمیں تاریخ سیاست، تاریخ ادب، تاریخ معاشرت اور اس کے وسیع النظر اساتذہ سے اور قومی و ملکی رہنماؤں سے یہی سبق ملا۔ اور یہی سبق سب سے بڑا اور سب سے اہم تھا۔

۴۵ء و ۴۶ء کی یاد مجھے کہاں لے گئی۔ آج ۱۹۷۸ء میں کوئی بتیس سال بعد میں اپنے استاد ڈاکٹر اختر اورینوی کی یاد میں پھر وہیں پہنچ گیا۔ اسی ماحول میں جو زندگی سے معمور تھا۔ پٹنہ کالیجیٹ اسکول، ایک سرکاری اسکول تھا وہاں تاریخ کے ایک استاد بابو کملیشوری پرشاد تھے۔ ایک روز میٹرک کے طالب علموں کو تاریخ پڑھاتے پڑھاتے انہوں نے کچھ ناروا الفاظ ہمارے رسولِ مقبولؐ کی شان میں استعمال کئے۔ اور اس کی خبر پٹنہ کے اخبار "صدائے عام" میں چھپ گئی۔ اس روز ہم لوگ پٹنہ کالج پہنچے اور اختر صاحب کلاس میں آئے تو ان کا دل زخموں سے چور تھا، وہ نہایت افسردہ تھے۔ انہوں نے کوئی تقریر نہیں کی صرف ایک جملہ ان کی زبان سے نکلا کہ "اس قوم کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے جس کے ہادیٔ برحقؐ کی شان میں ایسی گستاخیاں ہوں"۔ میں اختر صاحب کے اضطراب کی کیفیت کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ ان کا یہ جملہ ہمارے دل پر بجلی کی طرح گرا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہماری قلبی و دماغی کیفیت کیا ہوگئی۔ ہمارے منہ سے ایک بات بھی نہیں نکلی ہم سب خاموشی سے اٹھے اور کلاس سے باہر آگئے۔ ہم کل چھ طالب علم تھے۔ باہر نکل کر ہم لوگوں نے ایک فٹن گاڑی دن بھر کے لئے کرائے پر لی۔ ایک لاؤڈ اسپیکر بھی لگایا اور سارا دن پٹنہ سٹی سے لے کر گردنی باغ تک گشت لگاتے پھرے، ہم لاؤڈ اسپیکر پر کیا کہہ رہے تھے اور لوگ کیا سن رہے تھے۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم، بعد نماز مغرب مراد پور کے انجمن اسلامیہ ہال میں غیرت مند مسلمانوں کا ایک ہجوم اُمڈ آیا، ہم نے یہی اعلان کیا تھا۔ شہر میں زبردست بے چینی پھیل گئی تھی۔ امنِ عامہ میں خلل پڑنے کا خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ ایک طرف مسلم لیگ کے بعض لیڈر گھبرائے دوسری طرف کانگریسی حکومت بدحواس ہوئی۔ اندیشہ قوی تھا کہ ہندو مسلم فسادات برپا ہو جائیں، مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتے تھے، اور برداشت کر ہی رہے تھے، لیکن رسولِ مقبولؐ کی شان میں گستاخی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بڑی کوشش لوگوں نے کی کہ یہ جلسہ ہونے نہ پائے۔ ہمیں لوگ اونچ نیچ سمجھا رہے تھے۔ لیکن یہ جلسہ ملتوی نہیں ہوا ہم لوگوں نے کہہ دیا کہ احتجاج تو بہرحال ہوگا۔ لیکن ہماری طرف سے امن میں کوئی خلل نہیں پڑے گا۔

جلسہ ہوا تو ہجوم کا یہ عالم تھا کہ لوگ ہال کے اندر بھی بھرے ہوئے تھے، اس کے باہر بھی، صحن میں بھی اور احاطے کے پار سڑک پر بھی، ہال کے ایک کونے میں دیکھا کہ اختر صاحب بھی خاموش کھڑے ہیں۔ تقریریں ہوئیں اور خوب ہوئیں۔ جلسے نے حکومتِ بہار کو الٹی میٹم دیا کہ اگر بابو کملیشوری پرشاد نے فوراً غیر مشروط معافی نہیں مانگی تو نتائج کی ساری ذمہ داری کانگریسی حکومت کے سر ہوگی۔ ماسٹر صاحب نے فوراً معافی نامہ پیش کر دیا جس میں انہوں نے لکھا کہ "جو کچھ میری زبان سے نکلا تھا وہ عمداً نہیں تھا پھر بھی مجھے اس پر بہت افسوس ہے"۔ اور یوں بروقت گرفت

ہوئی۔ مسلمانوں نے واضح کر دیا کہ ان کو زندہ رہنے کا حق ہے، وہ اپنے اس حق سے دستبردار نہیں ہوئے نہ کبھی ہو سکتے ہیں۔

اختر صاحب کے زخموں کی ٹیس بہت حد تک کم ہو گئی۔ وہ خوش تھے کہ ہم لوگ زندہ ہیں، مسکراہٹ پھر ان کے چہرے پر لوٹ آئی۔ دنیا میں سب سے زیادہ محبت و عقیدت ان کو حضور رسول کریمؐ سے تھی۔ وہ دینی اور ملّی جذبات سے سرشار تھے۔ ہمارے صدر شعبہ جناب حافظ شمس الدین صاحب اور پروفیسر سید نجم الہدیٰ گیلانی، سب نہایت وسیع فکر و نظر اور گہرے دینی و ملّی جذبات کے حامل تھے۔ ان کے اندر بڑا اخلاص تھا۔ اور ہم لوگوں کی تعمیر میں اساتذہ کے اسی اخلاص کا ہاتھ تھا۔ اور ایسے ہی اساتذہ کی تربیت تھی جو پاکستان کو وجود میں لانے کا سبب ہوئی۔ اپنی فکر و نظر اور اصول کو چھوڑ کر اور اپنی غیرت و حمیت اور جذبے کو فراموش کر کے خلا میں زندگی بسر کرنے والے نہ تو کبھی متحد ہو سکتے ہیں اور نہ کبھی قوم بن سکتے ہیں، نہ دنیا میں کوئی کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔ ہمارے اساتذہ نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔

اختر صاحب کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور اس کو ہم اگر دبستان اختر کا نام دیں تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے بے شمار شاگرد سارے برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو خود بھی استادی کے منصب پر فائز ہیں۔ یقین ہے کہ ان کی روشن کی ہوئی شمع کو گل نہ ہونے دیں گے۔

دنیا میں انسان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو خود محنت کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو دوسروں کے دل میں بھی خدمت و عمل کا جذبہ ابھارتے ہیں۔ اختر صاحب کا شمار اسی دوسری قسم کے انسانوں میں تھا۔ پروفیسر فضل الرحمٰن مرحوم اور پروفیسر کلیم الدین احمد کو اردو میں لکھنے کی ترغیب اختر صاحب ہی نے دلائی تھی۔ مرحوم پروفیسر فضل الرحمٰن کی زندگی نے وفا نہ کی وہ بہت جلد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن پروفیسر کلیم الدین احمد سلامت ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ انہوں نے اردو زبان و ادب کو جو کچھ دیا وہ محتاج تعارف نہیں۔ عربی و فارسی پر ان کی نظر اور انگریزی زبان و ادب کی مہارت نے اردو زبان و ادب کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ ان کا رسالہ معاصر چالیس سال سے برابر جاری ہے اور اپنی علمی ادبی تحقیقی خدمات کے لحاظ سے منفرد ہے جس کے لکھنے والوں میں ایک اختر صاحب بھی تھے۔ اس رسالے کے کتنے اداریے ان کے قلم سے نکلے ہیں۔

تھامس ہارڈی کی طرح اختر صاحب بھی اپنے افسانوں میں مقامی رنگ ابھارنے کے قائل تھے۔ ان کے افسانوں نے بھی بہت نوجوانوں کے ذہنوں کو متاثر کیا ہے اور بہت سے نئے اہل قلم ان کی روش پر چل نکلے ہیں۔

اختر صاحب کو قلمی نسخوں اور نادر کتابوں کی بہت تلاش رہتی تھی وہ اس سلسلے میں ہمیشہ سرگرداں رہتے تھے، وہ مسلمانان بہار کے ثقافتی ورثے کو سامنے لانے میں بہت کوشاں رہے۔ اختر صاحب نے ایک ناول "محل نامہ" بھی کسی تہ خانے سے برآمد کیا تھا جو مسلمانان بہار کی ثقافتی و معاشرتی زندگی اور مزاج و انداز کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام رسوم اور طور طریقے، رہن سہن اور نشست و برخاست کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہ ناول لیڈی انیس امام کی نانی کی تصنیف ہے۔ اسی طرح اختر صاحب نے نواب نصیر حسین خیال کا غیر مطبوعہ کلام بھی بڑی محنت سے جمع کیا تھا۔ ان کو کام کرنے کی ایک دھن تھی۔ انہوں نے جہاں اچھے اچھے شاگرد تیار کئے وہیں متعدد نادر قلمی نسخے بھی برآمد کئے جن پر وہ کام کرنا چاہتے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ آدمی کام ہی کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اسے یہ اختیار تو حاصل ہے کہ اپنی پسند کے مطابق جو راہ چاہے اختیار کرے مگر کام سے گریز نہیں کر سکتا۔ اسے کرنا چاہئے۔ خود انہوں نے اپنی ساری زندگی علمی و ادبی اور تحقیقی کاموں میں گزار دی۔ اُن کے اُٹھ جانے سے ہمارا ایک شفیق استاد اٹھ گیا اور ایک متحرک زندگی خاموش ہو گئی۔

محمد ظفیر الحسن

اختر اورینوی

علم و ادب کی محفل سونی ہوتی جاتی ہے۔ ممتاز شخصیتیں تیزی سے اٹھتی جاتی ہیں، زیادہ دن نہیں ہوئے پیر ہاشم جان مجددی[1] اور ملا واحدی[2] دہلوی نے رحلت کی۔ سید وصی احمد بلگرامی ہم سے جدا ہوئے، مولانا عبدالماجد[3] دریابادی نے رخت سفر باندھا[4]۔ سید وقار عظیم[5] نے کوچ کیا۔ تحسین سروری[6] نے اور پروفیسر سلیم[7] نے الوداع کہی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی[8] نے دارالبقا کی راہ لی۔ پھر ۸ مارچ کو کرشن چندر چل بسے اور اب خبر آئی کہ ۳۰ مارچ کو ڈاکٹر سید اختر اورینوی بھی رخصت ہوئے۔ اور بعض اتفاقات تو ایسے ہوتے ہیں جن کے رونما ہونے سے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صدرالدین فقا مصنف "شاہ آیت اللہ جوہری" ڈاکٹر اورینوی کے جانشین تھے وہ بھی ڈاکٹر اورینوی کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا کے آئے تو ایسے سوئے کہ پھر نہ اٹھے دوسرے ہی دن انہوں نے بھی آخری سانس لے لی۔ یہ یک نظر چند کے نام سامنے آ گئے ورنہ ابھی اور ہیں جن کے نام لیتے تھے۔ مگر جب دل امنڈتا ہے اور آنکھیں برستی ہیں تو پلکوں سے ٹوٹتے ہوئے تاروں کو گننے کی تاب کس میں ہے۔

زندگی کے بارے میں ڈاکٹر اختر اورینوی نے ایک جگہ لکھا تھا کہ "زندگی فانی ہے اور محدود" ہم لوگ اس بیکراں کائنات میں زمان و مکان دونوں اعتبار سے بے حد حقیر ہیں۔ عظیم سمندروں کی موجوں پر رات کو گرنے والا شبنم کا قطرہ بھی اتنا بے بضاعت نہیں جتنی بے بضاعت آدمی کی زندگی ہوتی ہے۔" خود ان کی زندگی کا جائزہ لیجئے، تو یوں محسوس ہوگا کہ تمام عمر ان کی زندگی موت کے جھولے میں جھولتی رہی۔ ۱۹ اگست ۱۹۱۰ء کو وہ ضلع گیا کے ایک مشہور قصبہ "کاکو" میں پیدا ہوئے آٹھ سال کے تھے تو "ٹائیفائڈ" میں مبتلا ہوئے اور ۴۰ دن تک سرسامی کی کیفیت طاری رہی۔ حالت غیر ہوگئی۔ لیکن جو موت کے جھولے میں جھولتا رہا ہو، وہ وقت سے پہلے آخری سانس کیسے لے سکتا ہے۔

---

[1] متوفی ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۹ ستمبر ۱۹۷۵ء

[2] ″ کراچی۔ اتوار ۲۲ اگست ۱۹۷۶ء

[3] ″ کراچی۔ اتوار ۱۴ نومبر ۱۹۷۶ء ساڑھے ۹ بجے شب

[4] ″ لکھنؤ۔ ۶ دسمبر ۱۹۷۶ء

[5] ″ لاہور۔ ۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء

[6] ″ کراچی۔ ۷ دسمبر ۱۹۷۶ء

[7] ″ کراچی۔ بدھ ۲ فروری ۱۹۷۷ء

[8] ″ علی گڑھ۔ ۱۶ جنوری ۱۹۷۷ء

دو سال بعد سنہ ۱۹۲۰ء میں رخساروں کی ہڈیوں میں ناسور ہو گیا آپریشن کے بعد زخم بھرا۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں کالا آزار ہو گیا اور سنہ ۱۹۲۵ء میں وجع المفاصل ہوا۔ جس نے ان کے دل و دماغ پر بہت برا اثر کیا مگر انہوں نے حالات کا مقابلہ کیا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوتی رہی۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں مونگیر ضلع اسکول سے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا وظیفہ بھی ملا۔ کالج میں داخل ہوتے ہی ان کی تخلیقی صلاحیتیں ابھرنے لگیں۔ اور شعر کہنے لگے۔ اور مقالہ نگاری بھی۔ اسی زمانے میں ایک نظم "دریا کے کنارے" کہی۔ اور ایک مقالہ "مختصر افسانہ کی فنی خصوصیات" رسالہ "شمیم" پٹنہ سے شائع ہوا۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے پہلا افسانہ لکھ کر نیاز فتح پوری کی خدمت میں نگار کے لئے بھیجا۔ لیکن انہوں نے یہ لکھ کر واپس کر دیا کہ "افسانہ لکھنے کا اچھا میلان ہے، مشق جاری رکھئے۔"

سنہ ۱۹۲۸ء میں پٹنہ سائنس کالج سے آئی ایس سی پاس کیا۔ وظیفہ بھی ملا۔ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ طبی شعبے کا ڈاکٹر بننا چاہتے تھے لیکن مقدر میں ادبی شعبے کا ڈاکٹر بننا تھا۔ میڈیکل کالج کے تیسرے ہی سال میں تھے کہ ان پر مرض سل کا حملہ ہوا۔ تعلیم ترک کر کے اورین چلے گئے۔ اور دیہات کی صحت بخش ہوا میں دو ڈھائی سال آرام کرتے رہے۔ دوبارہ میڈیکل کالج میں نہ گئے، بلکہ سنہ ۱۹۳۲ء میں بی اے (آنرز) انگریزی میں داخلہ لیا۔ آخری سال کا امتحان دے رہے تھے تو پرانے مرض سل کا پھر حملہ ہوا اور خون تھوکنے لگے۔ لیکن ان کا عزم اس قدر مستحکم تھا کہ بیماری انہیں شکست نہ دے سکی۔ بیماری ہی کی حالت میں پرچہ دیتے رہے نتیجہ نکلا تو بی اے (آنرز) فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور یونیورسٹی بھر میں تیسرے نمبر پر رہے طلائی تمغہ بھی پایا۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں ان کو رانچی میں "اٹکی سینی ٹوریم" بھجوا دیا گیا۔ ڈیڑھ سال تک وہاں رہے۔ خود لکھتے ہیں کہ بستر علالت پر پریم چند۔ زولا۔ چیخوف دوستوئیفسکی۔ ترگنیف۔ لارنس، مادام کا بیشتر مطالعہ کیا اور اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ نیاز فتح پوری اور اقبال سے بھی اثر پذیر ہوئے۔ ان کے افسانے سینی ٹوریم کا فقیر، مریض اور کلیاں اور کانٹے دوران علالت اٹکی میں معرض وجود میں آئے۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں ایم اے (اردو) فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ گولڈ میڈل بھی ملا۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں پٹنہ کالج میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے اسی سال ان کا مشہور ڈرامہ "شہنشاہ حبشہ" مکتبۂ اردو لاہور سے شائع ہوا۔

ان کا ذوق فن بتدریج پروان چڑھتا رہا۔ اختر اورینوی صاحب نے شاعری بھی کی افسانے بھی لکھے۔ ڈرامے بھی تخلیق کئے۔ ناول نگاری بھی کی۔ تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی لکھتے رہے۔ وہ ہر خار دار راہ سے گزرے اور آبلہ پا بھی ہوئے لیکن ان کی شہرت افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے ہوئی جدید افسانہ نگاری کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک ہیں۔

سید وقار عظیم نے لکھا ہے کہ سنہ ۱۹۳۰ء کے ابتدائی دور کی افسانہ نگاری کی قیادت پریم چند کر رہے تھے۔ علی عباس حسینی ان کے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلے اور بعض نوجوان افسانہ نگاروں نے ان کی روش سے متاثر ہو کر سیاست، دیہی معیشت اور سرمایہ و مزدور کو اپنا خاص موضوع بنایا۔ اس خاص میدان میں سہیل عظیم آبادی اور اختر اورینوی نے جو کام کیا اس کی حیثیت ایک مستقل خدمت کی ہے۔ اختر صاحب کے بیشتر افسانے بہار کے دیہاتوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان افسانوں کے مجموعے "منظر و پس منظر" اور "کلیاں اور کانٹے" مطبوعہ ۱۹۴۰-۱۹۴۱ء ہیں۔ اول الذکر میں ۱۹ افسانے ہیں۔ سینی ٹوریم کے لکھے ہوئے تینوں افسانے اس میں شامل ہیں۔ منظر و پس منظر کا "پیش لفظ" استاذی المحترم جناب پروفیسر کلیم الدین احمد نے تحریر فرمایا ہے جس میں افسانے کے بنیادی اصول اور ناول اور افسانے کے بنیادی فرق پر ناقدانہ بحث کی گئی ہے۔ اس کے اختتام میں تحریر فرماتے ہیں کہ "میں اختر کے افسانوں کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ اختر نوجوان ادیب ہیں ان کی شہرت بہار کی حدود میں محدود نہیں۔ ان کی تحریریں

ہندوستان کے اکثر و بیشتر رسالوں میں شائع ہوئی ہیں اور شائع ہوتی رہتی ہیں اختر کے ادبی کارنامے محدود قسم کے نہیں وہ افسانہ نگار ہیں، شاعر ہیں اور نقاد ہیں اور انہوں نے دو ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانے خصوصاً نہایت مقبول ہیں۔ ان افسانوں میں سے زیادہ تر "معاصر" میں شائع ہو چکے ہیں ان کا معاصر "میں شائع ہونا ہی ان کی اچھائی کی دلیل ہے"۔ میں یہاں آل احمد سرور صاحب کے چند جملے بھی نقل کرنے پر قناعت کرتا ہوں۔ "وہ کہتے ہیں اختر کے افسانے مجھے پسند آئے اختر کا مشاہدہ بہت تیز ہے وہ خارجی اور داخلی ہر قسم کی مصوری کر سکتے ہیں۔ کردار نویسی کے گر سے بھی واقف ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دراصل کچھ کہنا ہے اور یہ ایک بڑی بات ہے"۔

اختر صاحب کے دو افسانے "بدگمانی اور زود پشیمانی" ماہنامہ رسالہ بہارستان پٹنہ میں شائع ہوئے تیسرا افسانہ "نیا شوالہ" نگار لکھنؤ میں چھپا۔ یہ کلیاں اور کانٹے "میں شامل ہیں۔

ارتقا میں تبدیلی ایک لازمی جز ہے۔ اختر صاحب بھی اپنے افسانوں میں ارتقائی منازل سے بڑھتے ہوئے اس سرحد پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں کرشن چندر، منٹو، احمد ندیم قاسمی، بیدی سب یکجا ہو جاتے ہیں۔ ان کا ایک مقالہ "افسانے میں مقصد" معاصر پٹنہ (جولائی اگست ۱۹۵۲ء) میں شائع ہوا تھا اس کے چند جملے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ لکھتے ہیں "افسانہ ادب کی ایک شاخ ہے اور ادب تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتا ہے۔ لہٰذا افسانوں میں دوسرے فنون کی طرح ابتدائی مقاصد کے علاوہ ایک ارتقائی مقصد بھی ہونا چاہئے لیکن اس مقصد کو فنکارانہ خوبصورتی اور لطافت و نفاست کے ساتھ پیش کرنا ضروری ہے اختر صاحب بحیثیت افسانہ نگار اپنے اس قول پر عمل پیرا رہے۔ ان کے افسانوں میں مقصدیت نمایاں ہے"۔

کردار نگاری میں ان کے افسانے کرشن چندر سے بڑی مماثلت رکھتے ہیں۔ اختر صاحب تمام فن کاروں کی بڑی قدر کرتے ہیں اور ہم عصر فنکاروں سے کبھی معاصرانہ رقابت کو روا نہیں رکھتے۔ کرشن چندر سے ان کے دوستانہ مراسم تھے ۱۹۶۰ء کی بات ہے جب وہ اپنی بچی کو علاج کی غرض سے رانچی لے گئے تھے تو واپسی پر پٹنہ ٹھہرے اور اختر اورینوی صاحب کے مہمان رہے۔ منٹو سے بھی ان کو بڑی محبت تھی۔ "منٹو کی افسانہ نگاری کے عنوان سے ان کا ایک مقالہ معاصر پٹنہ میں ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تو اس میں انہوں نے منٹو کو یوں یاد کیا ہے کہ "منٹو اردو کے افسانہ نگاروں میں اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس کے افسانوی تجربوں میں کثرت اور تنوع ہے پھر وہ کہانی کہنی جانتا ہے اس کے افسانوں میں فن کی کمی اور خوبی بھی ہو تو بھی قصہ پن ضرور ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے معمولی واقعات، حالات اور باتوں سے افسانہ گری کی باکمال صلاحیت رکھتا ہے"۔ منٹو نے احمد ندیم قاسمی کو ایک خط میں لکھا ہے کہ زندگی کو اس شکل میں پیش کرنا چاہیے جیسی کہ وہ ہے نہ کہ وہ جیسی تھی یا جیسی ہو گی یا جیسی ہونی چاہیے۔

ان کے افسانوں کے کئی مجموعے مثلاً انار کلی اور بھول بھلیاں، سمنٹ اور ڈائنا مائٹ۔ کیپلان اور بال جبریل، سپنوں کے دیس میں وغیرہ شائع ہوئے۔ حسرت تعمیر اور کاروان دو ناول بھی طبع ہوئے ان کا آخری مطبوعہ افسانہ "ایک درخت کا قتل" نقوش جنوری ۱۹۷۰ء میں نظر سے گزرا یہ ایک رمزیہ مختصر افسانہ ہے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو پروفیسر کلیم الدین احمد پٹنہ کالج کے لئے پرنسپل مقرر ہوئے ڈین کی حیثیت سے پروفیسر موصوف نے ۵ نومبر ۱۹۵۲ء کو اردو کا شعبہ الگ قائم کیا تو سید اختر اورینوی اس کے صدر مقرر ہوئے۔ "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء" ان کا تحقیقی مقالہ تھا جس پر انہیں ڈی۔ لٹ کی ڈگری ۱۹۵۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ملی اور ۱۹۶۰ء میں پروفیسر ہو گئے۔

دائرہ ادب پٹنہ کو ایک تاریخی ادارے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بانی پروفیسر کلیم الدین احمد ہیں اس ادارہ نے ۱۹۴۰ء سے ماہنامہ معاصر

مہر نیمروز کراچی

ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب کی ادارت میں جاری کیا، یہ خالص علمی اور ادبی رسالہ ہے جس کی قدر و قیمت مسلّم ہے۔ اس رسالہ نے نقد و ادب کے خزانہ میں گرانمایہ اضافہ کیا ہے اختر اورینوی نے اس کا اداریہ "گزارش" کے عنوان سے ۱۹۴۶ء تک برابر لکھا جس میں علمی، ادبی، تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور تحقیقی زاویہ سے اپنے قلم کی جولانی دکھاتے رہے۔ اگر ان سب کو یکجا کیا جائے تو ان تمام موضوعات پر ایک جداگانہ کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ معاصر ۱۹۴۳ء کے اداریہ میں ادیبوں اور شاعروں کو مشورہ دیتے ہیں کہ "ادب ذہنی و روحانی سکون و توازن چاہتا ہے اور تب ہی وہ تخلیقی بن سکتا ہے۔ آرٹ حیات کی جھاگ نہیں اس کی گہرائی ہے" زمانہ طالب علمی میں راقم السطور نے ٹالسٹائی، چیخوف، لارنس، جوائس اور الکزینڈر کیوپرن کے افسانوں کا اردو ترجمہ کیا جو معاصر میں شائع ہوئے ان افسانوں پر اختر اورینوی صاحب کی اصلاح ہوتی تھی۔

اختر اورینوی صاحب کی تحریریں اور مضامین میں عالمانہ وقار کے ساتھ ساتھ لچک اور دلکشی بھی پائی جاتی ہے وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا بیرسٹر ایٹ لا پٹنہ کی ادارت میں ایک انگریزی رسالہ "ہندوستان ریویو" نکلتا تھا اس میں بھی وہ برابر تبصرہ لکھا کرتے تھے۔ یہ تبصرہ بیشتر اردو کی نئی کتابوں پر ہوتا تھا۔

ان کا لسانی مطالعہ بھی کافی وسیع تھا انہوں نے ہند آریائی زبان کی ارتقائی منزلوں کا بہت ہی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اس طرح انہوں نے بہار کی مختلف زبانوں مگدھی، میتھلی، پراکرت، پالی، بھوجپوری وغیرہ پر مقالے لکھے ہیں۔ اور لسانی روایت کی تعمیر و تشکیل میں جو تدریجی ارتقا ہوا ہے اس کو روشن اور واضح الفاظ میں پیش کیا ہے۔

ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا احاطہ کرنا بھی ضروری ہوگا جن کی تعداد خاصی ہے۔ پہلا مجموعہ "قدر و نظر" لکھنؤ سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد متواتر کئی مجموعے "تحقیق و تنقید" "جدید کسوٹی" "مطالعہ اقبال" "مطالعہ نظیر" اور "سراج و منہاج" ہیں ان کا شعری مجموعہ "انجمن آرزو" بھی طبع ہو چکا ہے۔

"سراج و منہاج کا پیش نظر وہ نسخہ ہے جسے اختر اورینوی صاحب نے اپنے جگری دوست جناب شرف الدین عظیم آبادی کو ۱۹۶۰ء میں نذر کیا تھا۔ اس میں انہوں نے شرف صاحب سے مرنے سے پہلے ملنے کی آرزو ظاہر کی ہے مگر افسوس ان کی یہ تمنا محض آرزو ہی ہو کر رہ گئی۔

سراج و منہاج میں ادیبوں اور شاعروں کی فنکاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس میں ان کی ادبی قدروں کی تلاش ہے، اس مجموعے میں عبد الغفور شہباز کی شاعری، شہر عظیم آبادی کا ذکر، شاد عظیم آبادی کی غزل گوئی و ناول نگاری، شاد کے نام لاہور سے اقبال کا ایک خط مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۲۴ء یہ سب شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد علامہ فضل حق آزاد، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، اجتبیٰ رضوی کی شاعری کا جائزہ بھی ہے۔

ڈاکٹر سید اختر اورینوی سے جب بھی کوئی ملتا تو ان کے انداز گفتگو اور سنجیدگی سے بہت متاثر ہوتا۔ وہ بہت ملنسار اور خوش گفتار تھے۔ وہ جہاں رہے جس محفل میں گئے ہر جگہ چھا جاتے تھے اور اپنا گرویدہ بنا لیتے۔ ان کے احباب کا حلقہ بہت وسیع ہے لیکن چند ایسے خوش قسمت احباب بھی ہیں جن کو وہ بھلا نہیں سکے۔ یہ سب ان کے بچپن کے ساتھی ہیں۔ ان میں سے کچھ پاکستان میں ہیں جیسے جناب شرف الدین عظیم آبادی، جناب علی اطہر (ایڈوکیٹ) اور زبیر احمد تمنائی صاحب۔ ہر ایک کے اوصاف اور خصوصیات کو انہوں نے اپنے مقالہ "میرے احباب" میں یاد دلایا ہے کہ "شرف الدین عظیم آبادی سے بہتر خط کوئی نہیں لکھ سکتا۔ غالب کے بعد اگر کسی نے اردو معلی بنایا ہے اور رعود افشانی کی ہے تو وہ شرف ہیں اور مکتوب نگاری کے معیار سے کئی جہتیں ایسی ہیں کہ شرف غالب سے زیادہ دل اور روح کو چھوتے ہیں۔"

(بقیہ ص ۱۲۸ پر)

نہر بیروز کراچی

مہ جبیں ناز

سید اختر اورینوی

چند روز گزرے یہ افسوسناک خبر ملی ہے کہ ہمارے استاد اور ہند و پاک کے عظیم مشہور ادیب پروفیسر سید اختر احمد اورینوی کا انتقال ۳۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو پٹنہ (بھارت میں) ہوگیا۔ مرحوم عرصے سے فالج کے عارضے میں مبتلا تھے اور سخت اذیت میں تھے۔ وہ شیریں زبان جو کبھی خوبصورت الفاظ کے خزانے لٹایا کرتی تھی، عرصے سے تقریباً قوت گویائی سے محروم تھی، وہ ہاتھ جن میں قلم پکڑتے ہی علم و ادب کی دنیا میں نئے نئے قابل قدر اور قیمتی اضافے ہوتے رہتے تھے، اب کانپتے رہتے تھے۔ دماغ میں علوم و فنون کا ذخیرہ جمع ہو، دل میں خیالات و جذبات کی موجیں دوڑتی ہوں، نئے نئے الفاظ کا احساس پیدا ہوتا ہو، شاعری کی نئی نئی ترکیبیں سوجھتی ہوں، کچھ لکھنے، کچھ کہنے کو جی چاہے مگر اظہار کا کوئی ذریعہ نہ ہو، یہ اذیت ناک اور دل خراش کیفیت اختر صاحب پر عرصے سے طاری تھی۔ زبان کی ساحری خاموش تھی۔ ہاتھ کی جادوگری سو چکی تھی۔ صرف دو ذہین و متین آنکھیں اپنی بے بسی کا اعلان کرتی رہتی تھیں۔

اردو ادب کے لئے اختر صاحب کی موت ایک سانحہ ہے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ اختر صاحب ۱۹ اگست ۱۹۱۰ء میں صوبہ بہار کے ایک گاؤں "کاکو" میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے اردو ادب میں ۱۹۳۳ء میں ایم اے کیا۔ اول پوزیشن حاصل ہوئی، اور طلائی تمغہ ملا۔ ۱۹۳۶ء میں پٹنہ کالج میں بہ حیثیت لکچرار مقرر ہوئے ۱۹۳۲ء میں شکیلہ اختر سے شادی ہوئی۔ شکیلہ باجی کی ذات اردو افسانہ نگاری میں کافی جانی پہچانی ہے۔ "اراول" جہاں سونا ندی گاتی گنگناتی بہتی ہے۔ وہاں "بام وار" کے خوبصورت کنج میں نازک احساسات اور خوبصورت خیالات رکھنے والی شکیلہ باجی ایک اچھی بیوی اور ذہنی رفیق ثابت ہوئیں۔

اختر صاحب پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ آپ کی کتاب "بہار میں اردو ادب کا ارتقا" اردو ادب کے لئے انمول تحفہ ہے۔ تحقیق و تنقید، تنقید جدید، پس منظر، کسوٹی، کلیاں اور کانٹے، "پاؤں میں پھول" آپ کے تنقیدی مضامین اور افسانوں کے مجموعے ہیں۔ کسوٹی میں "فن میں اسلوب کا مسئلہ" ایک بصیرت افروز مضمون ہے۔ اختر صاحب شیریں بیانی، اور خوش زبانی کے قائل تھے۔ "بات سلیقے سے کہی جائے" یہ اصول ہمیشہ پیش نظر رہا۔ "اسلوب بیان کی بالیدگی اور تازہ کاری فن کار کی شخصیت کی تازہ خیالی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسلوب فن اسے آہنگ اور لے عطا کرتا ہے۔ اسلوب تازگی اور شگفتگی بخشتا ہے۔ اسلوب فن، فن کی روانی، جدت، تازگی، شیرینی اور دلکشی کا باعث ہے۔" کسوٹی میں غالب کی فن کاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ شاعری کے متعلق یوں لکھا ہے۔ "شاعری فنون لطیفہ میں سب سے زیادہ مرکب اور ترقی یافتہ فن لطیف ہے، امکانات سے لبریز اور صد پہلو شاعری کو خلاصہ فنون اور عطر مجموعہ بھی کہا جا سکتا ہے۔"

ان کی ایک نظم "جلوۂ منزل" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مدبھرے نینا میں پو پھٹتی نظر آتی ہے　　سرمگیں پلکوں میں رنگین سحر گاتی ہے
مل گیا زیست کو اب جلوۂ منزل کا سراغ　　دل میں شمعیں ہوئیں تاباں نہ رہا ایک بھی داغ
وجد میں آواز میں روح میری رقصاں ہے　　اپنے ماضی پہ میرا حال تو اب نازاں ہے

کتنی امید، کیسی قوت، کیا تابندگی ہے ان اشعار میں۔ یہ قوت و استحکام لب و لہجے میں ترقی پسندانہ رجحانات کے زیرِ اثر پیدا ہوا ہے۔ لیکن طرزِ بیان میں وہ تندی اور تیزی نہیں ہے۔ جو کہ عام ترقی پسند شعرا کے یہاں ہے بلکہ شیرینی اور نرمی ہے۔

چند اشعار اور پیشِ خدمت ہیں[1]

پہلے تو بہت ناداں تھے وہ ان کی شرارت کیا کہئے　　اس شوخ ادا کی باتوں میں جملوں کی لطافت کیا کہئے
تھم تھم کے وہ رونا آنکھوں کا اور زخمِ جگر کا ہنس دینا　　آنا وہ تصور میں ان کا اور چپکے سے رخصت کیا کہئے
ہوتے وہ مرے کیا کہنا تھا حاصل نہ ہو انکو یہ شرف　　کیا راز ہوا افشا الفت کا اب حرفِ محبت کیا کہئے

اختر بھی تڑپتا ہے تیری چاہت کی کہانی کو سنکر
دکھ درد سب کے سہتا ہے، شاعر کی حالت کیا کہئے

آپ کی ایک نظم "ایک مجاہد کے افکار" کے ایک بند کے چند اشعار سنئے۔ آج کل اس نظم کی بڑی قدر و قیمت ہے[2]

اے فلسطین! جوشِ ایماں اب بھی ناداروں میں ہے　　اب بھی جرأت کی چمک مسلم کی تلواروں میں ہے
اک گراں مایہ امانت ہے شہیدوں کا لہو　　جان دے کر بھی بچاؤں گا میں اپنی آبرو
تیری خاکِ پاک سے وابستہ ہے الفت مری　　بک نہیں سکتی کسی قیمت پہ بھی عزت میری
سو تو سکتا ہے مسلماں پر یہ مر سکتا نہیں　　لشکرِ باطل کے ہنگاموں سے ڈر سکتا نہیں
روح پرور اہلِ ایماں کے لئے تکبیر ہے　　مردِ مومن کا ارادہ خالقِ تقدیر ہے

---

[1] و [2] تذکرہ مسلم شعراء بہار مؤلفہ حکیم سید احمد اللہ ندوی (ص ۳۴ - ۳۶) جلد اول

اختر صاحب کے افسانے اور تنقیدی مضامین، غزلیں اور نظمیں ہند و پاک کے ممتاز رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ "نقوش" کے "آپ بیتی نمبر" میں اختر صاحب موجود ہیں۔ ماہر لسانیات بھی تھے۔ آپ کا انداز بیان نہایت شیریں، مترنم، رنگین، سبک رفتار اور سحر آگیں ہے۔ تخیل کی وسعت تجربے کا تنوع اور زبان کی رنگا رنگی آپ کے مضمونوں اور افسانوں میں بھرپور طور پر موجود ہیں۔ اقبال اور ٹیگور کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ٹیگور کی شاعری میں تمنائے سپردگی کی بے قراریاں ہیں اور اقبال کی شاعری میں آزار جستجو کی جنوں خیزیاں۔ ٹیگور کے لہجہ تخاطب میں نسائیت ہے اور اقبال کا ہر انداز مردانہ اور مجاہدانہ ہے۔

ذرا زبان و بیان کی رعنائی و پرکاری ملاحظہ کریں۔ وجہی کے نظریۂ فن کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے "خوبی اور محبوبی کے جلوے سجاوٹ اور سنوار سے دو چند تابندہ پیدا کرتے ہیں۔ شاعری کی روح موج کی طرح سوزاں و تاباں ہو اور اس کا بدن سجا سنوارا ہو نور پاشی کرے۔ آرٹ کی کامیابی نورٌ علیٰ نور ہے۔ وجہی کے نزدیک آرٹ حسن ہے۔

اختر صاحب کے یہاں آفاقیت بھی ہے اور مقامیت بھی۔ آپ کے افسانوں میں صوبہ بہار کے رسم و رواج، بول چال اور رہن سہن کے انداز نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ اختر صاحب کو اپنی مقامی زبان پر فخر تھا۔ اکثر ٹھیٹھ بہاری الفاظ استعمال کیا ہے۔ "کھتیا لینا" "قلم سونت لینا" وغیرہ صوبہ بہار کے موسم کی رنگا رنگی بھی ملتی ہے۔ ساون کی بھیگی بھیگی رُت، موتی جیسی پھواریں، دھانی چوڑیوں کی کھنک، رنگین آنچلوں کی شفق، ملہار کی میٹھی تانیں، جیٹھ اور بیساکھ کے لمبے لمبے گرم دن اور تپتی راتیں، بیلا اور چمیلی کی خوشبو، آم اور لیچی سے لدے ہوئے درخت، کوئل کی دردبھری آواز، آسن کاتک کی شل کر دینے والی ٹھنڈک، دھان چنے اور گنّے کے ہرے بھرے درخت سب موجود ہیں۔

اختر صاحب صرف شفیق استاد ہی نہ تھے۔ ہمدرد ناصح بھی تھے اور ہمارے ابا جان سید شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی مرحوم[۱] کے دردمند دوست بھی۔ میرے قلم کو تابندگی اور روشنی انہیں سے ملی ہے۔ میں پٹنہ یونیورسٹی کے وہ لمحات کبھی نہیں بھلا سکتی۔ جب "سیمنار" میں ہم اسٹوڈنٹس کسی شخصیت یا کسی موضوع پر بحث کیا کرتے تھے اور اختر صاحب کی شیریں بیانی، خوش گفتاری اور فکر انگیزی سے پورے کلاس پر سحر چھا جاتا تھا۔

اختر صاحب کو یاد کرتے ہوئے آج میری آنکھیں پرنم ہیں اور وہ خوشگوار اور بصیرت افروز دن یاد آرہے ہیں جب پٹنہ یونیورسٹی کی علم خیز اور پرسکون فضا میں ہم اختر صاحب کی شاگردی میں علم حاصل کر رہے تھے۔ ہمیں اختر صاحب کے کلاس کا شدت سے انتظار رہتا تھا۔ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ایک کشادہ خوبصورت کمرے میں اپنے مخصوص ٹیبل پر اختر صاحب بیٹھے رہتے تھے۔ پروقار، بلند و بالا شخصیت، کشادہ روشن پیشانی، چشمے کے اندر سے جھانکتی ہوئی سیاہ آنکھیں جن سے ذہانت، ذکاوت اور محبت ٹپکتی تھی، مزاج بے حد شگفتہ، رنگین، پرخلوص اور سادہ پایا تھا۔ وہ اپنی دلچسپ اور رنگا رنگ باتوں سے دلوں کو موہ لیتے تھے۔ لکچر دینے سے پہلے ایک

---

[۱] سید شاہ ولی الرحمٰن ولی تخلص خلف اکبر سید شاہ غفور الرحمٰن متخلص بہ حمد صوبۂ بہار کے صف اول کے شاعر تھے۔ ایم اے تک تعلیم پائی تھی۔ انگریزی ادب پر پورا عبور حاصل تھا۔ عربی فارسی اور اردو ادب سے گہری واقفیت تھی۔ آپ بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ آپ کے علمی و ادبی مضامین رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ شاعری میں شاد عظیم آبادی سے تلمذ ہے۔ ایکسٹرا ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ کا انتقال بروز جمعرات ۱۳ر جون ۱۹۶۳ء کو ہوا۔ مدفن پھلواری شریف ہے۔ آخری وقت میں ان سے نہ مل سکی۔ جس کا ملال ہمیشہ رہے گا۔

نگاہ شفقت اپنے شاگردوں پر ضرور ڈالتے، مسکراتے اور دو چار جملے چُست کر کے کلاس کو شگفتہ بنا دیتے۔ پھر سنجیدگی سے لیکچر دینا شروع کرتے۔ صاف، رواں، دلکش، رنگین طرزِ بیان ان کی زبان سے موتی بکھرتے رہتے اور ہم چنتے رہتے۔ ان کے لیکچر آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ مزاج اس قدر شاعرانہ اور رومان پسند تھا کہ اگر اچانک گھٹا گھر آتی تو فوراً کتاب بند کر دیتے اور شعر و شاعری کا سلسلہ کلاس میں شروع کر دیتے۔ خود بھی اشعار سناتے اور شاگردوں سے بھی مسلسل اصرار کرتے۔ ایک بار ہم سب پکنک پر راجگیر گئے۔ اختر صاحب، جمیل مظہری اور مطیع الرحمٰن صاحب میر کارواں تھے۔ مطیع صاحب کی بارعب اور رنگین شخصیت کی وجہ سے ہم سب بس میں خاموش بیٹھے تھے۔ اگر ہم طلبا و طالبات آپس میں ہنستے بولتے تو مطیع صاحب گھورنے لگتے اور ہم چپ ہو جاتے۔ لیکن راجگیر پہنچتے پہنچتے اختر صاحب نے ہماری خاموشیوں کو توڑ دیا۔ اچھے اچھے اشعار، پیارے پیارے لطیفے سنانے لگے اور مطیع صاحب کی ایک بھی نہ چلی۔ اب اختر صاحب کا اصرار کہ شاگردوں کو بھی کچھ سنانا ہوگا۔ سب نے کچھ اپنے اور کچھ دوسروں کے اشعار سنائے۔ اختر صاحب جھوم جھوم کر داد دینے لگے۔ جمیل مظہری بھی وجد میں آگئے اور کئی غزلیں سنا ڈالیں۔ "مہ جبیں اب تم سناؤ مگر اپنے اشعار سنانا" اختر صاحب کی آواز گونجی۔ میں نے معذرت چاہی تو ایک شفیق ڈانٹ مجھ پر اختر صاحب کی پڑی اور جب میں نے ڈرتے ڈرتے غزل پڑھنی شروع کی تو اختر صاحب نے تین اشعار پہ خوب داد دی۔ وہ اشعار یہ تھے۔

پا بہ زنجیر رقص کرنا ہے	زخم کھا کر بھی مسکرانا ہے
حکم ہے میر کارواں کا یہی	راہ پرخار میں بھی جانا ہے
در و دیوار سے لہو ٹپکے	آج زنداں کو یوں سجانا ہے

مجھے یاد ہے کہ ۶۳ء میں جب پٹنہ گئی تھی تو اختر صاحب نے اپنی تازہ تصنیف کسوٹی کے سرورق پر "بہ پاس خاطر عزیزی مہ جبیں سلمہا" اپنے دست شفقت سے تحریر کیا تھا۔ مجھے بطور خاص ہدایت کی تھی کہ پاکستان میں بھی میں اپنے ادبی اور علمی ذوق کو جاری رکھوں۔

پاکستانی ادیبوں کو، شاعروں کو، نقادوں کو پڑھتی رہی، سمجھتی رہی، پرکھتی رہی مگر کبھی کسی کے متعلق کہنے یا لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ دیار نیا، اجنبی محفلیں، نا آشنا لوگ، نامعلوم الجھنیں کیا لکھتی اور کس سے کہتی۔ ایک اس وقت اپنے جذبات و تاثرات نہیں روک سکی تھی جب والد محترم سید شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی کا انتقال ہوا تھا۔ یہ مضمون نگار پاکستان میں شائع ہوا دوسری بار ارشد کاکوی کی موت پر بھی میرے جذبات چھلک پڑے اور آج پھر اپنے استاد کی یاد میں کچھ خیالات و جذبات کا اظہار کر رہی ہوں۔

میں نے پٹنہ یونیورسٹی کی الوداعیہ پارٹی میں ایک طویل نظم "تاثر پارے" کہہ کر پیش کی تھی۔ اپنے استادوں کے متعلق عرض کیا تھا۔

تھا اردو کا سعید جہانِ لطافت	ہر اک سو فصاحت، ہر جا بلاغت
بلند فکر اختر کی گوہر فشانی	جمیل سخن آرا کی خوش بیانی
بہار سخن یہ زباں میں حلاوت	نگارِ سخن وہ بیاں میں لطافت
سراپا فصاحت مطیع کی متانت	مجسم بلاغت صدر کی صدارت
بیاں میں رواں موجۂ آب کوثر	سلاست کے حافظ تخیل کے آذر

خوش آہنگ فیاض ہم نفس عرفی — فنوں کے محافظ یہ استاد عالی

"سیمینار" کے جلوے ڈھونڈیں گے ہم کو — یہ گلیاں یہ رستے صدا دیں گے ہم کو

یونیورسٹی میں وہ طلباء کا عالم — ہم آواز، دمساز، ہم راز، ہم دم

یہی خوف تھا جو دھڑکتے رہے دل — بکھر جائے گی اب یہ تاروں کی محفل

نئی پود آئے گی گل بھی کھلیں گے — محبت کے ساغر بھی چھلکا کریں گے

وہی شوقِ لیلائے محمل رہے گا — وہی دور ساقی محفل رہے گا

وہی باغبانِ چمن زار ہوں گے — وہی شاخ گل کے نگہدار ہوں گے

وہی رنگِ صہبائے حافظ رہے گا — وہی رقصِ مینائے غالب رہے گا

وہی شوخی فکر اختر رہے گی — وہی تابشِ نطق اختر رہے گی

فضا میں یہاں قہقہے کم نہ ہوں گے — بہاریں بھی ہوں گی مگر ہم نہ ہوں گے

یہ خبر بھی نہایت افسوسناک ہے کہ پٹنہ یونیورسٹی کے موجودہ اردو کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ صدر الدین فضا[1] صاحب جب تعزیت کے لئے اختر صاحب کے گھر گئے تو دل کا دورہ پڑا اور ۲۰ اپریل کو انتقال ہوگیا۔ گویا

"موت کے بعد بھی دامن نہ تیرا چھوڑیں گے"

معلوم نہیں ہمارے شفیق و بزرگ استاد علامہ جمیل مظہری پہ کیا گزری جناب کلیم الدین احمد نے یہ صدمہ کیسے برداشت کیا۔ عطا کاکوی اور قاضی عبدالودود بھیا پہ کیا بیتی۔ شکیلہ باجی پہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہوگا۔ بہرحال یہ غم برداشت کرنا ہے کہ مشیت ایزدی یہی تھی۔

---

[1] ڈاکٹر صدر الدین فضا ڈاکٹر اختر اورینوی کے ریٹائر ہونے کے بعد بہار یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ ڈاکٹر صدر الدین شاعر بھی تھے اور فضا تخلص کرتے تھے۔ ابتدائی دور میں نظموں کی طرف زیادہ توجہ تھی بعد میں غزل کی طرف مائل ہوئے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ایم اے تھے۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں حضرت شاہ آیت اللہ جوہری ان کی حیات اور شاعری" پر مقالہ لکھ کر ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی، یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ آپ چند اور کتابوں کے مصنف ہیں۔ مثلاً بنیاں اللسان، انتخاب کلام درد، چند مقالات شبلی، علم العروض۔ اور انہوں نے اپنے استاد پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کے دو شعری مجموعوں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے یعنی ۲ اہم نظمیں "ایک روایت ایک بغاوت"۔ ۲۵ نظمیں "ایک نظریہ ایک تجربہ" ان کی یہ دونوں کتابیں چھپیں اور شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر صدر الدین فضا کا ذاتی کتب خانہ اچھا خاصہ تھا۔ مجھے زمانۂ طالب علمی میں ان کے کتب خانہ سے استفادہ کا موقع ملتا رہتا تھا۔

ڈاکٹر صدر الدین فضا کی تصانیف کے علاوہ ان کے آخری دو مقالے بھی اہم ہیں۔ پہلا "کلیم الدین احمد ایک خاموش مطالعہ" جو صحیفہ "نذر کلیم" میں شامل ہوا۔ یہ صحیفہ بہار اردو رائٹرس سرکل پٹنہ کی طرف سے کلیم الدین احمد صاحب کی ۶۵ ویں سالگرہ کے مبارک موقع پر "نذر کلیم" کے نام سے پیش ہوا تھا۔

اور دوسرا مقالہ "قاضی صاحب جیسا میں انہیں دیکھ سکا" رسالہ معاصر کے قاضی عبدالودود نمبر میں شامل ہوا۔ بہ نمبر پروفیسر کلیم الدین احمد

"تمنائی ان دنوں کراچی میں ہیں۔ انھوں نے ایلان پر ایک نہایت قیمتی کتاب لکھی ہے اور اب وہ اردو رسم الخط اور ٹائپ پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔" جناب تمنائی کا ایک مجسمہ بنا کر اپنے موئے قلم سے ان کی تصویر کھینچی ہے۔ "سانولا سلونا رنگ، گھنگھریالے بال، بیک برش کرتے ہیں، اور سر پر لہرائی ہوئی موج در موج گھٹائیں امنڈتی رہتی تھیں۔ بڑی خوبصورت رسیلی آنکھیں، ترشا ہوا چہرہ، تیکھا ناک نقشہ، میانہ قد، چھریرا بدن، کم سخن متین، نفیس مزاج، سلیقہ شعار۔ ادب و شعر میں غلطاں۔ نہایت درد مند دل کے مالک، مزاج میں رقت بہت، آنکھیں یوں بھی نم آلود نظر آتی تھیں جیسے کنول کی پتیاں تالاب کے پانی کی سطح سے اوپر بھی نم آلود رہتی ہیں۔"

ڈاکٹر اور رضوی تو ساری عمر کے علیل تھے مگر اس طرف کافی عرصہ سے علالت بہت بڑھ گئی تھی، غالباً گزشتہ سال کینیڈا بھی علاج کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اور افاقہ بھی ہو گیا تھا لیکن چند ہی ماہ صحت یاب رہے، پھر صحت گری اور صاحب فراش ہو گئے۔ علاج معالجہ ہوتا رہا لیکن ؎

کچھ نہ دوا نے کام کیا

اور آخر علم و ادب کا یہ اختر تابندہ، ہمیشہ کے لئے ۳۰ مارچ کو گل ہو گیا۔

ہر عہد میں کثیر تعداد میں اہل علم قلم کار و فن کار موجود ہوتے ہیں لیکن نام انہیں کے زندہ رہ جاتے ہیں جن کے فن میں مقصدیت اور زمانوں پر محیط ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

بقیہ نوٹ از مہ جبین ناز

صاحب کا مرتب کردہ ہے۔ اس مقالہ میں ڈاکٹر فضا کی اپنی سوانحی باتیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ "جب میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے کسی مضمون یا کسی کتاب کی تلاش میں تھا کہ اسے ترتیب دے ڈالوں تو جناب محترم ہی کے مشورے سے مثنوی گوہر جوہری کا انتخاب کیا اس کے خاتمے پر لکھتے ہیں کہ" قاضی صاحب نے اپنی عمر تحقیق و تفتیش نقد و تبصرہ ہی میں گزاری اور گزار رہے ہیں۔ مگر نام و نمود کی فکر کبھی نہ کی مضامین لکھتے رہے، شائع ہوتے رہے، مگر اپنے مضامین کو یکجا سمیٹنے کی خواہش یا کوشش کبھی نہ کی۔ کلیم الدین احمد صاحب کی تحریک پر بہار اردو اکاڈمی نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے۔

ڈاکٹر صدر الدین فضا ڈاکٹر اختر اورینوی کے دوست تھے اور بہار یونیورسٹی میں انہیں کی جگہ پر تھے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی کے انتقال پر پٹنہ ریڈیو تقریر کرنے گئے۔ تقریر کر کے واپس آئے۔ اور ان کے آخری دیدار کے بعد تاب نہ لا سکے اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔ ڈاکٹر صدر الدین فضا نے ساٹھ سال کی عمر پائی۔ میرے چچا سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی نے ہجری میں قطعہ تاریخ وفات کہا:

کل ہی اختر کو رو چکے تھے سب	آج یہ صدر دین کا غم ہے
زندگی میں رفیق تھے دونوں	مرنے پر بھی یہ ربط باہم ہے
موت کیسی ہوئی اچانک ہائے	یہ جنبش کے غم سے سر خم ہے
مل رہے ہیں سبھی کف افسوس	اور اشکوں سے آنکھ پُر نم ہے
کتنوں کو تو یقیں نہ ہوتا تھا	کتنا گیسوئے اردو برہم ہے

سر افسوس کو جھکا کے عطاؔ

بولا ہاتف "فضا کا ماتم ہے"

(۱۳۹۷ = ۱ - ۱۳۹۸)

محمد انیس الرحمٰن ایڈووکیٹ

ڈاکٹر اختر اورینوی بحیثیت استاد

اورین مونگیر ضلع کا ایک قصبہ ہے۔ اختر اورینوی اسی دیار میں پیدا ہوئے، پرورش پائی اور پروان چڑھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے پٹنہ تشریف لے گئے۔ محنتی اور ذہین طالب علم تھے اس لئے ہمیشہ اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کرتے ہذا داخلہ پٹنہ میڈیکل کالج میں ہوا۔

مونگیر، بھوجپور، مگدھ اور میتھل سے متصل واقع ہے۔ نسلی اور لسانی اعتبار سے یہ وسیع و عریض خطے صوبۂ بہار کے انتہائی حسین و جمیل زرخیز اور مردم خیز علاقے ہیں۔ بھوجپور کا علاقہ آرہ، چھپرہ، غازی پور، بلیا سے جون پور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ حکومت اس وسیع علاقہ پر مشتمل ایک صوبہ قائم کر رہی ہے جس کا نام بھوجپور رہوگا۔ یہاں کی زبان بھوجپوری ہے اس زبان کا عظیم شاعر کبیر داس پیدا ہوا جسے ہندی کا باباآدم تسلیم کیا جاتا ہے۔ آج ماہرین لسانیات ہندی بھوجپوری کو ہندی زبان کی ماں کہتے ہوئے فخر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی کتاب "برصغیر میں مسلمانوں کی جدوجہد" میں اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ بھوجپور کے رہنے والے ترکی النسل ہیں۔ اس لئے شجاع، جنگجو، بہادر اور جرأت مند ہیں۔ وجیہہ و شکیل، لمبے تڑنگے، کشادہ سینہ، مضبوط اور توانا ہوتے ہیں۔ یہاں کی آبادی ہندوستان کی عسکری تنظیم پر چھائی ہوئی ہے۔ برصغیر کی پولیس فورس اور فوج میں بھوجپوریوں کی تعداد معتد بہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے صدیوں قبل ترک اور تاتاری قومیں ہندوستان کے اس خطے میں آکر آباد ہوئیں اور اپنی شہ زوری اور بہادری سے ہندوستان کی تاریخ کو درخشاں اور تابناک بنا دیا۔ چندر گپت موریا کی فوج اور شیر شاہی لشکر بھوجپوریوں پر مشتمل تھا۔

یہاں کی ثقافتی اور معاشرتی تقاضوں میں بہادری، شجاعت اور بلند حوصلگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ساری آبادی عسکریت کی دلدادہ ہے۔ کشتی لڑنے کا ذوق اور پہلوانی کا شوق ہر فرد و بشر میں موجود ہے۔ یہاں کی معاشرتی زندگی کا مقابلہ یونان کے اسپارٹا (SPARTA) کی تہذیب سے کیا جا سکتا ہے۔ بھوجپوری تہذیب و تمدن اور اسپارٹا کی تہذیب و تمدن میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے البتہ بھوجپوری تہذیب و تمدن میں بہادری اور جرأت کے علاوہ علم و ادب کے رجحانات بھی بدرجہ اتم موجود ہیں جو یونان کے اسپارٹا کی تہذیب میں ناپید ہیں۔ اس لحاظ سے بھوجپوری تہذیب شہ زوری اور توانائی کے ساتھ علم و ادب کی عظمتوں سے بھی مالامال ہے۔ بھوجپوری تہذیب و تمدن کی مثال دنیا میں نہیں ملتی جہاں شخصیتیں صاحب سیف اور صاحب قلم ہوا کرتی ہیں۔

مگدھ کا علاقہ دنیا کی تاریخ میں عظیم الشان ہے۔ اسی علاقے میں پاٹلی پتر واقع ہے جو صدیوں برصغیر پاک ہند کا دارالحکومت رہا۔ جین ازم اور بدھ ازم کی مذہبی تحریکیں اسی مرکز سے پروان چڑھیں۔ مگدھی زبان میں جین ازم کی فکر و نظر کا اثاثہ موجود ہے۔ مگدھ ہمیشہ علم و عرفان کا سرچشمہ تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ اس کا مقابلہ ایتھنز کی تہذیب سے ممکن ہے۔

میتھل کا علاقہ سیتا کی وجہ سے معروف ہے جو رامائن کی ہیروئن ہے۔ یہ دیار حسن و جمال میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ یہاں کے برہمن زادوں اور برہمن زادیوں کی خوبصورتی کو طلائی خوبصورتی کا نام دیا جاتا ہے۔ چمپئی رنگ کی طرح ان کا حسن دمکتا ہے اس دیار کی زبان میتھلی ہے جس کا عظیم الشان شاعر ودیاپتی گذرا ہے۔ اس کی رومانی شاعری دنیا کی زبانوں میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔

مونگیر کا خطہ اپنے متصل علاقوں سے متاثر ہے اور مختلف تہذیبوں کے سرچشموں سے سیراب ہوتا رہا ہے۔ اور اپنی زرخیزی اور مردم خیزی میں اضافہ کرتا رہا۔ میر قاسم نے جب انگریزوں سے جنگ کی ٹھانی تو اس نے نظامت بنگالہ کا دارالحکومت مرشد آباد سے مونگیر منتقل کر دیا۔ جہاں اس نے عسکری تنظیم کا جال پھیلا دیا جس کے نشانات ابھی تک نظر آتے ہیں۔

اختر اورینوی کی نشو و نما ایسے ماحول میں ہوئی جہاں علم و ادب کا بول بالا تھا اور جرأت و ہمت کا بھی دبدبہ موجود تھا۔ اسی لئے ان کی شخصیت میں علم و ادب کے ساتھ شجاعت و بہادری کے تقاضے ملتے ہیں۔ وہ بہت جرأت مند پروفیسر تھے کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کا رعب لوگوں پر چھا جاتا تھا۔ ان کی شخصیت فہم رسا اور خوش اخلاقی سے مرتب تھی۔ لڑکوں کی ہمت افزائی کے لئے ان کی توجہ مہمیز کا کام کرتی۔ ان کو آگے بڑھانا ان کی ادنیٰ کرامت تھی اسی لئے پٹنہ کالج کی طلبہ برادری میں بہت عزیز تھے۔ لوگ ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔

راقم الحروف ۴۶-۱۹۴۵ء میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا شعبۂ تاریخ سے منسلک پٹنہ یونیورسٹی کے مسلم ہوسٹل میں قیام پذیر تھا۔ اس زمانے میں مسلم لیگ کی تحریک زور و شور سے چل رہی تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ ہندوستان میں الیکشن کی تیاری میں مصروف تھی۔ مسلم لیگ کی جد و جہد میں بہار مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ راقم الحروف صوبے کی کمیٹی آف ایکشن کا ممبر تھا۔ طلبہ برادری میں بحیثیت مقرر شہرت رکھتا تھا۔ بہت سے مضامین انگریزی اور اردو کے میرے نوک قلم سے نکلے جنہوں نے اپنا ایک مقام حاصل کیا۔ بعض مضامین کو صوبائی مسلم لیگ نے ہزاروں کی تعداد میں شائع کرا کے تقسیم کرایا۔ مثلاً (۱) مسلم لیگ کی ضرورت (۲) پاکستان کیوں؟ (۳) اور مسلم لیگ کی عسکری تنظیم وغیرہ وغیرہ۔ پروفیسر شمس الدین صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی اور پروفیسر اختر اورینوی میرے مضامین سے دلچسپی کا اظہار کرتے تھے اور میری بلند حوصلگی کی ہمیشہ داد دیا کرتے تھے۔ میں شعبۂ تاریخ کا طالب علم تھا۔ لیکن میرے تعلقات شعبۂ اردو کے اساتذہ سے بھی قائم ہو گئے تھے۔ میری تحریر و تقریر سے شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ کما حقہٗ پوری طرح آگاہ تھے اور وہ مجھے عزت و محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اقبالیات:۔ راقم الحروف اقبالیات کا مطالعہ اسکول کے ایام ہی سے کر رہا تھا۔ ایم۔ اے تک اقبال کے تمام فارسی اور اردو کلام سے فیض حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ اردو شعبہ کے اساتذہ کرام کی شفقت اور محبت مجھے کبھی تاریخ کے شعبہ سے اٹھا کر اردو کے شعبہ میں لے جاتی جہاں علم و ادب پر جب بحث چھڑ جاتی تو راقم الحروف بھی اس میں حصہ لیتا جس کی وجہ سے شعبۂ اردو کے اساتذہ راقم الحروف کے معیار علم کو پرکھ سکے۔

پروفیسر اختر اورینوی پٹنہ مسلم ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے۔ ہوسٹل میں کبھی کبھی علم و ادب کی محفلیں بھی سجائی جاتی تھیں جس میں ہوسٹل کے طلبہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ایک شب پروفیسر اختر اورینوی نے اعلان کروایا کہ اقبالیات پر گفتگو کی جائے گی۔ تمام ہوسٹل کے طلبہ ایک مخصوص کمرے میں جمع ہوئے۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ پروفیسر اختر اورینوی اقبالیات پر اظہار خیال کریں گے لیکن جب جلسہ شروع ہوا جس کی ابتدا پروفیسر اختر اورینوی نے کی تو انہوں نے لڑکوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آج اقبالیات کی مجلس میں گفتگو امین الرحمٰن صاحب کریں گے۔ راقم الحروف کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ اقبالیات پر گفتگو کریں اور لڑکوں کے سوالات کا جواب دیں۔

اختر صاحب کی فرمائش نے راقم الحروف کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ پروفیسر موصوف نے ایک عجیب و غریب انداز سے حکم صادر فرمایا۔ آخر کار میں نے اپنی بساطِ علم کے پیشِ نظر اقبالیات پر ایک مختصر سی تقریر کی۔ اس کے بعد مسلم ہوسٹل کے طلبہ نے بے شمار سوالات اقبالیات سے متعلق کئے اور ہر سوال کا جواب راقم الحروف نے شافی دیا۔ پروفیسر اختر اورینوی بیٹھے ہوئے میری فکر و نظر کی تائید کرتے رہے اور میرے جواب کو سراہتے رہے۔ یہ مجلس تقریباً دو گھنٹے تک قائم رہی اور آخر میں پروفیسر اختر اورینوی نے مجھ کا شکریہ ادا کیا اور میری تعریف و توصیف فرمائی۔ اس معیار اور اس انداز کا پروفیسر اختر اورینوی کے بعد دوسرا نظر نہیں آیا۔

استاد کی صفت یہی ہونی چاہئے کہ وہ شاگرد کو اس طرح تیار کر دے کہ وہ استاد کی نیابت کر سکے۔ یہ ایک شفیق اور ہمدرد استاد ہی کر سکتا ہے۔ دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی کا معیار اسی لئے ہندوستان کی سرزمین میں اس قدر بلند اور ارفع تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس سرزمین کے طلبہ اور اساتذہ علم و ادب کے وہ روشن مینار ہیں جہاں سے سارے برصغیر میں روشنی پھیلی ہے اور دنیا والے بھی کسبِ فیض کے لئے دامن دراز کرتے ہیں۔

بحیثیت مقرر:۔ پروفیسر اختر اورینوی نہ صرف ایک نثار، ایک نقاد ایک افسانہ نویس، ایک ڈرامہ نویس، ایک ریسرچ اسکالر اور ایک معیاری شاعر تھے بلکہ بہت اچھے مقرر بھی تھے۔ سیرت کے جلسوں میں عام طور سے مدعو کئے جاتے تھے جہاں وہ بہت اچھی تقریر کرتے تھے۔ دلکش شکل و صورت کے علاوہ ان کی شخصیت میں دلکشی اور حسن بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ گفتگو کے لئے متین، سنجیدہ اور دلکش لہجہ اختیار کیا کرتے تھے۔ مذہباً قادیانی تھے اور لاہوری جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن کبھی متنازعہ فیہ مسائل پر گفتگو نہیں کرتے تھے۔ مسلم ہوسٹل میں تفسیر قرآن کا درس بھی دینے کی کوشش کرتے۔ ان کے درس میں طلبہ کا اچھا خاصا اجتماع ہوتا تھا لیکن کبھی انہوں نے ایسے مسائل پر گفتگو نہیں کی جس سے اکثریت کی جماعت کے احساسات مجروح ہوتے ہوں، یہی وجہ تھی کہ طلبہ برادری میں لوگ ان سے محبت بھی کرتے تھے۔

انہوں نے میڈیکل کی چار سال تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ٹی۔ بی کے مہلک مرض کے شکار ہو گئے۔ اس لئے میڈیکل کی تعلیم سے دست بردار ہو گئے اور شعبۂ فنون میں داخلہ لیا۔ علم کے رسیا تھے۔ لہٰذا علم و ادب ہی کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے دم لیا۔ ان کا ایک پھیپھڑا جراثیم سے متاثر ہو گیا تھا اس لئے عمر بھر صحت کی حفاظت کرنی پڑی۔ ہمیشہ دوا دارو اور علاج و معالجہ ان کی زندگی کا ایک شعبہ قرار پا گیا۔ وہ خود سے انجکشن لیا کرتے۔ ڈاکٹری پڑھنے کا اتنا فائدہ ضرور اٹھایا۔ دائم المرض ہونے کے باوجود ہمیشہ ان کے مزاج میں شگفتگی قائم رہتی تھی۔ لڑکوں نے انہیں کبھی رنج ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بہت ہی طرح دار اور ہمہ گیر شخصیت تھی۔ بہت سے علوم و فنون میں کمال حاصل کیا۔ ان کے سامنے جو طلبہ کی جماعت رہتی تھی ان میں

بھی پڑھے لکھے لوگ تھے۔ اسی لئے اساتذہ اور طلبہ کے درمیان بڑی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ ایک دوسرے کی عزت کرنے میں پہل کرتے تھے۔

اختر اورینوی دائم المرض ہونے کے باوجود بڑے دبنگ پروفیسر تھے۔ صوبۂ بہار نوے فی صدی سے کچھ ہی کم ہندو آبادی کا صوبہ تھا۔ لیکن مسلم لیگ کی تحریک کے زمانے میں پٹنہ کالج کے پروفیسر ہوتے ہوئے اختر اورینوی نے پٹنے میں لیاقت علی خاں سکریٹری جنرل آل انڈیا مسلم لیگ سے ملاقات کی اور سیاسیات حاضرہ پر بہت دیر تک گفتگو کی۔

اختر اورینوی کی مرنجاں مرنج طبیعت پر متانت اور سنجیدگی غالب رہتی۔ پٹنہ یونیورسٹی میں ہر سال ڈرامے منعقد کراتے اور پس منظر میں صداکاری کا فرض انجام دیا کرتے تھے۔ پٹنہ کالج کے بعض ڈرامے بڑی شہرت کے حامل ہوئے۔ ان ڈراموں میں حصہ لینے والے طلبہ آج ہندوستان اور پاکستان میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور علم و ادب کے میدان میں بھی اپنے لئے ایک مقام رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں ابلیس کی مجلس شوریٰ کو ڈرامے کی صورت میں اسٹیج کیا گیا۔ ڈاکٹر معزّ الدین (ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی) نے ابلیس کا پارٹ ادا کیا اور راقم الحروف نے طارق کا۔

پروفیسر اختر اورینوی کا مقابلہ رابٹ لوئی اسٹیونسن سے کیا جاسکتا ہے جو انگریزی زبان کا بلند پایہ ناول نگار اور شاعر تھا۔ امراض مہلکہ نے انگریز شاعر کی صحت کو ایسا تباہ کر دیا تھا کہ وہ ہمیشہ بستر پر دراز رہا کرتا۔ لوگوں سے ملنا جلنا محال تھا لیکن اختر اورینوی اس کے برعکس بہت سوشل تھے اور شگفتگی کی کتاب۔ اسٹیونسن سے زیادہ مہلک مرض کے شکار تھے لیکن اس سے زیادہ کتابیں لکھیں اور اس سے زیادہ ہنس مکھ اور وضعدار تھے۔

شرق منائی

"کانپتا ستارہ"

وہ کانپتا ستارہ جو تھا رشکِ مہر و ماہ

ظلمت کدہ میں جس کے سبب روشنی رہی

منقوط میں لکھا یہ گیا سالِ ارتحال

اختر ہوا خموش مگر زندگی رہی

۱۹۷۷ء

(پروفیسر محمد معین الدین دردائی علیگ)

"ڈاکٹر اختر اورینوی"

اختر صاحب سے میری سب سے پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء میں ہوئی تھی۔ میں اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم اے کا طالب العلم تھا۔ اور "بہار اور اردو شاعری" والے مقالہ میں ان کا ذکر دور حاضر کے پسندیدہ شعرا میں کر چکا تھا۔ اختر صاحب پنجاب سے لوٹتے ہوئے علی گڑھ اتر پڑے تھے اور عثمانیہ ہوسٹل میں عبدالسلام صاحب کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ عبدالسلام صاحب سے میرے دوستانہ روابط تھے۔ میں اکثر ان کے کمرے پر جایا کرتا تھا۔ حسب معمول ایک سہ پہر کو وہاں پہنچا تو ایک خوش رو، وجیہہ متناسب الاعضاء، یونانی خط و خال رکھنے والے نوجوان کو بیٹھا دیکھا۔ عبدالسلام صاحب نے ان کا مجھ سے تعارف کرایا اور میں ان سے بہت جلد گھل مل گیا۔ گورا رنگ، لانبا قد، ستواں ناک، بلند پیشانی، چمکتی ہوئی ذہین اور خوبصورت آنکھیں۔ باوقار انداز گفتگو، اور دلکش آواز، میں ان سے پہلی ہی ملاقات میں بہت متاثر ہوا اور اس وقت ہم دونوں کے درمیان جو مخلصانہ روابط قائم ہوئے وہ آخر وقت تک قائم رہے۔ اور میں ان کی شرافت، اعلیٰ ظرفی، خلوص، وضعداری اور فضل و کمال کا برابر معترف رہا جب ان کا انتقال ہوا اتفاق سے میں اس وقت ہندوستان گیا ہوا تھا۔ اپنی ضعیفی اور معذوری کے باعث میں ان کو کاندھا تو نہ دے سکا لیکن میری آہیں، اور دعائیں ان کی آخری آرام گاہ تک ان کو پہنچانے گئی تھیں۔

اختر صاحب خوش پوشاک اور وضعدار انسان تھے، باتیں دلکش انداز میں کرتے اور کافی رکھ رکھاؤ سے ملتے تھے ملنے جلنے اور بات کرنے میں ان کا خلوص بہت زیادہ نمایاں ہوتا تھا۔ ان کی زندگی مجموعۂ اضداد تھی بظاہر دیکھنے میں توانا تندرست، ہمیشہ رواں دواں اور متحرک، لیکن ساری زندگی وہ مختلف مہلک بیماریوں سے دست و گریباں رہے۔ آٹھ سال کی عمر میں ٹائیفائڈ کے شکار ہوئے اور چالیس دن تک امید و بیم کی حالت میں پڑے رہے۔ پھر ناسور، کالا زار، اور مرض سل سب ہی سے ان کو سابقہ پڑتا رہا اور وہ ان سے آنکھ مچولی کھیلتے زندگی کی آخری منزل تک تیز تیز بڑھتے رہے۔ ان کے والدین انہیں طبی شعبہ کا ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے، لیکن قدرت اس سے زیادہ بڑے کام کے لئے ان کو منتخب کر چکی تھی وہ طبی شعبہ کے تو نہیں لیکن ادبی شعبہ کے ڈاکٹر ضرور بن گئے اور اپنی تحریر و تقریر سے بے شمار دل و دماغ کی تربیت، اصلاح، اور تزئین کرتے رہے۔

اختر صاحب ایک وقت میں افسانہ نگار، محقق، نقاد، ڈرامہ نویس اور شاعر سب کچھ تھے اور بلاشبہ سب میں ایک امتیازی شان بھی رکھتے تھے۔ لیکن مجھے ان کی یہی بڑی کمزوری معلوم ہوتی تھی۔ ان کی حوصلہ مندی ذہانت اور فطانت نے ان سے ہر صنف پر قلم اٹھوایا لیکن ہر صنف ادب پر قلم اٹھانے والا کسی میں کامل نہیں ہو سکتا ورنہ اختر صاحب کی غیر معمولی صلاحیتیں اس

لائق تھیں کہ وہ ادب کے کسی ایک دو صنف پر غیر معمولی کمال حاصل کرتے۔

اردو شعر و ادب کے نقاد کی حیثیت سے ان کا ایک خاص مقام ہے اور وہ برصغیر کے ممتاز تنقید نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں اُن کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں قدر و نظر، تحقیق و تنقید جدید، کسوٹی، مطالعۂ اقبال، مطالعہ نظیر، سراج و منہاج خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی تنقیدیں کافی سنجیدہ اور متوازی ہوتی ہیں۔ اردو تنقید نگاری کی بہت سی خوبیوں سے متصف ہیں، لیکن ان میں ایک عجیب قسم کی کمزوری بھی پائی جاتی ہے۔ وہ بعض مرتبہ لوگوں کو محض خوش کرنے کے لئے تنقید نگاری کرتے ہیں اور اس میں وہ اپنے فرائض تنقید نگاری کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ مثلاً تحقیق و تنقید میں پروفیسر عبدالمنان بیدل عظیم آبادی پر جو تنقید لکھی گئی ہے۔ وہ ان کی اس کمزوری کی غمازی کرتی ہے۔ کبھی کبھی وہ چلتی پھرتی تنقیدیں بھی لکھ دیتے ہیں یعنی فن تنقید کے متعلق یا اس کے علاوہ بہت کچھ لیکن جس کتاب یا مصنف پر تنقید لکھی گئی ہے۔ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں۔ اس طرح کی مثالیں ابن الوقت پر ایک تبصرہ وغیرہ میں پائی جاتی ہیں۔

اختر صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اردو فارسی کے علاوہ انگریزی ادب پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، ان کی تنقیدوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فن تنقید نگاری پر انگریزی میں تقریباً جتنی معیاری کتابیں ہیں ان کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ ایک بڑی بات ان میں یہ ہے کہ وہ بہت سے تنقید نگاروں کی طرح اردو ادب کو انگریزی ادب کی کسوٹی پر جانچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مشرق اور مغرب کا فرق سمجھتے ہیں۔ اختر صاحب میں اخلاقی جرأت کی بھی کمی نہیں وہ جو کچھ سمجھتے ہیں بے جھجک ظاہر کر دیتے ہیں۔

اختر صاحب کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے سید وقار عظیم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"۱۹۳۰ء کے ابتدائی دور کی افسانہ نگاری کی قیادت پریم چند کر رہے تھے علی عباس حسینی ان کے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلے اور بعض نوجوان افسانہ نگار ولتے ان کی روش سے متاثر ہو کر سیاست، ادبی معیشت اور سرمایہ و مزدور کو اپنا خاص موضوع بنایا۔ اس خاص میدان میں سہیل عظیم آبادی اور اختر اورینوی نے جو کام کیا۔ اس کی حیثیت ایک مستقل خدمت کی ہے۔ اختر صاحب کے بیشتر افسانے بہار کے دیہاتوں کی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔"

اختر صاحب نے افسانہ نگاری میں اپنا ایک خاص مقام چھوڑا ہے۔ ان کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ جن میں "منظر پس منظر" کلیاں اور کانٹے، انار کلی اور پھول جھلیاں، سمنٹ اور ڈائنامیٹ، سپنوں کے دیس میں، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کا آخری مطبوعہ افسانہ بہ قول م۔ ظفیر الحسن صاحب "ایک درخت کا قتل"، نقوش جنوری ۱۹۷۰ء میں چھپا ہے۔ یہ ایک رمزیہ افسانہ ہے۔ اختر صاحب نے بہت تیزی سے ارتقائی منزلیں طے کی ہیں افسانہ نگاری اور شاعری میں ارتقا کا ہونا ضروری ہے، اور اس سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون "افسانہ میں مقصد" (مطبوعہ معاصر پٹنہ جولائی اگست ۱۹۴۲ء) میں خود لکھا ہے کہ:۔

"افسانہ ادب کی ایک شاخ ہے۔ اور ادب تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتا ہے۔ لہذا افسانوں میں دوسرے فنون کی طرح ابتدائی مقاصد کے علاوہ ایک ارتقائی مقصد بھی ہونا چاہیے لیکن اس مقصد کو فن کارانہ خوبصورتی اور

لطافت ونفاست کے ساتھ پیش کرنا ضروری ہے۔"

اور وہ اس پر بہ حیثیت افسانہ نگار ہمیشہ عمل پیرا رہے۔ ان کے افسانوں میں مقصدیت نمایاں ہوتی ہے۔ معاصرین میں کرشن چندر منٹو، احمد ندیم قاسمی اور بیدی سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے، اور وہ اپنے معاصرین کی بڑی قدر اور عزت کرتے تھے۔ ادبی رقابت اور چشمک کا ان کے یہاں گذر ہی نہیں تھا۔ کردار نگاری میں ان کے افسانے کرشن چندر سے مماثلت رکھتے ہیں۔ ان کا پلاٹ مقصدیت کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن افسانوں میں ان کی زبان اکثر عالمانہ ہو جاتی ہے اور یہ افسانہ نویسی کے لئے موزوں نہیں ہوتی۔ ثقیل سنجیدہ اور باوقار قسم کے الفاظ علمی اور تحقیقی مضامین کے لئے تو مناسب ہوتے ہیں لیکن افسانوں میں بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ذاتی طور پر ان کی افسانہ نگاری سے زیادہ ان کی تنقید نگاری کا مداح ہوں۔ بلکہ ان کی بیگم شکیلہ اختر کے افسانوں میں مجھے زیادہ افسانویت معلوم ہوتی ہے۔ اور میں اسے پسند کرتا ہوں۔

"منظر اور پس منظر" کا پیش لفظ لکھتے ہوئے پروفیسر کلیم الدین احمد نے ان کی افسانہ نگاری کو داد تحسین ان الفاظ میں دی ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے:۔

> میں اختر کے افسانوں کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ اختر نوجوان ادیب ہیں، ان کی شہرت بہار کی حدود میں محدود نہیں۔ ان کی تحریریں ہندوستان کے اکثر و بیشتر رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں اختر کے ادبی کارنامے محدود قسم کے نہیں۔ وہ افسانہ نگار ہیں، شاعر ہیں، اور نقاد ہیں اور انہوں نے دو ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانے خصوصاً نہایت مقبول ہیں۔"

ان کے ایک ہم عصر پروفیسر آل احمد سرور نے بھی ان کی افسانہ نگاری پر رائے زنی کی ہے اور اس پر ان کی مہارت کو سراہا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

> اختر کے افسانے مجھے پسند آئے۔ اختر کا مشاہدہ بہت تیز ہے وہ خارجی اور داخلی ہر قسم کی مصوری کر سکتے ہیں کردار نویسی کے گُر سے بھی واقف ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دراصل کچھ کہنا ہے اور یہ ایک بڑی بات ہے۔"

اختر صاحب میں علم کا غرور اور انانیت وغیرہ بالکل نہیں، وہ ملنے جلنے میں حد درجہ خلیق، متواضع اور منکسر مزاج تھے۔ وہ جس محفل میں جاتے اپنے علم و فضل اور انداز گفتگو سے چھا جاتے اور سب کو اپنا گرویدہ بنا لیتے۔ ان کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ان کا ہر ملنے والا ان کے خلوص اور محبت کا معترف نظر آتا۔ وہ اپنے دوستوں کی ایک ایک ادا پر بچھ جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مقالہ "میرے احباب" میں اپنے چند دوستوں کے بارے میں جی کھول کر خلوص کی بارش کی ہے۔ اور ایک طرح پر اپنے موئے قلم سے ان کی صورت اور سیرت کا بہترین مرقع کھینچ دیا ہے۔

زبیر احمد تمنائی صاحب علی گڑھ میں میرے بھی دوستوں میں رہے ہیں اور اب ایک ہی شہر کراچی میں رہتے ہوئے بھی گرچہ ان سے ملاقات کے مواقع نہیں نصیب ہوتے لیکن ان کی قدیم اور دیرینہ روابط کی یاد تو اب بھی دل میں اسی طرح محفوظ ہے۔ ان کی قلمی تصویر جو اختر صاحب نے کھینچی ہے اسے پڑھ کر جہاں اور لوگوں کو ان کے ساتھ ان کی غیر معمولی محبت اور خلوص کا اندازہ ہوگا، وہاں مجھے بھی اپنی زندگی کی گھڑی کی سوئی کو پینتیس ۳۵ چھتیس ۳۶ برس پیچھے کرکے اسے پڑھنے میں بہت لطف آیا ہے۔ آپ بھی لطف اندوز ہوں:۔

"تمنائی ان دنوں کراچی میں ہیں انہوں نے ایران پر ایک نہایت قیمتی کتاب لکھی ہے۔۔۔ سانولا سلونا رنگ، گھونگریالے بال، بریک بررش کرتے ہیں، اور سر پر لہراتی ہوئی موج در موج گھٹائیں امنڈتی رہتی تھیں، بڑی خوبصورت رسیلی آنکھیں، ترشا ہوا چہرہ، تیکھا ناک نقشہ، میانہ قد، بھرا بدن، کم سخن، متین، نفیس مزاج، سلیقہ شعار ادب و شعر میں غلطاں، نہایت دردمند دل کے مالک، مزاج میں رقت بہت، آنکھیں یوں نم آلود نظر آتی تھیں جیسے کنول کی پتیاں تالاب کے پانی کی سطح سے اوپر بھی نم آلود رہتی ہیں۔"

شرف الدین عظیم آبادی کے بارے میں اپنی محبت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:۔

"شرف الدین عظیم آبادی سے بہتر خط گوئی نہیں لکھ سکتا۔ غالب کے بعد اگر کسی نے اردو کو معلی بنایا ہے اور عود افشانی کی ہے تو وہ شرف ہیں۔ اور مکتوب نگاری کے معیار سے کئی جہتیں ایسی ہیں کہ شرف غالب سے زیادہ دل اور روح کو چھوتے ہیں۔"

اختر صاحب ایک نکتہ رس محقق بھی تھے تحقیقی مضامین اور کتابوں سے ان کے علم و فضل کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے بہار کے اردو شعراء اور نظم نگاروں پر ایک وقیع اور معرکتہ الآرا کتاب لکھی ہے "جو بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" کے نام سے چھپ کر شائع ہوئی ہے اور اس پر ان کو پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی۔ لٹ کی ڈگری بھی ملی ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ کو پڑھ کر ان کی تحقیقی صلاحیت اور علمی کاوش کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو زبان کے ارتقا کے سلسلے میں مختلف زبانوں کے آپس میں لین دین کے سلسلے میں انہوں نے جو وضاحت پیش کی ہے وہ بہت دل لگتی اور حقیقت سے قریب ہے۔ پھر بہار کے اکثر قدیم مخطوطات کو بھی انہوں نے ڈھونڈ نکالا ہے اور انہیں بڑی خوش اسلوبی اور سلیقہ سے پیش کیا ہے۔

اکثر و بیشتر ادیبوں کی طرح اختر صاحب میں بھی کچھ کو پڑا پایا جاتا ہے۔ ان کا ایک خاص کو بڑ یہ ہے کہ وہ مذہبیات اور اسلامیات کا ذکر کئے بغیر ایک لقمہ بھی نہیں توڑ سکتے تھے۔ موضوع کوئی بھی ہو لیکن وہ اسلامی تاریخ و تمدن وغیرہ کا ذکر کسی نہ کسی طرح ضرور لانے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے ان کے اکثر مضامین اور تحریر میں تبلیغی شان آجاتی ہے۔ مثلاً اپنے مقالہ "ادبیات عالم اور اردو ادب میں ترقی پسندانہ رجحانات" میں ایک جگہ نظام معاشرت کے اندر انقلاب کا ذکر آگیا۔ تو فوراً اسلام کے انقلاب کو پیش کر دیا۔ اور پھر دس بیس سطروں سے سیری نہیں ہوتی بلکہ پورے دو صفحے مسلسل اسلامیات کے لئے وقف کر دیئے گئے ہیں۔ پھر آگے چل کر اسی مضمون میں "فن برائے زندگی نہ کہ فن برائے فن" کا ذکر آگیا۔ تو پھر کئی صفحات مذہبیات پر لکھ مارے، مثلاً:۔

"اسلام نے آج سے تیرہ سو برس پہلے ہی اس معیار فن کی بنیاد ڈالی تھی جو معیار آج رائج ہو رہا ہے۔۔۔ غرض اسلام فن برائے فن کا مخالف ہے۔ اور فن برائے انسانیت عظمیٰ کا موید، اسی اسلامی فلسفہ کے مطابق اسلامی ادب نے جنم لیا۔ اور وہ ایشیا و یورپ کو متاثر کرتا رہا۔ امام مالکؒ، شافعیؒ، ابو حنیفہؒ اور ہندوستان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہ کے مذہبی اور فلسفیانہ کاموں سے قطع نظر ادبیات اسلامی میں ابن عربی، سعدی، مولانا روم وغیرہ جیسی جلیل القدر ہستیوں کے نام ملتے ہیں۔"

غرض میری یہ ہے کہ اختر صاحب ہر چیز کو اسلامیات کے نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی تھے۔ وہ چاہے کوئی تنقید کریں یا

تحقیقی مضمون لکھیں ان کا محور زیادہ تر اسلامیات ہی رہتا تھا۔ اور اس لئے ان کی ہر تحریر میں تبلیغی شان نمایاں ہو جاتی ہے۔
اختر صاحب شاعر بھی تھے۔ باکمال اور دل نواز شاعر ۔ علم و فضل نے جہاں ان کو قادر الکلامی بخشی تھی وہاں ان کے درد مند دل نے سوز و درد اور اثر بھی پیدا کر دیا تھا۔ ان کی شاعری میں بڑی دل کشی اور جاذبیت پائی جاتی ہے۔ موجودہ ترقی پسند شعرا میں ان کا مخصوص مقام ہے لیکن ان کے یہاں علی سردار جعفری وغیرہ کی طرح "آگ" اور "خون" کی بھنبھنات نہیں ملتی۔ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی ان کے یہاں مذہب کا حد درجہ لحاظ اور احترام پایا جاتا ہے۔ سنجیدگی اور شائستگی کا دامن وہ کسی وقت اور کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑتے۔ غزل اور نظم دونوں ہی کہتے تھے۔ نظم میں میرا خیال ہے وہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم سے زیادہ متاثر تھے۔ تغزل میں ان کے یہاں رومانیت، محاکات اور معاملہ بندی کافی پائی جاتی ہے۔ مجھے ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں ہی پسند ہیں۔ غزل کے ان کے یہ چند اشعار اگرچہ ان کے ابتدائی دور کے ہیں اور بہت پرانے ہیں لیکن مجھے بہت پسند ہیں۔ انہیں جب بھی پڑھتا ہوں لطف آتا ہے ؎

پہلے تو بہت ناداں تھے وہ، اب ان کی شرارت کیا کہئے
اس شوخ ادا کی باتوں میں جملوں کی لطافت کیا کہئے

تھم تھم کے وہ رونا آنکھوں کا اور زخم جگر کا ہنس دینا
آنا وہ تصور میں ان کا اور چپکے سے رخصت کیا کہئے

ہوتے وہ مرے کیا کہنا تھا حاصل نہ ہوا مجھ کو یہ شرف
کیا راز ہوا افشا الفت کا اب حرف محبت کیا کہئے

اختر بھی تڑپتا ہے تیری چاہت کی کہانی کو سنکر
دکھ درد یہ سب کے سہتا ہے شاعر کی بھی حالت کیا کہئے

افسر صدیقی امروہوی

"محقق بھی اور ناقد بھی"

تھے محقق بھی اور ناقد بھی
کامل و کامگار تھے اختر

مجلس شعر و شاعری کے لئے
موجب افتخار تھے اختر

ان کی تحریر سے ہویدا ہے
اک حقیقت نگار تھے اختر

ہے یہ تاریخ لاجواب وفات
مدح سنج بہار تھے اختر

۱۹۸۹ ــ ۱۲ ــ ۱۹۷۷ء

ایس مثانی

سرمایۂ یک عالم

اکثر ارباب قلم اپنی یا اپنے ممدوح کی اعلیٰ قابلیتوں یا علمی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے قدیم سیاسی مفکرین کے خیالات یا جدید اصحاب فکر کے نظریات کا سہارا لیتے ہیں۔ مغربی فلسفے کی اساطین کے تذکروں اور فلاسفۃ الاسلام کی باتوں کو مثال اور دلیل سمجھتے ہیں اور خالقین شعر و ادب یا ناقدین نظم و نثر کو زیر بحث لے آتے ہیں مگر میں اپنے ممدوح کے فن اور شخصیت کے سلسلے میں نہ کسی ماہر لسانیات یا فاضل ادبیات کا ذکر کروں گا۔ اور نہ کسی تخلیقی کارناموں یا اخلاقی خصوصیتوں کو موضوع گفتگو بناؤں گا۔ کیونکہ مجھے نہ تو اپنی علمی معلومات کا اظہار مقصود ہے اور نہ میں اپنے ممدوح کو محتاج تعریف و تعارف سمجھتا ہوں۔ ان کی شخصیت پر ان کے احباب اور رشتہ دار لکھیں گے اور ان کے فن پر ان کے ہم عصر اور مستقبل کے اصحاب فکر رو قلم صرف کریں گے۔ میں تو محض ایک معمولی اور ادنیٰ شخص ہوں۔ ایک ایسا شخص جس نے انہیں صرف پڑھا، سنا اور دیکھا ہے اور اسے "پڑھا، سنا اور دیکھا" کی روشنی میں فی الوقت کچھ مختصراً عرض کرنے کی جسارت کی ہے۔

میرے ممدوح ڈاکٹر سید اختر اورینوی ہیں جو ۱۹ اگست ۱۹۱۰ء کو عالم وجود میں آئے اور ۳۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو ملک عدم سدھارے۔

لفظ "اختر" کو اتنا زیادہ پرکشش اور اس قدر پسندیدہ سمجھا گیا ہے کہ اردو شاعری میں متعدد شاعروں نے اس کو تخلص کے طور پر اپنایا اور بے شمار ادیبوں نے اپنا قلمی نام رکھا۔ صرف بہاری شعراء کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو ان میں پندرہ بیس نام ایسے مل جائیں گے جو اردو شاعری کے لئے وجہ ناز و افتخار کہے جا سکتے ہیں۔ مگر ان سب ناموں میں اختر اورینوی کا نام نمایاں اور روشن نظر آئے گا۔ اختر کی شہرت عام اور بقائے دوام میں اصناف شعر و سخن ہی کو صرف دخل نہیں بلکہ ان کا زبان و ادب پر کامل عبور اور اس پر مکمل گرفت ہے۔ تخلیقی توانیں اور تنقیدی صلاحیتیں ہیں۔ چنانچہ جب بھی ماہرین لسانیات کی فہرست مرتب کی جائے گی۔ ان کا نام لازمی آئے گا اور جب جب تاریخ و تحقیق کے شہسواروں کی جستجو ہوگی ان کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ اگر صف اول کے ممتاز افسانہ نویسوں کا ذکر چھڑے یا صاحب طرز ڈرامہ نگاروں کی بات چلے، لائق تحسین ترجموں کے تذکرے ہوں یا قابل ستائش ناقدوں کے بیان۔ اختر اورینوی کا نام ضرور لیا جائے گا۔

اختر اورینوی کے فن کو ان کے معاصروں نے خواہ جس نظر سے بھی دیکھا ہو مجھے اس پر کچھ نہیں کہنا ہے۔ اسی لئے میں کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، آل احمد سرور، اعجاز حسین، معین الدین دردائی، احمد اللہ ندوی، علی حیدر نیر، کرشن چندر، سہیل عظیم آبادی، محمد ظفر احسن اور بہت سے دوسرے اصحاب فکر و خیال کی گراں قدر آراء کے حوالے نہیں دے رہا۔ میں شکیلہ اختر اور مہ جبین ناز وغیرہ کے تاثرات و جذبات بھی سپرد قلم نہیں کروں گا کہ نیک سیرت شریک حیات کے تاثرات اور سعادت مند شاگردوں کے جذبات سے قطع نظر مجھے اپنی بات کرنی ہے۔ اس طرح ان کا فن اور ان کی شخصیت جو دوسروں کے ذریعہ پہنچائی گئی ہے میرے لئے موضوع بحث نہیں۔ میرا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ اپنے اصول ہیں اور اپنا نظریۂ فکر ہے

میرا معیار خصائل و رذائل عام لوگوں سے مختلف ہے۔ میں عیوب میں محاسن اور محاسن میں عیوب تلاش کرتا ہوں، اجمال میں تفصیل اور تفصیل میں اجمال ڈھونڈتا ہوں۔ جہاں مجھے ایجاز و اختصار پسند ہے وہاں شرح و بسط بھی ناپسند نہیں۔ مثال کے طور پر حیات اختر کو اگر چالیس جلدوں پر مشتمل تحریر کیا جائے تو بھی درست اور اگر وہ "یعقوب پسرے داشت گم شد باز یافت" کے مصداق ہو تو بھی نامناسب نہیں۔ اب اس کا کیا کیا جائے بہ ایں عقل و دانش۔ اسے حسن سمجھا جائے یا قبح کہا جائے ؎

نالہ تم کھینچو سنجاد ، اب چاہے کچھ ہوئے نہ ہوئے

ڈاکٹر سید اختر اورینوی اپنی ننہال کاکو ضلع گیا میں ۱۹ اگست ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے۔ مونگیر سے میٹرک ۱۹۲۶ء میں اور پٹنہ سے انٹر سائنس ۱۹۲۸ء میں پاس کر کے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا مگر علالت کی وجہ سے ایم بی بی ایس کو نامکمل چھوڑ کر پٹنہ ہی سے ۱۹۳۲ء میں بی اے آنرز کر لیا اور پھر ۱۹۳۴ء میں ایم اے اردو فرسٹ کلاس فرسٹ پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں لکچرار اردو ہو گئے ۱۹۵۲ء میں صدر شعبہ پٹنہ یونیورسٹی ہوئے ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹریٹ کیا اور ۱۹۶۱ء میں پروفیسر بنا دیئے گئے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو پٹنہ میں انتقال ہوا۔ اورینوی قصبہ اورین ضلع مونگیر کی نسبت سے کہلاتے تھے جہاں آپ کے والد سید وزارت حسین صاحب اور ان کے اسلاف آباد ہوئے تھے۔

آپ تمام عمر جن مہلک امراض مختلف میں پریشان رہے ان میں ٹائیفائڈ، سرسام، ناسور، کالا زار، وجع المفاصل اور سل وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جسم بیمار تھا مگر ذہن صحت مند۔ اسی لئے شعر گوئی اور مضمون نویسی شغل رہا۔ مصوری اور منظر کشی سے دلچسپی رہی۔ ۱۹۲۶ء سے چھپنے لگے۔ ہند و پاک کے معیاری رسائل و جرائد میں چھپتے رہے۔ "ہندوستان ریویو" میں انگریزی مضامین بھی شائع ہوئے۔ تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی مجموعوں میں (۱) "منظر و پس منظر" اور "کلیاں اور کانٹے" (افسانوں کے مجموعے) (۲) "حسرت تعمیر" اور "کارواں" (ناول) (۳) "شہنشاہ حبشہ" اور "زوال کینٹن" (ڈرامہ) (۴) انجمن آرزو (شعری مجموعہ) (۵) تحقیق و تنقید۔ تنقید جدید۔ سراج و منہاج۔ کسوٹی قدر و نظر۔ مطالعۂ اقبال۔ مطالعۂ نظیر اور تحقیق تنقید جدید (تنقیدی مضامین کے مجموعے) (۶) بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء (تحقیقی مقالہ برائے ڈاکٹریٹ) قابل ذکر ہیں۔ جو اشاعت پذیر ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

۱۹۳۳ء میں ہند و پاک کی مشہور افسانہ نگار خاتون شکیلہ اختر سے شادی ہوئی۔ جنہیں اپنے بچپن ہی سے بچے اچھے لگتے ہیں مگر وہ اکیلی اکیلی سی ہیں۔ یہ سونا پن ان کی زندگی سے کبھی دور نہیں ہوا۔ سچ ہے مقدر بڑا ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔

سرسری طور پر اور سطحی نظر سے دیکھا جائے تو اختر کی ساری زندگی کو ان چند سطور نے اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ مگر کیا یہ حقیقت ہے؟ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ابھرتا ہے۔

اختر اورینوی کا اصل نام سید اختر احمد تھا۔ جس سے از روئے جمل ان کا سال پیدائش ۱۳۲۸ھ ظاہر ہوتا ہے (معلوم نہیں یہ ان کا واقعی تاریخی نام تھا یا صرف میرے ذہن کی اپج ہے۔ ویسے عیسوی اور ہجری سالوں میں جو فرق ممکن ہے اس اعتبار سے گمان غالب ہے کہ یہ ان کا تاریخی نام تھا) اس طرح ہجری سالوں کے شمار سے وہ ۶۹ (انہتر) سال تک کشاکش غم دوراں اور کش مکش حیات مستعار میں مبتلا رہے۔ معالجوں کی زیر نگرانی زندگی کی پُر پیچ راہوں اور ناہموار پگڈنڈیوں سے گزرتے رہے اور اپنے رب کا شکر بشکل شکوہ کرتے رہے جب سینہ داغدار اور قلب بے قرار ہو تو کوئی اور کیا کرے۔ پھر بھی صبر اور شکر کا عنصر غالب رہا۔ اور اس صبر و شکر میں جہاں ان کی سخت جانی

کو دخل رہا ہے وہاں ان کے بزرگوں کی تربیت اور ان کی عطا کردہ دینی تعلیم کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ گرچہ آگے چل کر اختر کو تیقن و تشکک کے امتزاج کا سامنا کرنا پڑا۔ دونوں کے سنگم تک پہنچنا پڑا۔ مگر اسی "مذہبی کو بڑ" نے انہیں سہارا دیا ہے اور اسی شکستہ کشتی کے ذریعہ وہ دامن مراد پکڑ سکے ہیں شاید — وہ اپنی جگہ کھڑے جہاد کرتے رہے۔ خدمت اور اطاعت بھی تو جہاد ہی ہے نا! خصوصاً امام جماعت کی اطاعت، وہ اپنی جگہ کھڑے اپنے نصب العین کی حفاظت کرتے رہے۔ بقول خود بھاگ کر مجرم نہیں بنے — مجاہد تھے مگر بیمار۔ تلوار تو نہیں چل سکی لیکن اقرار بھی انکا سے نہیں بدل سکا۔ فاتح اورین کا سپوت جس کے اجداد کا پیشہ کبھی سپہ گری تھا۔ اب وہ پیشہ زراعت بن چکا تھا، مگر مقاصد اب بھی وہی تھے۔ "رشد و ہدایت"۔ وہی مجاہدانہ بات۔ وہی مجاہدانہ سرشت جس میں جوش کے ساتھ ساتھ محبت بھی تھی۔ جیسے چٹانوں کے درمیان آبشار۔ وہی نغمگی، وہی ترنم۔ وہی سکون قلبی اور وہی قرار ذہنی — اور یہی وجہ ہے کہ اختر "نیم ملا" ہو کر بھی خطرۂ ایمان نہیں بن سکے۔ جب احتیاط اور پرہیزگاری کسی کی عادت ہو جائے تو کس طرح وہ کسی کے ایمان کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

اختر اور ہیوی نیم ملا بھی تھے اور نیم حکیم بھی۔ انہوں نے ایم بی بی ایس کے دو امتحانات میں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ مگر وہ خطرۂ ایمان کی طرح خطرۂ جاں بھی نوبت نہیں ہو سکے۔ وہ تو خود ساحل سون پر ایک ایسا روگ لگا بیٹھے تھے جس میں تا دمِ آخر مبتلا رہے گرفتاری دل کا بڑا پیارا اور بڑا انوکھا روگ۔ جو ۱۹۴۳ء میں جینے کا سہارا بن گیا۔ "جولا نکاری" میں جنگلوں کا ساتھی بنا اور جو بن باسی کے لئے یہ ثابت کر گیا کہ جینے کے لئے روحانی سہارے کے علاوہ کسی جسمانی سہارے کی بھی ضرورت ہوتی ہے — یہ تمام باتیں اختر کے یہاں استعاروں اور کنایوں میں مل جاتی ہیں — انہیں جرأت اظہار نہیں مگر ان کی زندگی اُن کے افسانوں میں جھلکتی ہے۔ ان کی نظموں سے جھانکتی ہے۔ اختر کے ابتدائی افسانوں اور نظموں میں رومانیت غالب ہے۔ لیکن جب اٹکی سینی ٹوریم میں قیام کے دوران ان میں حقیقت پسندی آگئی تو ان کے فکر و نظر کا دائرہ مختلف ہو گیا۔ مغربی ادبیات اور اشتمالیت کے مطالعہ نے ان کے ذہن و روح کو یکسر بدل دیا۔ وہ اورین کے مذہبی اور مستحکم قلعے کو منہدم کرنے کے درپے ہو گیا۔ اور کاشتکار کے کھیت کھلیان کے لئے برق خرمن ثابت ہونے لگا۔ مگر دریائے سون سے نکلی ہوئی شاداب نہر، شیشم کی قطاریں، آموں کے باغات اور سرو و چنار کے مانند رومان پرور "رانگڑ" کے جھنڈ کے اندر "بام والا" کے حسن نے کچھ ایسا جادو جگایا کہ اختر حقیقت پسند اور اشتمالی نہ بن سکے۔ اشتراکی احباب انہیں دہریہ اور کمیونسٹ نہ بنا سکے۔ اور ان کی جبین نیاز سجدہ ریز ہو گئی اور وہ خدا کا انکار نہیں کر سکے — اس خدا کا جس نے ان کے دل میں اردو کی محبت پیدا کی اور اردو کو ان کا ایمان بنا دیا۔

وفا شعار ملے گا نہ کوئی میرے بعد
یہ بات ختم ہوئی اب پیمبری کی طرح

مہ جبین ناز

آہ — میرے اُستاد

ہند سے آئی ہے دلدوز خبر
کر گئے کوچ جناب اختر

فلکِ عظمتِ انساں، اختر
ادب و شعر پہ احساں اختر

خوش ادا۔ خوش نظر و خوش طینت
علم کا حُسن، ادب کی زینت

شیریں گفتار، شگفتہ سیرت
نیک، ہمدرد، سراپا شفقت

منبع علم و ہنر، مصدر عزم
سارے احباب کی جاں، نازشِ بزم

بجھ گئی شمع فروزانِ کمال
خاک میں چھپ گیا مہتاب جمال

لُٹ گئی محفل نقد و ادراک
شہرِ تحقیق میں اڑنے لگی خاک

میرے استاد شفیق آہ! مگر
موت ہے آخری انجام بشر

شعر و افسانہ و تنقید، سبھی
آپ کے ساتھ ہی ہر چیز گئی

کس طرح پہونچوں کہ مجبور ہوں میں
خواب گہہ آپ کی ہے دور بہت دور ہوں میں

میں ہوں پردیس میں معذوری ہے
راہ کا سنگ گراں، دوری ہے

باپ کے بعد پھر استاد کسے بتلاؤں
داغ پر داغ کہاں تک کھاؤں

موت بر حق سہی لیکن یہ یقیں
آپ کو بھی کبھی موت آئیگی سوچا بھی نہیں

ام حبیبہ
شعبہ اردو برائے خواتین
گورنمنٹ کالج کراچی

یادوں کی شمع فروزاں

کاروانِ حیات رواں دواں ہے جس کی منزل آجاتی ہے وہ قافلہ سے بچھڑ کر اپنی منزل کی طرف چلا جاتا ہے۔ ہم مسافرِ حیات صحیفۂ زندگی کی ورق گردانی کرتے ہوئے ماضی کے اوراقِ پارینہ میں بچھڑنے والوں کے عکس دیکھتے ہیں، ان کے لیے آنسو بہاتے ہیں، آہیں بھرتے ہیں مگر انہیں کبھی پا نہیں سکتے۔ ان کی یادیں دلوں پر نقش ہوگئی ہیں، اور ہم ان زخموں کو سینے پر سجائے رہتے ہیں۔ اس لئے کہ یہی یادیں سرمایۂ حیات ہیں۔

سنہ ۱۹۵۲ء کا زمانہ اور اگست کا خوشگوار مہینہ تھا ہم لوگ انٹر کرنے کے بعد آنرز کی پڑھائی کے لئے پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے گئے میری نظر سب سے پہلے علامہ جمیل مظہری صاحب پر پڑی۔ انہیں میں بچپن سے جانتی ہوں وہ میرے پیارے علامہ چچا ہیں اور رہیں ان کی بھتیجی ہی۔ علامہ چچا اور ابا جان کی دوستی مثالی ہے اسی لئے یونیورسٹی میں بھی وہ مجھے علامہ چچا ہی نظر آئے جن کے چشمۂ علم سے میں فیض یاب ہوتی رہی ہوں جن کی شفقتوں اور محبتوں کے نقوش میرے دل پر بچپن سے ثبت ہیں۔ علامہ چچا کے ساتھ میں صدر شعبۂ اردو جناب اختر اورینوی صاحب کے روم میں گئی۔ انہوں نے میرا تعارف کرایا۔ بھئی اختر یہ میری بیٹی ام حبیبہ ہے۔ اختر صاحب بہت ہی اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔ آپ کی باوقار اور پر خلوص شخصیت سے میں بہت متاثر ہوئی۔

کچھ دنوں کے بعد پڑھائی شروع ہوئی۔ اختر صاحب انتخاب کلامِ مومن پڑھاتے تھے۔ ایک ایک شعر پر بحثیں ہوتیں۔ اشعار کی باریکی گہرائی، گیرائی اور معنویت سے آگاہ کیا جاتا۔ ایک ہی موضوع اور مضمون پر مومن، غالب اور دیگر شعرا کے اشعار پیش کئے جاتے۔ ان کا تقابلی اور انفرادی جائزہ لیا جاتا۔ ہر شعر کی انفرادیت ظاہر کی جاتی۔ مومن خاں کے تیور اور نفسیاتی کیفیتوں کا تذکرہ ہوتا اور آہستہ آہستہ ایسی فضا پیدا کر دی جاتی۔ کہ ہم یوں محسوس کرتے کہ عہدِ مومن میں کچھ دیر کے لئے پہنچ گئے ہیں۔ ان کی تقریر میں جادو کا اثر تھا وہ ایک ساحر کی طرح اپنے سننے والوں کو مسحور کر لیتے تھے۔ اختر صاحب دوران لکچر اکثر کہا کرتے ادب میں کسی نظریہ یا مقصد کو پیش کرنا کفر نہیں ہے مگر اسے بہ اندازِ جمال پیش کرنا چاہیے۔ وہ واعظ کے بیان میں بھی قلقلِ مینا سننا پسند کرتے تھے۔ وہ ادب میں حسن کاری کے نئے ڈھنگ پیدا کرنا جانتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ ہم میں سے ہر ایک یہ محسوس کرتا کہ مجھ پر خاص نظرِ عنایت ہے۔ سبھی کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔ لکچر کے دوران چٹکلے اور لطیفے بھی سنائے جاتے۔ جب ہم لوگ کلاس روم سے باہر آتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کسی پر کیف تقریب سے واپسی ہو رہی ہے۔

مجھے بی۔ اے کے انگلش کا نصاب بہت مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی پریشانی علامہ چچا سے بیان کی انہوں نے کہا اچھی بات ہے

ہیں انتظام کردوں گا۔ دوسرے دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ ایک بجے کالج سے واپس آتے ہوئے تم اختر صاحب کے گھر پر چلی جایا کرو۔ وہ تمہیں انگلش پڑھا دیں گے۔ دراصل اختر صاحب کو اپنے شاگردوں سے بے پناہ محبت تھی، وہ ان کے اندر کی صلاحیتوں کو جلا دے کر ان کی شخصیت کی تعمیر کرتے تھے۔ جس نے بھی ان سے تعلیم حاصل کی ہے وہ شعوری یا لاشعوری طور پر ان سے ضرور متاثر ہوا ہے۔ اختر صاحب بہت ہی پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بڑے باکردار اور نیک خصلت شخص تھے بہرحال دوسرے دن سے میں اور مسعودہ پھول نے اختر صاحب کے گھر جا کر انگلش پڑھنا شروع کر دیا (اختر صاحب انگلش کے اسکالر بھی تھے انہوں نے انگلش آنرز میں اپنے زمانے میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی) اب میں محسوس کرتی ہوں کہ کالج میں کئی گھنٹے تک پڑھانے کے بعد گھر آ کر آرام کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے۔ مگر وہ آرام کے وقت ہم لوگوں کو بہت ہی پیار سے پڑھاتے۔ ہماری ہمت افزائی کرتے۔ میں اس عنایت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی

تعلیم کے دوران تفریحی پروگرام بھی بنائے جاتے۔ ایک بار ہم لوگ پکنک منانے کے لئے منیر شریف گئے۔ کئی روز پہلے سے اہتمام شروع ہو گیا۔ منیر شریف کی درگاہ پر فاتحہ خوانی کے بعد مطیع الرحمٰن صاحب نے تاریخی پس منظر بتاتے ہوئے سیر کرائی۔ سیر کے بعد کھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مہ جبیں ناز نے ناریل کی برفی بنائی تھی اس کی تعریفیں ہوئیں۔ سلطانہ حسین نے شاہی ٹکڑے بنائے اس پر بھی واہ واہ کی گئی۔ پھر کباب کی باری آئی لوگوں نے بہت زیادہ پسند کیا۔ علامہ چچا نے تو قصیدہ خوانی شروع کر دی۔ پھر کہا، حیرت ہے اس لڑکی نے کیسے اتنا لذیذ کباب بنایا۔ اسے تو کھانا پکانا بالکل ہی نہیں آتا ہے۔ اختر صاحب نے میری پشت پناہی کرتے ہوئے کہا جمیل بھائی! آپ جیجیہ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیں۔" لہٰذا اس کباب کے طفیل میرے سب گناہ معاف کئے گئے اور ڈگری ضبط کرنے کی دھمکی بھی واپس لی گئی۔ پھر چائے کا دور شروع ہوا۔ چائے بنانے کا عہدہ بدر النساء کو ملا اور پیالیوں میں شکر ڈال کر چائے پیش کرنے کی ذمہ داری میرے سپرد ہوئی۔ میں نے اختر صاحب کے سامنے چائے پیش کی۔ ایک گھونٹ پینے کے بعد منہ بنا کر کہا شکر لاؤ میں نے ایک چمچہ شکر پیالی میں ڈال دی پھر شکر لانے کا حکم ملا۔ میں نے کہا، "سر! آپ چائے پیتے ہیں یا حکیم صاحب کا لعوق" زوردار قہقہہ لگا کر کہا جی آپ کی طرح جوشاندہ نہیں پیتا ہوں"۔

برسات کے موسم میں جب زوردار بارش ہوتی تو کلاس کو مخاطب کر کے کہتے "کیا بدذوقی ہے۔ ایسا خوشگوار موسم ہے اس میں نہ چائے، نہ پکوڑے اور نہ شعر خوانی، کتابیں بند کریں۔ پھر ہیرا لعل کو آواز دی جاتی۔ ہیرا لعل ان کا چہیتا چپراسی اندر آتا۔ اسے چائے تیار کرنے کا حکم دیتے۔ پھر بزم مشاعرہ منعقد ہو جاتی۔ خوب داد دی جاتی، ساتھ ہی سب چائے بھی پیتے۔ اس کے بعد بہت ہی پیار سے ہیرا لعل کو کچھ روپے دیتے ہوئے کہتے جاؤ کچھ کھا پی لو۔ اب کون ایسی شفقت کرتا ہوگا۔ شاید وہ بھی اختر صاحب کی یاد میں ہم لوگوں کی طرح آنسو بہا رہا ہوگا۔

پلک جھپکتے دو سال کا عرصہ گزر گیا ہم لوگوں نے آنرز کے ساتھ بی۔ اے پاس کر لیا۔ اس کے بعد کئی لڑکیوں کی شادی ہو گئی کچھ نے تعلیم ترک کر دی اور کچھ نے جاری رکھی۔ اب تک تو بچپنا اور لاابالی پن تھا مگر ایم۔ اے میں داخلہ لینے کے بعد ہم لوگ سنجیدگی کے ساتھ پڑھائی میں لگ گئے۔ علم و فن کے خزانے سے زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ علامہ چچا اور اختر صاحب کی ذاتی لائبریری ہر وقت ہم لوگوں کے لئے کھلی رہتی۔ مجھے تو سہیل بھائی (سہیل عظیم آبادی) کی کتابوں سے بھی فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ ان کے پاس بہت سی نادر اور نایاب کتابیں تھیں۔

ایم اے میں ڈراما اختر صاحب پڑھاتے تھے۔ ڈراموں کی ابتدا و ارتقا پر لیکچر دینے کے بعد لڑکوں کو حکم دیا کہ کل سمینار لائبریری سے اندر سبھا نکال کر لائیں گے۔ بہر حال اندر سبھا لائی گئی۔ میں نے کہا، یہی اندر سبھا ہے۔ اس کے لئے اتنا شور ہو رہا تھا۔ یہ تو قاعدہ بغدادی ہے۔"

"جی ہاں یہ قاعدہ بغدادی ہی ہے۔ سمجھ گئیں آپ۔ ہم لوگوں کے برجستہ جملوں سے بہت محظوظ ہوا کرتے۔

ایم اے پاس کرنے کے بعد اختر صاحب نے مجھے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا مشورہ دیا مگر مشکل یہ تھی کہ میرے شوہر پاکستانی تھے۔ اور مجھے پاکستان آنا تھا اس لئے میں ان کے مشورہ کو قبول نہیں کر سکی۔ مگر اتفاق ایسا ہوا کہ میرے شوہر کا تبادلہ مشرقی پاکستان کے دیہی علاقہ میں ہوگیا۔ جہاں میرے رہنے کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکا اس لئے میں کئی سال تک پاکستان نہیں آ سکی۔ یہ زمانہ میری زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ان دنوں ابا جان بہار کے وزیر قانون تھے اور ان کا بنگلہ اختر صاحب کے کوارٹر سے بہت قریب تھا۔ اکثر شام کے وقت میں ان کے یہاں چلی جاتی اور ان سے اکتساب علم کرتی۔ کبھی اختر صاحب ہم لوگوں کے یہاں آجاتے۔ پھر ابا جان کے ساتھ نہایت ہی شگفتہ باتیں ہوتیں۔ میرا اسپیشل پیپر "دبستان بہار کی شاعری" تھا۔ لہٰذا زیادہ تر اسی موضوع پر گفتگو ہوتی۔ انہوں نے مجھے اپنی کتاب "بہار میں اردو زبان کا ارتقا" نہایت ہی خلوص کے ساتھ عنایت کی تھی مگر افسوس کہ وہ قیمتی تحفہ ضائع ہوگیا۔ انہی دنوں رانچی کالج میں شعبہ اردو میں ایک جگہ خالی ہوئی اور پبلک سروس کمیشن سے میرا انتخاب ہوگیا۔

ایک بار میں پٹنہ آئی ہوئی تھی۔ پرانی یاد تازہ کرنے کے لئے پٹنہ یونیورسٹی گئی۔ پہلے جمیل صاحب کا روم تھا۔ وہ حسب عادت آنکھیں بند کئے لیکچر دے رہے تھے۔ میں خموشی سے جاکر ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ جب انہوں نے آنکھیں کھولیں اور مجھ پر ان کی نگاہ پڑی تو کہا ع

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

میں نے جواب میں کہا ع

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

علامہ چچا نے کہا "بہت خوب، بہت خوب" پھر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کیا۔ نہایت ہی شفقت سے خیریت دریافت کی۔ میری آواز اختر صاحب کے روم میں جا رہی تھی وہاں سے دو لڑکیاں نکل کر آئیں۔ اور مجھ سے لپٹ گئیں۔ وہ دونوں رانچی ویمنس کالج سے بی اے کرنے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی میں ایم اے کی طالبات تھیں۔ میں ان کے ساتھ اختر صاحب کے روم میں گئی۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ جمیلہ! کبھی تم نے بھی میری اس طرح تعریفیں کی ہیں جس طرح کہ یہ لڑکیاں تمہاری تعریف کرتی ہیں۔ یہ تو تمہاری تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی ہیں۔ میں نے کہا "سر! اگر یہ لڑکیاں میری تعریف کرتی ہیں تو دراصل آپ لوگوں کی تعریف کرتی ہیں۔ اس لئے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ آپ ہی لوگوں کا بخشا ہوا ہے۔" اختر صاحب اپنے شاگردوں کو اپنی تخلیق کہتے تھے وہ اکثر کہا کرتے "تخلیق حیات تو ہر ذی روح کرتے ہیں تخلیق فن مشکل ہے۔ اور آپ سب میرے فن کی تخلیق ہیں۔" اختر صاحب جس طرح اپنے شاگردوں کی کامیابی پر خوش ہوتے تھے وہیں اپنے استادوں کی عزت و توقیر بھی کرتے تھے۔ ایک بار مجھ سے انہوں نے ایک واقعہ یوں بیان کیا۔ ایک صاحب نے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں داخلہ لیا۔ ان کی ادبی صلاحیتیں طالب علمی ہی کے زمانہ میں منظر عام پر آچکی تھی۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے فرمایا۔ جناب

میں صرف آپ کے لکچر سننے کے لئے یہاں آیا ہوں ورنہ میری نظر میں نہ تو بیدل صاحب (عبدالمنان بیدل عظیم آبادی) کی کوئی وقعت ہے اور نہ حافظ صاحب (حافظ شمس الدین منیری) کی۔ میں نے ان سے کہا عزیزم اگر ایسی بات ہے تو آپ ابھی اس کلاس سے تشریف لے جائیں۔ اس لئے کہ بیدل صاحب اور حافظ صاحب میرے استاد ہیں، میں جو کچھ بھی ہوں وہ اپنے استادوں کے فیض سے ہوں"۔ اس واقعہ سے اختر صاحب کی بڑائی اور عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۶۵ء میں پاک و ہند کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس کے نتیجہ میں کافی دنوں تک دونوں کے سفارتی تعلقات ختم ہو گئے۔ میں ان ناسازگار حالات کو دیکھتے ہوئے ۱۹۶۶ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئی۔ یہاں آتے وقت جب میں اختر صاحب سے ملنے گئی تو وہ مجھے افسردہ دیکھ کر بہت دیر تک تسلی دیتے رہے۔ آخر میں یہ کہا "جاؤ وہاں تمہارا مستقبل ہے، تمہارے بچے اسلامی معاشرہ میں پروان چڑھیں گے۔"

ہر سال میں پاکستانی پاسپورٹ پر انڈیا جاتی رہی۔ اختر صاحب سے میری آخری ملاقات ۱۹۶۹ء میں ہوئی۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان کا حادثہ عظیم رونما ہوا۔ بمشکل تمام میں جون ۱۹۷۲ء میں پٹنہ پہنچی۔ جس دن میں پٹنہ گئی اس کے دوسرے دن اختر صاحب بغرض علاج کلکتہ روانہ ہو گئے۔ مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں نے اپنے رنج و غم کا اظہار علامہ چچا سے کیا۔ انہوں نے کہا "بیٹا ان سے ملاقات نہ ہونے کا یقینی تم کو بہت رنج ہوگا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہتر ہوا۔ اس لئے کہ تمہارے خیال میں تو وہی ہنستے بولتے قہقہے لگاتے زندگی سے بھرپور اختر ہیں"۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اختر صاحب نہ خود کبھی مایوس ہوئے اور نہ کسی کو مایوس ہونے دیتے۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر انسان رنج و غم کو بھول جاتا تھا۔

قریب تین ماہ انڈیا میں قیام کرنے کے بعد ہم لوگ بھی دوسرے تباہ حال مشرقی پاکستانیوں کی طرح کھٹمنڈو اور بنکاک ہوتے ہوئے کراچی آ گئے۔ جب میں علامہ چچا سے رخصت ہونے لگی تو وہ مجھ سے زیادہ مضمحل ہو رہے تھے۔ خدا حافظ کہنے کے بعد کہا "بیٹا ہم لوگ تو چراغ سحری ہیں کسی وقت بھی گل ہو سکتے ہیں۔ پکے آم کے مانند زندگی کی ڈال پر لٹک رہے ہیں ہوا کا ایک تھپیڑا گرا دیگا۔ تم وہاں ہم لوگوں کے رخصت ہونے کی خبر سن لو گی۔"

اپریل ۱۹۷۷ء کی ۱۵ یا ۱۶ تاریخ ہوگی میں اپنی خالہ سے ملنے اسٹیٹ بینک کے فلیٹ میں گئی تو انہوں نے بتایا کہ پٹنہ میں روحی کے بڑے بہنوئی اختر اورینوی صاحب کا ۳۱ مارچ کو انتقال ہو گیا۔ یہ سنکر کچھ دیر کے لئے میں چکرا گئی۔ علامہ چچا کے جملے کانوں میں گونجنے لگے پھر آہستہ آہستہ ماضی کے دریچے کھلنے لگے۔ ابھی تو اختر صاحب کا غم کم بھی نہیں ہوا تھا کہ مجیبی نے بتایا کہ اختر صاحب ... کی تجہیز و تکفین کے وقت حرکت قلب بند ہو جانے سے ہمارے دوسرے استاد جناب صدر الدین صاحب بھی اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ یہ سنکر دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپکنے لگے۔ اپنے جگر لخت لخت کو جوڑنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ پٹنہ سے خبر آئی کہ میرے سسر سالی ان سید ظفر حسین صاحب جو کہ میرے پھوپھا بھی تھے ہم لوگوں سے جدا ہو گئے۔ کیسے کیسے گنج ہائے گراں مایہ خاک میں مل گئے۔ یکے بعد دیگرے کتنے دکھوں کو برداشت کروں۔ کس کس کی جدائی کے صدموں کو سہوں۔ غالب نے شاید میرے ہی لئے کہا تھا ؎

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

سید ابوالفتح سہمد
معاون پروفیسر شعبہ اردو
جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

ڈاکٹر سید اختر اورینوی

پٹنہ (بھارت) سے یہ اندوہناک خبر ملی ہے کہ اردو کے مشہور و معروف ادیب پروفیسر سید اختر احمد اختر اورینوی نے ۳۱ مارچ ۷۷ء کو بعارضہ فالج اپنے ذاتی مکان پٹنہ میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

ع آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

موصوف برصغیر پاک و ہند کے چوٹی کے افسانہ نگار، شاعر، محقق اور نقاد کی حیثیت سے ایک جانی پہچانی شخصیت تھے۔ آپ کا تحقیقی مقالہ جس پر آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی "صوبہ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اس گراں پایہ تالیف نے آپ کی شہرت پاک و ہند کے گوشہ گوشہ تک پہنچا دی ہے۔ آپ نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان و ادب کی پرورش میں صوبہ بہار نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور دکن کی طرح بہار میں بھی زبان کی نشوونما اور فروغ میں صوفیائے بہار نے اہم کردار ادا کئے ہیں۔ اس ضمن میں حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہ کے ملفوظات، قالنامے، اشعار، گنج مندرے، نسخے اور نقش بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے جانشین مولانا مظفر الدین بلخی کی زبان مبارک سے بھی بعض جملے اور اشعار ایسے نکلے ہیں جن سے اردو زبان کے ارتقا پر روشنی پڑتی ہے۔ ؎

بھی تن میں بہت کرتی ہیں سہانی رتیاں جن کے کارن تھے بہت دن سے بنائی گتیاں

لیکن دکن اور شمالی ہند کی طرح صوبہ بہار میں اردو نثر کی کتاب بارھویں صدی سے پہلے نہیں ملتی۔ شاہ ظہور الحق صاحب پھلواروی نے ایک رسالہ "نماز" پر لکھا ہے۔ یہ رسالہ ۱۱۰۰ھ کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کے تین مذہبی رسالے "فضائل رمضان"، "فیض عام" اور "کسب النبی" بھی ملتے ہیں۔ اور خانقاہ عمادیہ، منگل تالاب پٹنہ سٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ بہار کی ایک اور خصوصیت بھی قابل ذکر ہے، اس نے عام بول چال کی زبان کو علمی و ادبی زبان سے بالکل علیحدہ رکھا۔ اہل بہار روزمرہ کی زبان میں تو بے شک مگدھی زبان کا استعمال کر لیتے ہیں، لیکن ان کی ادبی زبان میں مگدھی کو دخل نہیں رہا ہے۔ سید عماد الدین حماد اور غلام نقش بند، سجاد، گیارھویں اور بارھویں صدی کے شعرا ہیں۔ جن کی زبان خالص اور سلیس ہے۔ برخلاف اس کے دکن میں، تامل اور تلنگی وغیرہ زبانوں نے دکنی شعرا پر اپنے پورے اثرات ڈالے ہیں۔ اور فراقی، خوشی، نصرتی، روحی وغیرہ کے کلام میں ان زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں۔

وہ ان کا بلند و بالا قد، گٹھا ہوا جسم، بیضوی چہرہ، قدرے لمبی اور اونچی ناک، بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، جو سیاہ عینک کی اوٹ سے

بھی مخاطب کو مسحور کر لیتی تھیں۔ خوش وضع، خوش لباس اور خوش بیان۔ باتیں کرتے وقت بلا مبالغہ منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ سردیوں میں سیاہ سرج کی شیروانی، کبھی کوٹ پتلون اور گرمیوں میں ململ کا سفید براق کرتا اور پائجامہ زیب تن کرتے تھے۔ کشادہ، بلند اور روشن جبیں ان کی بلند حوصلگی اور وسیع القلبی کی غماز تھی۔ پروفیسر اختر اورینوی مرحوم کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف اور افتخار مجھے بھی حاصل ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا پورا نام سید اختر احمد اور اختر تخلص تھا اور اورینوی، وطنی نسبت کے سبب نام کا جزو بن گیا۔ اختر صاحب کی ولادت قصبہ کاکو ضلع گیا (بہار) میں ۱۹ اگست ۱۹۱۰ء کو ہوئی۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید وزارت حسین تھا۔ آپ نقوی زیدی خاندان سے تھے۔ آپ کے جدِ امجد سید احمد جاجنیری، بہار کے اولین فاتح، اختیار الدین بن محمد بختیار خلجی کے لشکر میں رسالدار تھے۔

اختر صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والدین کے زیرِ سایہ کٹر مذہبی ماحول میں ہوئی۔ بچپن میں آپ نے قرآن پاک، فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی تعلیم مونگیر ہائی اسکول میں حاصل کی۔ ایف۔ ایس۔ سی پاس کر کے میڈیکل کالج پٹنہ میں داخلہ لیا۔ دو سال کامیابی سے طے کر چکے تھے کہ سل کا پہلا حملہ ہوا۔ ہسپتال میں داخل ہوئے اور دو ماہ کے علاج کے بعد روبصحت ہو گئے، لیکن میڈیکل کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور "نیم حکیم" ہو کر رہ گئے۔ صحت کی مزید بحالی اور سکون کی خاطر وہ اپنی ددھیال اورین چلے آئے۔ ان کے دادا اور والد دونوں اس گاؤں کے بڑے کاشتکاروں میں شمار ہوتے تھے۔ اختر صاحب بھی کاشتکار بن گئے، اور اس میں عملی حصہ لینے لگے۔ اس شغل سے ان کی گرتی ہوئی صحت سنبھل گئی اور انہیں کسانوں اور مزدوروں کی پرمشقت زندگی کا بھی خاصا تجربہ ہو گیا جو بعد میں ان کے افسانوں میں کام آیا۔ پھر اپنے قریبی رشتہ داروں سے ملنے ارول چلے گئے جو ساحل سون پر ایک پر فضا مقام ہے، اور جس کے بالکل قریب سے دریائے گنگا بہتا ہے۔ اور آم، لیچی اور شیشم کے خوبصورت درخت دعوتِ نظر دیتے ہیں۔

"پام ولا" اور "نیو ہوٹل" کے حسین مکینوں کی دلکش باتیں فردوسِ گوش بنی ہوئی تھیں۔ کیوپڈ بھی کہیں قریب ہی کسی کنج میں اپنا تیر و کمان لئے تاک میں بیٹھا تھا۔ اختر صاحب اور شکیلہ بانو اس کی زد میں آ گئے۔ یہ "حادثۂ لذیذ" ۳۳ء میں رونما ہوا۔ اسی دور کی اختر صاحب کی ایک مشہور غزل کے یہ چند شعر یاد رہ گئے ہیں جو پیشِ خدمت ہیں۔

پہلے تو بہت نادان تھے وہ، اب ان کی شرارت کیا کہئے — اس شوخ ادا کی باتوں میں، جملوں کی حلاوت کیا کہئے

تھم تھم کے وہ رونا آنکھوں کا، اور زخمِ جگر کا ہنس دینا — آنا وہ تصور میں اس کا، اور چپکے سے رخصت کیا کہئے

اختر بھی تڑپ اٹھتا ہے تیری چاہت کی کہانی کو سن کر — دکھ درد وہ سب کے سہتا ہے، شاعر کی بھی حالت کیا کہئے

کس قدر پر اثر اور پر کیف غزل ہے۔ شدتِ جذبات اور احساس کا بہاؤ قاری کو انجانے کوہ و صحرا میں لے جاتا ہے۔ مومن خاں مومن کی غزل بے ساختہ یاد آجاتی ہے جس کا ایک شعر ہے ؎

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اسی طرح اختر صاحب کی اکثر غزلوں اور نظموں میں "آپ بیتی" کا لطف اور کیف سمویا ہوا ہے۔

ارول نے اختر صاحب کو حیاتِ نو بخشی اور وہ تازہ دم ہو کر پھر اپنی نامکمل تعلیم کو مکمل کرنے کی خاطر پٹنہ آ گئے، اور پٹنہ کالج میں بی اے (آنرز انگریزی) میں داخل ہو گئے اور بی اے میں اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ آنرز کا آخری پرچہ دے رہے تھے کہ پھر "لالہ ری" شروع ہو گئی، لیکن انہوں نے امتحانات ختم ہی کر کے دم لیا۔ جب طبیعت زیادہ بگڑی تو انہیں ڈاکٹروں کے مشورے پر رانچی کے ٹی بی اسپتال اٹکی

میں منتقل کر دیا گیا۔

اس بیماری دل و جگر میں ان کی رفیقۂ حیات اردو کی مشہور افسانہ نگار شکیلہ اختر نے حقِ رفاقت بڑی خوبی اور تن دہی سے ادا کیا۔ انہوں نے اختر صاحب کی اس خطرناک حالت میں ان کی دل جوئی اور تیمارداری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ہسپتال کی نرسیں بھی ان کی شوہر پرستی اور رضاں تیمارداری کی قائل ہو گئی تھیں۔ اختر صاحب ڈیڑھ سال کے عرصہ تک اٹکی اسپتال میں زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا رہے۔ آخرکار ان کی قوت برداشت، اور مستقل مزاجی کو فتح حاصل ہوئی۔ علالت کے دوران میں بھی ان کا قلم گل کھلاتا رہا اور "کلیاں اور کانٹے" جیسے دلچسپ افسانے تخلیق کرتا رہا۔ یہ افسانے بھی "آپ بیتی" ہی کا دوسرا روپ ہیں۔ ان افسانوں میں اٹکی کے اسپتال کی نرسوں کی چشمکوں، رقابتوں اور دل نوازیوں کے دلچسپ واقعات زینتِ قرطاس ہیں۔ اختر صاحب کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ "پاؤں میں پھول" چھوٹا ناگپور کے آدی باسیوں کے معاشقے اور ان کی زندگیوں کے نشیب و فراز کو بڑی فنکاری اور چابکدستی کے ساتھ افسانوی کردار میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش ہے۔ اختر صاحب کے افسانوں میں بہار کے دیہاتوں کی سادہ زندگیاں، ان کی بولی ٹھولی، طبقاتی کش مکش کی عکاسی، اپنی پوری دلفریبیوں اور دل آویزیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں، جہاں وہ اپنے کرداروں کی نفسیات کو اجاگر کرتے ہیں وہ پڑھنے والے کو مسحور کر لیتی ہے۔ ان کی زبان بھی بہت نکھری ستھری ہے۔ کرشن چندر کی رومانیت اور حقیقت نگاری میں جو حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اس کا پرتو اختر صاحب کے افسانوں میں بھی جا بجا ملتا ہے۔

اٹکی سے واپسی پر جب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے تھے، انہیں پھر اپنی تعلیم کا خیال آیا اور انہوں نے ایک پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی سے اردو ایم اے کے امتحانات دئے، اور ایک بار پھر ممتحنوں سے اپنی صلاحیت اور قابلیت کا لوہا منوا لیا۔ انہیں ایم۔ اے میں فرسٹ کلاس ملا۔ اور بطور انعام سونے کا تمغہ اور دو سو روپے کی کتابیں ملیں۔ اس کے دوسرے سال یعنی ۱۹۴۸ء میں پٹنہ کالج میں اردو کے لیکچرار کی اسامی خالی ہوئی۔ اور قرعۂ فال ان کے نام نکلا۔ اس تقرری کے بعد، بتدریج وہ عزت، شہرت اور شعبہ جاتی ترقی کے مدارج تیزی سے طے کرتے ہوئے، پٹنہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کے معزز عہدہ تک پہنچے اور نیک نامی اور ہر دلعزیزی کے ساتھ، ۲۳ برسوں تک اردو ادب کے گیسو سنوار کر ۱۹۷۱ء میں سبکدوش ہوئے۔ آخری عمر میں وہ اکثر مریض رہتے تھے، اور پھر ایسا وقت بھی آیا کہ وہ بار بستر بن کر رہ گئے۔ زبان گنگ ہو گئی، ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا دشمن ہو گئے۔ فالج کا زبردست حملہ جان لیوا ثابت ہوا اور یہ پروانۂ شمع اردو ۳۱؍ مارچ کو ہمیشہ کے لئے اس پر نثار ہو گیا۔ ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ — شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اختر صاحب کی ساری زندگی موت کی آغوش میں جھولتی رہی، لیکن انہوں نے اپنے موذی مرض سے کبھی شکست نہیں مانی، اور وہ اس شعر پر عمل پیرا رہے کہ

چلا جاتا ہوں ہنستا، کھیلتا موجِ حوادث سے — اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

وہ ایک مردِ مجاہد تھے جو محاذِ زندگی پر ہمیشہ ڈٹے رہے۔ ان کے قدم جادۂ حیات کے پیچ و خم کے باوجود، کبھی نہ ڈگمگائے اور وہ تلخیٔ حیات کو امرت سمجھ کر گھونٹ گھونٹ پیتے رہے۔ اختر صاحب جب اردو کا کلاس لینے لیکچر ہال میں آتے تھے تو ہمیشہ ان کے لبوں پر ایک تبسم خفی مچلتا رہتا تھا۔ وہ طلبا و طالبات سے بڑے شگفتہ انداز میں مخاطب ہوتے اور ان سے نجی اور ادبی معاملات پر تبادلۂ خیالات کرتے۔

(باقی صفحہ ۱۸۶ پر)
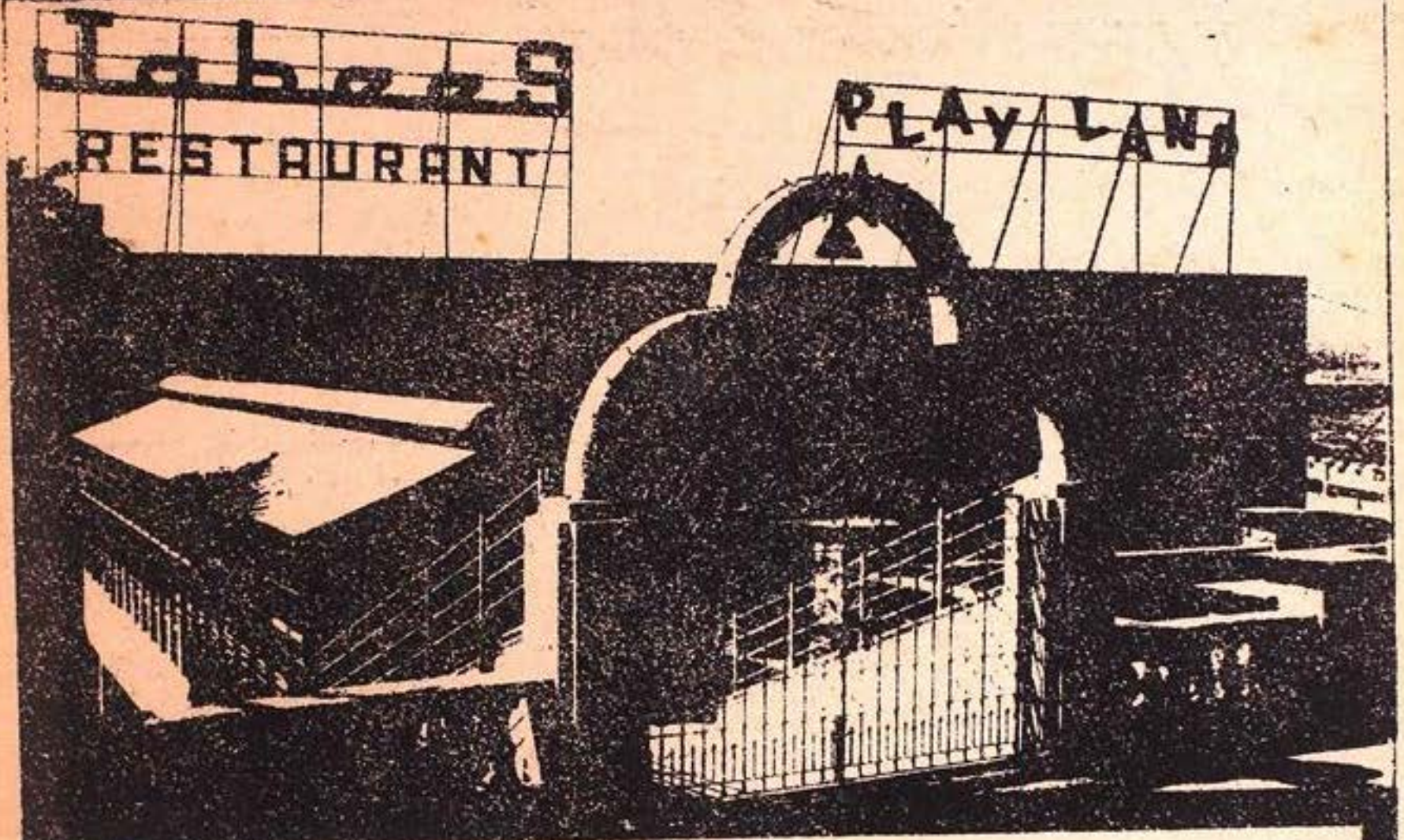
مہر بیورز کراچی
محمد ظفیر الحسن

آہ - اختر اورینوی

جی میں آتا ہے مرے
پھر کروں اخترؔ یکتا کو یاد
اور بس یاد کئے جاؤں میں

ہاں وہی اخترؔ رخشندۂ افلاکِ کمال
دانش و علم کے مینار بلند
فن افسانہ نگاری کے اچھوتے کردار
ایک تنقید نگار
خضرِ رہ، عرصۂ تحقیق و تفحص کے لئے
جن سے روشن ہیں دیئے
اور جو خود آج جُدا ہیں ہم سے

آئی جس وقت خبر
بزم انجم میں ضیا بار ہوئے آج اخترؔ
ہو کے یکجا اٹھے ہم سوگ منانے کے لئے
اور سب پہونچے "کتب خانۂ مرزا بیدلؔ"
پھر یہ طے پایا کہ ہمدردی کا رسمی پیغام
محترمہ شکیلہ کو یہ بھیجیں کہ "یہی ہے انجام"
صبر کیجیے ۔ کہ نہیں چارہ کوئی اس کے سوا
"موت کا ایک دن معین ہے"
سخت مجبور ہے یہاں انسان

"کل من علیہا فان"
ہے تقاضائے کائنات یہی
پوچھئے سچ تو ہے حیات یہی

ان کی عادت تھی کہ جب درس میں ہوتے مشغول
ان کے لہجے سے بکھرتے موتی
شعر سنتے تھے سناتے خود بھی
زعفران زار بناتے محفل
اور وہ طرز تکلّم کہ جسے
جو بھی سن لیتا تھا
ہو جاتا تھا شیدا ان کا
مل کے کوئی نہ ہوا ان سے جدا
ایک تصویر محاسن تھے تمام
ان کی عظمت کو سلام
مغفرت ان کی ہو اے ربّ عُلا۔ آمین

ان کا چہرہ تھا کہ ہنستا ہوا پھول
ان کی آنکھوں میں تھی تابانی عزم
تھی جبیں جیسے چمکتی ہوئی پیشانی مہہ
کیا خبر تھی کہ تہہ خاک وہ ڈھلنے کی طرح
آدمیت کا ٹھکانا ہوگا
عمر بھر سوگ منانا ہوگا۔ . . سوگ منانا ہوگا

پروفیسر اختر اورینوی

عظیم عظیم آبادی کی شاعری پر ایک نظر

میرے نالوں سے یقیں ہے دلِ احباب ہلیں   میری آہوں سے ہے محفل کو چراغاں ہونا   (عظیم)

اردو شاعری کا موجودہ دور، دورِ انقلاب ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے حیاتِ نو کے پیغام بداماں نغمے فردوس گوش ہو رہے ہیں۔ حالی کی پراثر مرثیہ خوانی کے بعد اقبال نے ذہنی و نظری انقلاب کا گیت گایا۔ اور چکبست اور جوش نے رجز پڑھے اور دھوم دھام سے پڑھے۔ بہار نے بھی اس دورِ احیاء میں ثبوتِ زندگی پیش کیا۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم (سابق صدر شعبۂ عربی، فارسی و اردو۔ پٹنہ کالج) کی شاعری بالکل عصری شاعری ہے اور اس کی نبضوں میں انقلاب کا لہو گرم جولاں ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ ادب و شعر کے شہسواروں کے ساتھ شاعری کی رزمگاہ میں عصرِ وسطیٰ کے ناٹیوں کی طرح "صدائے خاموش" کا نقاب ڈال کر اترے ہیں۔

علامہ عظیم نے کبھی کاوشِ سخن نہیں کی۔ آپ فرماتے ہیں کہ "میں شاعر نہیں ہوں۔ رات کی تنہائیوں میں دل کے جذبات صورت اختیار کر لیتے ہیں اور شعر کی شکل پیدا ہو جاتی ہے"۔ علامہ نے آج تک مجلسوں میں شعر نہیں پڑھے اور نہ کبھی خود سے آپ نے ادبی صحیفوں میں اپنی چیزیں بھیجیں۔ پروفیسر محمد مسلم مسلم عظیم آبادی نے آپ کا کلام "صدائے خاموش" کے نام سے جامعہ میں شائع کرایا۔ اور کبھی کبھی علامہ کے شاگردوں نے آپ کا کلام آپ سے حاصل کر کے دنیائے شعر و سخن کے سامنے پیش کر دیا۔ بعد میں آپ کے صاحبزادے کلیم الدین احمد نے علامہ کے کلام کا مجموعہ "گل نغمہ" کے نام سے شائع کیا۔

اردو ادب و شعر کے نقادوں نے اکثر شعر و فلسفہ کے متعلق غلط بحث پیدا کر دیا ہے۔ ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر، جو رازہائے حیات کو عریاں کرتا ہے، عام نظروں میں صرف ایک فلسفی کی حیثیت رکھتا ہے، حالانکہ شعر و فلسفہ میں بنیادی فرقِ مشرقین ہے۔ امورِ فلسفہ بھی نظم کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن وہ شعر نہیں۔ اور دامانِ شعر حکمتوں سے لبریز کیا جا سکتا ہے۔ اور اس حال میں بھی شعر، شعر باقی رہ سکتے ہیں۔

ایک فلسفی اخذِ نتائج میں اصولِ استقراء کو راہبر بناتا ہے۔ اور ایک شاعر جذبی طریقہ سے نتیجہ تک پہنچتا ہے۔ ایک شاعر حکمت کی باتیں بتائے گا، لیکن اس کا پیغام دماغ کے لئے نہیں دل کے لئے ہوتا ہے۔ وہ منطق کے ذریعہ مخاطب کو قائل نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے دل کے بربط چھیڑ کر دوسرے دلوں کو بھی اسی نغمہ کی لے پر نچاتا ہے۔ شاعری موسیقی ہے۔ وہ صرف ایسے دلوں کو متاثر کر سکتی ہے جو اثر قبول کر لینے کے لئے آغوش کھولے ہوئے ہوں۔ شعر کا تعلق شعور و ادراک سے براہِ راست نہیں بلکہ یہ وہ نغمہ ہے، جو تحت الشعوری پردے سے نکلتا ہے۔ فلسفہ، علت و معلول کے جال بچھاتا ہے اور شاعری ایک دیوانہ جست و خیز کے بعد علت العلل کے چہرے سے نقاب اٹھا دیتی ہے۔

شاعری مذہب ہے۔ لہٰذا اس میں ایمان بالغیب کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ شاعری کو بھی قلبِ مومن کی ضرورت ہے جو "بلیٰ" کہنے کے لئے

لب کشا ہو، اگر کوئی شاعر دل کو نہیں، بلکہ دماغ کو مخاطب کرتا ہے تو وہ آئینہ کو چھوڑ کر سنگ خارا میں اپنی صورت دیکھنے کی حماقت کرتا ہے۔
علامہ عظیم، علامہ اقبال کی طرح اسرار حیات کو منظر عام پر لاتے ہیں ان کے ہاں بھی حکمت کی باتیں زبان شعر پر جاری ہیں، مگر یہ انداز شاعرانہ، فلسفہ و شاعری میں مطمح نظر کا نہیں اصول کار کا فرق ہے۔ شاعری اس وقت تک بلند و ارفع نہیں ہو سکتی جب تک وہ زندگی کے اعلیٰ ترین تخیل کی ہم رکاب نہ ہو فرماتے ہیں:۔

تری قسمت میں ہے سرِّ خفی کا رازداں ہونا — تو مشت خاک ہے لیکن ہے تجھکو اک جہاں ہونا
نہیں تو آشنا اپنی حقیقت سے ہے اے غافل — تو وہ ذرہ ہے جس کو ایک دن ہے آسماں ہونا
تجھی کو اے اسیر دام آب و گل بقا بھی ہے — تجھی کو زور والوں سے یہ کہنا ہے خدا بھی ہے

شاعر "انسانیت کے امکانات" کے فلسفیانہ موضوع پر گفتگو کرتا ہے۔ مگر فطرتِ شاعرانہ کا تقاضا یہ تھا کہ درمیانی کڑیوں کو چھوڑ کر سر منزل ہی پہنچ جائے۔ "مشتِ خاک" کا ایک جہاں ہو جانا دماغ کے قبول کرنے کی بات نہیں بلکہ یہ ایک عقیدہ ہے جس پر دل ایمان لا سکتا ہے۔
عظیم کی شاعری کی رفعت کا راز اس کی زندگی سے ہم عنانی ہے۔ ان کی شاعری پیچھے واردات ہیں۔ اس میں زندگی کا لہو ہے۔ شاعر زندگی کے ہیجانات سے متاثر ہوتا ہے اور ان خارجی اثرات کو اپنے خون دل میں رنگ کر منعکس کرتا ہے۔ علامہ کی شاعری میں انکشاف حقیقت کے ساتھ ارتقائے خیال بھی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

غلط غلط کہ بقا ہے نمود ہستی کو — بجا کہ جور بہت صرصر و خزاں کے ہوئے
غلط کہ نشو و نما اس جہاں کی دائم ہے — بجا کہ ظلم بہت مرگ ناگہاں کے ہوئے
یہ کس زمانہ کا بدلہ فلک تھا ہم سے کہ ہم — حریف کب ترے دور ستم نشاں کے ہوئے
ہم اور چرخ کا احسان زندگی کے لئے — وہ اور ہوں گے جو منت کش آسماں کے ہوئے
یہ کیا طلسم ہے، کیسی کشش ہے یا اللہ — کوئی یہاں کا نہ ٹھہرا، سبھی وہاں کے ہوئے

یہ نظم ۱۹۰۲ء نومبر کے بلائے آسمانی طاعون سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ علامہ کی شاعری کا یہ وہ دور ہے جب روح حیرت خانۂ عالم میں سراسر سوال و اضطراب رہتی ہے۔ اس نظم سے روح شاعری کی بے تابی و بے اطمینانی صاف ظاہر ہو رہی ہے۔ ہر حساس فرد پر یہ نفسی بے چینی کا دور آتا ہے اور شاعر پر تو قیامت ہی آجاتی ہے۔ اس محشر بداماں زمانہ کے گذر جانے کے بعد کامیاب روحیں اسرار حیات سے واقف ہونے لگتی ہیں اور ناکامیاب و نامراد ارواح کی کشتی اسی سیلاب میں کسی خوفناک چٹان سے پاش پاش ہو جاتی ہے۔ ہمارے شاعر کی کشتی اس دور تلاطم سے سلامت نکل کر ساحل پر آلگی تاکہ ایک وسیع تر سفر کے لئے پھر اپنے بادبان اٹھائے۔ سنئے:۔

نہیں بیکار کوئی قطرۂ بارانِ وجود — بڑھتے بڑھتے اسی قطرے کو ہے طوفاں ہونا
میری تکوین ہے عالم میں مثال ذرہ — لیکن اس ذرّے کو ہے مہر درخشاں ہونا
میں حقیقت میں وہ طاقت ہوں کہ اس گیتی کا — منحصر مجھ پہ ہے صحرا کم گلستاں ہونا
مجھ سے ہے پیدا تپش شوق میں عالم سوزی — مجھ میں پوشیدہ ہر اک درد کا درماں ہونا
میری تخلیق میں ہے سرّ خلافت پنہاں — میری تقدیر میں ہے حاکم دوراں ہونا

زندگی عزم تسلط ہے بہ سعیِ ذاتی — موت ہے غیر کا شرمندۂ احساں ہونا
سعیِ پیہم میں بصد شوق گذارے اک عمر — تب میسّر ہو کفِ خاک کو انساں ہونا

کائنات پر نظر ڈالیے، ہر طرف زندگی اظہار کے نئے نئے طریقے ڈھونڈتی ہے۔ ہر جانب ارتقا ہے، انقلاب ہے، تجدید ہے۔ آسمان کی طرف دیکھیے۔ ہزاروں ستارے روز ٹوٹ ٹوٹ کر جو فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور نہ جانے کتنے آفتاب تازہ کی روز تخلیق ہوتی رہتی ہے۔ زمین کی طرف نگاہیں واپس لائیے۔ فلک پیما پہاڑ گردشِ زمانہ کی چکّی میں پس کر رفتہ رفتہ مٹی میں مل جاتے ہیں اور سمندر کی تہہ کبھی ہمالہ کی سربفلک چوٹی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

بپا کرتی ہیں ہر ساعت نیا ہنگامۂ عالم — دکھاتی ہیں بہار تازہ ہر دم شوخیاں اس کی

عظیم الشان ہرے بھرے جنگل شدت و سختیٔ روزگار سے وسیع کوئلے کی کان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اسی اندھیاری میں محل و قصور کے لئے الماس شب چراغ پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کے جمود کا مظہر، یہ کوئلے کی کانیں، برق و ابخرات کا قالب بدل کر تگاپوئے حیات کا تماشہ دکھلاتی ہیں۔ اور کبھی زندگی لالہ و گل کی صورت میں دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔

قومیں پیدا ہوتی اور مٹتی ہیں۔ اور پھر نئی نسل سر نکالتی ہے۔ مصر کے فراعنہ کا طنطنہ، فغفورِ چین کی ہیبت، روم اور قرطاجنہ کی عظمت و عسکریت، ہند کی شوکت و عزت، یونان کا علم و حکمت، عرب کی معجز نما ترقی و علو، یہ سب زندگی، پراسرار زندگی کے مظاہرِ عجیبہ ہیں۔

خزاں و بہار، لیل و نہار، موت و حیات، زندگی کی دو کروٹیں ہیں۔ زندگی ایک پرجوش قوت، ایک ناقابلِ تسخیر حرکت ہے۔ ہر سو تعمیر ہے اور ہر جانب تخریب۔ "فرد" بھی زندگی کی اسی تعمیر و تخریب میں مبتلا ہے۔

مگر انسان میں فطرۃ اللہ کی جھلک بھی ہے۔ یہ وہ ذرہ ہے، جس میں بجلیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ اگر وہ بروئے کار آجائیں تو تخریبِ کہنہ و تعمیرِ نو کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

ہمارے شاعر کا دل اس رمزِ حیات سے وجدانی طور پر آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور جب طلسمِ حیات کی کنجی سکینتِ بنی اسرائیل کی طرح اسے مل جاتی ہے تو وہ یقین و عرفان سے سرشار ہو کر گانے لگتا ہے۔ شاعر کا دل زندگی کے دل کی دھڑکن کے ساتھ دھڑکنے لگتا ہے۔ اسی ہم آہنگی کا ظہور علامہ عظیم کی شاعری میں بھی ہے۔

شاعر انسان کو "نمائندۂ اسرارِ حیات" سمجھتا ہے اور خلافتِ الٰہیہ کا وارث۔ ملاحظہ ہو:-

میں ہوں بالفعل نمائندۂ اسرارِ حیات — بالقوہ مجھ میں نہاں خازنِ امکاں ہونا
میری تخلیق میں ہے سرِّ خلافت پنہاں — میری تقدیر میں ہے حاکمِ دوراں ہونا

علامہ، انسانی ترقی کی کوئی حد مقرر نہیں کرتے۔ انسان صرف "نمائندہ اسرارِ حیات" نہیں بلکہ وہ "خازنِ امکاں" بھی ہے۔ انسانی ارتقا کے امکانات جولانگاہِ حیات سے بھی پرے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں:-

زندگی عزم تسلط ہے بہ سعیِ ذاتی — موت ہے غیر کا شرمندۂ احساں ہونا
سعیِ پیہم میں بصد شوق گذارے اک عمر — تب میسّر ہو کفِ خاک کو انساں ہونا

نغمئہ دہر میں بیکار کا ہے نام حیات	تو ہے ترپا کی صدا راحت و آرام ابھی
زیست میں مرگ ہے پوشیدہ تو ہے مرگ میں زیست	غور سے دیکھ ذرا گردشِ ایام ابھی

فنا کی گود میں پل کر بنا ہے آشیاں میرا	مری ہستی یہ کہتی ہے زمیں میری زماں میرا

علامہ کی شاعری کے نظام شمسی کا آفتاب بھی نصب العین حیات ہے جس کے گرد دوسرے سیارے گردش کرتے ہیں۔ علامہ عظیم، اقبال گوئٹے اور ہائینے کی طرح نبض شناس حیات ہیں۔ اسرار کے پردۂ رنگین میں پوشیدہ زندگی علامہ کی شاعری کے غرفے سے جھانکتی ہے، صرف یہی نہیں بلکہ اس کے اثر سے خود ہماری روح و دل کی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ اور ان کے عکس میں ہم تلزم حیات کو جوش زن دیکھتے ہیں۔ اپنی تمام ناقابل تسخیر طاقتوں کے ساتھ زندگی کا گرجتا ہوا دھارا ہماری نبضوں سے ہو کر بہنے لگتا ہے ؎

مجھے یہ ہمت مردانہ کہتی ہے کہ "ایسا دل جو قبل از موت ہی مرنے پہ ہو طیار پیدا کر"

شاعری میں درد و سوز کا عنصر ایک بنیادی عنصر ہے۔ ایک شاعر اپنی انفرادی محرومیوں پر آنسو بہاتا ہے اور کبھی زندگی کے مظاہر مختلفہ میں رونے رلانے کا سامان پاتا ہے۔ حیات، خود اپنے دل میں چند ایسے داغ رکھتی ہے، جو اکثر ہرے ہو جاتے ہیں۔ قلب زندگی کا ناسور جب پھوٹ بہتا ہے تو زندگی ایک دل دوز کراہ کے بعد سسکیاں لینے لگتی ہے۔

ایک سچے شاعر کا دل زندگی کے گریہ اور اس کے تبسم سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ علامہ عظیم کی شاعری بھی ایک دکھتی ہوئی رگ ہے، ملاحظہ ہو۔

اہل ملت کے لئے مجھ کو ہے ماتم کرنا	ان کی خاطر ہے مجھے بزم میں گریاں ہونا

مجھے تو رازداروں کی طرح محو خموشی رکھ	دلوں میں دل جلوں کے پھونک دے یارب زباں میری
زباں تو سر سے پہلے کٹ چکی ناخن سلامت ہیں	دلوں میں نیل ڈالیں گی، الٰہی چٹکیاں میری
حباب آسا دریں دریائے ہستی یک نفس دارم	ببیں مایوسی و حرماں کہ ایں ہم در قفس دارم

(نظم تاثیر درد)

لیکن ہمارا شاعر لذت غم سے واقف ہے۔ وہ محرومیوں کی قیمت سے آشنا ہے۔ تباہی و بربادی ایک راز حیات ہے۔ اس میں تطہیر کے علاوہ تخلیق کا موقع بھی ملتا ہے۔ زندگی انسان کے سامنے اپنی ویرانیوں کو پیش کرتی ہے تاکہ انھیں آباد کیا جائے۔ دشت و بیاباں کو گلستاں میں تبدیل کر دینا بندے کا خدا بن جانا ہے۔ سنئے:-

خوشی سے مجھ کو کیا حاصل کہ لذت یاب حسرت ہوں	طرب کی مجھ کو کیا پروا کہ میں محروم عشرت ہوں
میں اک تصویر ہوں گویا زبانِ بے زبانی کی	نہ میں منت کش نالہ نہ مرہونِ سماعت ہوں

مگر.....

علو کے راز، اسرار تنزل مجھ میں پنہاں ہیں	میں اپنی آپ عزت ہوں میں اپنی آپ ذلت ہوں
میں گو اک فرد ہوں، پر نوع ہوں اور سارا عالم ہوں	میں خود دیر و حرم ہوں، میں ہی دوزخ اور جنت ہوں

میں وہ ہوں جو ہو سب کے ساتھ پھر سب سے الگ ٹھہرے　　مجاز عالم ہستی ہوں اور اس کی حقیقت ہوں

حقیقت کے کرشموں سے جو دل مجبور ہوتا ہے　　تو پھر کہہ کر انا الحق دار پر منصور ہوتا ہے

شاعر غم کو بھی کارآمد و موثر سمجھ لینے کے بعد اپنے نفس میں بے پایاں احساس خودی پاتا ہے۔ علامہ کی "تاثیر درد" میں اسی خودی اور امید کے جلوے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

نہ میں گنجینۂ قاروں، نہ میں جم کا دفینہ ہوں　　نہ جس کو ہو فنا ایسا خزانہ ایسی دولت ہوں

علامہ عظیم کی شاعری میں احساس خودی، اعتماد اور امید کے جو نو بہ نو جلوے نظر آتے ہیں وہ پیغام عمل کی پیدائش کا باعث بنتے ہیں۔ سنئے:۔

پھر بہار آئے گی پھر جوش میں سودا ہوگا　　زخم دیرینہ سے پھر خون ٹپکتا ہوگا

ہاتھ کو دست درازی کا پڑے گا چسکا　　پاؤں کو پھر خلش خار کا سودا ہوگا

جھانکتی پھرتی ہے ویرانوں کو پھر آبادی　　پھر چمن بند کوئی انجمن آرا ہوگا

بادِ صرصر نے جو چھوڑے ہیں خزاں کے تنکے　　ڈوبتوں کو انہیں تنکوں کا سہارا ہوگا　　(نوید امید)

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

مٹا اے بادِ صرصر باغ کو لے جا نہیں سکتی　　یہ گل بوٹے ہیں سب میرے اگر ہے باغباں اپنا

ہمارا شاعر دلوں کو آتش امید سے گرمانے کے بعد پرجوش پیغام عمل دیتا ہے۔ شاعر کے پیغام میں تاثیر پیدا کرنے کا سبب اولین تو وہ ازلی درد ہے جس سے دل شاعر آشنا ہو چکا ہے سنئے:۔

درد سے اور تڑپ اے دلِ ناکام ابھی　　سوچتا کیا ہے تو آغاز کا انجام ابھی

اس کی کیا فکر کہ پروانے جلیں گے کہ نہیں　　شمع ساں آپ ہی جلنا ہے ترا کام ابھی

تاثیر پیغام کے دوسرے اسباب جوش، سادگی اور تخیل کی رعنائیاں ہیں۔

تخیل وہ صلاحیت ہے جس کے ذریعہ شاعر مظاہر حیات کے اس بنیادی ربط سے وقوف حاصل کرتا ہے۔ جو کثرت میں وحدت پیدا کئے ہوئے ہے ؎

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

تخلیق معنی، استعارہ کی تازگی، تشبیہ و محاکات کی جدت۔ یہ سب تخیل کی کارفرمائیوں کے رہین منت ہیں۔ عظیم کی شاعری رعنائی تخیل اور اس کے سارے لوازم کی سرمایہ دار ہے۔

صحیح اور پائدار جوش ہمیشہ سادگی سے ہم دست رہتا ہے۔ علامہ کی شاعری میں جوش اور فطری سادگی نمایاں ہیں۔ تخیل اور اس کے لوازم جوش، سادگی اور درد علامہ کی پیامی شاعری کو سرچشمۂ حیات بنا دیتے ہیں۔

ہمارے شاعر کا پیغام سنئے:۔

بجلیاں گر رہی ہیں ہر طرف مسکن کو دیکھ
گلشن کو دیکھ! وادیٔ ایمن کو دیکھ

کھول آنکھیں اب بھی دہقاں چل ذرا خرمن کو دیکھ
گلشن کو دیکھ! وادیٔ ایمن کو دیکھ

ہے ترا مطلوب جو گل، وہ ہے کانٹوں میں گھرا
پھر خوف کیا! تجھ میں ہے گر حوصلہ
جا الجھ کانٹوں سے گلچیں، ہاں نہ اب دامن کو دیکھ
گلشن کو دیکھ! وادیٔ ایمن کو دیکھ

کاٹ لے پروا نہیں ہے پھر نکل آئے گا سر
مثل شجر، ہے زبانِ شمع پر
غور سے گل گیر شمع بزم کی گردن کو دیکھ!
گلشن کو دیکھ! وادیٔ ایمن کو دیکھ

ہے کڑکتا رعد، آتی ہے چلی کالی گھٹا
کیا غم فزا! غافل نہ ہونا دیکھنا!
باغباں ہوشیار! طوفانِ شجر افگن کو دیکھ
گلشن کو دیکھ! وادیٔ ایمن کو دیکھ

جس نے اک عالم کے دل کو لوٹ کر ویراں کیا
حیراں کیا، سربسر نالاں کیا
جاگ اٹھ اے سونے والے اس پیچھے رہزن کو دیکھ
گلشن کو دیکھ! وادیٔ ایمن کو دیکھ

نظم بالا ایران کی قومی شاعری کے علمبردار شرف الدین گیلانی کی ایک مستزاد کے انداز میں ہے "تہرانِ جنگ آور نگر"۔
خاتمۂ سخن میں علامہ کی ایک فنی خصوصیت کا اظہار کرنا ضروری ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے کیٹس کی طویل نظموں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں "تعمیری نظام" کا اہتمام نہیں۔ یونان کے شعراء نے اس صنعت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ ARCHITECTONICS تعمیری نظام نام ہے نظم کی ابتدا۔ انتہا اور اس کے وسط کے آپس میں مربوط ہونے کا۔ نظم میں ارتقا ہونا چاہیے۔ فطری ارتقا۔ فن کا یہ تناسب اسے حسن بخشتا ہے۔ علامہ کی نظموں میں تعمیری حسن و تناسب کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر میں اس نظم کو پیش کرتا ہوں جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:۔

سُننے والوں سے یہ کہدو نہ ہراساں ہونا　　　طرزِ نو سے ہے مجھے آج غزل خواں ہونا

(باقی صفحہ ۱۸۶ پر)

پروفیسر اختر اورینوی

پرویز شاہدی کی فن کاری

تنقید کا کام بڑی آزمائش کا کام ہے۔ یہ صلاحیت کی بھی آزمائش ہے اور ایمان کی بھی۔ عمل تنقید ایک نہایت پیچیدہ عمل ہے اور اتنا ہی پیچیدہ جتنا خود عمل تخلیق پیچیدہ ہے۔ ناقد کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ زندگی کے مختلف تجربات سے بھی آگاہ ہو اور ان تجربوں کی جمالیاتی پیش کش کی نوعیت سے بھی۔ مشاہدۂ حیات و کائنات فنکار کے لئے بھی ضروری ہے اور ناقد کے لئے بھی۔ فن کار کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ حیات و کائنات کے جلوؤں کو اپنی شخصیت کی آنچ میں پکا کر صاحبانِ ذوق کے سامنے پیش کرے۔ آرٹ ایک ذوقی اور ذہنی دعوت ہے اور اس دعوت میں ہمیں زندگی کا اُکٹس نہیں ملتا۔ چبائے ہوئے لقمے نہیں ملتے۔ بلکہ نیا رس اور تازہ مزہ ملتا ہے۔ یہ رس اور گھلاوٹ فن کار کی روح سے ٹپکتی ہے۔ فن کا رنگ و آہنگ، فن کار کے قلب و جگر کے پروردہ ہیں۔ ناقد کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تخیل کی مدد سے فنکار کی شخصیت، اس کی روح اور اس کے دل میں جھانک سکے۔ ایک اچھا ناقد فنکار کی نبض دیکھ کر روایتی طبیبوں کی طرح یہ بتا سکتا ہے کہ فنکار کی زندگی کی مختلف منزلوں میں اس پر کیا بیتی ہے ـــ اور فنکار کا دل اس کے فن میں دھڑکتا ہے۔ تنقید کا کام نبض فن پر بڑے حکیمانہ طور پر انگلیاں رکھنے کا کام ہے۔ ناقد بھی رسم و راہِ منزل سے آگاہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے وہ خود زائر نہ ہو۔ کسی شاعر کی شاعری کی قدر و قیمت متعین کرنے میں ایمانداری کی بھی جانچ ہوتی ہے۔ ممکن ہے کوئی تجربہ، کوئی مشاہدہ، کوئی احساس، کوئی جذبہ، کوئی خیال، کوئی فکری نکتہ، کوئی عقیدہ ناقد کے ڈھنگ کا نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود ان میں شخصیت کی آنچ کا سوز و گداز موجود ہو، اور اس سوز و گداز کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ منعکس بھی کیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں ناقد کا یہ فرض ہے کہ اس عملِ تخلیق کی تاثیر کا اقرار کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو منکرِ حق ہے۔ اسی طرح اگر کسی فنی نمونے کا محرک تجربہ ناقد کے ڈھب اور ڈھنگ کا ہو، لیکن اس تجربے کے اندر کوئی نئی معنویت اور نئی تعبیر نہ پائی جائے تو یہ ناقد کا فرض ہوگا کہ اس خطا کو یہ اعلان ظاہر کر دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو باطل کی تائید کرنے والا ہے۔

ظاہر ہے کہ دونوں مرحلے بہت مشکل ہیں۔ فن کی منازل سلوک کی پوری واقفیت بھی کٹھن ہے اور اپنی شخصیت سے نبرد آزما ہونا بھی مشکل ہے۔ ناقد کو اپنی شخصیت کے خلاف جہاد کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ فن کار کی شخصیت تک پہنچ سکے اور اس سے بھی ایک منزل آگے کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ یعنی ناقد اپنی شخصیت کی صلیب خود اٹھائے ہوئے فنکار کی بنائی ہوئی جنت تک پہنچتا ہے۔ اور اپنی شخصیت کو فن کار کی شخصیت میں جذب کر دیتا ہے۔ لیکن اس ہوش و حواس کے ساتھ کہ وہ حسن کو حسن کہہ سکے اور بدصورتی کو بدصورتی۔ ناقد کی شخصیت فن کار کی شخصیت میں گم نہ ہو، بلکہ جذب ہو۔ جذب ہونے اور ہضم ہونے میں بڑا فرق ہے۔ دراصل تخلیق فن اور تنقید فن کا مسئلہ ایک بڑا صوفیانہ مسئلہ ہے۔ خودی اور بیخودی کی بحث چھڑتی ہے۔ ناقد کی خودی قائم بھی رہے اور اس پر فنکارانہ بیخودی بھی طاری ہو جائے۔ یہ نازک بات ہے۔ بہرحال ناقد کو پل صراط سے گذرنا

پڑتا ہے، جو بال سے بھی زیادہ باریک اور تلوار سے بھی زیادہ تیز ہے۔ فنکار تو اس راستے سے عاشقانہ و والہانہ گزر جاتا ہے، جذبۂ دل کے سہارے سب کچھ جھیل لیتا ہے، لیکن ستم تو یہ ہے کہ ناقد کو عقل و خرد کی مدد سے یہ راہ طے کرنی پڑتی ہے۔ ہاں ذوق و وجدان اس کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ رہنمائی نہ ہو تو تنقید کی کامیابی معلوم۔

تنقید مجاہدہ بھی ہے، محاسبۂ نفس بھی۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اس راہ سے سلامت گزر چکا ہوں، ہم میں سے کون ایسا ہے جو یہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ بغیر لغزش و انحراف کے وہ فرض تنقید ادا کرتا رہا ہے۔ تنقید کا کام اور مشکل ہو جاتا ہے، جب موضوعِ تنقید ہمعصر فنکاروں کی فنکاری ہو۔ ایسے وقت تحت الشعور میں چھپی ہوئی رقابت چوری چوری سچائی کا گلا گھونٹتی ہے۔ اور کبھی کبھی دوست داری کانوں میں سرگوشی کرنے لگتی ہے۔ اس سے بھی ایک سخت ابتلاء کی منزل آتی ہے۔ نفس کہتا ہے کہ فراخ دلی سے کام لو۔ تاکہ تمہارے اخلاق فاضلہ کی دھونس پڑے۔ کبھی مروّت بھی خود پسندی کی بہکائی ہوئی ہوتی ہے۔

آج کی صحبت میں پرویز شاہدی کی شاعری کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ پرویز میرے ہمعصر ہیں، بہاری ہیں، عظیم آبادی ہیں، میرے دوست ہیں۔ پرویز اشتمالی الخیال ہیں۔ اور میں ابھی تک اپنے کو مذہبی کہتا ہوں۔ اتنی دیواریں میرے راستے میں حائل ہیں۔ ان سبھوں کو توڑ کر مجھے پرویز کی شخصیت اور اس کے فن تک پہنچنا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں اتنی ساری فصیلوں کو کامیابی کے ساتھ عبور کر بھی سکوں گا، یا نہیں۔ پھر بھی سعی پیہم فرض ہے۔

سب سے پہلے تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ محض ایک مقالہ یا مقالے کے دائرے میں پرویز کی فنکاری کا صحیح جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ کبھی ایجاز سے بڑے کام ہوتے ہیں، کبھی اختصار حجاب حقیقت بن جاتا ہے۔ لہٰذا صرف یہ عرض کروں گا کہ میں پرویز کی حسن کاری کو جستہ جستہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پرویز کے فن کی جو تصویر میں پیش کروں گا میری اپنی نظر، میرے اپنے ذوق کی بنائی ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے بہت سے زاویے یا چند پہلو دوسرے نگاہ رکھنے والوں کو کھٹکیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اہل نظر بعض نئے گوشوں کو دیکھ کر خوش ہوں۔ تنقید و تفسیر کا معاملہ بھی تخلیق کی طرح انفرادی ہے جس میں عمومیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور بس۔

میں پرویز کی شاعری کا معروضی اور موضوعی مطالعہ کروں گا۔ لیکن ارتقائی نہیں۔ ارتقائی مطالعہ کے لئے وقت چاہئے اور صبر بھی۔ اس کے علاوہ میں اپنے مطالعہ کو کلی حیثیت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ پرویز کی ساری نظموں اور غزلوں پر تبصرہ فی الحال ناممکن ہے۔ میں براہ راست آپ کو پرویز کی بعض نظموں اور غزلوں تک لے چلتا ہوں۔ تاکہ ہم دونوں مل کر اس کی فنکاری کا مشاہدہ کریں۔

کامیاب شاعری کے لئے ضروری ہے کہ موضوع یا تجربہ شعریت اختیار کرے اور بعد ازاں موزوں، خوبصورت اور پراثر ہیئت کے ذریعے منزل اظہار سے گزرے۔ شعریت روح فن ہے اور موضوع و ہیئت اس کا بدن۔ شعریت کی پوری تعریف نہیں کی جا سکتی۔ پھر بھی چند چیزوں کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے جو اجزائے شعریت ہیں۔ کسی تجربے کا حواسی، احساسی جذباتی اور تخیلی مرکب شعریت ہے۔ شاعر کے بیدار حواس، ذکی احساسات، الگداز جذبات، بلند اور رنگین تخیل، مختصر یہ کہ اس کی پوری شخصیت تجربے کو جذب کر کے گھلا پگھلا کر اسے ایک نئی زندگی بخشتی ہے۔ فنکار اپنی روح کا ایک حصہ موضوع اور تجربے میں داخل کر دیتا ہے۔ شاعر کی روح کی روشنی اور شیرینی، گرمی اور گداز یہ سب مل کر اس کے فن کو حرارت، تابانی اور حلاوت عطا کرتے ہیں۔ تجربہ مظاہر فطرت کا ہو یا حب وطن کا۔ اشتمالی انقلاب کی نغمہ سرائی ہو یا ملت بیضا کے معجزات کی قصیدہ خوانی۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ فنکار نے موضوع میں نفخ روح کیا ہے یا نہیں اس میں شعریت پیدا ہوئی ہے یا نہیں، اور پھر اس شعریت

نے موزوں، ہم آہنگ، مربوط، خوبصورت اور پر تاثیر پیکر کی شکل اختیار کی ہے یا نہیں۔

پرویز کے کلام کا مطبوعہ مجموعہ "رقص حیات" میرے سامنے ہے۔ پہلی نظم ہے "ساز مستقبل"۔

کتنے اصنام نا تراشیدہ — پتھروں ہی میں کسمساتے ہیں
کتنے ہی ناشگفتہ لالہ و گل — ذہن بلبل کو گدگداتے ہیں
کتنے ہی جلوہ ہائے نادیدہ — ابھی پردے میں مسکراتے ہیں
ناسرائیدہ کتنے ہی نغمے — دل کے تاروں سے لپٹے جاتے ہیں
بے جلائے ہوئے دیئے کتنے — رات ہوتے ہی جھلملاتے ہیں
کس نے چھیڑا ہے ساز مستقبل — آج لمحات گنگناتے ہیں

یہ نظم مربوط ہے۔ لیکن اس میں خیال کا ارتقا نہیں پایا جاتا۔ ایک مرکزی تجربہ ضرور موجود ہے اور اس کو بہت ہی خوبصورت تصویروں اور تعبیروں کے ذریعہ مختلف اشعار میں پیش کیا گیا ہے۔ مستقبل کی حقیقت، حال کے ارمانوں میں آنکھیں جھپکاتی ہیں۔ کبھی یہ آرزوئیں پوری ہوتی ہیں اور کبھی نہیں پوری ہو پاتیں۔ مستقبل کے نغمات کو شاعر کا تخیل سن لیتا ہے۔ شاعر کی ذکاوت، ذرات کو لوٹتے ہوئے سنتی ہے ان دیکھے جلوے اس کی چشم بصیرت کے سامنے رقص کرتے ہیں۔ لمحات گنگناتے ہیں۔ زمان و مکان کی طنابیں کھنچ کر سمٹ آتی ہیں۔ امکانات کا حسن، نظارہ ساماں ہوتا ہے۔ پرویز نے ایک ایک شعر میں اس کیفیت کو پیش کیا ہے۔ شاعر اپنے برش سے لطیف رنگ آمیزی کرتا ہے۔ اور ایک نازک تجربے کو زندگی عطا کرتا ہے۔ تجربہ بہت بالیدہ نہیں ہو۔ لیکن اس کی معنویت دل میں کسک پیدا کرتی ہے۔ نظم کا اختتام بہت ہی تسکین بخش ہے۔ ترکیبیں خوب ہیں۔ اور افعال کا استعمال بہت پر اثر ہے۔ مجموعی طور پر نظم میں بڑی شعریت پائی جاتی ہے۔ جذبہ اور تخیل کا کامیاب امتزاج ملتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب، ان کی تنظیم اور لب ولہجہ کی غنائیت پر اثر ہے۔ یہ ایک کامیاب نظم ہے۔ اس میں معنویت کا بھی حسن ہے اور اس کی پیش کش بھی عمدہ ہے۔ ہاں اس کی تعمیری تراشیدگی اتنی بالیدہ نہیں۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تاثراتی نظم ہے اور اس میں تعمیری اٹھان سے زیادہ ہلکے ہلکے رنگ و خطوط کی آزادگل کاری ہے۔

دوسری نظم ہے "رجز انقلاب"۔ قومی شاعری، مذہبی شاعری اور اخلاقی اور انقلابی شاعری سے شاعر کی آزمائش ہوتی ہے۔ مقصدی و فنکاری ایک ابتلا ہے۔ پرویز بھی اس میں مبتلا ہوئے ہیں۔ عصر جدید کے بڑے بڑے فنکاروں کو یہ روگ لگا ہے۔ حالی، اقبال، جوش، جمیل مظہری، پرویز شاہدی اور بہتیرے فنکار مقصدی شاعری کی آگ میں ڈالے گئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس کے لئے گلزار بنتی ہے۔ فنکاری صرف بت شکنی نہیں، چمن سامانی بھی ہے۔ شاعری ضرب کلیم کے ساتھ ید بیضا اور جلوۂ طور بھی ہے۔ رجز انقلاب میں پرویز نے فرہادی تو کی ہے۔ مگر اس میں خارہ شگافی زیادہ ہے۔ اور جوئے شیر کی دھار بہت ہی ملاحظہ ہو۔

میں ہوں اک زندہ حقیقت، میں ہوں دل کا اضطراب — میں نومبر میں ہوں لینن، میں ہوں روح انقلاب
میں ہوں طوفاں، میں طلاطم، میں ہوں شعلہ، میں ہوں برق — میری ٹھوکر میں زمانہ، میری زد میں غرب و شرق

الفاظ محض الفاظ، بے جان الفاظ، لپکتے ہوئے گرم الفاظ۔ شعلۂ بے فانوس۔ شاعری الفاظ سے بنتی ہے۔ بالکل ایسے جیسے گلاب مٹی سے بنتا ہے۔ مٹی کے ڈھیر کو گلاب نہیں کہتے، لغت کو ادب نہیں کہتے۔

بنگالی شاعر نذرالاسلام اور جوش نے اس رنگ کی نظمیں لکھی ہیں۔ پرویز نے موضوع کے اعتبار سے بھی کوئی جدت اور ندرت نہیں پیش کی۔ طرز اظہار بھی نقالی ہے۔ اور اس نقالی میں بھی بھونڈا پن۔ چبائے ہوئے لقمے کو چبانا نفاست طبع کے خلاف ہے۔ ان کمزوریوں کے باوجود بعض شعر یا بعض مصرعے بہت ہی شعریت بداماں ہیں ملاحظہ ہو ؎

ہر نفس میں ہے اجالا ہر نظر میں روشنی　　　میں تڑپتی آرزو ہوں سینۂ تاریخ کی

دوسرے مصرعہ میں کتنا خوبصورت استعارہ ہے کیسی پراثر تعبیر ہے۔ لیکن جزو کے حسن سے کلی حسن پیدا نہیں ہوتا۔ بعض اشعار تو اتنے بے کیف ہیں کہ جیسے "چل کبڈی تارا، سلطان گنج مارا" ملاحظہ ہو ؎

میں ہوں مزدوروں کا ہمدم، میں کسانوں کا رفیق　　　میں ہوں مظلوموں کا مونس، بے زبانوں کا رفیق

گویا نہر پہ چل رہی ہے پن چکی" اور "رب کا شکر ادا کر بھائی" اور ایک اور نابالغانہ شعر سنیئے ؎

رعب ایٹم بم کا میرے دل پہ چھا سکتا نہیں　　　زور ڈالر کا مری گردن جھکا سکتا نہیں

ہر کلام منظوم شعر نہیں ہوتا۔ خطابت اور صحافت کو شاعری نہیں کہتے۔ اس پوری نظم کو پڑھ کر یہ اثر ہوتا ہے کہ ایک عنفوان شباب میں داخل ہوتے ہوئے نوجوان کو غصہ آگیا ہے اور وہ غصہ بھی سلیقے سے نہیں کر پاتا ہے۔ اس نظم سے کمزور رفتات اور معمولی ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اخبار کا کالم نویس ایک مراسلہ سپرد قلم کر رہا ہے جس میں کہیں کہیں ادبیت کی جھلک بھی ملتی ہے اور جو اتفاق سے منظوم ہو گیا ہے۔

پرویز غزلیں بھی لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جوش، فیض اور پرویز یہ تینوں اصل میں حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ اور ناکردہ گناہوں کی حسرت انہیں رومان فطرت کی رنگینیوں سے ہٹا کر رومانِ انقلاب کی تلخیوں تک لے گئی ہے میرا خیال ہے کہ انقلابی شاعری میں علی سردار جعفری نسبتاً زیادہ کامیاب ہیں۔ علی سردار کے یہاں انقلاب کی شعریت ہے۔ ان کی دنیائے شاعری کا محور انقلاب ہے۔ اور جب وہ بہکتے نہیں ہیں تو بہت ہی پُر تاثیر انقلابی نظمیں لکھتے ہیں۔

بہر کیف پرویز عشقیہ شاعری اور فطرت کی شاعری میں زیادہ کامیاب ہیں۔ ملاحظہ ہو، ایک غزل کے چند اشعار، کیا بولتا ہوا مطلع ہے ؎

دل کی دھڑکنوں سے اک داستاں بنانا ہے　　　آپ کی نگاہوں کو ہم زباں بنانا ہے
ماہ خوردہ اگانے ہیں، کہکشاں بنانا ہے　　　اے زمیں تجھی کو اب آسماں بنانا ہے

غزل کے اندر اتنے امکانات ہیں کہ اس صنف کی علامتوں کے سہارے بھی انقلابی شاعری کی جاسکتی ہے ملاحظہ ہو ؎

شوق کے تسلسل کو داستاں بنانا ہے　　　اک جہاں مٹانا ہے، اک جہاں بنانا ہے

پرویز غزل کی روایات کو پختگی سے برت سکتے ہیں لیکن انقلابی نظموں کے برتاؤ میں ان کے یہاں بڑی ناپختگی ہے۔ کتنا اچھا شعر ہے، سنیئے ؎

اپنے سرخ ہونٹوں کی مسکراہٹیں دے دو　　　بجلیوں کی یورش میں آشیاں بنانا ہے

اس شعر میں رسمی رعایت لفظی نہیں، آشیاں سازی کے لئے عزم پختہ اور پُر امید دل کی ضرورت ہے۔ امید کا سہارا مسکراہٹیں ہیں

محبوب کا تبسم حیات بخش ہے۔ اسی غزل میں ایک خوبصورت انداز اظہار ملاحظہ ہو۔ شاعری کی صنعت گری میں اسلوب کا حسن بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سنیئے:۔

آج ان کی آنکھوں سے جھانکتی ہیں تلواریں　　　دل کی آرزوؤں کو سخت جاں بنانا ہے

ندرت اظہار اور الفاظ کی صنم سازی نہایت کامیاب ہے۔

پرویز کی نظم "تلوار" مجموعی طور پر کامیاب ہے۔ اس میں کھردری اور بھونڈی حب الوطنی نہیں۔ بلکہ ایک نئی اور شاعرانہ تعبیر ہے نظم کی سلاست اور رعنائیت بھی پُراثر ہے۔ ملاحظہ ہوں چند ٹکڑے ؎

اے پیاری تلوار . . . .

اُترا ہے کیوں چہرہ تیرا، پھیکے کیوں رخسار

زنگ سے سندر روپ ڈھکا ہے کُند ہے بالکل دھار

شاعر نے تلوار کو ایک سندر ناری کے روپ میں دیکھا ہے۔ جو بیوہ ہوگئی ہے۔ جب تلوار چلانے والے بزدل ہو جائیں تو تلوار بیوہ ہی تو ہو جاتی ہے۔ اس نظم میں تخیل اور جذبے نے بڑی خوبصورت تعبیریں تخلیق کی ہیں ؎

زنگ کی چادر اوڑھے اوڑھے گھٹتا ہو گا دم　　　صدیوں کی اس قید میں تو نے کتنے سہے ہیں غم

"دم" کا لفظ پہلے مصرعہ میں کتنا پُرمعنی آیا ہے۔ ایک پُراثر مصرعہ ملاحظہ ہو۔

تیری سُوکھی پیاسی زباں سے کھیلے ماہ و سال

اس نظم میں تشبیہیں بھی بہت اچھی اچھی ہیں۔ بعض بند کمزور ہیں اور بعض میں نثریت غالب آجاتی ہیں۔ کہیں کہیں بے جا خطابت پیدا ہوئی ہے۔

کبھی کبھی پرویز کی خام انقلابیت ان کی روح تغزل کا بھی فشار کر دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

تضادات سرمایہ داری نے مارا　　　شکاری کو آخر شکاری نے مارا

کس قدر گراں بار شعر ہے۔ جسے شعر کہنے سے بھی قلم رکتا ہے۔ جدلیات کو منظوم کر دینا بھی ایسے کرتب ہیں جیسے "خالق باری" لکھنے کی ہنرمندی۔ یہ پوری غزل بوجھل ہے، بے کیف ہے، پھس پھسی ہے۔ ایک اور نظم ہے "بنت ہمالہ"۔ اس نظم میں بعض بند بہت ہی خوبصورت ہیں۔ فنکار نے لفظوں سے مصوری کی ہے، پیکر تراشی کی ہے۔ موسیقی کی لہریں پیدا کی ہیں اور ترکیب و استعارہ سے نئی تعبیریں تخلیق کی ہیں۔ اسلوب ادا میں بھی ندرت ہے۔ پہلے بند کی معنویت اور شعریت ملاحظہ ہو ؎

آہ گنگا، یہ حسیں پیکر بلّور ترا

تیری ہر موج رواں جلوۂ مغرور ترا

چُور مغرب سے مگر دل ہے بہت چُور ترا

جھانکتا ہے ترے گرداب سے ناسور ترا

آئی ہے نیمز سے اک موج رواں گاتی ہوئی　　　زخم اب تک ترے سینے پہ ہیں پتواروں کے

اس نظم میں بڑے امکانات تھے۔ لیکن شاعر کو آنی جانی تاثرات نے بہکا دیا۔ شاعری لمحے کو ابدیت میں تبدیل کرتی ہے لیکن نظم میں ابدیت کو لمحہ بنا دیا گیا ہے یعنی یہ نظم کرپس مشن پلان پر ایک صحافتی تبصرہ ہے۔ کتنا پھیکا بند ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

آئی ہے ٹیمز سے اک موجِ رواں گاتی ہوئی　　تجھکو آزادی کے پیغام سے بہلاتی ہوئی

شاید شاعر اپنی سیاست میں اتنا الجھ گیا کہ معمولی عروض ہنرمندی سے بھی چشم پوشی کر لی۔ آزادی کی یائے معروف بُری طرح گر گئی ہے اور ریا جائز ہے۔ پال رابسن کے نام ایک نظم ہے اور یہ بھی نہایت سرسری اس میں بلاغت تو ہے۔ لیکن صرف بلاغت کو شعریت نہیں کہتے۔ آخری شعر اچھا ہے:۔

گیت اب زنداں سے باہر جائیں گے　　رابسن تم گاؤ، ہم بھی گائیں گے

اس سادگی میں جذبے کا گداز ہے۔

"یانگسی کو سلام" ایک انقلابی نظم ہے، اور اس کے اندر بھی وہی خامیاں ہیں جو پرویز کی انقلابی نظموں میں ملتی ہیں۔ پہلا بند بہت شاعرانہ ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

عزیب جبین سو رہا تھا بیکسی کی گود میں　　بہار تھی بھنچی ہوئی فسردگی کی گود میں
سسک رہی تھیں نکہتیں کلی کلی کی گود میں　　تڑپ رہی تھی رُوحِ نغمہ خامشی کی گود میں
رُخِ سحر چھپا ہوا تھا تیرگی کی گود میں　　مگر ابال پل رہا تھا "یانگسی" کی گود میں

اس کے بعد آنے والے بند کمزور پڑتے گئے اور تیسرا بند تو محض وقتی صحافت کی آئینہ داری کرتا ہے۔ نری سیاست، محض نعرہ، ملاحظہ ہو ؎

اُلٹ گئی چیانگ کی وہ کشتیٔ ٹرومنی　　ٹرومنوں کی دوستی نے کی عجیب دشمنی

یہ نظم بھی بہت سطحی نظم ہے۔ پہلے شگفتہ بند کے بعد روحِ شاعری پرواز کر گئی۔ پرویز شاہدی اگر خالص رومانی شاعری کرتے یا مناظرِ فطرت کی آئینہ سامانی کی طرف متوجہ ہوتے، تو اردو ادب کا سرمایہ گراں قدر بنتا۔ کبھی کبھی پرویز کی جنسی رومانیت ان کی انقلابی حقیقت پسندی کے ساتھ مل کر مضحکہ خیز اثر پیدا کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ملوں کی سخت چھاتیاں دھڑک رہی ہیں راگ میں　　دلہن بنی بسی ہوئی ہیں کھیتیاں سہاگ میں

ملوں کی "سخت چھاتیاں" کی ترکیب ملاحظہ ہو، کیا تک ہے۔ بات یہ ہے کہ پرویز شاہدی کے تصورات اور توہمات میں جنسیت پائی جاتی ہے۔ یہ کمزوری جوش میں بھی بہت پائی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو یہ بند۔ ویسے یہ اچھا بند ہے:۔

عروسِ امن کی کھنک رہی ہیں سرخ چوڑیاں
کلائیاں سنا رہی ہیں دل کشی کی داستاں
مہک رہا ہے آرزو کے گیسوؤں کا گلستاں
حسین مانگ بن گئی ہے سجدہ گاہ کہکشاں

اس نظم میں بے کیف اور غیر شاعرانہ بند بکثرت ملتے ہیں۔ نظم کا کلّی اثر بھی غیر مربوط اور پھیکا ہے۔ تعمیر کے اعتبار سے بھی یہ نظم نہایت ہی ناتراشیدہ ہے۔ ارتقائے خیال کی بجائے تکرارِ خیال ملتی ہے۔ شاعرانہ تجربے کی شگفتگی اور بالیدگی کی بجائے اس میں جذبات

کا شور وشیون بہت ملتا ہے۔ اس نظم میں ایک لفظ کی بھرمار ہے اور وہ لفظ ہے "جوان، جوانی، جوانیاں، شباب، عروس، دلہن، کلائی، چوڑیاں، سہاگ، چھاتیاں، اُبھار، یہ جنسی الفاظ انقلاب کے پردۂ آہنی کے اندر سے جھانکتے ہیں۔ اور کسی نہ کسی کیفیت کی غمازی ضرور کرتے ہیں۔

پرویز کی نظم "رقصِ حیات" اچھی اور کامیاب نظم ہے۔ شاعر نے شہپرِ فکر کو روح شعریت عطا کی ہے۔ مگر اس نظم پر تنقید آئندہ پیش کی جائے گی۔ اس مختصر مضمون میں، میں نے جستہ جستہ پرویز کی بعض نظموں اور غزلوں کا تجزیہ کیا ہے اور بس۔ پرویز کی شاعری کی خصوصیات اور تفصیلات سے ابھی بحث نہیں کی گئی ہے اور شاعری کی حیثیت سے ان کا مقام بھی اردو ادب میں ابھی متعین نہیں کیا گیا ہے۔ یہ کارِ خیر بشرطِ فرصت آئندہ انجام دیا جائے گا۔ انشاءاللہ۔

(۲)

میں نے فروری ۱۹۵۶ء میں مندرجہ بالا عنوان پر مضمون کی پہلی قسط پیش کی تھی۔ عرصہ بعد دوسری قسط لکھنے کی توفیق ملی ہے میں قارئین سے معذرت کا طالب ہوں۔

پرویز شاہدی ترقی پسند شعراء میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ ایک فطری شاعر ہیں۔ ان کی سیرت مزاج و میلان بکسر شاعرانہ ہیں۔ زندگی اور فن دونوں میں وہ اخلاص، جوش، صداقت، احساس اور جراُتِ اظہار کے علم بردار ہیں۔ ذہانت، جدّت اور نفاست اُن کی سرشت میں داخل ہیں۔

حسبِ وعدہ میں پرویز کی نظم "رقصِ حیات" کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد ان کی شاعری کی خصوصیات پر عام تبصرہ کروں گا۔ یوں تو اُن کے کلام کے مجموعہ کی ہر نظم و غزل میں ان کی فطرت کی خوبصورت جھلک ملتی ہے۔ لیکن آرٹ ارتقائے فطرت کا نام ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ پرویز نے بخششِ فطرت میں کس طرح کے چار چاند لگائے ہیں اور تجربوں کی تعمیر و تحسین کس رنگ میں کی ہے۔

پرویز "رقصِ حیات" کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اپنے بھائی کی اور پھر بہن کی شادی کی خبریں پاکر یکبیر اسپیشل جیل ۱۹۵۰ء میں لکھی گئی"۔ ہر چند کہ یہ نظم ایک گھریلو تجربہ سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن آپ بیتی جگ بیتی بن گئی ہے۔ نیز یہ کہ محدود تجربہ پھیل کر مختلف آفاقی تجربوں کی وسعت اختیار کر گیا ہے۔ اس تراشیدہ و خوبصورت نظم میں، احساسات، جذبات و تخیلات کو فنکارانہ حسن و صداقت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا کرٹھا اور نکھرا ہوا اندازِ اظہار، اس کی مربوط و منظم تعمیر اور اس کا ولولہ پرور و دل نشین پیغام بہت ہی پر اثر ہیں۔ ہر کلام منظوم شعر نہیں ہوتا۔ مگر یہ نظم شعریت بداماں ہے۔ اس کا فنکارانہ توازن بھی دلکش ہے۔ رقصِ حیات کی تمہید میں شاعر نے فکر کو جمال عطا کیا ہے۔

جب بزمِ ارتقا میں جلی شمعِ زندگی
تھی روشنی میں شان حجابِ عروس کی
گونجی فضائے شوق میں شعلوں کی راگنی
جو بڑھ کے دوسری نئی تانوں میں ڈھل گئی
ہر لو نئی لوؤں کو جگاتی چلی گئی   زنجیر روشنی کی بناتی چلی گئی

اظہار و اسلوب کی تازگی، قوت و شعریت ہر مصرعہ سے ہویدا ہیں۔ استعاروں کی تصویریت نے تخیل اور جذبہ دونوں کو جگایا ہے ترنم شعری بھی دلکش ہے۔ روشنی میں حجاب عروس کی شان ہے۔ کتنی سجی اور سنوری ہوئی تشبیہ ہے۔ ذہنی اور تہذیبی ارتقا کی صبح صادق کی حجاب آگینیاں تخلیق مستقبل کی غماز تھیں۔ جلوۂ ارتقا کی نیرنگیوں کو تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں شاعرانہ تعبیرات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ٹیپ کی شعریت، متحرک تصویریت اور سنگینی غنائیت بہشت ذوق، جنت نگاہ و فردوس گوش ہیں۔

پرویز اظہار کی دل نواز تازہ کاریوں کے صناع ہیں۔ ان کی تراشیدہ ترکیبیں نہایت حسین، جاندار و پر اثر ہوتی ہیں۔ بزم ارتقا، شمع زندگی، فضائے شوق، افسانۂ لطافت، حسن خود آرا۔ حیات صرف خود بیں ہی نہیں، خود آرا بھی ہے۔ دوسرے بند کا ٹیپ بند کے معنوی ارتقا کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کرتا ہے ؎

فطرت بجائے جاتی ہے ساز التفات کا — رکتا نہیں ہے رقص مسلسل حیات کا

پوری نظم میں مرکزیت، ارتقائے خیال، صوری و معنوی ربط و ہم آہنگی اور تکمیل تاثیر نمایاں ہیں۔

نظم میں اشتمالی مقصدیت صاف جھلکتی ہے۔ لیکن بانداز لطیف۔ چوتھے بند کی آزمائش سے شاعر کامیاب گزر گیا ہے۔ ع

ہے جادۂ شباب جہاں جنت سفر!

اور پھر پانچواں بند بھی شاعرانہ اظہار کا ہی سہارا لیتا ہے۔

ساز بہار نو پہ غزل خواں ہیں ولولے — معمار تازگی گلستاں ہیں ولولے

پانچویں اور چھٹے بند میں معنوی اور تعمیری ربط و ہم آہنگی کتنی مکمل ہے۔

شادی تمہاری مژدۂ تعمیر گلستاں — خواب بہار تازہ کی تعبیر کامراں

پرویز نہایت رومانی ترکیبیں گڑھتے ہیں۔ جنت سفر۔ تعمیر گلستاں، تعبیر کامراں، ترانۂ ساز خیال، نشاط رفاقت۔ ساز وقت وغیرہ۔

آٹھواں بند نہایت سادہ و پرکار ہے۔ اس کی دیرپا غنائی کیفیت نشاط روح اور دعوت عمل ہے۔

تم دونوں ساز وقت پہ گاتے ہوئے چلو — دنیا کو نغمہ زار بناتے ہوئے چلو

نواں، دسواں اور گیارہواں بند بھی نظم کے دوسرے حصوں سے مربوط ہے۔ اور تجربہ کے مرکزی دھارے سے بالکل ہم آہنگ۔ فرد کا شر جماعت کے سرگم میں مل جاتا ہے۔

تعمیر زندگی کے طریقے نکالنا — میخانۂ حیات میں ساغر اچھالنا

آخری ٹیپ میں نظم اپنے عروج پر جا پہنچی ہے۔ حیات کے جوش اظہار و تخلیق کی شاعرانہ لے سنئے:۔

ہر ذرّہ ہے نشاط تمنا لئے ہوئے — آگے بڑھو خوشی کا پھریرا لئے ہوئے

اقبالؔ اور جوشؔ نے اپنے عصر کے فن کاروں کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ بہتروں نے ان کی نقالی کی اور کہیں کے نہ رہے۔ منتخب شعراء نے ان سے تخلیقی رنگ میں فیض حاصل کیا اور چمک اٹھے۔ اور عام طور پر ملی جلی اثر پذیری کی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ اقبالؔ اور جوشؔ کے رنگ سخن اردو شاعری کی مستقل اور جان دار روایت کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور مستقبل کے فن کار بھی ان سے اثر قبول

کرتے رہیں گے۔ محض نقل کرنے والے ان ادبی سمندروں میں ڈوب مریں گے اور اچھے تیراک شناوری کے گر سیکھیں گے اور جیالے غواص ان سے قیمتی موتی نکالیں گے۔

بہار کے بڑے شعرا میں جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی اور پرویز شاہدی وغیرہ اقبال و جوش کے دبستانوں کے تربیت یافتہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آخرالذکر نے جوش کے طرز کلام کے پھولوں سے اپنے حسن بیان کی آرائش زیادہ کی ہے۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ شاہدی نے خیابان جوش کے کانٹے بھی چن لئے ہیں اور یہ خار اُن کی کسوتِ سخن میں کھٹکتے ہیں۔

میں قبل عرض کر چکا ہوں کہ پرویز بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں۔ انقلاب حاضرہ بھی اپنی رومانی ولولہ خیزیوں اور جذباتی اہتزازات کی وجہ سے انہیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کے معاشی اور عمرانی، ذہنی اور فکری پہلو کبھی بھی سنجیدگی سے پرویز کو متاثر نہ کر سکے۔ رومان کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ صوفیت بھی ایک نوع کا رومان ہے۔ اور جذباتی انقلابیت بھی۔ فیض اور پرویز نے صوفیوں کے حجلۂ عبادت کی طرح قید خانہ کو رومانیت بخشی ہے۔ فیض اور پرویز دونوں صاحب تجربہ رومان سرشت انقلابی ہیں۔ انقلاب کے فکری، اخلاقی اور انسانی تقاضے ان کے لئے ثانوی محرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انفرادی آزادی، رسمیت سے نجات۔ رومانی سنسنی خیزی اور انقلابی عشق پیشگی ان کی شاعری کے لئے قدر اول کے محرکات ہیں۔ پرویز کہتے ہیں ؎

ہم نوجواں ہیں، جانِ بہاراں، مرگ خزاں ہیں
شادابیوں کا گلشن بداماں اک کارواں ہیں
جام و سبو کی، کیفِ نمو کی، روحِ تپاں ہیں
ہم آتشِ گل کی رقص کرتی چنگاریاں ہیں
ہم نوجواں ہیں

پرویز کی نظم "ہم نوجواں ہیں" رومانی شبابیت اور انقلابی شعلگی سے برق بداماں ہے ع
بجلی کے دھارے ہر وقت رقصاں اعصاب میں ہیں

اور مقصد انقلاب کیا ہے؟

بھیگی مسیں پھر کیف نمو کا حق مانگتی ہیں
تسکین ذوق جام و سبو کا حق مانگتی ہیں
بزم جوانی میں ہائے ہو کا حق مانگتی ہیں

اس نظم میں اسلوب بیان کی جذبات سے لبریز تازہ کاری کی خوبصورت مثالیں ضرور ملتی ہیں، مگر تکرار اور بہکا ہوا انداز، نہ جمال پرور بن سکا، نہ فکر آفریں۔ نذرالاسلام کی شاعری والا عسکری ترنم بھی دل کشی پیدا کرتا ہے۔ آتش، چنگاری، سورج، آتش فشاں، بجلی، شرارہ، طوفان، سلگتے ستارے، دہکی رگیں، سیال آہ ہیں۔ شعلے یا بپھرے نغمے، بھیگی مسیں، جام و سبو، بزم جوانی، ہائے و ہو، نشاط حسن، شام مسرت اور کھوئی ہوئی جنت کی سعی حصول کے سوا اشتعال انقلاب کے پاس نوجوانوں کو بخشنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ یہ نظم کامیاب "منفسٹو" بھی نہیں۔ صرف تحریبی اور رومانی ترغیب ہے۔ اس سے کہیں بہتر اور شعریت بداماں نظم "ماضی کا قید خانہ" ہے، ہرچند کہ

اس نظم سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اشتمالی انقلاب میں "شباب" طبقہ اعلیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انقلاب کی رومانیت اور شبابیت ہی سب کچھ ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ خود مارکس اور اینجلز نے اس طریقۂ فکر اور افتاد جذبہ پر کڑی تنقید کی ہے۔ بُخارن، زائنو ویو اور ٹروٹسکی کے دردناک انجام کی وجہ بھی یہی ہوئی کہ وہ لوگ اشتمالی انقلاب کی ذمہ داریوں، حقیقت پسندیوں اور سنجیدگیوں کا حق ادا نہ کر سکے۔

وجد کرتا ہے آج کیوں سبزہ — پتّے کیوں تالیاں بجاتے ہیں
نغمہ ہی نغمہ ہے ہواؤں میں — لَے کے بادل کہاں سے آتے ہیں
بات کیا ہے کہ آج زنداں کی — سختیاں ہم بھی بھولے جاتے ہیں

دیکھ کر طور مسکرانے کا
فق ہے رنگ آج قید خانے کا

دوسرے بند میں قید خانے کی حقیقت پسندانہ تصویر بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کی گئی ہے:

یہ سلاخیں، یہ پہرے، یہ تالے
کالے قانون کی یہ زنجیریں

. . . .

. . . .

اور ان مصائب و شدائد کے باوجود —

دل میں رقصاں ہے روشنی پھر بھی
مسکراتی ہے زندگی پھر بھی!

اور اس مسکراہٹ کا جذبی و تخیلی سبب کتنے روشن و دل نشیں انداز میں ظاہر کیا گیا ہے:

ہے تصوّر میں اک حسین تصویر
دل امنگوں سے آج ہے آباد!
روح میں چٹکیں نغموں کی کلیاں
ڈھل گئے ساز میں لبِ فریاد
نغمہ گونجا جو ربطِ دل کا
شور شرما گیا سلاسل کا

نظم کا اختتام کتنا تیکھا، پر اثر اور حسین ہے! یہ کلی تاثیر کو کتنے خوبصورت و مکمل طور پر منضبط و منعکس کرتا ہے۔

نغمہ گونجا جو ربطِ دل کا — شور شرما گیا سلاسل کا

پیر تویتہ کی نظمیں "تضاد"، "خوش آمدید" اور "اُجالا" اظہار و بیان کی قوت و ندرت کی آئینہ دار ہیں۔ ملاحظہ ہو:

تجھے خار و خس کی سطوت یہ یقین پائیداری — مرے ہر نفس میں رقصاں مرا عزم شعلہ باری

ترے ولولے ہراساں، ترے حوصلے پشیماں مرے دل میں دامن افشاں صنمانِ کامگاری (تضاد)

"تضاد" نادر وجاندار ترکیبوں کا مخزن ہے۔ قدلائے لالہ کاری، مزار، مزار تاجداری، الم گریز پائی، ضمیر شبگوں، نفس صبح دشمن، نظام گل فروشی، غلام جام زریں، طلوع عصر حاضر، تضاد رو بہ شکست۔

نظم "تضاد" کی تنظیم وتعمیر تراشیدہ وبالیدہ تو نہیں، تاہم یہ نظم شعریت بداماں اور مجموعی طور پر پُراثر ہے۔

نہ چھپا اب اس حقیقت کو فسانہ در فسانہ
تری رات سن رہی ہے مری صبح کا ترانہ

نظم "خوش آمدید" کی ابتدا بہت اچھی ہے۔

سرخوشیٔ موسم شبنم چکاں لائے ہو تم
تازگیٔ برگ ہائے ضوفشاں لائے ہو تم
لالۂ وگل کا سکوت نغمہ خواں لائے ہو تم
طائرانِ باغ کا شورِ جواں لائے ہو تم
اپنی سانسوں میں چھپا کر گلستاں لائے ہو تم
ساتھیو خوش آمدید! اے دوستو خوش آمدید
دھوپ گیہوں کی چمکتے چاولوں کی چاندنی
چاند سورج کی یہ فصلیں زرنگار و نقرئی
سرخ اور تازہ پھلوں کی یہ شفق پیراہنی
ڈالیوں کی مانگ شبنم کے ستاروں سے بھری
سرزمیں سے اپنی جیسے آسماں لائے ہو تم

یہ دونوں بند اردو شاعری کے آسمان پر تابندہ ستاروں کی طرح دمکتے رہیں گے۔ ان کی تشبیہیں، ترکیبیں، استعارے، تصویریت اور نغمگی بہارِ بے خزاں ہیں۔ جذبہ کی سرشاری اور تخیل کی رنگینی جام سرجوش وگلرنگ کی طرح نشہ پرور ہیں۔

نظم "اجالا" میں فیض کے فن کی روشنی جھلکتی ہے۔ پرویز کہتے ہیں:۔

یہ خردسال اجالا یہ تیرگی کا سپوت
یہ رُوسیاہیٔ شام بلا کا نورِ نظر!

فیض نے کہا تھا:۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر! وغیرہ

پرویز نے بھی فیض کے میدان میں اپنی کاریگری کے کرتب دکھائے ہیں۔ بزرگوار شعرائے قدیم بھی دوسروں کی پٹی ہوئی زمینوں میں بازی گری فرمایا کرتے تھے۔ ایک ترقی پسند شاعر کے لئے یہ بازیچۂ بزرگاں زیب نہیں دیتا۔ جوش کی نظم کسان پڑھیے اور دیکھیے کہ کسان

اور "ہل" کے لئے کتنے استعاروں کا انبار لگایا ہے۔ تشبیہہ اور استعارے کی شاعری میں بڑی اہمیت ہے۔ مگر جب جزو کل، پر بھاری پڑنے لگے، جب زیور سے حسن ذاتی اوجھل ہو جائے اور جب تشبیہیں اور استعارے بوجھل بن جائیں تو جمال و فن کراہنے لگتے ہیں۔

'اُجالا' میں اسلوب اظہار کی نادرہ کاری ضرور ملتی ہے۔ مگر ذوق شاعری کو صدمہ پہنچتا ہے۔ طرز و اسلوب حاصل شاعری نہیں ذریعے ہیں۔

یہ روسیاہی شام بلا کا نور نظر
حریص رات کے دل کا یہ عکس نور فریب
ہوس کی ساحرۂ تیرہ رُخ کا لخت جگر

. . . .

یہ خسروانہ شرارت کی صبح شب پرور

نظم کا دوسرا حصہ تکراری نہیں، ارتقائی ہے اور کامیاب۔

مگر تصوّر مہر مبیں کو کیا کہئے!!
کہ رات ہی سے درخشاں ہے خاک راہگزر
ہے سطوت شب تاریک ریگ کی دیوار
ہوائے تند کے دامن میں پل رہی ہے سحر
جواں اُجالے کا رقص شباب دیکھیں گے
ہم اپنی گود میں کل آفتاب دیکھیں گے

پرویز نے اپنی نظم "دعوت" میں اپنے فن کا خود تجزیہ کیا ہے۔ میں اسی تجزیہ پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

پرویز کی شاعری میں نفس نفس میں بجلی چھپی ہوئی ہے اور طرز کلام میں شعلے لرزاں ہیں۔ ان کی نظم "شمع فروزاں" ہے۔ وہ رباب ہنر کے تاروں کو کس کر تیغ بکف بنا دیتے رہیں۔ ان کے کلام میں شفق ریز استعارے سجائے جاتے ہیں، لیکن وہ آرائش فن کو مجاہدانہ مقاصد کی کمان دیتے ہیں۔

میں اپنے ہونٹوں پہ شعلے بچھا کے جاؤں گا ہر ایک سانس میں بجلی چھپا کے جاؤں گا
نظر کو شمع فروزاں بنا کے جاؤں گا ضرور جاؤں گا اور سر اٹھا کے جاؤں گا

اب میں "ماضی کا قید خانہ" کا تنقیدی تجزیہ پیش کرتا ہوں۔

مجموعی طور پر یہ نظم کامیاب ہے۔ معنیٰ اور ہیئت کی ہم آہنگی کے ساتھ نظم ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے۔ اس کا محرک ایک مرکزی تجربہ ہے، جو ساری نظم پر خوبصورتی سے چھایا ہوا ہے۔ "ماضی کا قید خانہ" نہایت ایمائی عنوان ہے۔ یہ تجربہ شاعرانہ کو تمثیلی طور پر مرتکز کرتا ہے۔ نظم کی کلی تاثیر، شعریت، قوت و ندرت کا اظہار قابل تحسین ہیں۔

یہ برف پوش تمدن، یہ منجمد تہذیب شعاع مہر درخشاں کے انتظار میں ہے

یہ صدیوں قرنوں کا ٹھٹھرا ہوا نظامِ حیات   تمازتِ دلِ انساں کے انتظار میں ہے
روایتوں کی یہ بے رُوح شامِ یخ بستہ   سحر کے شعلۂ رقصاں کے انتظار میں ہے

اگر اس نظم کے بندوں میں غزل کی ہیئت استعمال نہ کی جاتی تو بہتر تھا۔ فارم نے مزاجِ نظم کو بھی متغزلانہ بنادیا ہے۔ تکرارِ خیال بہت کھلتا ہے، چوتھا اور پانچواں شعر محض تکرار ہے۔

یہ ژالہ بارِ تخیل، یہ سرد سرد سی فکر   برشتگیٔ دل وجاں کے انتظار میں ہے
ندامتوں کا یہ انبارِ خشک وسرد وکثیف   دہکتی آگ کے طوفاں کے انتظار میں ہے

کاش اردو نظم کو کوئی غزل کی زیادتیوں سے نجات دلادیتا۔ نظم کے فارم میں تکرارِ خیال اور لفظوں کا بہروپ بہت بُرا لگتا ہے۔ نظم کی کاریگری نہایت ہی کڑھی ہوئی، گٹھی ہوئی، تراشیدہ ومربوط ہوتی ہے۔ بالخصوص جوش ملیح آبادی نے نظم کے فارم کو غزل کی ریودگی دے دی اور ایک بڑے شاعر کی بُری مثال سے بہتوں کو ٹھوکر لگی۔ ویسے ان کے یہاں تراشیدہ ومربوط نظمیں بھی نظر نواز ہوتی ہیں۔

نظم کا دوسرا بند زیادہ مربوط ہے۔ اور اس میں خیال آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اور تجربہ کے مختلف گوشے نکھرتے جاتے ہیں، تیسرا بند بھی خاصا کامیاب ہے۔ مگر چوتھا بند، بھیس بدل کر تکرارِ خیال ہی ظاہر کرتا ہے۔ پانچویں بند میں نظم کا مرکزی تجربہ اور نکھرتا اور ابھرتا ہے۔

طلوعِ صبحِ درخشاں کے بعد بھی دنیا   جبیں پہ رات کے لمحات ہے سجائے ہوئے
شکار ہوتی ہے اب بھی مشقتِ نادار   کہ دامِ لعل وگہر اب بھی ہیں بچھائے ہوئے

نظم کا نقطۂ عروج عنوان کے ساتھ وابستہ وپیوستہ ہے۔

چھڑا سماج کو گذرے ہوئے ہر زمانے سے   نکال حال کو ماضی کے قید خانے سے

پرویز کی ایک اور کامیاب نظم ہے — "بربطِ دل"۔ یہ نظم اردو سرمایہ شاعری کی ایک گراں قیمت چیز ہے۔ بہر جہت کامیاب، کہیں یہ جھول نہیں۔ مقصد ونظریہ نے فن کو قتل کرنے کی سازش نہیں کی۔ صنعت گری کا حسن دلکش ہے۔ تصنع، تکرار، تکلف، لفظی بازیگری کہیں نہیں۔ ایک جوئے رواں کی طرح نظم کا ترنم فضائے دل پر چھا جاتا ہے۔ شعریت حسنِ تعبیر سے اور اجاگر ہوگئی ہے، جذبہ، تخیل اور فکر ہم آغوش ہیں، تاثیر قدم چومتی ہے۔

کیوں خوشی سے چمکتی ہیں آنکھیں
چہرے کیوں آج جگمگاتے ہیں
کیسی اٹھتی ہیں لہریں ہونٹوں سے
آج کیوں لوگ مسکراتے ہیں

بیدلؔ لائبریری

مرزا عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی جیسی عظیم المرتبت شخصیت کے نام پر ایک لائبریری شرف آباد میں قائم ہے۔ بہتر سے بہتر کتابیں اس میں جمع ہو رہی ہیں۔ اور نادر قلمی کتابوں کا عکس بھی محفوظ کیا جا رہا ہے، تاکہ آپ بھی اور آپ کی آئندہ نسلیں بھی محفوظ علمی ذخیرے سے فیض یاب ہونے کا موقع پائیں۔ لہٰذا اس مہم میں آپ کا تعاون بیحد ضروری ہے۔ انسان کی طرح کاغذ کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ لیکن کتابیں اگر محفوظ کر دی جائیں تو وہ انسانوں سے کہیں زیادہ صدیوں تک زندہ رہتی ہیں، اور اُن کی زندگی سے کتابوں کا ذوق رکھنے والے بھی پائندہ ہو جاتے ہیں۔

آپ کے پاس چھوٹی بڑی جو کتابیں بھی موجود ہوں ان کو بیدلؔ لائبریری میں محفوظ کرنے کا انتظام فرمایئے۔ بہتر سے بہتر کتب خانے آپ کے اسلاف نے قائم کیے ہیں۔ آپ کو بھی یہ روایت تازہ کرنی چاہیے۔

جن لوگوں نے کتابیں فراہم کی ہیں ہم ان کے بے حد ممنون ہیں۔ لائبریری کے ساتھ ان کا نام زندہ رہے گا۔

مہتمم **بیدلؔ لائبریری** شرف آباد۔ کراچی ۵

پروفیسر اختر اورینوی

وفا براہی

پروفیسر اختر اورینوی، صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۵۲ء میں مشہور شاعر جناب وفا براہی کے کلام پر ایک مخلصانہ تاثر کی ذیلی سرخی کے ساتھ حسب ذیل مضمون لکھا تھا۔

زندگی کی علامت حرکت ہے، ارتقاء یا انحطاط۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وفا براہی کی شاعری میں زندگی ہے، زندگی کی حرکت ہے اور اس حرکت میں ارتقاء ہے "نکہت گل" اور "سحر نظر" کے بعد وفا کے کلام کا یہ پیش نظر مجموعہ جاذب توجہ ہے۔ نکہت گل غزلوں کا مجموعہ ہے اور سحر نظر میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ اس تازہ مجموعے میں سحر نظر کی پیروی کی گئی ہے۔

وفا براہی کے متعلق حضرت نوح ناروی نے لکھا ہے کہ "سید محمود عالم وفا براہی میرے دو رسوم کے شاگردوں میں ہیں.... آج ان کا اچھے کہنے والوں میں شمار ہوتا ہے"۔

حضرت علامہ عظیم مرحوم عظیم آبادی فرماتے ہیں کہ ؏ "عندلیبان خوشنوا میں وفا کا چرچا چمن چمن ہے"۔

میرے نزدیک اس عندلیب خوشنوا میں سوز بھی ہے اور ساز بھی۔ وفا کی شاعری جذبے کی شاعری ہے جس میں لہک کے ساتھ رنگینی بھی ہے جو تخیل کی پیدا کردہ ہے۔ وفا میں ولولہ ہے۔ سرمستی ہے۔ ترنگ ہے۔ وفا کے مزاج میں سیلاب، بیباکی، جوش اور طنطنہ ہے۔ یہاں شاعر کے مزاج اور اس کے کلام کے مزاج و آہنگ میں تضاد نہیں اور یہ بہت اچھا ہے۔ وفا جمہور کے شاعر ہیں، مگر مذاق خاص لئے ہوئے۔ وہ انداز بیان میں رنگینیت کے ساتھ جدت کی طرف بھی مائل ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں اچھوتی ترکیبیں بھی ہیں۔ تازہ کار خیال بھی اور شاداب طرز بھی۔ میری رائے میں اگر وفا لغزش رندانہ کے امکانات اضداد کو اچھی طرح سمجھ لیتے تو ان کے فن میں اور زیادہ توازن پیدا ہو جاتا۔ وفا کی شاعری کی مختلف سطحیں ہیں کہیں رفعت ہے کہیں سپاٹ۔ مگر اس نشیب و فراز سے گزرتا ہوا فن کارامید افزا منزلوں کی طرف تیزی سے سفر کر رہا ہے۔ مجھے وفا کی یہ نظم بہت پسند ہے "شاعر کی التجا"۔

روشنی کیا ملے گی آنکھوں کو　　روشنی کے ان استعاروں سے
اب تو ہو جا طلوع میرے چاند　　کام چلتا نہیں ستاروں سے

وفا کے قطعات بڑے جاندار، خیال پرور، درد خیز اور دلکش ہیں۔ "کیا سحر اب کبھی نہیں ہوگی؟"(1) یہ ایک دلدوز سوال ہے

---

(1) ظلمتیں ہیں کہ بڑھتی جاتی ہیں　　آبدیدہ ہے روشنی دل کی

(باقی نوٹ اگلے صفحہ پر)

جو شاعر اپنے ایک قطعے میں کرتا ہے۔ وفاؔ گہری نظر سے مشاہدہ حیات کرتے ہیں اور وہ درد مند دل بھی رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں فکر کے عناصر بھی کافی ملیں گے۔ لیکن ان کے نظامِ فکر میں قدرے ہم آہنگی کی کمی ہے۔ وفاؔ کی شاعری ان کی غزلوں اور چھوٹی نظموں میں روشن تر ہے۔ بڑی نظموں میں جذبے کی آنچ تیز ہو کر تاثیر کو پراخشاں ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تاثیر بڑی نازک سی چیز ہے۔ اسے نہ زیادہ گرمی برداشت ہوتی ہے نہ سردی راس آتی ہے۔

وفاؔ کی شاعری میں تند اشارے بھی ہیں جو حقیقت حال پر مبنی ہیں ملاحظہ ہوں ان کی نظمیں "یادِ غم" "۱۹۴۶ء" "دیوالی" "لیڈر سے"۔ وفاؔ محبِ وطن شاعر ہیں۔ مگر لیڈروں سے زیادہ ان میں جرأتِ اظہار ہے۔

وفاؔ کی غزلیں سروسامانِ تغزل سے ہمکنار ہیں۔ ان غزلوں میں شاعر کا ذوق لطیف حسین رنگ میں پیش ہوا ہے۔ غزلوں میں فنکارانہ ہنسائش ہے۔ اور صنفِ غزل کی نوعی کمزوریوں کے باوجود وفاؔ کی غزلوں میں روحِ شاعری نور افشاں ہے۔

پاسِ ادب سے کام لے دیوانہ پن ابھی — ہستی نشاط روح سے ہے ہم سخن ابھی

بات یہ ہے کہ اردو کی محفل میں غزل کی ثقافت نظم کے کلچر سے زیادہ گہری اور اچھی ہوتی ہے۔ عام طور سے اردو کا شاعر غزل کی تخلیق میں زیادہ ہنر مند اور سبک کار ہوتا ہے۔ وفاؔ کی غزلیں بھی ہنر مندی سے پیش کی گئی ہیں۔ اور شاعر کے ذہن میں ان کے تجربات شعریت سے ترکیب پاکر شاعرانہ زندگی حاصل کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں مندرجہ ذیل اشعار:۔

چاندنی رات منفعل سائے — زندگی معصیت نہ بن جائے

اور

شوق جس کا شکست خوردہ ہو — وہ وفور ستم سے گھبرائے

جوشِ وحشت نہیں ہے قابو میں — کون دیوانگی کو سمجھائے

زبان کی سادہ پرکاری اور بے تکلف اندازِ بیان کے ساتھ اثر خیزی قابلِ تحسین ہے۔ "منفعل سائے" کی ترکیب جدید رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مندرجہ ذیل شعر کتنا گہرا ہے۔

ہر ذرہ اعتمادِ خودی کا ہو راہزن — وہ جلوۂ تمام اگر راہبر نہ ہو

وفاؔ کے رنگِ تغزل میں نغمہ کی لوچ، لچک اور گداز بھی ہے۔ ترنم کی لہریں نیرنگ ساماں ہیں۔ ان میں تنوع ہے ؎

ترا تبسم فریب آگیں، ترا تکلم امید افزا — تری اداؤں کو جانتا ہوں، تری ادا بے کرم نہیں ہے

اور ؎

ان کو آئے قرار ناممکن! — آپ واقف ہیں بے قراروں سے

اتنا تھا اضطراب کہ اے شمع انجمن — پردہ حریم ناز کا میں نے اٹھا دیا

جلوۂ مہر و ماہ کے پرستارو — کیا سحر اب کبھی نہیں ہوگی؟

نظم لمبی ہے آخری شعر یہ ہیں:۔

عزمِ آدم کی ہے قسم اے دل — جنگ ہی سے وجودِ عالم ہے

جو جھجکتا ہے موت یا غم سے — ننگ ہستی ہے ننگ آدم ہے

(شرارِ فطرت)

مندرجہ ذیل شعر میں خیال کے ساتھ ایک متحرک تصویر بھی ہے، کیسا اچھوتا خیال ہے ؎

روشن کیا تھا جس نے ازل میں چراغ عشق — کچھ سوچ کر اسی نے پھر اس کو بجھا دیا

اور کیف و حال کی سرمستی دیکھئے ؎

ناحد ممکنات لیا کام عقل سے — لیکن ادائے خاص نے مجنوں بنا دیا

شوخی اور بے تکلفی، تمکینی و رنگینی، رقص و مستی کی وفا کی شاعری میں کمی نہیں۔ ان کے خیال اور اظہار خیال میں روانی ہوتی ہے۔ وفا کی سادگی کی عمومیت بھی بے اثر نہیں ہوتی۔

جن سہاروں پہ زیست ہے موقوف — ڈھونڈتا ہوں انہیں سہاروں کو

پھر کوئی ظلم آپ ڈھائیں گے — میں سمجھتا ہوں ان اشاروں کو

شاعر سرمستی میں پتے کی بات بھی کہہ جاتا ہے۔

کس کس کو برق گر کے چمن میں جلائے گی — ہر شاخ گل پر ایک نیا آشیاں رہے

کیفِ بہار باعث صد اضطراب ہے — بے کیفیٔ بہار لئے گلستاں رہے

دوسرے شعر میں نازک بات کہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ داخلی کیفیات و واردات ہی پُر کیف ہوتی ہیں ورنہ خارجی پیکروں میں کیا رکھا ہے؟ وفا کی غزلوں میں اکثر مصرعے بڑے رواں اور ترشے ہوئے ہوتے ہیں ملاحظہ ہوں،

تم مسرت کا نام لیتے ہو — اس کی لذت میں خاص تلخی ہے

جو مرے دل میں ہے اسے سن لو — ان سے اتنی سی بات کہنی ہے

مسکرا کر وفا سے کہتے ہیں — اب طبیعت جناب کیسی ہے

اشعار کی سلاست، فصاحت داد کے قابل ہیں۔ وفا کی غزلوں کے استعاروں میں حقیقت کی تڑپ ہے اور انہیں دشنہ و خنجر سے وہ گفتگو میں کام چلاتے اور دردمندانہ پیام دے جاتے ہیں، ملاحظہ ہوں یہ اشعار:-

بناؤں گا ابھی اک آشیاں اور — کھلے گا گلستاں میں گلستاں اور

بہت سہمے ہوئے ہیں اہل گلشن — نہ کوئی گل کھلائے باغباں اور

خدا کا نام لب پر آگیا تھا — اسی دن سے ہوئے وہ بدگماں اور

وہ کہتے ہیں کہ تم بھی مسکراؤ — طبیعت چاہتی ہے کچھ یہاں اور

اداسی کہہ رہی ہے رہگزر کی — ابھی گزرے گا شاید کارواں اور

مٹانے سے مٹے گا نقش ہستی — بنا کر دیکھ اک آسماں اور

جلا کر جب چلی برق نشیمن — وہیں ظاہر ہوا اک آشیاں اور

لیا جب نام اس نے زندگی کا — ہوئی چشم محبت خونفشاں اور

مذکورہ بالا اشعار ۹ر نومبر ۱۹۵۲ء کی ایک غزل کے ہیں۔ اس غزل میں کتنی پائندگی پیدا ہوگئی ہے، تنقید حیات کی ہے مگر یہ انداز

(باقی صہ پر)

شاعرانہ۔ پیام امید سنایا ہے مگر خطیبانہ نہیں۔ ایک اور غزل کے چند پُر تاثیر اشعار سنئے:۔

شعورِ ہستی کی کشمکش سے گریز، احساس کمتری ہے — سکون کی ہے تلاش تجھ کو، سکون میں زندگی ملے گی؟

کسی کی بزم طرب میں اک دن خوشی کا نغمہ سنا تھا لیکن — ہماری آنکھوں میں اشک غم کی ہنوز ترتم کوئی ملے گی

ہماری آنکھوں میں حسن بھر کر نظر سے کوئی جھجک رہا ہے — کسی کی رنگین ادا کے صدقے کسی میں یہ سادگی ملے گی؟

کسی کے جلوے سے کیا غرض ہے مری نگاہ نظارہ جُو کو — مرے تصور رہیں سلامت انہیں سے کچھ روشنی ملے گی

وفا کا فن ترقی کر رہا ہے۔ شاعر کا شعور پختہ ہو رہا ہے۔ فنکار کی ہنرمندی اور اسلوب اظہار میں نفاست آ رہی ہے۔ بیشتر نظر مجموعہ میں کافی سامان نشاط موجود ہے۔ میں شاعر اور اس کے قدردانوں کے درمیان دیر تک حائل نہیں ہونا چاہتا، وفا کی آواز سنئے۔

سنا ہے کسی کا شباب آ رہا ہے — بلندی پر اب آفتاب آ رہا ہے

بقیہ: علیم عظیم آبادی (صفحہ ۱۶۸ کا)

اس نظم میں تمہید ہے، نفس مضمون ہے اور اختتام میں پوری نظم کا نچوڑ پیش کر دیا گیا ہے۔ اس نظم کے اکثر شعر مقالہ ہذا میں نقل کئے گئے ہیں۔ یہاں ہم آرٹ کی ایک دوسری خوبی بھی پاتے ہیں۔ یعنی ذہنی سکون۔

علامہ علیم کی شاعری، فن برائے فن قسم کی چیز نہیں۔ یہ شاعری زندگی کی حقیقتوں سے آشنا ہے۔ اس گنج گراں مایہ سے ہمیں حسن کے ساتھ صداقت بھی ملتی ہے۔ حسن و صداقت کی آمیزش انسانی روح کو ایک لازوال مدہوشی و سرشاری عطا کرتی ہے، مگر ایسی مدہوشی جس میں ماندگی نہیں بلکہ جوش عمل ہے، ایسی سرشاری جس سے سرفروشی ظاہر ہوتی ہے۔ حسن و صداقت کے ازدواج سے ایک ایسی وسیع کائنات نو پیدا ہوئی ہے، جہاں موت کی ہیبت ناکیاں معدوم ہوتی ہیں اور زندگی کی رحمت مسکراتی ہے۔

بقیہ: سید ابو الفتح سرمد (صفحہ ۱۵۹ کا)

پھر وہ اپنے اصلی موضوع کی طرف آتے اور جب بولنے لگتے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک آبشار الفاظ و معانی ہے کہ بہتا چلا جا رہا ہے اور علم و ادب کے موتی اچھل اچھل کر اذہان کے سبزہ زاروں پر رُلتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی شخصیت میں جمال پرستی اور حقیقت پسندی کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور نقاد سب ہی کچھ تھے۔ علامہ نیاز فتحپوری، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر احتشام حسین ان کے مداحوں میں تھے۔ پروفیسر اختر اورینوی کی وفات سے جو اردو زبان و ادب میں خلا پیدا ہو گیا ہے وہ مشکل ہی سے پر ہوگا۔ انہوں نے برصغیر میں عموماً اور صوبہ بہار میں خصوصاً اردو ادب کے فروغ اور اس کی آبیاری میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

پروفیسر اختر اورینوی

انشائیہ نگاری

یہ اب سے ۳۳ سال پہلے کا ایک مضمون ہے۔ پروفیسر سید اختر احمد اورینوی نے اپنے شاگرد سید علی اکبر قاصد کی انشائیہ نگاری کے تعارف میں لکھا تھا۔ سید علی اکبر قاصد تحریک پاکستان کے زمانے میں اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا شاہ حسین میاں قادری چشتی پھلواروی کے دست راست تھے۔ اور سیاست سے بھی ان کی دلچسپی براہ راست تھی، پاکستان قائم ہوا تو وہ کراچی چلے آئے، یہاں کے جمالیاتی شعور اور تنقیدی و تخلیقی صلاحیتوں نے قومی تعمیر کی راہ اختیار کی۔ انہوں نے کوآپریٹو موومنٹ کی ایسی قیادت کی جس نے خوابوں کو حقیقت کا روپ بخش دیا۔ انہوں نے انجینیرنگ نہیں پڑھی تھی نہ معماری سیکھی تھی۔ لیکن عملاً بڑے انجینیر اور بڑے معمار ثابت ہوئے، ان کے اندر قومی و ملی قیادت کے تمام اوصاف نمایاں تھے، کامرس بھی انہوں نے نہیں پڑھی تھی۔ لیکن چیمبر آف کامرس کے ممتاز اراکین میں ان کا شمار ہوتا تھا اور یہ سب کچھ اس قوت تنقید و تخلیق اور احساس جمال کمال کا اثر تھا جس کی پرورش ان کے اساتذہ نے ان کے اندر کی تھی۔ "ادارہ"

اردو ادب میں انشائیوں (Essays) اور خاکوں کی بڑی کمی ہے۔ کبھی کبھار کوئی اچھا سا انشائیہ پرچوں میں نکل آتا ہے تو دو گھڑی کے لئے جی بہل جاتا ہے۔ انشائیہ نگاری مضمون نویسی کی ایک خاص صنف ہے۔ اس کا چرچا مغربی ادب میں تو خاصا ہے مگر مشرق میں یہ پھلجھڑی چھوٹتی نظر نہیں آتی۔ اردو دنیا میں مضمون نگاروں کی کمی نہیں رہی۔ حالی، شبلی، شرر اور حسن نظامی کے مضامین و مقالے تو بکثرت ہیں اور ان میں سے بعض مضامین میں انشائیہ کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ تاہم خالص انشائیے نایاب ہی ہیں۔ سجاد حسین، مہدی افادی، نیاز، شوکت تھانوی، پطرس، ماینوری، عظیم بیگ چغتائی اور رشید احمد صدیقی کے مضامین میں انشائیت کافی پائی جاتی ہے۔ متقدمین میں حسن نظامی کے یہاں انشائیت کے جلوے سب سے زیادہ ہیں اور متوسلین میں رشید احمد صدیقی کے فن میں۔ نئی پود میں سے کئی نے اس رنگ میں سرسبزی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر پوری طرح سے کوئی بھی پھولا پھلا نہیں ہاں کنھیا لال کپور اور شرف الدین احمد عظیم آبادی کے انشائیے خاصے شاداب ہوئے ہیں۔ نیرنگ خیال کے ایام شباب میں شرف عظیم آبادی نے خوب خوب داد سخن دی تھی۔ تہذیب و عصمت میں بھی اس نے کیا کیا گل کھلائے تھے۔ "کاہلی"، "تبرکہ"، "گاندھی جی ناخانے میں"، "شعرائے گل و بلبل سے" وغیرہ انشائیے دھوم مچا چکے ہیں۔ فی الحال شرف "مرحوم" ہو کر دبیر الملک یعنی سپلائی کے محکمہ کے میر منشی بن گئے ہیں۔ خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

کرشن چندر کبھی تو مزے کا انشائیہ لکھتا اور نئے نئے گل بوٹے اگاتا ہے اور کبھی اس پر افسانویت، ایسی غالب ہوتی ہے کہ انشائیت کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔

انشائیہ طرازی نثر نگاری میں ایک خاص صنف ہے۔ ہر نثر بھی ادبی نہیں ہوتی۔ نثر کے ادبی ہونے کے لئے چند قواعد مقرر ہیں ان

میں سب سے زیادہ اہم دو ہیں۔ ایک نثری ترنّم (PROSE RHYTHM) اور دوسرے طرز (STYLE)۔ انشائیہ ادبی نثر کی ایک قسم ہے۔ ہم جسے عام مضمون کہتے ہیں کچھ ضرور نہیں کہ وہ انشائیہ بھی ہو بلکہ بات یوں بنے گی کہ مضمون نگاری کی دو موٹی موٹی قسمیں ہیں پہلی انشائیہ نگاری اور دوسری مقالہ نویسی یہ انشائیہ کے اندر جب نظمیت کے عناصر بہت زیادہ ہو جاتے ہیں تب وہ ادب لطیف بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل نقد نے ایک مضمون کے ایک نوع کو "خالص انشائیہ" کہا ہے۔ غرض انشائیہ نویسی ایک نہایت ہی منفرد فن ہو گیا ہے۔ مقالہ نگاری مضمون نویسی کی وہ صنف ہے۔ جس میں سنجیدگی، منطقیت اور استدلال زیادہ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں، مقالہ کسی تنقیدی، علمی، سماجی یا سیاسی موضوع پر ہو سکتا ہے اور اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ یعنی ادبی مقالات خواہ وہ کسی نوع کا علمی رنگ رکھتے ہوں۔ اور دوسرے اصطلاحی مقالات، اصطلاحی مقالات سے ادبیت پرواز کر جاتی ہے۔

انشائیوں میں چند خصوصیات ہوتی ہیں۔ انفرادی نقطہ نظر کے جلوے انشائیوں میں ضرور ہونے چاہئیں۔ یعنی موضوع کے متعلق ذاتی اور نجی ردّعمل کو ایک خاص انوکھے پن کے ساتھ پیش کرنا ضروری ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ انشائیہ نویسی بڑے عیش و آرام کی مزیدار فلسفہ طرازی ہے۔ دراصل انشائیہ فلسفیت اور رنگینی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایسی فلسفیت جس میں دل جلے پن، خشونت، یا وحشت خیز سنجیدگی نہ ہو۔ یہاں فلسفہ ہوتا ہے مگر بغیر رندھے ہوئے چہرے کے، رنگینی ہوتی ہے۔ مگر ذمہ داری کے ساتھ، رندی اور احتساب کا یہ عجیب و غریب مجموعہ مضحکہ خیز نہیں ہوتا۔ بلکہ امتزاج کامل کے نتیجہ میں ایک بڑی دلنواز شخصیت پیدا کرتا ہے۔ ایک ایسی صوفیت جس میں مزاح کا رنگ ملا دیا جائے۔

کہنے والوں نے یہ بھی کہا ہے کہ انشائیے دماغ کی آزاد "ترنگ" ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کسی موضوعِ سخن پر باضابطہ قسم کا مدلّل اور منطقی مضمون پیش نہیں کیا جاتا۔ بلکہ بات سے بات نکلتی جاتی ہے، اور کبھی بے بات کی بات پر بھی بڑے فلسفیانہ انداز میں خامہ فرسائی کی جاتی ہے۔ خیالات کو تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ بغیر پاسبانی کے وہ آوارہ ہو جائیں، خیالات عزم سفر نہیں کرتے اور نہ منزلیں مارتے چلے جاتے ہیں تاکہ ایک خاص منزل مقصود تک پہونچیں بلکہ انشائیوں میں خیالات کی گلگشت ہوتی ہے۔

انشائیوں کے لئے تھوڑی سی نظمیت ([illegible]) بھی ضروری ہے۔ یعنی نثر کے عام ادبی نمونوں کی نسبت انشائیوں کا رنگ کچھ شوخ ہوتا ہے۔ ایک ہلکی سی لہک سی، یوں سمجھئے کہ بس ایک آنچ زیادہ۔ جذبات، خیالات، تشبیہ اور استعارے روانی، سوز، بانکپن، ترنّم، ان چیزوں سے گل افشانی کی جاتی ہے۔ مگر بڑی لطافت سے اور روک ٹوک کے ساتھ اور اس کے نتیجہ میں جو تر شید ا ہوتی ہے وہ مقابلتاً زیادہ دلنواز اور خیال پرور ہوتی ہے۔

انشائیوں میں مزاح کا عنصر بھی ضروری ہے۔ ایک انشائیہ نگار مزاح کے ترکش کا ہر تیر استعمال کر سکتا ہے، مگر سلیقہ شرط ہے۔ مثلاً مزاح لطیفہ سے لے کر طنز تک کی یہاں گنجائش ہے۔ اور ہنسی مذاق۔ بولی ٹھولی، پھبتی، سوانگ۔ گدگدی، چٹکی اور ظرافت کی دوسری قسموں کا بھی برمحل استعمال انشائیوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ جملے بازی اور فقرے کستا یا دقت کی سوجھ یا کوئی پتے کی بات کہہ دینا یا کوئی چبھتا ہوا ریمارک یا ہلکی سی چوٹ، یہ سب کچھ ہو جا سکتا ہے۔ ظرافت کا استعمال ہر جگہ خوش مذاقی چاہتا ہے۔ انشائیوں میں بھی ظرافت کی چاشنی ایسی ہو کہ بس چاشنی ہی رہے۔ کبیدگی اور بیزاری پیدا نہ کرے۔ دراصل انشائیوں میں سب سے

زیادہ مزاح لطیف سمجھتا ہے۔ مزاح لطیف اگر وسیع ہمدردی کی بنا پر ہو اور بے لاگ تخیل کے سہارے پرواز کرے تو اثر خیزی بہت ہی تیز ہو جاتی ہے۔ ایسے مزاح میں درد و سوز کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ جو ہر چند کہ پوشیدہ رہتا ہے۔ مگر رہتا ضرور ہے۔ یہ حسن انگریزی انشائیہ نگاروں میں سے چارلس لیمب کو حاصل تھا اور جدید دور میں چسٹرٹن طنزیات کا بادشاہ ہے۔

انشائیوں میں ایک اور کیفیت بھی برتی جاتی ہے۔ جسے "بننا" کہتے ہیں کبھی تو انشائیہ نگار حقیقت پر ایک خوبصورت فریب کا پردہ ڈال دیتا ہے اور اچانک جہاں جی چاہتا ہے پردہ اٹھا دیتا ہے۔ پڑھنے والے کچھ سمجھ رہے ہوتے ہیں اور بات کچھ نکل آتی ہے لیکن کبھی کبھی فن کار کبھی خود بنتا ہے۔ اور کبھی دوسروں کو بناتا ہے۔

انشائیہ نگاری میں چونکہ نظمیت کا عنصر ہوتا ہے لہٰذا موضوعات کے متعلق داخلی ردعمل کا پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ اچھے انشائیے میں خارجی بیانات کے ساتھ داخلی تاثرات کا امتزاج ہوتا ہے۔ یہی داخلی صورت اظہار انشائیوں میں وہ گہرا کیف پیدا کرتا ہے جو اسے نظم کے قریب کر دیتا ہے۔ ویسے تو کوئی ادبی مضمون یا مقالہ ادبی بن ہی نہیں سکتا اگر اس کے اندر داخلیت کے جلوے نہ ہوں مگر انشائیوں اور ادب لطیف میں داخلی تصورات نمایاں تر ہوتے ہیں۔ چاند اور تاروں پر علم نجوم والے بھی مضمون لکھتے ہیں۔ اور گل سے گلقند بنانے کے قواعد اور گل کے فوائد سے عطار اور حکیم بھی بحث کرتے ہیں۔ مگر جب ایک ادیب چاند تاروں پر یا گل پر مضمون لکھتا ہے تو صرف اصلاحی رنگ نہیں ہوتا یا خالی خولی خارجی بیانات ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک داخلی تجربے کا اظہار کرتا ہے۔ جن کا تعلق ان موضوعات سے ہوتا ہے۔ شاعر بھی یہی کچھ کرتا ہے فرق صرف آنچ کا ہے۔ نثر کے ادیب اور نظم کے ادیب اپنی داخلی کیفیات کو مختلف طریقۂ اظہار سے پیش کرتے ہیں۔ ادبی نثر اور شاعری میں درد و سوز اور گھلاوٹ کا فرق ہے نیز تکنیک کا۔ انشائیہ نگار بھی ادیب ہوتا ہے اور وہ اپنے فن میں داخلیت سے روح پھونکتا ہے۔

انشائیوں میں مندرجہ بالا خصوصیات عموماً پائی جاتی ہیں۔ مگر جزوی رنگ میں نہیں۔ کلّی رنگ میں یعنی ان خصوصیات کو سمو کر، رچا کر فنکار ادبی نثر کی ایک خاص صنف پیدا کرتا ہے۔ جسے ہم انشائیہ کہتے ہیں۔ یہ ایک انوکھا مرکب ہوتا ہے آمیزہ نہیں۔

بعض دفعہ انشائیوں میں افسانوی رنگ ہوتا ہے۔ یعنی اس کی تماش میں ایک قصہ پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ یہ نہایت ہی نازک مرحلہ ہے۔ انشائیوں میں واقعات تو ہو سکتے ہیں مگر ان کا استعمال اور برتاؤ انشائیہ کے خاص رنگ میں ہونا چاہئے۔ اگر انشائیوں میں مختصر افسانوں کی تکنیک برت دی جائے تو پھر یہ انشائیہ نہیں رہے گا۔ بعض اُدبا انشائیہ لکھنے بیٹھتے ہیں مگر اس میں ماجرا اتنا بالیدہ ہو جاتا ہے۔ اور مختصر افسانہ کی تکنیک اتنی چھا جاتی ہے کہ نتیجہ میں جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ کم از کم انشائیہ نہیں ہوتی۔

مغربی اور مشرقی ادب میں اب ایک نئی صنف پیدا ہوتی نظر آتی ہے۔ اس صنف میں انشائیت اور مختصر افسانویت کا کامیاب امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اعلیٰ فنکاروں کے لئے نئے تماش (NEW PATERN) اور نئے نمونے (NEW - ESCANT) تخلیق کرنے کے لئے میدان کھلا ہوا ہے۔ اصناف ادب اسی قسم کے تجربات سے پیدا ہونے ہی رہتے ہیں مگر نوسکھ لوگوں کے لئے خطرہ ہوتا ہے کہ وہ دو جنسوں کو ملا کر کہیں مخنث نہ پیدا کر لیں۔ کبھی ادب میں بھی "خچر" پیدا ہوتے ہیں اور کبھی بار آور نئی مرکب جنس۔

انشائیوں کی تاریخ مغربی ادب میں ماؤنٹین (Montaigne) اور بیکن (Bacon) سے شروع ہوتی ہے۔ مگر یہ ابتدائی عہد تھے۔ دراصل انیسویں صدی میں انگریزی انشائیوں نے بالغ شخصیت اختیار کی۔ اس عہد کے فنکاروں نے انشائیہ نگاری کے

اعلیٰ اور منفرد نمونے پیش کئے ۔ ان میں لیمب، ہیزلٹ، ڈی کوئنسی وغیرہ ادبا ہیں۔ بیسویں صدی میں بھی یہ فن ترقی کرتا رہا۔ آج بھی انگریزی ادب میں بے مثل انشائیہ طراز ادبا موجود ہیں۔ مثلاً ڈین انج، جیروم، بکیلے، ورجینا اولف، ہربرٹ وغیرہ۔

ایشیائی تاریخ میں انشائیوں کی واضح روایات تو نہیں ملتیں مگر عربی اور فارسی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ایسے مضامین ملیں گے جن میں انشائیت کے بیج موجود ہیں۔ مثلاً گلستان سعدی میں چھوٹے چھوٹے ادبی مضامین و حکایات ایسے فنکارانہ رنگ میں پیش ہوئے ہیں کہ ہم انہیں بیکن اور ماونٹین کے مضامین پر بہر رنگ فوقیت دے سکتے ہیں۔ ہاں انیسویں صدی کے مغربی فنکاروں کا مقابلہ نہیں۔ مشرقی ادب میں انشائیہ نویسی نے منفرد بلوغت اختیار نہیں کی تھی۔

اردو ادب کی روایات کے دو سلسلے ہیں۔ ایک مشرقی اور ایک مغربی۔ صنف انشائیہ میں بھی ہمیں انہی دونوں پر نظر کرنی ہوگی۔ جدید انشائیہ نگاری اصلی معنوں میں انگریزی ادب سے متاثر ہے۔ مشرقیت کا اثر واضح اور نمایاں نہیں۔ ہمارے ادیبوں نے انگریزی اثر قبول تو کیا ہے مگر ابھی وہ اس مغربی فن کی باریکیوں کو سمجھ نہیں پائے ہیں۔ اردو ادب میں انشائیہ نگاری کی ترقی کے لئے بڑی گنجائش ہے۔ حالی، شرر اور حسن نظامی نے اس طرف کافی توجہ کی تھی اگر رفتار ترقی وہی رہتی جو ان بزرگوں نے حاصل کی تھی تو اب تک اس صنف میں اردو ادب کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوتا۔ پرچوں کی ترویج کے بعد انشائیوں اور مختصر افسانوں کی اشاعت کے لئے بہت ہی سازگار فضا پیدا ہو گئی تھی اور اب تک وہ فضا چھائی ہوئی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں تو عجیب بھیڑ چال ہے۔ لوگ شاعری کی طرف متوجہ ہوئے تو گریبان پھاڑ کر شاعروں کو سر پہ اٹھا لیا اور مختصر افسانہ نگاری کے پیچھے پڑے تو پھر ملک کا ملک داستان گو ہو کر رہ گیا۔ نئے اور آزاد تجربات سے جی ہچکچاتا ہے۔ بالیدہ ذہنیتیں، نئی شاہراہیں پیدا کرتی ہیں اور ہندوستان میں ذہن اور روح دونوں غلام ہیں۔

پیش نظر مجموعہ "ترنگ" جناب علی اکبر قاصد کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ قاصد نے پہلے پہل بی۔ اے کلاس میں ایک مضمون لکھا، میں نے اس مضمون کو سن کر یہ رائے قائم کی کہ یہ ہونہار نوجوان اپنے اندر انشائیہ نگاری کی بہترین صلاحیت رکھتا ہے۔ میں نے بعد میں قاصد صاحب کی توجہ اس طرف منعطف کی کہ وہ اردو میں انشائیہ لکھیں۔ یہ خدمت ادبی ہوگی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی نوجوان نہایت ہی اعلیٰ قسم کا انشائیہ لکھ کر اچانک طور پر پیش کر دیتا ہے۔ اس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ اس شخص کو میں اسی فن کی خدمت پر لگا دوں۔ بعد میں بات آئی گئی ہوتی ہے۔ کچھ تو نوجوانوں کے خلوص کی کمی کی وجہ سے، اور کچھ میری غفلت سے۔ مگر قاصد میں نہ خلوص کی کمی تھی اور نہ مجھ میں ان کی طرف سے غفلت کرنے کی ہمت کیونکہ وہ خود اپنے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ قاصد کو شاعری کا بھی ذوق ہے وہ تقریر اور اداکاری بھی اچھی کر سکتے ہیں۔ ان کی صورت مرزا غالب سے ملتی جلتی ہے۔ آپ جانئے غالب کے اندر بھی انشائیہ لکھنے کی بڑی صلاحیت تھی۔ خطوط غالب کو پڑھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ بے مثل مکتوب نگار اگر انشائیے لکھتا تو کیا غضب ڈھاتا۔ قاصد نے "روحوں کے مشاعرہ" میں غالب کا پارٹ ادا کیا تھا۔ ان کے سر پر چوگوشیہ ٹوپی خوب پھبی تھی۔ حد یہ کہ میں مرعوب ہو گیا تھا۔ قاصد پر انشائیت بھی پھبتی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

ڈاکٹر اختر اورینوی

سید علی اکبرؔ

۱۹۶۲ء میں سید علی اکبر قاصد نے انتقال کیا تو استاد نے اپنے شاگرد کی وفات پر یہ مضمون لکھا تھا، (ادارہ)

مجھے اخباروں کے ذریعے اور پھر قاصد مرحوم کے عم محترم[1] کے خط سے اس دلدوز سانحہ کی خبر ملی کہ وہ وفات پا گئے۔ کئی دفعہ میرا جی چاہا کہ میں پھلواری جاؤں اور قاصد مرحوم کے عم محترم سے مل کر اظہار تعزیت کروں لیکن میری ہمت نہ ہوئی۔ میں اپنے کو حقیقت کی تلخی برداشت کرنے کے قابل نہیں پاتا تھا۔ مجھ میں یہ تاب بھی نہیں تھی کہ عزیز مرحوم کے عم محترم کے پاس جاؤں۔ بھی تو محض اظہار تعزیت کے لئے جناب حسین نے میرے ساتھ ہمیشہ کرم فرمائی کی ہے۔ لیکن اپنی صحت کی خرابی اور مشغولیت کی وجہ سے میں بار بار پھلواری شریف نہیں جا سکا ہوں۔ اس کی مجھے ندامت ہے اور جب اس سانحے کے متعلق جناب نے خود مجھے خط لکھا تو میں عجیب کیفیت میں مبتلا ہوا بڑی تیز خواہش ہوئی کہ گریاں آنکھوں کے ساتھ پھلواری جاؤں اور جناب والا کے رنجور دل پر مرہم رکھوں۔ لیکن پھر یہ شدید احساس غالب ہوا کہ میں اپنے الفاظ کی بے بضاعتی اور اپنے اظہار غم کا کھوکھلا پن برداشت نہ کر سکوں گا۔ یہ سانحہ سب لوگوں کے لئے اتنا سخت تھا کہ اس کے متعلق اظہار غم رسمی تعزیت کے دائرہ میں آ ہی نہیں سکتا۔

ایک ماہ قبل جناب حسن مثنیٰ صاحب نے مجھے کراچی سے لکھا کہ وہ "مہر نیمروز" کا ایک خاص نمبر علی اکبر قاصد مرحوم کے متعلق نکال رہے ہیں۔ ان کی یہ خواہش ہے کہ میں قاصد مرحوم کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کروں۔ اس تقاضے کو بھی میں ایک ماہ تک ٹالتا رہا ہوں۔ میں نے کئی بار کوشش کی اور میری آنکھیں پرنم ہو گئیں اور تحریر نظروں سے اوجھل ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ عزیزم قاصد میرے متعلق کچھ لکھتے نہ کہ میں ان کے متعلق آج لکھنے بیٹھ رہا ہوں اس سے بڑھ کر اور کیا تکلیف ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے چھوٹوں کا ماتم کرے۔ پھر ادائیگی فرض کا احساس پیدا ہوا۔ اور حسن مثنیٰ صاحب کی دل شکنی کا خیال آیا۔ تو میں نے اپنے مندمل زخم کو کریدنا شروع کیا۔

انسان ہر لمحہ مرتا رہتا ہے۔ اور اس لمحہ بہ لمحہ موت کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ آخری سانس لے لیتا ہے۔ ماضی حقیقت کے اعتبار سے فنا ہو جاتا ہے اور عالم مثال وخیال میں قائم رہتا ہے جب بھی ماضی کو یاد کیجیے دل میں میٹھا میٹھا درد اٹھتا ہے اور کبھی یہ درد ٹیس کی طرح بیدار ہو جاتا ہے اور دل وزین جاتا ہے۔ وہ دن بھی کتنے اچھے تھے جب طلبا میں زیادہ اخلاص اور تہذیب تھی اور اساتذہ میں زیادہ محبت اور وقار۔ قاصد مرحوم کا حلقہ بہت بڑا حلقہ تھا۔ وہ اپنے دوستوں میں بھی محبوب تھے اور اپنے اساتذہ کے لئے بھی بہت پیارے۔ پٹنہ کالج بہار کا قدیم ترین کالج ہے۔ اور اس کی حیثیت صرف کالج کی نہیں ایک ادارہ، ایک مرکز تحریر اور ایک تحریک کی ہے۔ پٹنہ کالج سے عظیم آباد کے دور آخر کی تہذیبی روایتیں بھی وابستہ ہیں۔ بزم ادب کی حیثیت ایک ایسے مے خانے کی ہے جس میں بڑے چھوٹے سب مل کر بادہ نوشیٔ ادب کرتے ہیں۔ یہ طلبا کی انجمن ہے وہی اس

---

[1] مولانا شاہ غلام حسین چشتی پھلواروی

کے روح رواں ہوتے ہیں لیکن ان کے ساتھ اساتذہ بھی مل بیٹھتے ہیں اور اس مجلس میں اردو کے بڑے بڑے فن کار بھی شریک ہوتے رہتے ہیں مولانا عبدالحق[1] جوش، جگر، عندلیب، جذبی، مجاز، سرور و احتشام، عبادت وسلام، ساغر اور روش صدیقی۔ فراق اور اثر اور بھی کئی شاعر اور ادیب اس بزم زندان میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ علی اکبر قاصد بزم ادب کے نمایاں رکن تھے۔ عام صحبتوں کے علاوہ خاص صحبتوں کی تنظیم کا انہیں بڑا سلیقہ تھا۔ وہ اس بزم کے معتمد بھی رہے ہیں۔ علاوہ جلسوں کے موقعوں پر ہم لوگ کبھی کبھی اردو ڈرامہ بھی پیش کرتے ہیں۔ اب تو بزم ادب کا اسٹیج سونا سونا سا ہے۔ لیکن بزم نے کئی پر لطف ڈرامے پیش کئے تھے۔ ایک ڈرامہ میں مولانا عبدالحق مرحوم بھی شریک تھے اور انہوں نے تمثیل کی بڑے اچھے الفاظ میں تحسین کی تھی۔ یہ ڈرامہ علی اکبر قاصد مرحوم مجتبیٰ، شمس، حسنین، منان، فضل قیوم وغیرہ (طلبہ) کی اداکاری کی وجہ سے نہایت کامیاب ہوئی تھی (روحوں کا مشاعرہ) میری نگرانی میں خود لڑکوں نے ترتیب دیا تھا۔ ڈرامائی رنگ میں دور وسطیٰ کی داستانی چشمک کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے ارتقا کو بھی پیش کیا گیا تھا۔ اور علامہ اقبال اور جوش سے گزرتے ہوئے مجاز اور میراجی، راشد اور نظر تک مناظر پیش کئے گئے تھے اور ادبی سطح پر خوب خوب ڈرامائی تصادم دکھایا گیا تھا۔ علی اکبر قاصد نے غالب کا پارٹ ادا کیا تھا۔ میک اپ کے بعد وہ بالکل غالب کی طرح معلوم ہوتے تھے اور اداکاری میں بھی انہوں نے اپنے اوپر غالبیت طاری کر لی تھی۔ مجھے یاد ہے شمس الضحیٰ نے بہادر شاہ ظفر کا پارٹ ادا کیا تھا۔ اور جب وہ ظفر کی دردناک غزل پڑھنے لگے تو مجمع پر سناٹا طاری ہو گیا۔

لڑکے دیر دیر تک کالج میں ریہرسل کرتے رہتے تھے۔ اور اسٹیج کی تعمیر میں وہ جس انہماک سے مشغول ہوتے تھے وہ دیکھنے اور مسرور ہونے کی چیز ہوتی تھی، علی اکبر مرحوم کو کام کرنے میں لطف آتا تھا۔ اور وہ اتنے لگن سے کام کرتے تھے کہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ وہ صرف تنہا کام نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں کام لینے کا سلیقہ معلوم تھا۔ وہ اپنے دوستوں کا تعاون حاصل کرتے تھے اور اس حصول تعاون میں فوقیت کا نام تک نہ ہوتا تھا۔ بڑی مساوات کے ساتھ جمہوری رنگ میں بھائیوں کی طرح کام کرتے تھے۔ اور قاصد ان کاموں میں شیرینی، شگفتگی اور شادابی پیدا کرتے تھے۔

طلبا کے حلقہ کا جوش عمل اتنا فراواں تھا کہ ان میں سے ایک منتخب جماعت نے ایک اور ادبی انجمن بنا رکھی تھی۔ یہ انجمن بڑی زندہ دل تھی غالباً اس کا "شمع ادب" نام تھا۔ اس تنظیم کے قیام میں حسنین نے مرکزی حیثیت سے کام کیا تھا۔ یہی حسنین آج ڈاکٹر حسنین ہیں (پروفیسر گیا کالج گیا) علی اکبر قاصد منان (پروفیسر منان جونیر) مجتبیٰ (جو پاکستان میں کسی اونچے عہدے پر ہو ں گے) شمس الضحیٰ جو غالباً کوئٹہ میں پروفیسر ہیں[2] جیلانی (جو کہیں مشرقی پاکستان میں ملازم ہیں) اور چند دوسرے طلبا اس انجمن کے اراکین میں شامل تھے۔ یہ انجمن بزم ادب کی ایک "آوٹ ڈور" شاخ تھی۔ اس کی نشستیں کبھی دریائے گنگا کے شمالی ساحل پر ہوتی تھیں کبھی کشتیوں پر، کبھی کالج کے چمنستان میں (ولسن گارڈن) کبھی پٹنہ میوزیم کے خوبصورت احاطہ میں اور کبھی منیر شریف کے ڈاک بنگلہ کے سامنے والے تالاب کے کنارے۔ کبھی کبھار میں بھی اس انجمن کی نشستوں میں شریک رہا ہوں۔ طلباء اپنے مضامین، تنقیدیں، انشائیے، لطیفے، غزلیں اور نظمیں سنایا کرتے تھے اور پھر ان پر اہل مجلس بڑی سنجیدگی سے آزادانہ تنقید کرتے تھے، کیا دن تھے کہ جب کوئی تنقید سے ناراض نہیں ہوتا تھا بلکہ ترقی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ آج اس انجمن کے اکثر اراکین اردو دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ علی اکبر قاصد کو نہایت نفیس انشائیہ نویسی کا درک حاصل تھا۔ قاصد نہایت شگفتہ انشائیے لکھا کرتے تھے۔ انہیں انشائیوں کا مجموعہ "ترنگ" کے نام سے میری تحریک پر شائع بھی ہوا۔ میں نے اس پر ایک مختصر تعارف لکھا۔

---

[1] ڈاکٹر عبدالحق، جگر مرادآبادی، عندلیب شادانی، اسرار الحق مجاز، روش صدیقی اور نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی بھی اس دنیا سے کوچ کر چکے۔

[2] شمس الضحیٰ پہلے کوئٹہ میں تھے پھر کراچی یونیورسٹی میں آگئے۔ شمس ضحیٰ کے نام سے مشہور تھے افسوس کہ اس جواں سال نے بھی اس دار فانی کو چھوڑا اور یہ دوسرا زخم ہے جو ڈاکٹر اختر اورینوی کے دل پر لگا ہوگا۔ جیلانی کراچی میں ہیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ قاصد کو اداکاری[1] کا بھی بڑا ذوق تھا۔ ایک دفعہ اور ہم لوگوں نے ڈرامہ پیش کیا تھا۔ غالباً اس ڈرامہ میں بھی علی اکبر قاصد نے حصہ لیا تھا" طلوع اسلام اور ابلیس کی مجلس شوریٰ" یہ ڈرامہ بھی لڑکوں کی کوششوں سے بہت کامیاب ہوا تھا۔ بڑے معرکے کے دن تھے۔ برصغیر میں عظیم تحریکیں چل رہی تھیں۔ اس ڈرامہ میں تاریخ عالم کو مختلف مناظر میں علامتی طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اور اس تاریخ کا سب سے روشن باب طلوع اسلام تھا۔ بعد ازاں مسلمانوں کا انحطاط دکھایا گیا تھا۔ اور اسی دور زوال میں سرمایہ داری، فسطائیت، نادسیت اور اشتمالیت کا عروج اسٹیج پر پیش کیا گیا تھا۔ پھر یہ بھی دکھلایا گیا تھا کہ "سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے کہ شیر پھر ہوشیار ہوگا" اور اس سلسلہ میں اقبال کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ کو ڈرامائی رنگ دے دیا گیا تھا۔ کالج جمنازیم میں ہی اسٹیج بنا ہوا ہے۔

سارا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ اثر و تاثیر کا یہ عالم تھا کہ اپنے اور پرائے سب انہماک سے اسٹیج کی طرف لو لگائے تھے ان دنوں مجھ پر وجع المفاصل کا سخت حملہ ہوا تھا۔ لیکن میرے ان عزیز شاگردوں نے اس قابل بنا دیا تھا کہ میں دو دن۔ رات کے دو بجے تک کام کرتا رہا تھا۔ مجتبیٰ علی اکبر قاصد، منان، معین خاں، شمس الضحیٰ، جینین وغیرہ جیسے عزیزوں کی قربت میں بیماری کا احساس بھی باقی نہیں رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ "دل گرمے، نگاہ پاک بینے، جان بیتابے" ڈرامے کے درمیان اچانک میرے نام کالج کے پرنسپل کا ایک پرزہ آیا انہوں نے مجھے بلا بھیجا۔ میں اسٹیج پر پس پردہ ہدایت کاری میں مشغول تھا دل دھڑک رہا تھا، پاؤں لرز رہے تھے اور میں اب اس عالم میں آ گیا تھا کہ دیوار سے ٹیک لگا کے آہستہ آہستہ ہدایتیں دے رہا تھا۔ اور اسٹیج پر بھاگ دوڑ ہو رہی تھی، و لے برندش پرنسپل صاحب کے پاس گیا۔ جو ہال سے برافروختہ ہو کر اپنی کوٹھی پر جا چکے تھے۔ میں وہیں گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ کالج کا ڈرامہ ہو رہا ہے یا تبلیغ اسلام۔ بس کچھ نہ پوچھئے، کہ کس طرح میں نے یہ بلا ٹالی اور ڈرامہ اپنی تکمیل کو پہنچا۔ میں جانتا ہوں کہ اگر مجھ پر بنتی تو علی اکبر قاصد مرحوم اور ان کے سارے دوست میرے ساتھ ہوتے اور ایک ایسا موقع آ ہی گیا تھا۔ جب کالج میگزین کے سرنامے کے متعلق مسلم طلبا میں بے چینی پیدا ہوئی۔ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ کامیابی انہیں حاصل ہوئی جو نڈر تھے۔ ان دنوں لڑکوں کے درمیان بڑی وفاداری اور راجوت تھی اساتذہ بھی بڑے باوفا تھے، شعبۂ اردو پر یہ شبہ ہوا کہ مسلم طلبا کے درمیان اسی شعبہ نے تحریک چلائی لیکن حقیقت یہ تھی کہ کسی کے چلائے سے تحریک نہیں چلی تھی۔ بے ساختہ طور سے چل نکلی تھی۔ میں نے دیکھا کہ علی اکبر قاصد ان دنوں بہت ہی جری، ہوش مند، سنجیدہ اور حکم ماننے والے ثابت ہوئے تھے میں اس دور کے متعلق آج بھی سوچتا ہوں تو میرے دل میں ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ علی اکبر قاصد کا تعلق چار سال تک کالج سے رہا۔ لیکن وہ اس کے بعد بھی وہ مجھ سے ملتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں میری ان کی ملاقات مونگیر میں ہوئی۔ فسادات کے دن تھے اور ہم سب فکرمند تھے۔ غالباً اس کے بعد بھی قاصد مرحوم کی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ لیکن تفصیل سے ملنے کا موقع نہیں ملا۔ اور پھر ان صحبتوں کے لئے جی ترس گیا جو ہم لوگوں کو ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک حاصل رہیں۔

---

[1] اداکاری کے اسی شوق نے سید علی اکبر کو فلم سازی کی طرف متوجہ کیا۔ وہ فلموں کے اچھے برے اثرات سے آگاہ تھے اور کہتے تھے کہ "پاکستان میں فلم سازی کو صحیح راستے پر لگایا جائے، غیر ملکی فلمیں قوم کے ذہن و فکر کو مسموم کرتی رہتی ہیں اور ملکی فلمیں بھی غیر ملکی سمت دانستہ یا نادانستہ اپنی قوم کے حلق میں انڈیل رہی ہیں، اگر ہم آگے نہ بڑھے تو ہماری فلم ساز کمپنیاں اغیار کا آلہ کار بن جائیں گی"۔ سید علی اکبر نے اپنے ہم خیالوں کو ساتھ لے کر قدم آگے بڑھائے تھے مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ لیکن ان کا یہ خیال بہر حال زندہ ہے کہ ہمیں اپنے ملکی فلم سازی کو صحیح راستے پر لگانا چاہئے اور انہیں اپنی فکر و نظر اور اصول و اقدار کا ترجمان بنانا چاہئے۔ (ادارہ)

سید علی اکبر (غالب)　　　سید محمد حسین (رند)

اختر اورینوی

ایک درخت کا قتل

(آخری مطبوعہ زمرویہ افسانہ)

ایک کوارٹر کے پہلو میں ایک بہت ہی اونچا مضبوط، گھنیرا اور خوبصورت درخت تھا۔ شہر کے ایک مشہور باغ کو بڑی بدسلیقگی سے کاٹ کر بے ربط اور بد وضع کوارٹر کھڑے کر دیئے گئے تھے، بے ہنگم، نہ ناک درست نہ نقشہ۔ صرف ایک کوارٹر اسی چھتنار اور بلند و بالا درخت کی وجہ سے بہت بھلا لگتا تھا۔ ہرا بھرا، سایہ دار، ماحول کے بے کیف سپاٹ پن اور بد آہنگی کو دور کرنے والا۔ گہری جڑیں، لوڈل، بھاری بھرکم، اونچا تنا، پھیلی ہوئی صحت مند شاخیں، سرسبز کونپلیں، سندر ہرے برتے ہوئے پتے اس پیڑ کی سربلندی کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا تھا اور آسمان کی طرف نظریں اٹھ جاتی تھیں۔ دل میں بڑا اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔ جس مٹی سے ایسا وشال درخت اگے وہ مقدس محسوس ہوتی تھی۔

اس پرانے باغ کے نہ جانے کتنے خوب صورت اور پھل دار درخت کاٹ کر پھینک دیئے گئے ہوں گے، آم، لیچی، جامن، امرود اور شریفے کے پیڑ۔ افتادہ زمینوں اور بنجروں قطعوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن نہ جانے کس جبلّت کی تسکین کے لئے یہی حسین باغ قتل گاہ بنایا گیا۔ اس برباد باغ کی ایک تاریخ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شاہی وقت کا باغ تھا۔ ایک فراخ دل نواب نے اپنے جگری دوست ایک مہاراجہ کو "تحفتاً" یہ باغ پیش کیا تھا۔ انہی دنوں ایک کامل فقیر باغ کے ایک گوشے میں دھونی رما بیٹھا۔ مہاراجہ نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ اسے نیک شگون سمجھا اور پہلو میں ایک قطعہ اراضی بھی شاہ صاحب کو دے دی۔ آج بھی اس احاطے میں قبریں موجود ہیں۔ خدا رسیدہ فقیر کا سالانہ عرس ہندو مسلمان سب مل کر دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ جس عظیم الشان درخت کا ذکر ہے شاہ صاحب کی قبر پر سایہ کئے ہوئے تھا، جیسے چھتر لگانے کی سعادت حاصل کر رہا ہو۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ یہ درخت بھی متبرک ہے اور اس خطے کی خاک پاک ہے۔

جب انگریزوں کا راج ہوا تو لیفٹیننٹ گورنر بہار نے سخت دباؤ ڈال کر یہ باغ مہاراجہ سے اونے پونے خرید لیا۔ یہیں سرکار بہادر کی کوٹھی بنی۔ مگر باغ کا بڑا حصہ قائم رہا اور وقت پر دیتا رہا۔ قبریں رفتہ رفتہ منہدم ہو گئیں اور ان کے نشانات بھی مٹتے گئے، لیکن پیر صاحب کی قبر جیسی تھی ویسی رہی۔

۱۸۵۷ء کے ناکام ہندوستانی انقلاب کے بعد اسی باغ میں کئی مجاہدوں کو سولی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔ انگریزی راج محل خون اور گوشت کے گارے سے تعمیر ہوا۔ اس وشال پیڑ نے یہ خونیں ڈرامہ دیکھا تھا۔

خلقت کہتی ہے کہ اس عجیب درخت کی خونِ شہدا سے آبیاری ہوتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر درخت کے پتے یا شاخیں کوئی توڑتا تو ان سے سرخ خون ٹپکنے لگتا تھا۔ اس وجہ سے جب نئے کوارٹر باغ کے درختوں کو کاٹ کاٹ کر بنائے جانے لگے تو کسی بڑھئی کی یہ جرأت

نہ ہو سکی کہ اس مبارک زندہ جاوید درخت پر آرا چلائے۔

یہ درخت عجوبۂ روزگار تھا۔ اس کا نام کوئی صحیح طور پر نہیں جانتا تھا۔ کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ نہ پھول نہ پھل مگر ہریالی و شادابی یعنی سکھ اور سکونِ دل وجان۔ یہ بھی مشہور تھا کہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے پھول کھلتے تھے، پھل لگتے تھے۔ اس بات کی شہرت بھی تھی، فرنگیوں کی حکومت کے بعد تین چار بڑے خوشبودار پھول کھلے اور لال لال پھل آئے اور فرنگیوں کو بڑا تعجب ہوا۔ ادھر برسوں سے کسی نے پھول دیکھے نہ پھل پائے۔ شہر بھر میں ایسا اور کوئی پیڑ نہ رہا۔ ریاست اور ملک بھر میں لاثانی اور فرد ہو تو عجب نہیں۔ مجھے اس درخت کے وقار سے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آندھیوں، طوفانوں کو آڑے گا۔ وہ ہمارا سپر تھا۔ سہارا تھا، مربی تھا، ہم سایہ تھا، ساتھی تھا، دوست اور غم گسار تھا وہ قطب نما تھا۔ ایک عظیم و رفیع علامت تھا۔ پورے احاطے کی انفرادیت اس سے قائم تھی میں پہروں اسے دیکھتا رہتا تھا۔ ہر موسم میں اس کی الگ بہار تھی، صبح، دوپہر، شام جب دیکھئے وہ دلکش تھا۔ چاندنی راتوں میں اس کا حسن دیدنی تھا۔ اندھیری راتوں میں وہ ایک بلند و بالا اور قوی جاگتا ہوا سنتری دکھائی دیتا تھا اور اس کی حفاظت میں ہم لوگ سکھ کی نیند سوتے تھے اس کی خاموش ہم کلامی میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کبھی تو میں یہ محسوس کرتا کہ اس درخت کا بیج میرے دل میں ہے کبھی نہ کبھی وہ انکر آئے گا اور ایک عظیم و سرفراز شجر بن جائے گا۔

اس شاداب درخت کو کاٹ کر گرانے کی کوششیں برسوں سے ہو رہی تھی۔ لیکن اس کی تقدیس جاننے والے بڑھئی اور مزدور اسے کاٹنے سے ڈرتے تھے۔ درخت کی رگوں میں لہو تیرتا ہے اور اس کا سایہ پیر صاحب کی خدمت گزاری کرتا ہے۔ وہ قبر کے کنارے جیتے جاگتے پاسباں کی طرح چوکس کھڑا تھا کبھی کوئی ٹھیکہ دار دور کے شہروں سے مزدور لاکر اس پاک پیڑ کو کاٹ کے اور اس کی لکڑیاں بیچ کر نفع کمانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ دیکھا گیا کہ درخت کے کسی تنے یا شاخ پر تبر چلاتے ہی سرخ عرق ٹپکنے لگتا اور کارندوں پر دہشت طاری ہو جاتی اور کام رک جاتا۔ ایک بار کلہاڑا چلانے والا درخت کی کسی اونچی شاخ سے گر کر مر گیا۔ کبھی کوئی مزدور خطرناک طور پر بیمار پڑ جاتا۔

غرض یہ کہ حیات و رحمت کا علم بردار درخت فضا کی رفعتوں پر لہلہاتا رہا اور اس کا ماحول امن کا گہوارہ بنا رہا اسے دیکھ کر شکتی اور شانتی کا احساس ہوتا تھا۔

پچھلی گرمیوں میں نہ جانے کہاں سے ایک سخت دل اور بیباک ٹھیکہ دار کو انجان اور ڈھیٹ کارندے مل گئے۔ اور ایک نئی ترکیب سے اس شاندار پیڑ کا قتل شروع ہوا۔ بڑے بڑے لانبے اور موٹے رسوں سے اس درخت پر پھانسیاں بنائی گئیں۔ بالائی پتلی پتلی شاخوں کو کاٹ کاٹ کر پھانسی چڑھایا جانے لگا۔ پھر بڑے تنوں کی باری آئی اور انہیں آرے سے کاٹ کاٹ کر پھانسی پر لٹکایا گیا کئی مزدور کٹے ہوئے تنوں کو آہستہ آہستہ جھلاتے ہوئے زمین پر لے آتے، یہ اہتمام اس لئے تھا کہ کوارٹروں کو نقصان نہ پہنچے یہ پیڑ جڑ کے پاس سے کاٹ کر گرایا نہیں جا سکتا تھا، اس کا وقار و جلال لرزہ پیدا کر دیتا تھا۔ اس میں زمین کا جاں بخش رس تھا، بلند آسمانوں کی کرنوں کی روشنی اور دھڑکتی ہوئی زندگی کی شادابی تھی۔

پندرہ دنوں تک اس درخت کو پھانسی دی جاتی رہی، عضو بہ عضو لال لال عرق بہتا رہا۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد خون کے چھیچھڑوں کی طرح جم جاتا۔ اس کے عرق کا رنگ ببول کے گوند کی طرح پیلا نہ تھا۔ کوارٹروں کی نالیوں میں لال لوتھڑے کیچڑ کے ساتھ مل کر بہہ رہے تھے۔

اچانک کئی مزدور بیمار پڑ گئے اور کئی موٹے موٹے رسّے پارہ پارہ ہو گئے۔ پندرہ دنوں کے لئے کام رک گیا۔ لانبے لانبے بالوں اور

چڑھی ہوئی آنکھوں والے ٹھیکہ دار کو بڑی تشویش ہوئی محلے کے لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں۔ اور پیر صاحب کی کرامات کے چرچے ہونے لگے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو چاہتے تھے کہ اونچا جھاڑ درخت کٹے تو وہ اپنے کوارٹروں کے چھوٹے چھوٹے احاطوں میں مولی، گوبھی، آلو اور چقندر اگا کر کچھ پیسے حاصل کرلیں۔ اس عظیم درخت کی قلمرو میں مولی اور چقندر کہاں اگ سکتے تھے۔ ہاں امن سکون طمانیت، راحت اور حسن کی نشو و نما ہوتی رہتی تھی اور چین کی برکھا برستی تھی۔

کام پھر شروع ہو گیا۔ درخت کے بڑے بڑے موٹے موٹے تنے کٹنے لگے۔ کئی تنوں سے جہازی لمبے کئی سمتوں میں باندھے جاتے تھے اور ان کے سرے درجنوں مزدور زمین پر کھڑے تن کر پکڑے رہتے تھے۔ درخت کے تنوں پر کلہاڑے اور آرے سے تیز دست مزدور اس کے جوڑ بند کاٹتے جاتے تھے۔ اور مضبوط رسوں سے باندھ کر انہیں آہستہ آہستہ جھلا جھلا کر زمین پر کوارٹروں سے بچا بچا کر گرایا جاتا تھا۔ دور سے ایسا لگتا کہ قد آور گھٹیلے بدن کے پہلوانوں کو پھانسی دی جارہی ہے اور ان کی جسیم لاشیں زمین پر پڑی ہیں۔

روزانہ دو یا تین تنے بھی کاٹے جا سکتے تھے اور انہیں نیچے لانا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ رسّے کئی پہلوؤں سے باندھے جاتے اور کئی سمتوں سے کھینچے جاتے تھے اور مرکزی رسّے کو دھیرے دھیرے ڈھیل دے کر اس حساب سے دیو قامت تنوں کے ٹکڑوں کو کوارٹروں کی چھتوں اور دیواروں سے بچا بچا کر زمین پر گرایا جاتا تھا کہ ان پر ضرب نہ پڑے پھر بھی زور کا دھماکہ ہوتا تھا اور در و دیوار لرز جاتے تھے۔

چند دنوں میں جیسے جاگتے، شاداب و ثمر بار درخت کا عضو عضو کاٹ ڈالا گیا۔ جیسے یہودی لوگوں کو صلیب پر چڑھانے کے بعد ان کی ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔ میرا ذہن مہینے بھر تک سولی پر چڑھتا رہتا اور میرے دل کو صلیب دی جاتی رہی۔

اب ایک محیط رعب دار جڑیلا تنا اور اسی سے نکلے ہوئے دو توانا تنوں کے ٹکڑے بے برگ و بار بے دم ہو کر رہ گئے۔ اوپر کے دونوں تنوں سے بندھے رسے جھول رہے تھے۔ ایک صبح میں اپنے احاطے میں ٹہل رہا تھا۔ میری نظر اس ٹھنٹھ درخت پر پڑی۔ زمین پر تنوں کی لاشیں بے سدھ بکھری ہوئی تھیں۔ بہت سے تنے اور شاخیں ٹھیکیدار بیل گاڑیوں پر لے جا چکا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سامنے ایک دیو قامت غلیل ہے۔ اس کا عظیم دیو قامت غلیل ہے، اس کا عظیم دو شاخہ آسمان تک بلند ہونا چاہتا ہے اور مہیب دستہ دھرتی کے ہاتھ میں ہے اور اب شکتی شالی دھرتی کٹے ہوئے تنے کے چھوٹے چھوٹے ٹونوں کو چھوٹی پر چا کر شست باندھے گی اور قاتلوں پر بھرپور نشانے لگائے گی۔

ایک روز دو شاخہ بھی کاٹ دیا گیا مگر گرتے گرتے دو شاخہ کے ایک بازو نے ایک کوارٹر کی دیوار سے ٹکرا کر اسے شق کر دیا اور دوسرے بازو نے دوسرے کوارٹر کے گیراج کی چھت کو پارہ پارہ کر ڈالا۔

نہ جانے کیوں مہینوں قتل و غارت کا کام پھر ٹھیکیدار نے روک دیا اور وسطی جڑیلا تنا دیوار سے ٹنگی ہوئی لاش کی طرح کھڑا رہا۔

ہفتوں یہ دردناک مقتول امن و شادابی کی علامت بن کر میرے دل میں تیر نیم کش کی طرح پیوست رہا اور دو شاخے کے دونوں بازو کی عظیم ٹوٹی ہوئی بیسا کی کے بالائی حصوں کی مانند اس سروتن بریدہ درخت کی لاش کے سامنے زمین پر پڑے رہے۔ بیساکھ اور جیٹھ کے مہینے ختم ہو گئے اور اساڑھ آ گیا۔ وقفے وقفے سے بادل کے ٹکڑے آئے اور کچھ چھڑ کاؤ ہوتا رہا۔ ایک صبح روح پرور معجزہ رونما ہوا۔ اسے دیکھ کر ہم سب خوشی سے لہلہا اٹھے۔ چند ہی دنوں بعد ٹھیکیدار پھر نمودار ہوا۔ اور درخت کے وسطی تنے پر مزدوروں کو آرا چلانے پر آمادہ کیا۔ پہلے کلہاڑیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ ہم لوگ چوکنا ہو گئے اور بھاگتے ہوئے مقتول درخت کی طرف آئے دیکھا کہ درخت کو جڑ سے کاٹا جا رہا ہے۔

ہم لوگوں نے ٹھیکیدار اور عملے سے پرزور احتجاج کیا اور انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ جڑ والا تنا ہرگز نہیں کٹے گا۔ جو زمین پر گرے

(باقی صـ پر)

ہوئے تنوں کے ٹکڑے ہیں انہیں چاہو تو اٹھا کرلے جاؤ، جڑ میں اب ہرگز ہاتھ لگانے نہیں دیا جائے گا۔ تند و تیز مجادلے کے بعد ٹھیکیدار اور اس کی ذرّیت دفع ہوئی اور دوسرے دن وہ لوگ تنوں کے افتادہ ٹکڑے لاد کرلے گئے۔

مجروح جڑ یلا تنا صبر، استقلال، اطمینان اور امید کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بالائی پہلوؤں میں سر سبز نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اور کوارٹروں کی چھتوں سے اونچی چند نئی ہری بھری شاخیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔

وہ رحمت نشان درخت مر کر پھر جی اٹھا تھا کیونکہ اس درخت کو ابھی اور بہت کچھ دیکھنا تھا۔ (بشکریہ نقوش لاہور)

عکس تحریر اختر اورینوی

ڈاکٹر اختر اورینوی

غزل

تجھ کو معلوم ہے دل پر مرے کیا گزری ہے
وادیٔ غم سے دعا آبلہ پا گزری ہے

تیرے کاکل کی مچلتی ہوئی یادوں کی قسم
آہ نکلی ہے ترے بن جو صبا گزری ہے

سایۂ ابر ہیں شادابیٔ قامت اللہ
موجِ دریا ترے قدموں پہ فدا گزری ہے

ٹہنیوں نے ترے شانوں کی بلائیں لی ہیں
سبزۂ و گل سے تری زلف رسا گزری ہے

سیر کہسار کی وہ خواب سی سرشار فضا
روحِ بیدار سے نغمے کی صدا گزری ہے

تیرے چونکے ہوئے تیور پہ نچھاور ارمان
تیرے کھوئے ہوئے عالم سے دعا گزری ہے

کوئی اختر کو بھلا، دیگا تسلی ہمدم
زندگی اس کی خود اپنے سے خفا گزری ہے

اختر اورینوی

ایک منظر

گل رخوں، لالہ لبوں، رنگیں عذاروں کا ہجوم
شوخ چنچل لڑکیاں ہیں یا شراروں کا ہجوم
چاند کے ٹکڑوں کا یا شوریدہ پاروں کا ہجوم

فطرت رنگیں قلم کے شاہکاروں کا ہجوم
دل ربا، تمکیں شکن، تقویٰ شکاروں کا ہجوم
جلوہ گستر حسن کے سرمایہ داروں کا ہجوم
آستاں جُو عشق کے پروردگاروں کا ہجوم

سبزۂ شاداب پر شہلا جمالوں کا ہجوم
سون کے وادی میں رقصاں ہے غزالوں کا ہجوم
غنچۂ نورس، ثمرور، نونہالوں کا ہجوم
شاعر سرشار کے رنگیں خیالوں کا ہجوم

ڈاکٹر اختر اورینوی

میرا نظریۂ فن

میں سوچتا ہوں کہ جب میں نے شاعری اور افسانہ نگاری شروع کی تھی تو کیا میرا کوئی نظریہ تھا۔ میرا حافظہ مجھے جواب دیتا ہے کہ کوئی نظریہ نہیں تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ شعر و ادب کی طرف جھکاؤ پیدا ہوا، ریاضی میں نسبتاً کمزور تھا مگر انگریزی اور اردو ادب سے بڑی رغبت تھی۔ جغرافیہ کی طرف بھی طبیعت بہت مائل رہی۔ نقشے اور ریلیف نقشے بنایا کرتا تھا اور انعام حاصل کرتا تھا۔ بعد ازاں سائنس کا طالب علم بنا۔ اس دور میں بھی اردو ادب سے دلچسپی بڑھتی گئی، میڈیکل کالج کی طالب علمی کے زمانے میں بھی ادبیات کی طرف دل کھنچتا تھا۔ دو سال کی صحرا نوردی میں ادب و شعر ہی کا سہارا ملا۔ جب انگریزی آنرس کلاس میں نام لکھایا تو پھر ادب اوڑھنا بچھونا ہو گیا۔ میں سوچتا ہوں کہ ان زمانوں میں میرا کوئی نظریۂ فن تھا؟ جی نہیں! کوئی نظریۂ فن نہیں تھا۔ مطالعۂ ادب بھی میں نے میلان طبع کی وجہ سے کیا، اور تخلیق ادب کا کام بھی شوق بے اختیار کے نتیجے میں شروع ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ۱۹۲۷ء سے چھوٹے چھوٹے ادب لطیف کے نمونے پیش کرنے شروع کر دیئے تھے اور غزلیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ عنفوان شباب کا خاص تعلق ادب لطیف اور غزل سے ہے بھی۔ تخلیق سے ذوق و شوق کی تسکین ہوتی تھی اور بس۔ ادب و نظریہ کے تصور سے بھی واقف نہ تھا۔ یہ کیفیت ۱۹۳۶ء تک رہی۔ اور اس لمبے عرصے میں میں نے رومانی رنگ کی تخلیقات بھی کیں، حقیقت پسندانہ بھی، اور مقصدی ادب بھی پیش کیا لیکن یہ سب مشاہدہ اور ذوق و شوق کے نتیجے ہی میں تھا۔ میرا کوئی فلسفۂ شعر و شاعری یا نظریۂ ادب وجود میں نہیں آیا تھا۔ بعد میں جب اس مسئلے کے متعلق سوچنا پڑا تب بھی میں نے کٹر پن کے ساتھ کوئی نظریہ اختیار نہیں کیا۔ کیونکہ میں ہمیشہ یہ سمجھتا رہا کہ اصل چیز تخلیقی قوت، مذاق سلیم، ذوق و شوق اور قدرت اظہار ہے۔ سوچ بچار کر اس نکتے کو بھی سمجھا ہے کہ فن کے اندر فکری پہلو کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ جذبۂ تخئیل کی قدر و قیمت فکر سے بڑھ جاتی ہے۔ اور فکر و فلسفہ فن کو وزن اور وقار عطا کرتے ہیں۔ زندگی اور حقائق زندگی کے متعلق ہر شخص کا کچھ نہ کچھ نظریہ ہوتا ہے۔ ایک انداز نظر، ایک اسلوب فکر، ایک مخصوص رد عمل کا پایا جانا فطری بات ہے۔ آدمی ہمیشہ کائنات اور حیات کے بارے میں سوچتا ہی رہتا ہے۔ اس کے جذبات کا بھی ایک طور ہوتا ہے اور اس کے خیالات و افکار کا بھی۔ ہم ہمیشہ کسی نتیجہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ معنی اور مقصد کی تلاش کرتے ہیں، منزل اور آدرش کی طرف سفر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ساری باتیں انسانی سرشت میں پائی جاتی ہیں۔ ہم کائنات، فطرت اور معاشرہ کو ایک نظام عطا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ابتری اور انتشار میں ترتیب و تنظیم کی تخلیق کرتے ہیں، کائنات اور حیات کے خالق نے ان کا کچھ مقصد رکھا ہو۔ وجود کے کوئی معنی ہوں یا نہ ہوں لیکن ہم ابن آدم بہر حال مقصد و معنی کی تلاش میں بے چین رہتے ہیں۔ اور اگر ہم اپنے چاروں طرف مقصد و معنی کہیں پاتے ہیں تو ان کی تمنا کرتے ہیں۔ اور ان کی

تخلیق کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح کائنات و حیات میں نیرنگی ہے ویسے ہی انسانوں کے ردعمل میں نیرنگی و بوقلمونی ہے فرد فرد کا ردعمل مختلف ہوتا ہے۔ ہر فرد کی داخلی زندگی ایک عالم صغیر ہے۔ اسی عالم صغیر میں عالم کبیر، کائنات و فطرت کی مختصر ترویج اور تعبیریں ہوتی ہیں۔ فرد فرد کے ذہن و ذوق میں فرق ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے اس کے نظریے میں اختلاف پیدا ہوتا ہے انسانی معاشرہ کا کوئی ذکی اور دانشور فرد ان امور کے بارے میں زیادہ گہرے طور پر سوچتا ہے اور وہ معنی و مقصد کی تلاش میں دور تک جاتا ہے۔ ہمہ جہتی طور پر اپنی جستجو اور غور و فکر کو جاری رکھتا ہے اور دوسروں کی نسبت زیادہ بالیدہ، واضح اور مربوط نظریہ حیات و کائنات پیش کر دیتا ہے۔ بہت سارے لوگ اسی کی پیروی کرنے لگتے ہیں اور اک دبستان فکر پیدا ہو جاتا ہے۔ فکر و نظر کے مطابق عقائد و اعمال پیدا ہوتے ہیں۔ فلسفے، مذاہب اور نظام ہائے معاشرہ وجود میں آتے ہیں۔ انقلابات برپا ہوتے ہیں۔ آویزشیں اور تصادم سے قیامتیں اٹھتی ہیں۔ لیکن اختلافات بہرحال قائم رہتے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ ہر شخص اسی طرح سوچے اور عمل کرے لیکن ساتھ ساتھ وہ دوسروں کے تحکم اور ردعمل کو ناپسند بھی کرتا ہے۔ آپ کسی پہلوئے زندگی کے بارے میں سوچیں۔ آپ لوگوں کے مختلف ردعمل کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ فرق جا بجا قدم بہ قدم ملتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے فرقوں کا تذکرہ نہیں، نمایاں اختلافات بھی بہت ملتے ہیں۔ کوئی زندگی کو المناک سمجھتا ہے کوئی عبرتناک، لہذا کوئی قنوطی بن جاتا ہے کوئی رجائی۔ کوئی لذتیت کا قائل ہے، کوئی رواقیت اور کلبیت کا، کہیں وحدانیت سب کچھ ہے، کہیں کثرت اور شرک کا دور دورہ ہے اور کہیں وحدت الوجود کے نغمے گائے جا رہے ہیں۔ کسی کے مزاج میں رومانیت پائی جاتی ہے اور وہ کائنات کو اسی نظریے سے دیکھتا ہے۔ کسی کے اندر حقیقت پسندی اور توازن اور جزئیات پسندی ہے، کوئی کلاسیکیت اور روایت پرستی کا قائل ہے، کوئی جدت، تازگی اور اختراع پر مرتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ قومی خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ مقامی ماحول اور حالات ہوتے ہیں، تاریخی موڑ اور حوادث نمودار ہوتے ہیں اور یہ سب افراد و اقوام کی نظر، نظریہ، ردعمل، فلسفہ اور آدرش کو بدلتے رہتے ہیں اور جب مجموعی طور پر زندگی اور کائنات کے نظریے بدلتے ہیں تو لازماً فنون لطیفہ اور ادبیات کے نظریے بھی بدلتے ہیں۔

آپ ادبیات کے مطالعے کے سلسلے میں یہ دیکھیں گے کہ فنی نظریے صرف سماجی، سیاسی اور اقتصادی بنیادوں ہی پر نہیں بدلتے بلکہ وہ ذوقی اور ذہنی اسباب سے بھی بدلتے ہیں مثلاً کسی ادب پر اک دور آتا ہے کہ شعراء سادہ کاری اور فطرت نوازی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور دوسرے دور میں وہ پر تکلف طرز اسلوب اور پیچیدہ مضامین سے دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ کبھی منظر نگاری ہوتی ہے اور انسان و فطرت کے تعلقات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کبھی تمدنی زندگی کی تفصیلات پیش کی جاتی ہیں۔ جزئیات نگاری ہونے لگتی ہے۔ کبھی عالم النفس کی نازک لہروں، ان کی پیچیدگیوں اور حیرت افزائیوں کے تجزیے ہوتے ہیں۔ ادبیات کے ہزار شیوے ہیں۔ اور یہ فنکاروں کے ذوق و شوق، میلان و رجحان، نظر و نظریہ کے مطابق ابھرتے اور پسپا ہوتے ہیں۔ ہاں، یہ صحیح ہے کہ زندگی کے معروضی حالات، خارجی انقلابات ذہن و ذوق اور فکر و خیال کو بھی گہرے طور پر متاثر کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ذہن و ذوق یا فکر و خیال انسان کی خارجی زندگی کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو ہم کہیں گے کہ غیر معمولی شعور اور جذبہ رکھنے والے افراد کے فکر و خیال اور ذوق و شوق میں وہ بجلیاں بھری ہوئی ہوتی ہیں کہ اس سے اجتماعی حشر سامانی ہوتی ہے اور نسلاً بعد نسلٍ اس کے اثرات پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ بہرحال اتنا تو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ انسانی زندگی میں خارجی حالات اور داخلی حالات مل کر ایک دائرہ متحرک

بنا دیتے ہیں اور ایک نصف دائرہ دوسرے نصف دائرے کو پہنچ کر متاثر کرتا رہتا ہے۔

مجھے ادب و نظریہ کے مسئلے پر سوچنے کی طرف چند باتوں نے مائل کیا۔ ایک دفعہ میں پٹنہ کالج کے پرنسپل آرمر سے ملنے گیا۔ میں بی اے آنرس انگریزی کے ساتھ پاس کر چکا تھا۔ اردو میں ایم اے بھی کر چکا تھا۔ یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ ریسرچ اسکالرشپ کے لئے کوشاں تھا۔ میرے ہاتھوں میں ایک روسی ناول کا ترجمہ تھا غالباً "لیزا"۔ آرمر صاحب نے پوچھا کون سی کتاب ہے۔ میں نے بتایا۔ انہوں نے اپنی نیلی تیز آنکھوں سے مجھے بغور دیکھا اور پھر مسکرانے لگے۔ فرمایا "زندگی تو تلخ حقیقتوں سے بھری ہوئی ہے اور تم ادب میں بھی انہیں تلخیوں سے ناتا جوڑے ہوئے ہو۔ تمہیں اور کچھ پڑھنے اور دو گھڑی دل بہلانے کو نہیں ملتا۔ عومزم ہی تو حقیقت پسندی سے اکتا چکا"۔ میں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن بعد میں اس واقعے نے مجھے اور زیادہ حقیقت پسندی کی طرف مائل کر دیا۔ شاید ہر ممنوع چیز کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہی ہے، اور معلم کی تنبیہ اپنے اندر ایک تاثیر معکوس رکھتی ہے۔ انہیں دنوں ملک میں ترقی پسند تحریک پھیل رہی تھی۔

پٹنہ میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں ادیبوں کا ایک حلقہ تھا جو اس تحریک سے بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ کچھ لوگ باضابطہ ممبر تھے۔ کچھ بے ضابطہ اور کچھ ہم خیال تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے نقطۂ نظر اور ترقی پسندوں کے نقطۂ نظر میں کچھ اقدار مشترک پاتے تھے۔ اور ان کی حلقہ بندی سے متاثر ہو کر ساتھ ساتھ تھے۔ میرے دوستوں میں علی اطہر، زبیر احمد تمنائی، رضا نقوی، یحییٰ نقوی اور سہیل عظیم آبادی مختلف رنگ اور آہنگ کے ساتھ ترقی پسند کہلاتے تھے۔ کچھ کم ابھرتے ہوئے ادیب بھی اس حلقے کی طرف کھنچ گئے تھے جیسے طفیل احمد خاں، مظفر، سید اختر بیابی وغیرہ۔ ان کے علاوہ بھی اور نوجوان یا ترقی پسند تھے یا کہلاتے تھے یا غلط طور پر سمجھے جاتے تھے۔ خود میں بھی پانچویں سواروں میں سمجھا جاتا تھا۔ میں نے باقاعدہ طور پر کبھی انجمن ترقی پسند مصنفین کی رکنیت اختیار نہیں کی۔ صوبہ سے باہر کی دنیا میں بھی ترقی پسندی کا غلغلہ تھا اور انجمن ترقی پسند ادیب کا طوطی بولتا تھا۔ لاہور اور لکھنؤ کی انجمنیں اور بعد میں دلی، بمبئی کی انجمنیں خوب سرگرم تھیں، لکھنؤ سے نیا ادب نکل رہا تھا۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبد العلیم، ترقی پسندی کا نظریہ پیش کر رہے تھے۔ ان دنوں علی سردار جعفری، سبط حسن، مجاز اور حیات اللہ انصاری سب وہاں اکٹھا تھے۔ احمد علی بھی وہیں لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے۔ بعد میں احتشام حسین اور آل احمد سرور بھی وہیں آ گئے۔ لیکن اس وقت تک علی سردار جعفری وہاں سے جا چکے تھے۔ اکثر نوجوان شاعر اور افسانہ نگار ترقی پسندانہ رنگ اختیار کر رہے تھے۔ کرشن چندر، بیدی، احمد ندیم، احسان دانش، مجاز، علی سردار وغیرہ وغیرہ۔ ادبی فضا میں خود میرا میلان بھی حقیقت پسندی، مقصدیت اور ایک الدیاد جمہوری اور اخلاقی اشتراکیت کی طرف ہو گیا۔ لیکن میں ترقی پسندوں سے پورے طور پر مطمئن کبھی نہ ہوا اور وہ بھی مجھ سے مطمئن نہ ہوئے۔ ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ نیا ادب بمبئی چلا گیا۔ نیا ادب کے پچھلے کور کے آخری صفحے پر ترقی پسند فنکاروں کی ایک فہرست نکلتی تھی۔ اور شاید ان کی کتابوں کا اعلان نکلتا تھا۔ عنوان ہوتا "نئے ادب کے معمار" غالباً ۱۹۴۶ء میں میرا ایک افسانہ ادب لطیف لاہور میں چھپا۔ "انہیں مردے نہ کہو" اس میں میں نے ذہنی طور پر ظالمانہ تقسیم فلسطین کی ذمہ داری روس اور امریکہ دونوں پر ڈالی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے رانچی میں ترقی پسندوں کے بعض رویہ اور ان کی ادبی لغزشوں کے متعلق ایک تقریر کی تھی۔ بس غضب ہو گیا۔ پہلے "نیا ادب" میں نئے ادب کے معماروں کی فہرست میں میرا نام بھی ہوا کرتا تھا۔ مذکورہ واقعات نے غالباً اشتمالی خیال کے ترقی پسندوں کو مجبور کیا کہ وہ مجھ پر ارتداد اور کفر کا فتویٰ لگا لیں اور برادری سے مجھے خارج کر دیں۔ بہرحال اب

نیا ادب کی فہرست میں میرا نام نہ تھا۔ کچھ اسی طرح کی بات سہیل عظیم آبادی کے ساتھ بھی ہوئی اور سعادت منٹو نے تو تماشہ کیا۔ انہوں نے بمبئی کے انتہا پسند ترقی پسندوں کے مرکز میں ادبیات اور افسانہ نگاری سے متعلق ایماندارانہ باتیں کہہ دیں۔ منٹو کی کسی ادبی مجلس میں بڑی کامیاب تقریر ہوئی جس میں انہوں نے اپنے فن کے متعلق خاص طور پر اور فنون کے متعلق عام طور پر بالغ نظرانہ باتیں کیں۔ اور اس کے بعد منٹو پر انتہا پسندوں نے کڑی نظریں ڈالیں اور انہیں ترقی پسند ماننے سے انکار کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ ترقی پسندی کو انتہا پسند ترقی پسندوں نے شدید نقصان پہنچایا ہے۔

۱۹۴۰ء میں شاہد احمد دہلوی کی فرمائش پر میں نے ترقی پسندی پر ایک مقالہ ساقی کے خاص نمبر کے لئے لکھا اور ۱۹۴۱ء کے ادب لطیف لاہور کے سالنامے کے لئے ایک مقالہ بہ عنوان "اردو اور ادبیات عالم میں ترقی پسندانہ رجحانات" لکھا۔ ان دونوں مقالوں میں میں نے ترقی پسندی کی تعریف کی تھی اور اس کی کمزوریوں پر بھی نظر ڈالی تھی۔ میں بہر حال ان میں فنی حسن چاہتا ہوں۔ تجربہ خواہ کوئی ہو، موضوع اور نظریہ چاہے جو بھی ہو، فن کی داخلی اور خارجی خوبیاں جب تک نہ ہوں، فن کی بلندیاں طے نہیں ہوتیں۔ محض حقیقت نگاری، مقصدیت اور ترقی پسندی سے فن کاری نہیں ہوتی۔ فن کاری فنکاری سے ہوتی ہے۔ ہاں مقصد و منہاج فن کو مزید قوت عطا کرتے ہیں۔ میں ان دنوں بھی حقیقت پسندی کو سب کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے ادب لطیف میں ایک مقالہ لکھا تھا "حقیقت پسندی اور مثالیت" اس سے بھی میرے خیال کی وضاحت ہوتی تھی، واقعیت اور مثالیت کے امتزاج کامیاب ہی سے اعلیٰ ادب پیدا ہو سکتا ہے۔ آج میں اسی خیال پر اور زیادہ استحکام کے ساتھ قائم ہو گیا ہوں۔ عالم مثال، خود عالم حقیقت کی ایک بلند شاخ ہے، بلکہ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ حقیقتوں کے پردے اٹھانے چاہئیں آپ کو یہیں حقیقت میں عالم مثالی کی جلوہ گری کے نظارے ملیں گے۔

نگار لکھنو نے نظیر نمبر شائع کیا۔ اس نمبر میں مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین اور کئی ادباء کے مقالے نظیر کی شاعری اور زندگی پر تھے، خود نیاز صاحب نے بھی نظیر اکبر آبادی پر تحقیقی مضمون لکھا تھا۔ اک میرا مقالہ بھی تھا۔ غالباً یہ نمبر بھی ۱۹۴۱ء میں نکلا تھا۔ اختر تلہری صاحب نے بعد میں مجنوں اور احتشام پر اور اس خاکسار پر بھی سخت تنقیدیں کیں اور ہمیں مارکسی بتایا۔ معلوم نہیں اختر تلہری کو میرے مقالے میں مارکس کہاں پر سے جھانکتا ہوا نظر آیا۔ تماشے کی بات تو یہ ہے کہ میری نا استواری یا عدم کٹرپن کی وجہ سے اشتمالی ترقی پسندوں نے مجھے رجعت پسند قرار دیا اور مولانا تلہری صاحب نے مجھ پر کفر کا فتویٰ لگایا اور مارکسی قرار دیا۔ اب آپ حضرات ہی فیصلہ کر لیں کہ میں مارکسی ہوں یا مسلم۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ ادب میں ایک مارکسی کی بھی جگہ ہے۔ اور مسلم کی بھی۔ زندگی متقی کی بھی ہے ایک ہندو اور گبر کی بھی، ایک عیسائی اور یہودی کی بھی اور ایک ایسے شخص کی بھی جو کچھ نہ ہو، نرا آزاد خیال، خالص نیچرل۔ میں سوچتا ہوں، سوچ بچار کر آدمی اس نتیجے پر بھی پہنچ سکتا ہے کہ زندگی اور ادب میں کسی نظریئے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی ایک نظریہ ہے، بشرطیکہ وہ پروردۂ فکر ہو۔ سمجھ بوجھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کائنات بے معنی ہے یا کم از کم یہ کہ خالق کائنات یا نیچر کے اپنے معنی ہوں گے، ہم اتنے حقیر نہیں کہ اس عظیم و بسیط کائنات اور فطرت کے معنی سمجھ نہیں سکتے اور از خود اس میں معنی پیدا بھی نہیں سکتے۔ پھر ایک نظریہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے اپنے ظرف کے مطابق لوگوں کو معنی و مقصد سمجھنے کی آزادی دی جائے۔ اور ہم زندگی اور فن میں رواداری کو راہ دیں، اس کثرت معنی سے لطف سخن بھی پیدا ہوتا ہے۔ کثرت تشریحات و تعبیرات کی کثرت و نیرنگی کیف و شعور حیات کو بڑھاتی ہے۔ ایک ہی کائنات ایک ہی فطرت اور ایک ہی حیات کو اتنی مقداروں سے ضرب دے دیتی ہے جتنے آزادانہ سوچنے والے ذہن و دماغ اور آزادانہ محسوس کرنے والے دل ہوتے ہیں۔ کثرت نظریہ سے ادب میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ

کامیاب فنکاروں کی انفرادیت اور جدت بھی ایک حد تک نظریہ کی نیرنگی پر منحصر ہے بلکہ کبھی کبھی میں یہی محسوس کرتا ہوں کہ ایک ہی فنکار کے مختلف تجربوں کی بدلتی ہوئی تعبیرات کی وجہ سے اس کے کلام میں تازگی و شگفتگی پیدا ہوئی ہے۔ نظریئے کی قطعیت اور انجماد، اکتاہٹ، سپاٹ پن، زوال اور نقالی پیدا کرتا ہے۔

مذکورہ بالا باتوں کے باوجود فی الحال میرا ایک نظریہ فن ہے۔ میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ فرقے، نظریئے، فلسفے اور عقائد، تجربات و افکار کی روشنی میں تدریجی طور پر پیدا ہوتے ہیں، وراثت، ماحول تعلیم اور تربیت کے اثرات اور تحریکوں، تبدیلیوں اور انقلابات عالم کے نتائج، افراد اور جماعتوں کے نظریئے اور عقائد کی نوعیت متعین کرتے ہیں، میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میرے خاندانی حالات، ماحول، تعلیم و تربیت، مطالعے اور تجربات نے مجھے ایک نظریۂ فن دیا ہے۔ لیکن تخلیق کا عمل بڑا پیچیدہ ہوتا ہے اور انسانی ذہن و روح کے کوائف و احوال ہمیشہ نت نئے سانچوں میں ڈھلتے رہتے ہیں خصوصاً ایسے افراد کی جن کی شخصیت میں انفرادیت ہوتی ہے اور عموماً ہر فرد کی زندگی اور خیالات و افکار کا ایک درمیانی دھارا ہوتا ہے۔ لیکن درمیانی دھارے کے علاوہ اطراف و جوانب کے چھوٹے چھوٹے دھارے، موجیں اور لہریں بھی ہوتی ہیں، آگے بڑھنے والے دھارے کے علاوہ "پس آید" بھی ہوتا ہے۔ جہاں کبھی الٹی گنگا بہتی ہے اور کبھی وہاں سکون اور ٹھہراؤ پایا جاتا ہے۔ نیز شخصیت کی بالائی موجوں کے علاوہ اندرونی اور گہری موجیں بھی ہوتی ہیں، کوئی ضروری نہیں کہ اندرونی موجوں کی خواہش وہی ہو جو بیرونی موجوں کی خواہش ہے۔ انسانی زندگی اک دریائے تموج و تضاد۔ اک عالم تصادم و اتحاد۔ اک دنیائے سکون و حرکت، حقیقت و فوق الفطرت، واقعیت اور مثالیت ہے۔ نیرنگ وجود کو سمجھنا گویا ناممکن ہے، پھر بھی ہم کسی حد تک سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے قلیل سرمایۂ عقل و فہم کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں۔

یہ فریب عقل ہماری تگ و تاز کا باعث ہے۔ بہرحال یہی قلیل پونجی ہمارے جذبات و واردات کو بھی کچھ دیتی ہے اور انہیں حرکت میں لاتی ہے۔ میں نے بھی اپنی شخصیت اور اپنے خیالات و افکار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ عرفان وجود، عرفان کائنات اور عرفان خدا تو بہت بڑی چیزیں ہیں۔ اپنا آپ عرفان بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں، کیا مجھے عرفان ذات حاصل ہو چکا ہے۔ اندر کی دنیا سے جواب آتا ہے ادھورے طور پر ہوا۔ میں آپ کو بھی کسی نارسائی اور ناتمامی کے دھندلکے دکھاؤں گا۔

میرا خیال ہے کہ تخلیق فن بہت حد تک انفرادی اور ایک حد تک اجتماعی مسئلہ ہے، روح تخلیق کا مرکزی حصہ انفرادی ہے۔ اس کے علاوہ فن کی ہر تخلیق اپنی انفرادیت علیحدہ رکھتی ہے۔ ان کے درمیان مشابہتیں ہو سکتی ہیں، جیسے دو بھائیوں میں مشابہت پائی جاتی ہے، مگر ان کی ہستی علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک ہی فنکار کی دو تخلیقیں بالکل ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ، شکوۂ ابلیس کی مجلس شوریٰ، ہملٹ اور ٹمپسٹ، میگھ دوت اور شکنتلا، اپنی اپنی انفرادیت کے حامل فنی کارنامے ہیں۔ غرض یہ کہ اول تو فنکار کی انفرادیت مسلّم ہے دوسرے یہ کہ فنی تخلیقات کی انفرادیت بھی واضح ہے۔ ایک دبستان، ایک دور، ایک تحریک و عقیدہ سے وابستہ فنکاروں کی تخلیقات میں کئی جہتوں سے فرق پایا جاتا ہے، ہم فنکاروں اور ان کے کارناموں کو مشینی پیداوار کی طرح ہرگز نہ سمجھیں، وہ کسی ایک فرمے یا سانچے میں ڈھلے ہوئے نہیں ہوتے۔ اسی طرح ان کی تخلیقات بھی ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی نہیں ہوتیں، فنکاروں کے دماغ کا سانچہ بھی ہمہ آن بدلتا رہتا ہے۔ ہر چند کہ اس میں نیرنگی بھی پائی جاتی ہے اور کثرت میں وحدت۔

ان معروضات کی روشنی میں، میں عرض کروں گا کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد میرا ایک نظریۂ فن بنا۔ لیکن اس نظریہ کی ڈور ہر وقت میری

گردن میں الجھی ہوئی نہیں رہی میرے نظریئے نے کسی شکنجے اور زہر کی طرح مجھ پہ اثر نہیں ڈالا۔ اور جب کبھی میں نے یہ محسوس کیا کہ میری تخلیق میرے نظریئے کی غلام ہوتی جا رہی ہے تو میں نے اس سے چھٹکارا بھی حاصل کرنا چاہا، کبھی شعوری طور پر شاید کبھی لاشعوری طور پر، اس لاشعوری عمل سے اس وقت واقفیت ہوئی جب کوئی تخلیق عمل میں آگئی۔ اور کچھ دنوں کے بعد میں نے اس کا جائزہ لیا۔ میرے نظریۂ فن نے ایک کیمیاوی مادے کی طرح ذہن و دماغ میں کام کیا۔ لیکن کبھی کبھی میرے نظریئے نے بھونڈے طور پر کارفرمائی کی ہے۔ پھر میں یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ میرے نظریۂ فن کے رنگ، سائے، اور آہنگ اور لے بدلتی بھی رہی۔ جھٹکے کے ساتھ نہیں، تھوڑی تھوڑی، کبھی لب و لہجہ میں تبدیلی ہوئی ہے کبھی آنچ، کبھی ترکیب و تعلقات، کبھی انداز نظر کبھی پیش کش میں، کبھی اضافی، اقدار کی کمی اور بیشی کے سبب، میرا نظریۂ فن کچھ اس طرح بنا کہ اس میں پھیلاؤ اور لچکداری ملتی ہے، ریاضی میں سمجھتا ہوں، ممکن ہے دوسرے لوگ اس طرح نہ سمجھیں۔

میرا نظریہ، یہ ہے کہ فن کی ساری قسمیں تجربات زندگی سے خام مواد حاصل کرتی ہیں اور ترتیب فن کی اندرونی شخصیت سے نئی ترتیب تازگی، زندگی، روح، سوز و ساز تعبیر و معنویت اخذ کرتی ہیں۔ اور پھر پیش کش کی منزل میں فنکار کی ہنرمندی سے ترتیب و تناسب، ربط و ہم آہنگی، تراش خراش، وضع قطع، اسلوب و ادا، تنظیم و تعمیر پاتی ہیں۔ غرض یہ کہ فن، فطرت اور معاشرہ، زندگی کی کائنات کی محض ترجمانی کا نام نہیں بلکہ ان کی تخلیق جدید کا نام ہے۔ میں خود اپنی تخلیقات میں کہاں تک اس تخلیق جدید میں کامیاب ہوا ہوں، صحیح صحیح طور پر اس کا اندازہ نہیں کہ کام میرے ذہن یا ذوق اور واقف کار ناقدین کا ہے۔ میں فن کی تخلیقی اور جمالیاتی اقدار کو فن کے لئے بنیادی طور پر ضروری سمجھتا ہوں جن کی انفرادیت اس کا صنعتی فن، انہیں اقدار سے متعین ہوتا ہے۔ اس لئے فنکاری کو حسن کاری کہتے ہیں۔ لیکن میں ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ فن ارتقائی منزلوں سے گزرتا ہے پہلے تصویری محاکاتی منزل آتی ہے۔ پھر جذبی اور تخیلی منزل۔ بعد ازاں فکری اور معنوی منزل نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو پچھلی منزلوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھتے ہیں، یہ عجیب ماجرا ہے، ترقی یافتہ فن کاری بیک وقت تصویری، محاکاتی، جذبی شخصی فطری اور معنوی ہوتی ہے۔ اسی فکری اور معنوی منزل پر پہنچ کر ہمیں معاشرہ، فطرت، کائنات، حقائق اور حق کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ نظریہ اور فکر کی منزل پر بھی ہمیں تخیلی، جذبی، محاکاتی اور تصویری انداز بیان کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔ غرض یہ کہ فنکاری کی کچھ ثانوی قدریں بھی رونما ہوتی ہیں۔ اور بالیدہ فنکاری میں ہمیں ثانوی قدروں کی پھیلی ہوئی روشنی ملتی ہے۔ انہیں ثانوی قدروں میں نظریہ اور فلسفۂ حیات کا مقام ہے۔ ظاہر ہے کہ نظریئے مختلف ہوتے ہیں اور یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ وہ نظریوں کا مقابلہ اور موازنہ کرتا ہے اور جو نظریہ اسے پسند آتا ہے اس کی جلوہ گری اگر فنی کارناموں میں دیکھتا ہے تو ان کارناموں کو زیادہ پسند کرنے لگتا ہے۔ جمالیاتی لذت اندوزی اور اثر پذیری میں بھی یہ ثانوی اسباب دخیل ہوتے ہیں۔ ہم اصولی طور پر جمالیاتی لذت اور فنی تاثیر کی بات بالکل علیحدہ رنگ میں کر سکتے ہیں لیکن عملی طور پر بالکل منزہ اور مصفیٰ جمالیاتی تاثیر کا وجود شاید ممکن نہیں، حسن ایک علیحدہ قدر ہے لیکن جب ہم کسی حسین عورت کے حسن سے متاثر ہوتے ہیں تو اس تاثیر میں صرف حسن و جمال نہیں ہوتا کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ عملی طور پر اثر پذیری میں حسن کو جنس سے الگ کرنا بہت مشکل کام ہے اور شاید ناممکن۔ اسی طرح تخلیقات فن سے اثر پذیر ہوتے ہوئے ہم محض جمالیاتی اقدار کو ہی محسوس نہیں کرتے بلکہ ثانوی نظریاتی اقدار سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم "جمنا میں تیراکی" ہمیں اسی طرح متاثر نہیں کرتی جس طرح اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" کرتی ہے۔ اسی طرح نظیر کی نظم "بلدیو جی کا میلہ" یا "کرشن کنہیا" ہمارے قارئین کو اتنی گہرائی کے ساتھ متاثر نہیں کریں گی جتنی ہندو قارئین کو۔ تاج محل پر ایک نظم ہر شخص کے لئے ایک تاثیر نہیں رکھتی۔ بہرکیف تخلیقات فن کی اثر پذیری بنیادی جمالیاتی اقدار کے ساتھ ساتھ ثانوی نظریاتی اقدار سے بھی وابستہ ہے۔ جمالیاتی اعتبار سے اگر دو نظمیں یا دو ڈرامے ایک ہی

پائے کے ہوں تو ہم اس تخلیق کو زیادہ پسند کریں گے جس میں ثانوی اقدار ہمارے معیار سے بہتر ہوں۔ یہ تشریح طلب مسئلہ ہے جس کی وضاحت کی گنجائش یہاں نہیں۔

صرف بہار و ناپسند کا سوال ہی نہیں، ثانوی اقدار میں موضوعات کی نوعیت اور وسعت بھی شامل ہے۔ فنکار کو یہ حق ہے کہ وہ سماجی حقائق کی تصویر کشی کرے، ان پر تنقید کرے اور پھر اک بہتر سماجی دور کے خواب دیکھے۔ فنکار کے لئے یہ ساری کائنات ساری فطرت اور پورا معاشرہ سرمایۂ موضوعات فراہم کرگیا ہے۔ اسے کہیں سے تحریک تخلیق حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے کوئی نظریہ وجہ القاء بن سکتا ہے، یہ صحیح ہے کہ اس کی کامیابی جمالیاتی اقدار پر منحصر ہے۔

لیکن اس کی وسعت و ہمہ گیری، وسعت مشاہدہ، عمیق مطالعے اور بصیرت حیات سے حاصل ہوتی ہے۔ فنکار کی ترقی پسندی یہی ہے کہ وہ کسی کا غلام نہ ہو، نہ جاگیرداروں کا، نہ سرمایہ داروں کا، نہ آمروں کا، نہ اشتمالیوں کا۔ وہ ایماندارانہ زندگی، معاشرہ، فطرت اور کائنات کے متعلق اپنے ردعمل کو پیش کرے، اور اس پیشکش میں جمالیاتی اقدار کو اپنا راہبر بنائے۔ وہ تنقید و تعبیر حیات میں اپنے ایمان اپنے اخلاص، اپنی جرأت، اور اپنی حسن کاری کی روشنی میں آگے بڑھے۔ وہ اپنے نصب العین کی پرورش اپنے نصب العین کے لہو سے کرے، وہ حقیقتوں کو بھی پیش کرے، خوابوں کو بھی، وہ ایک بہتر سماج کی تشکیل کے لئے بھی کوشاں ہو، اس کی فنکارانہ روح ملازمیات میں بھی حسن کاری کرنا چاہتی ہے اور سیاسیات و اقتصادیات میں بھی۔ اس لئے اگر وہ اصلاحی اور انقلابی پیام بھی دیتا ہے تو یہ اس کی جبلّت ہے۔ اس کی سرشت ہے اس کا فنکارانہ جذبہ ہے بشرطیکہ وہ پیام رسانی کے وقت جمالیاتی طریقِ کار سے انحراف کرے کیونکہ ایک فنکار اس وقت تک فنکار ہے جب تک وہ فن کے جمالیاتی تقاضے پورا کرتا ہے۔

میں نے اپنی ادبی زندگی میں سب سے پہلے نیاز فتحپوری سے اثر لیا اور ساتھ ہی ساتھ یا اس کے کچھ بعد اقبال سے اثر پذیر ہونے لگا۔ نیاز اور اقبال کے دو متضاد نظریہ ہائے فن ہیں۔ آج میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں نظریئے ایک دوسرے کی تشکیل کا باعث ہیں۔ اردو ادب کی روایت میں ترقی پسندی بھی ملتی ہے اور عیش کوشی بھی۔ ان دونوں کا تصادم بھی ملتا ہے اور رجعت پسندی کا بھی۔ میرے گھر کی مذہبی فضا نے مجھے حالی، اقبال، شبلی اور شرر کا گرویدہ بنا دیا۔ لیکن میرے مزاج کی جذبات پروری اور رومانیت نے مجھے میر، غالب، نیاز فتحپوری، یلدرم اور اختر شیرانی کی طرف بھی مائل کیا۔ درمیانی دور میں اخترا کیت سے بھی بہت متاثر ہوا ہوں۔ اسی بنا پر ترقی پسند مصنفین کی انجمن اور ترقی پسند تحریک سے گہرا اثر قبول کیا۔ اب غور کرتا ہوں تو میں کسی ایک میلان کا کبھی نہیں ہوا اور ایک دھارے میں کبھی نہیں بہا۔ کچھ دیر ہر رہرو کے ساتھ چلا اور بعد ازاں ٹھٹک کر سوچنے لگا کہ صحت و سلامتی اور حسن و معنی کہیں اور بھی ہیں یا نہیں۔ اور اب میں بڑے مطمئن قلب کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جنت فن، نام ہے حسن کاری کا، گہرے مشاہدے، ذکی احساس، مخلص جذبات، بلند تخئیل، انسانی محبت، اخوت عامہ، حرکت و عمل، مساوات و حریت، گداز و ہمدردی، قربانی و ایثار اور موجودہ دنیا سے بہتر دنیا کی تلاش کا، لیکن یہ تلاش حق، بغیر رواداری اور مفاہمت کے ناممکن ہے۔ میرا عقیدہ لا اکراہ فی الدین بھی ہے اور لا اکراہ فی الفن بھی۔

طیب عثمانی

اخترؔ اورینوی کا نظریۂ فن

ادب میں نظریۂ فن کی حقیقت کو اقبال نے اپنے ایک سادہ سے شعر میں بڑے بلیغ انداز میں پیش کیا ہے ؎

نقش ہیں ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اخترؔ اورینوی کے نظریۂ فن کا چراغ بھی بڑی حد تک اقبال ہی کے ادبی و شعری نظریہ سے فروزاں ہے۔ اخترؔ کا ذہنی پس منظر بھی نہ صرف اقبال سے متاثر ہے بلکہ اس کے ذہنی افق پر جدید و قدیم کے ویسے ہی ستارے روشن ہیں جو اقبال کا طرۂ امتیاز ہے۔ اخترؔ کے یہاں بھی ہمیں جدید علوم کی گہرائی، ان کی پرکھ، حسن و قبح کا صالح معیار ویسا ہی ملتا ہے جیسا اقبال کا ہے۔ ساتھ ہی زندگی کا ایک واضح تصور، اخلاقی اقدار کا احساس، مذہبی نقطۂ نظر اور زندگی سے اس کی ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہے اور یہ باتیں اخترؔ اورینوی کے نظریۂ فن کو ایک انفرادیت اور یگانہ حیثیت عطا کرتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اخترؔ اورینوی کے نظریۂ فن کا تفصیلی جائزہ لیں، فن اور نظریہ کی حقیقت پر چند باتوں کا اظہار مناسب ہے۔

فن کی حقیقت تک رسائی کے لئے ہمیں کائنات کی جلوہ آرائیوں کا مشاہدہ کرنا چاہئے۔ کائنات پر جب ہم ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں حسن کے مختلف جلوے نظر آتے ہیں۔ فطرت نے اس جہانِ رنگ و بو میں وہ گل بوٹے کھلائے ہیں اور زمین نے اپنی کوکھ سے حسن کے وہ خزانے اگلے ہیں جو نگاہوں کے لئے جنت اور ہمارے لئے باعثِ مسرت ہیں۔ ہر سال بہار کا موسم اپنی پوری رنگینیوں کے ساتھ آتا ہے۔ ان کے علاوہ آسمان پر جھلملاتے ہوئے ستارے، چاند کی تابانی، آبشاروں کی روانی، کوہ و صحرا، دشت و دریا یہ سب حسنِ فطرت کے جلوۂ صد رنگ ہیں جنہیں دیکھ کر نہ صرف یہ کہ ہمارے ذوقِ جمال کی تسکین ہوتی ہے بلکہ ان سے ہمیں روحانی مسرت اور فنی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

انسان جو فطرت کا سب سے بڑا شاہکار ہے، فطرت کے ان حسین مناظر سے متاثر ہو کر اس کے تخلیقی عمل میں شریک ہو جاتا ہے اور وہ اس دنیا کے بنانے اور سنوارنے میں ویسے ہی انہماک اور دلچسپی کا ثبوت دیتا ہے جیسے خود قدرت کا عمل اس پر سایہ فگن ہو۔ انسان کے تخلیقی کارناموں نے اس کائنات کے حسن و تابانی میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے، انسان کے اس جمالیاتی، تخلیقی عمل ہی کا نام حقیقتاً "فن" ہے۔ فن اظہارِ خیال کی سب سے قدیم شکل ہے۔ اجنتا ایلورا کے فنی کارنامے انسان کی حسن کاری کے شاہکار ہیں۔ فن نے انسان کو زندہ رہنے کے آداب سکھائے اور زندگی میں رنگ و آہنگ کی آمیزش سے ایک بہترین زندگی کے خواب دکھائے اور خوب سے خوب تر کی جستجو پیدا کی۔ فن کے پس منظر میں غم، محبت اور پرستش کے جذبے اور تجربے کے جھلملاتے ہوئے سائے ایک نیا روپ اختیار کرتے ہیں۔ اگر غم و محبت کے جذبے نے تاج محل کی تخلیق کروائی تو پرستش کے جذبے نے انسان کے مجسمے ترشوائے، مندر، مسجد اور گرجا بنوائے۔ اس طرح اگر بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو فن کی تخلیق میں قدرت اور انسان دونوں ہی شریک ہیں۔ اقبال نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے۔ ع

سفال آفریدی ایاغ آفریدم

فطرت کا وجود خواہ وہ سنگ و آہنگ کی شکل میں ہو خواہ مادہ سیال اور دھاتوں کے روپ میں، یہ سب براہ راست خدا کی قوت تخلیق کے مرہون منت ہیں اور ان سے صناعت و فن کی تخلیق میں انسانی شعور و عمل اور جذبۂ محبت و عبادت کا دخل ہے۔ فطرت کے اعلیٰ شاہکار سے انسانی فن کے شاہکار وجود میں آتے ہیں، خاک و آب اور سنگ و آہن خدا کی تخلیق ہیں۔ اسپین کے خدا پرست فنکاروں نے ان سے مسجد قرطبہ اور قصر الحمراء کو وجود بخشا اور اسی "حرم قرطبہ" کے حسن و جمال میں حکیم مشرق اقبال کو کسی "مرد خدا کے حسن و جمال کی تخلیق پر آمادہ کیا۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو ادب و فن میں جمالیات ایک اہم قدر ہے۔

ادب و فن کے سلسلے میں جہاں جمالیات ایک بڑی قدر ہے۔ وہیں مواد اور نظریہ کی اہمیت فن و ہیئت کے مقابلے میں بہر صورت زیادہ ہے۔ کوئی فنی کارنامہ نظریاتی مواد کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ اس طرح ادب کے جمالیاتی پہلو اور نظریے کی مکمل ہم آہنگی کے بغیر ہم ادب و فن میں حسن عظمت کا کوئی تصور نہیں کر سکتے۔ ہمارے کلاسیکی شعراء و ادباء فن کا احترام و اہتمام زیادہ کرتے تھے۔ فن اور زندگی میں جو پیچیدہ رشتہ ہے وہ شعوری یا غیر شعوری طریقے پر ان کا موضوع سخن کم بنتا تھا۔ وہ الفاظ کی تراش خراش اور نوک پلک کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں ترشے ہوئے ہیرے کا حسن ہوتا ہے۔

بلا شبہ الفاظ اپنے اندر لازوال قوت کا خزانہ رکھتے ہیں، وہ اپنے معنی و مفہوم کے اظہار میں خلاقانہ حصہ لیتے ہیں۔ لیکن خیال و معنی حرف و صوت سے بہر حال زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ الفاظ کی بامعنی ترتیب کا مقصد حقیقتاً خیال کی شمعیں روشن کرنا ہے۔

ادب و فن میں نظریہ کی وہی اہمیت ہے جو زندگی میں نظر و فکر کی۔ ٹی ایس ایلیٹ کا یہ قول مبنی بر صداقت ہے کہ "ادب کی عظمت صرف ادبی معیاروں سے نہیں جانچی جا سکتی گرچہ یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ادب کے علام اور وجود کو صرف ادبی معیاروں ہی سے پرکھا جا سکتا ہے"۔ نظریہ کا لفظ جب ہم بولتے ہیں تو اس میں عقیدہ اور عمل دونوں کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ایک اچھے ادیب و شاعر کے یہاں ایک نظریۂ زندگی کا احساس ضروری ہے بلکہ جو ادیب و شاعر زیادہ باشعور ہوگا۔ اس کے یہاں نظریہ کا تصور زیادہ مربوط مکمل اور ایک نظام زندگی کی صورت میں نمایاں ہوگا۔ میرے نزدیک اقبال کی عظمت کا راز یہی ہے کہ وہ باشعور نظریہ اور ایک نظام حیات کے ساتھ اپنے اندر کمال فن کا اندرونی ربط، موزونیت اور نفاست سب کچھ بدرجۂ کمال رکھتے ہیں۔ اچھا ادب ہمیشہ باشعور ہوتا ہے اس میں صرف تلقین نہیں ہوتی۔ وہ انسانی زندگی کے پیچ و خم اور جذبات و افکار کے زیر و بم سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ وہ انسانی دکھ سکھ، آرزوں، امنگوں اور کامیابیوں، ناکامیوں، عزائم اور حوصلوں کی نہ صرف یہ کہ جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے بلکہ اس کے اندر یقین کی گرمی ایک نظام حیات کی روشنی اور مقصد کو پالینے کی توانائی بھی پائی جاتی ہے۔ ایسے ادیب و شاعر کے لئے نظریہ نعرہ بازی کا نام نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے احساسات، جذبات، جمالیاتی حسن، اخلاقی قدر اور سماجی ذمہ داری، یہ سب کچھ اس طرح ہم آمیز ہوتے ہیں کہ اس کی تخلیق ایک زندہ متحرک صداقت بن جاتی ہے۔ یہی صداقت ایک شاعرانہ ادبی اور ابدی صداقت میں نمودار ہوتی ہے۔ اس طرح نظریہ ایک دیدۂ بینا بن جاتا ہے۔ جس سے زندگی کے حقائق بہ نظر ہو جاتی ہے اور اس کے بعد ہی ہمارا آبگینہ "حریف سنگ" بن سکتا ہے۔

ادب و فن میں جب نظریہ کا ذکر آتا ہے تو بعض ذہن پریشان ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس پر پریشان یا پشیمان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حقیقتاً ادب و فن میں نظریے کے معنی ایک شعور کے سوا کچھ اور نہیں۔ اور شعور کا اظہار جب بھی ہوگا اس کے پس منظر میں کسی نہ کسی نظریے

کی کارفرمائی ضرور ہوگی۔ اس طرح نظریہ کسی باشعور احساس ہی کا پیرتو ہوتا ہے۔ ادب کے مختلف اصناف میں نظریئے کے اظہار کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، تنقیدی ادب تو نظریوں کا ادب ہی ہوتا ہے، ہاں تخلیقی ادب میں نظریہ ہمیشہ پس پردہ ہوتا ہے، ادبی تخلیق میں جب تفکر، جذبہ بن جاتا ہے تو اس سے فن لطیف وجمیل وجود میں آتا ہے۔ بقول آل احمد سرور "صرف فکر کی روشنی سے فن کی محفل میں چراغ نہیں جل جاتے فن یہاں ایک فانوس ہے جو شمع فکر کو حسین و دل پذیر بناتا ہے۔" آج کی پیچیدہ اور نظریاتی دنیا میں فکر اور اس میں نظریئے کی تلاش ضروری ہے اس لئے کہ اگر زندگی میں نظریات کی ضرورت ہے تو ادب میں بھی نظریات کی گنجائش باقی رہے گی، ادب میں نظریہ کی اہمیت کا اقبال کی شاعرانہ صداقت نے اس طرح اظہار کیا ہے۔

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اس سائنسی دور میں جبکہ "ہر دم متغیر ہیں خرد کے نظریات" یہ حقیقت زیادہ ابھر کر سامنے آگئی ہے کہ زندگی کی طرح ادب میں بھی ایک مثبت نظریہ کی ضرورت ہے، نظریہ کے بغیر ادب ایک سادہ و بے رنگ پھول ہے، چمن ادب میں وہی پھول خوش رنگ و دلکش ہیں جو اپنے اندر نظریئے کی خوشبو رکھتے ہیں۔

ادب فن اور نظریہ پر اس اظہار خیال کا مدعا یہ ہے کہ ہمارے سامنے تینوں کی صحیح حقیقت واضح ہو جائے، تاکہ آئندہ ہم اختر اورینوی کے نظریہ فن پر گفتگو کرتے ہوئے ادب کے جمالیاتی اخلاقی اور فنی پہلوؤں کے ساتھ انصاف کر سکیں۔

اختر اورینوی کے نظریہ فن پر براہ راست اظہار خیال سے پہلے مناسب یہ ہے کہ ہم اختر کے ذہنی پس منظر اور فکری نظریئے کا جائزہ لیں۔ کسی شخصیت کے فن پر گفتگو سے پہلے اس کی فکر کا تجزیہ ضروری ہے۔ فن کے ارتقار اور فنی اقدار کی تشکیل میں فکر کی کارفرمائی رہتی ہے۔ اختر اورینوی کے ذہنی پس منظر میں مذہب و اخلاق اور جمالیات کی جڑیں بہت گہری دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جہاں تک "جمالیات" کا تعلق ہے اس کا ہم ان کے نظریہ فن اور فنی اقدار کے سلسلے میں تفصیل سے جائزہ لیں گے۔ اس وقت ہم اختر اورینوی کے اس ذہنی و فکری پس منظر کا پتہ چلائیں گے جہاں مذہب و اخلاق کی شمع فروزاں ہے۔ اختر اورینوی کے ذہن و فکر کی تعمیر میں مذہب و اخلاق کا بڑا حصہ ہے۔ اختر نے زندگی کے مطالعے میں سنجیدگی اور گہرائی سے کام لیا ہے۔ آج کل کے متنورین کی طرح مادی زندگی کی دل فریبیوں اور سائنسی انکشافات و ایجادات کی جھلملاہٹوں نے ان کی آنکھیں خیرہ نہیں کی ہیں۔ جبکہ ابتداء ہی میں میں نے یہ عرض کیا ہے کہ اختر اورینوی نے زندگی کے حقائق کا مطالعہ اقبال ہی کی طرح مغرب میں ڈوب کر کیا ہے۔ نئے علوم اور سائنس پر غور و فکر سے انہیں کائنات کا علم بھی ہوا ہے اور اپنا عرفان بھی۔ اختر اورینوی کے سامنے یہ حقیقت روشن ہے کہ سائنس نے جہانِ فطرت کی طاقتوں کو عریاں کیا ہے اور جس کے پیچھے کوئی اخلاقی قدر نہیں رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ع "اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ"

سائنس اور ٹکنالوجی کی یہ بے پناہ طاقت ہمارے لئے رحمت بھی ہے اور لعنت بھی، ایسے حالات میں زندگی کی شب تاریک کو سحر میں تبدیل کرنے کے لئے ایک ایسے نظام حیات کی ضرورت ہے، جو زندگی کو حقیقی امن و سکون بخش سکے۔ اسی حقیقت کے ادراک نے اختر اورینوی کے ذہن کی تعمیر کی ہے۔ اور ان کے ذہنی افق پر جدید افکار و نظریات کے ساتھ اسلامی اخلاق و روحانیت کے روشن ستارے بھی جھلملا رہے ہیں اختر اورینوی کے نزدیک اسلام نے نہ صرف یہ کہ دنیا کے اکثر انقلابوں کو متاثر کیا ہے بلکہ آئندہ بھی اس کے امکانات ہیں کہ ایک بار پھر دنیا کو اپنے اسلامی انقلاب کی گود میں ڈال دے اور جارج برنارڈ شا کا یہ قول صادق آئے کہ آئندہ ساری دنیا کا مذہب صرف اسلام ہوگا۔ اس حقیقت کا اظہار

اختر اورینوی نے بہت واضح طور پر ان لفظوں میں کیا ہے :۔

" ہر چند کہ یہ اسلامی انقلاب اجتماعی طور پر میدان کربلا میں حسین کے ساتھ شہید ہوگیا لیکن بحیثیت فلسفۂ حیات یہ اب تک زندہ و پائندہ ہے اور ہمیشہ تہذیبوں اور انقلابوں کو متاثر کرتا رہا ہے ۔ بالواسطہ طور پر انقلاب فرانس اور انقلاب روس کو متاثر کیا ہے اور میں کہتا ہوں کہ مستقبل کے عالمگیر انقلاب کو اسلامی تصور حیات و نظام معاشرہ شدید طور پر متاثر کرنے والا ہے" (ادبیات عالم ۔ تنقید جدید ۔ از اختر)

اس حقیقت کو زیادہ واشگاف لفظوں میں اور صراحت کے ساتھ دوسری جگہ یوں کہتے ہیں :۔

" قبل اس کے کہ میں ادب کے متوازی سلسلے کو پیش کروں ، نہایت ہی اہم امر کو پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ نظام معاشرۂ انسانی کو متاثر کرنے والے انقلابات فرانس و روس کا تذکرہ تو لوگ کرتے ہیں مگر انقلاب عرب کو بھول جاتے ہیں ۔ اسلام کے انقلاب نے بہ یک وقت دو شہنشاہیوں کا خاتمہ کیا یعنی قیصریت اور کسرائیت کا ۔ اس انقلاب عظیم نے انقلاب فرانس سے صدیوں پہلے عصر کہن کے کھنڈروں کو خشت و سنگ سے پاک کرنے کے بعد نئے اقدار کی عمارت بنائی تھی ۔ اسلام کا انقلاب بورژوائی انقلاب نہیں تھا اور نہ پرولتاری بلکہ صحیح معنوں میں انسانیت عظمیٰ کا انقلاب تھا ۔ اس نے خلافت الٰہی کو دنیا میں قائم کیا ۔ نیز مادیت و روحانیت ، انفرادیت و اجتماعیت میں صحیح توازن پیدا کر کے اس نے اخلاقی معیار پر جمہوریت انسانی کی بنیاد ڈالی" (ادبیات عالم تنقید جدید ۔ اختر)

اختر اورینوی کے ذہن و فکر میں اسلام کے سائے بڑے گہرے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ذہنی افق پر مذہب و اخلاق کی پرچھائیاں نمایاں نظر آتی ہیں ۔ اسی چیز نے ان کی ادبی تخلیقات میں روشنی اور تازگی پیدا کی ہے اور ان کے ادبی نقطہ نظر میں تعمیری انداز اور اسلامی نظر کے نقوش ابھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ اسلام نے کیا ادبی انداز نظر پیدا کیا ہے ۔ اس کے بارے میں اختر اورینوی کے ذہن میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے وہ صاف لفظوں میں اس کا اظہار کرتے ہیں کہ

" اسلام نے آج سے تیرہ سو برس پہلے ہی اس معیار فن کی بنیاد ڈال دی تھی ، جو معیار آج رائج ہو رہا ہے ۔ یعنی فن برائے زندگی نہ کہ فن برائے فن ۔ یہی وجہ تھی کہ جو فنون موجب اس وقت کے حالات کے لحاظ سے زندگی کی پھوٹتی کونپل کے لئے مضر سمجھے گئے ، ممنوع قرار پائے ، اسلام مقصدی فن کا قائل ہے ۔ فن برائے تعیش کا نہیں ، بلکہ فن برائے انسانیت کا ۔ اس لئے فنون کو زندگی کے معیار و منہاج کا تابع ہونا چاہئے" (ادبیات عالم ۔ تنقید جدید از اختر)

" غرض اسلام فن برائے فن کا مخالف ہے اور فن برائے انسانیت عظمیٰ کا پیامی ۔ اسی اسلامی فلسفے کے مطابق اسلامی ادب نے جنم لیا اور وہ ایشیا و یورپ کو متاثر کرتا رہا " (ادبیات عالم)

اسلام کے اس ادبی نقطۂ نظر کی وضاحت سے یہ بات خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ محض ادبی تخلیق جس کے پیچھے کوئی اخلاقی قدر اور بلند مقصد نہ ہو ۔ کوئی بلند ادبی تخلیق نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ ایسا ادب مریضانہ انفرادیت کا شکار ہوتا ہے ۔ فن کار صرف عکاس یا نقاش نہیں ہوتا کہ وہ بے سوچے سمجھے اور بے مقصد قلم لے کر لکھنے بیٹھ جائے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ادیب و شاعر کی حیثیت اس کے ادیب و شاعر ہونے سے پہلے ایک ذمہ دار انسان کی ہے یہی ذمہ دارانہ حیثیت اسے بے مہار ہر طرف منہ مارنے اور جو چاہا کہہ دینے سے روکتی ہے ۔ ایک باشعور فن کار اپنے ذہن میں زندگی کا ایک وسیع ، تصور رکھتا ہے ، اور وہ تصور اسے ایک مقصد کا پابند بناتا ہے ۔ ایسے ہی فنکار کی شاعری جزو پیغمبری ہوتی ہے جو انسانیت کی فلاح کی موجب ہوتی ہے ۔ عالمی ادب و فنون پر جب ہم ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ حقیقت صاف دکھائی دیتی ہے کہ عالمی ادب کے ہر بڑے فنکار کے یہاں اعلیٰ اخلاقی اقدار کسی مذہب و عقیدہ کے پیش نظر ہی کافی گہری اور رچی بسی اور ان کی شخصیت میں پیوست نظر آتی ہیں ۔ بات یہ ہے

کہ اگر کوئی خیال یا عقیدہ خون میں حل ہو گیا ہو اور فنکار کا جذبہ بن گیا ہو تو اس کی جلوہ گری بہیں اس کے فنی کارناموں میں ضرور نظر آیگی یہی وجہ ہے کہ ان تمام بڑے فنکاروں کے یہاں ان کے عقیدہ و یقین کی بجلیاں اور ان کی روشن زندگیوں کی تجلیاں نظر آتی ہیں، اسی حقیقت کا اظہار اختر اورینوی نے دوسرے لفظوں میں یوں کیا ہے۔

"ادب بھی دوسرے فنون لطیفہ کی طرح اخلاقی قدروں کے ذریعہ عظمت و بزرگی کا اکتساب کرتا ہے، لیونارڈو ڈی ونچی، رفائیل وغیرہ مصوروں کے کارنامے مذہب عیسوی کی روایت کے سرچشمے سے سیراب ہیں۔ ہندوستانی مصوری کو لیجئے یہ بھی اساطیر سے اثر پذیر ہے ایک خاص اخلاقی قدر (MORAL VALUE) کی نمائندہ ہے، بدھ تہذیب کی بت تراشی بھی مخصوص اخلاقی قدر کو پیش کرتی ہے۔ ہندوستانی موسیقی کا انتہائی عروج بھی مذہب و اخلاق کی مملکت سے جا ملتا ہے۔ پروفیسر لیمان کے بقول "ہر آرٹ میں مخصوص قومی اخلاق کے جوہر ممکنہ نظر آتے ہیں"۔ اور میرا خیال ہے کہ فنون کے وہی کارنامے شہرت دوام حاصل کرتے ہیں۔ جو روح اجتماع کے سامنے ان اخلاقی قدروں کو کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہومر کی رزمیہ نظمیں، رامائن اور مہابھارت، شاہنامہ اور مرثیے اخلاق اجتماعی سے روح زندگی حاصل کرتے ہیں"۔ (ترقی پسند ادب تنقید جدید از اختر)

اس جدید اور سائنسی دور میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث بیکار و بے معنی ہے۔ اس لئے کہ زندگی کا تصور اتنا وسیع رنگا رنگ اور متنوع ہے کہ اس پر ہماری موجودہ زندگی کی پرچھائیں ضرور پڑے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ سوائے دور انحطاط کے کبھی بھی ادب بے مقصد نہیں رہا ہے۔ آج کا کوئی ادیب و شاعر اپنے سماجی ماحول، معاشی محرکات، سیاسی حالات، مذہبی اور تہذیبی رجحانات سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ دور انحطاط کا ادب غیر مقصدی اور مریضانہ ہوتا ہے۔ یہ سائنس اور عمل کا دور ہے۔ عمل بغیر کسی صالح نصب العین کے جنون ہٹلری ہے، اور سائنس بغیر کسی اخلاقی بلندی کے ایٹمی لعنت ہے۔ موجودہ شعر و ادب کی دنیا میں کسی بلند انسانی نصب العین کی تلاش اور اخلاقی اقدار کا تعین کرنا چاہئے۔ اختر اورینوی کا ادبی نقطۂ نظر یہی ہے۔ وہ پیام اور نصب العین کو زندہ اور رواں دواں محسوس کرتی اور سوچتی ہوئی حقیقتوں کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "سخنہائے گفتنی جب جمالیات سے ہم آغوش ہوتے ہیں تو مقصدی ادب پیدا ہوتا ہے۔ ادب ایک صناعت ہے۔ لہٰذا یہ جمالیات کے بنیادی اصولوں کی پیروی کرتا ہے۔ لطافت اور حسن کاری ادب کی تشکیل کے لئے ضروری ہے۔ ادب کا تبلیغی مقصد ادب کے اجزائے حسن و لطافت کے ساتھ شیر و شکر ہوتا ہے"۔ (ترقی پسند ادب تنقید جدید از اختر)

یہاں سے ہم اختر اورینوی کے مخصوص نظریہ فن پر گفتگو کی ابتدا کرتے ہیں۔ اب تک ادب، فن، نظریہ اور مقصد کی جو بحث سامنے آئی ہے۔ اس سے اختر اورینوی کا فکری پس منظر، نظریاتی ذہن اور ادب میں ان کے مقصدی اور تعمیری انداز کا اظہار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام مسئلوں میں اختر اورینوی کا ذہن نہایت صاف، واضح اور حقیقت پسندانہ ہے۔ اب تک کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آج کا ادیب و شاعر اپنا کوئی نہ کوئی مقصد خیال اور رجحان رکھتا ہے۔ بڑا ادیب و شاعر بننے یا ہونے کے لئے بے عقیدہ، بے مقصد اور بے تعین ہونا کافی نہیں۔ اگر شعر و ادب میں حسن و عظمت پیدا کرنے کے لئے جہاں فن پر گہری نظر درکار ہے وہیں اس کے ساتھ حیات و کائنات کا فکری شعور ایک عقیدہ کا یقین اور تعمیری مقصد اور نصب العین کا ہونا بھی لازمی ہے، اور یہی وہ عناصر ہیں جو شعر و ادب کو حسن دلآویزی اور بقائے دوام بخشتے ہیں۔

ان باتوں پر سیر حاصل گفتگو کے باوجود جو بات سب سے زیادہ قابل غور ہے وہ یہ کہ ادب کی بنیادی قدر صرف فنی اور جمالیاتی ہے یا

فکری اور افادی بھی؟ اس سلسلے میں اختر اورینوی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ادب و فن کی بنیادی قدر صرف "جمالیات" ہے۔ اس چیز نے اختر اورینوی کے فکر و فن اور ادبی تخلیقات میں تضاد پیدا کر دیا ہے۔ ایک طرف نظریاتی طور پر ان کا فکری پس منظر اسلام ہے اور دوسری طرف فن کی بنیادی قدر صرف جمالیات کو قرار دینے کی وجہ سے ان کے یہاں ایک طرح کا اضطراب (CONFUSION) نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فکر و فن میں ہم ان کے یہاں وہ ہم آہنگی اور توافق نہیں پاتے جس کی ان جیسے باشعور فنکار سے ہم توقع رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "آرٹ کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ وہ آرٹ ہو یعنی آرٹ کی بنیادی قدروں کو وہ کامیابی کے ساتھ برتنے۔ ہاں اس کا ثانوی مقصد کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔" اختر اورینوی کے اس نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے دو باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ ایک ان کا تصورِ حسن اور دوسرا تصورِ عشق۔ ان کے نزدیک آرٹ کی بنیادی قدروں میں ایک قدر اگر حسن و جمال ہے تو دوسری قدر عشق ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "حسن کے جلووں کا انعکاس و انضباط فنونِ لطیفہ کی بنیادی قدر ہے۔ فنونِ لطیفہ میں حسن کی جلوہ گری حسن کاری کہلاتی ہے۔" اس کے ساتھ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ فنکاری کے لئے لے کلی لازمی ہے۔ حسن کے ساتھ عشق کا بھی لگاؤ ہے۔ آرٹ کے بنیادی قدروں میں سے ایک قدر "عشق" بھی ہے" اور ان دونوں کی مزید تشریح و تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ

"حسن و عشق دونوں کو وسیع معنوں میں سمجھنا چاہئے۔ فن کے ان محرکات کو محدود کر دینا مناسب نہیں۔ مسجد قرطبہ ہو یا بدھ کے مجسمے، مریم عذرا کی تصویریں ہوں یا نٹ راج کے بت، اسٹالن گراڈ کی جنگ کی داستان ہو یا شاہنامہ، خمریات خیام ہو یا عریانیات امرا القیس ان سب کی بنیادی قدریں تصورِ حسن اور سوزِ عشق سے وابستہ ہیں۔"

اختر اورینوی کا یہ "جمالیاتی تصور" انتہا پسندانہ ہے۔ اس حیثیت سے ان کا ڈانڈا ان "جمالیئین" سے مل جاتا ہے جو فن زندگی اور معاشرے کے لئے جمالیاتی اقدار کو مطلق اور فائق ترین حیثیت دیتے ہیں۔ حالانکہ ادب و فن کے لئے جمالیات ایک اہم قدر تو بن سکتی ہے۔ لیکن سب کچھ جمالیات ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ سچ ہے کہ ادب کا مقصد براہ راست عمل کی تلقین نہیں بلکہ بالواسطہ عمل کی ترغیب دلانا یا اس پر اکسانا ہے۔ میرا ادبی نقطۂ نظر یہ ہے کہ فکر و فن باہم اس طرح ہم آمیز اور رچے بسے ہوں کہ دونوں کے درمیان کوئی خطِ امتیاز نہ کھینچا جا سکے۔ فکر و فن جن میں جمالیات بھی ایک اہم قدر ہے۔ دونوں مل کر ادب کے روئے تاباں پر نکھار اور دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ اختر کے یہاں حسن کا مفہوم و معنی اپنے اندر بہت ہی وسیع انداز رکھتا ہے۔ کائنات میں بکھرے ہوئے تمام ہی حسن، اختر کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ حسن کی جلوہ آرائیوں سے فیض یاب ہوتے ہیں ان کے نزدیک ادیب و شاعر کے لئے کوئی حدود و قیود نہیں۔ کائنات کا ہر حسن نگاہوں کے لئے جنت ہے اور اس سے آرٹ کی تخلیق ممکن ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

"آرٹ کی تخلیق کے لئے ایمان شرط ہے، خواہ یہ ایمان ذرّہ پر، ستارے پر، پھول پر یا حسین آنکھوں پر، شرابِ طہور پر، آبِ انگور پر، خودی پر یا خدا پر ہو۔" "ایک حسین عورت، ایک حسین منظر، ایک حسین خیال، ایک حسین عمل ان سب میں حسن قدرِ مشترک ہو سکتی ہے۔" "نسائی حسن ہو یا منظری حسن، شمیمِ گیسو ہو یا نکہتِ گل، سینے کی بلوریں گولائی ہو یا ماہِ تاباں، ان میں حسن ہی قدرِ مشترک ہے۔" (ادب و فن کی بنیادی قدریں۔ قدر و نظر۔ از اختر)

نتیجہ یہ نکلا کہ حسن کے یہ تمام جلوے فنکار کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں اور ان سے آرٹ کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں حسن کے ان جلووں کے اظہار کے پس منظر میں اخلاقی حدود و اقتدار کا ہونا لازمی ہے۔ ورنہ ادب و فن میں حسن کے اظہار کی بے قید چھوٹ فنکار کو حریصانہ جنسیت اور لذت پرستی کا شکار بنا دے گی جس کا خمیازہ آج کی نئی نسل بھگت رہی ہے۔ اور آج نہ صرف فرائڈ زدہ شعراء و

ادبا بلکہ پوری نسل کے اعصاب پر عورت اور جنس سوار ہے ، آج کا یہ اخلاقی مزاج موجودہ انسانی تاریخ میں ایک انتہائی ناپسندیدہ اور مضر حادثہ ہے جس کے ناخوشگوار اثرات سے نئی نسلوں کے ذہن زہر آلود ہو رہے ہیں اور ان میں ذہنی و فکری اور اخلاقی انتشار برپا ہے اس لئے ادب و فن میں اخلاقی اقدار کا واضح طور پر تعین ہونا چاہئے ۔ اختر اور رینوی کے نظریہ فن میں ہمیں "جمالیات" اتنا حاوی نظر آتا ہے کہ اخلاقی اقدار کا نہ صرف یہ کہ واضح تعین نہیں ہوتا ہے بلکہ حسن کی تیز آنچ سے اخلاقی قدر پگھل کر رہ گئی ہے حالانکہ ادب و فن میں جمالیاتی اور اخلاقی قدریں باہم متوازن اور ہم آہنگ ہونے چاہئیں ۔ ادب و اخلاق کے اس تعلق اور ہم آہنگی کو میں نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں اس طرح بیان کیا ہے ۔

"میرے خیال میں ادب و اخلاق دونوں کا مقصود و منتہا یہ ہے کہ ایک ایسے نظام زندگی کا احیا کیا جائے جس میں گندگی ، فحاشی ، بے حیائی اور جنسی بے راہ روی نہ ہو ، عفت و عصمت کا تصور عام ہو ، شرم و حیا عورت کے رخ تاباں کا غازہ ہو ، سماج میں شرافت نیکی اور پاکدامنی ہو صحت مند جائز جنسی تعلقات آسان ہو ، اور جنسی تراج مشکل ہو ، ادب و اخلاق کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے سماج اور معاشرے کے قیام کے لئے کوشاں ہو جس میں صحت مند جنسی تصور رہے اور مرد و عورت کی جنسی زندگی میں ایسا توازن برقرار رہے جس کی تلاش میں انسان آج تک سرگرداں ہے ۔" (ادب میں اخلاقی اقدار کا تصور ۔ اپریل ۶۲ء سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ)

اگر ادب و فن کی بنیادی قدریں صرف جمالیات پر نظر رہی اور اخلاقی قدر کو نظر انداز کیا گیا تو اس اعلیٰ ادب و فن کی تخلیق ممکن نہیں جس سے حیات انسانی میں تازگی و شادابی آتی ہے اور جس سے ہمارے سرمایۂ مسرت و بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے ۔ زندگی کے اعلیٰ اقدار اور معیاری حسن پر یقین سے اعلیٰ ادب کا وجود ہوگا اور زندگی کے ادنیٰ اقدار اور ادنیٰ حسن پر یقین سے ادنیٰ ادب کی تخلیق ہوگی ۔ ذرہ اور ستارے ، سینے کی بلوریں گولائی یا ماہ تاباں ، حسین آنکھوں یا آب انگور پر یقین سے اس اعلیٰ شاہکار کی تخلیق ممکن نہیں جو خودی اور خدا پر یقین سے وجود میں آتی ہے ۔ اقبال کی نظم "قرطبہ" ذوق و شوق ، اور ساقی نامہ وغیرہ کا اور امراء القیس کی عریانیات کا ادب کی دنیا میں ایک مرتبہ اور ایک مقام نہیں ہو سکتا ۔ اور نہ ہے ۔ حسن و عشق کے محرکات کو اخلاقی حدود و اقدار کا پابند بنانا نہ صرف یہ کہ لازمی ہے بلکہ اعلیٰ ادب و فن کی تخلیق کے لئے ضروری بھی ۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ اختر اور رینوی کے یہاں مذہب اور جمالیات دونوں کی جڑیں بڑی گہری اور دور تک پھیلی ہوئی ہیں ۔ مگر ان دونوں کے درمیان کوئی ایسا نقطۂ اتحاد وہ اپنے پیش نظر نہیں رکھتے ہیں جس سے فکر و فن میں توازن و توافق پیدا ہو ۔ ان کے نزدیک "آرٹ اور مذہب دونوں کا بنیادی و حقیقی تعلق وجدان سے ہے ، دونوں کا سرچشمۂ فیض جمالیاتی تجربے ہیں ۔" اسی بات کی وضاحت دوسری جگہ اس طرح کرتے ہیں کہ

"اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو اصل مذہب خود ایک عظیم آرٹ ہے ۔ نبی اور صوفی مشاہدہ جمال کے بعد انسان اور انسانی معاشرہ کو حسین بنانا چاہتا ہے ۔"

یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ آرٹ اور مذہب دونوں کا بنیادی اور حقیقی تعلق انسانی ضمیر و وجدان سے ہے اور دونوں انسان کی اسی لازوال جمال پسندانہ جبلت سے فیض یاب ہوتے ہیں جن سے انسان کا اندرون روشن و تابناک ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ادب و فن میں "جمالیات" اور اخلاقی اقدار آپس میں متوازن ہوں ۔ ان دونوں کی ہم آہنگی ہی سے اعلیٰ شعر و ادب کی تخلیق ممکن ہے ۔

اختر اور ینوی کے نظریۂ فن "برجمالیات" کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اس کا اثر ان کی دیگر ادبی تخلیقات پر بھی نمایاں رہتا ہے اور ان کے فکر و نظر کی پرچھائیں ان کے تخلیقی کارناموں کے رومانی کہر میں دب کر رہ جاتی ہے حالانکہ ادبی تخلیق اپنے اندر کوئی معنویت نہیں رکھتی۔ اگر اس کے پیچھے انسانی معاشرہ کی تعمیر و تطہیر اور کائنات کے بناؤ سنوار کا جذبہ کارفرما نہیں ہے انسان اور انسانی معاشرہ کی تہذیب و تطہیر کا جذبہ ہی کسی عظیم فنکار کو اعلیٰ قسم کی تخلیق پر آمادہ کرتا ہے، انسانی اعمال پر اس کے اندرونی اخلاق کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ انسان جس طرح خارجی دنیا کی تسخیر اور اس پر تصرف سائنس کی قوت اور ٹکنالوجی سے حاصل کرتا ہے اسی طرح انسان کے اندرون پر اس کا اخلاقی نقطۂ نظر اثر انداز ہوتا ہے۔ اپنی تطہیر روح اور تہذیب نفس کا کام وہ اخلاق کے ذریعے لیتا ہے۔ اس طرح اخلاقی اقدار زندگی کی تعمیر و تطہیر اور اس کو حسین و پرمسرت بنانے میں بنیادی عوامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب و فن میں ان اخلاقی اقدار کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا انہیں کی بدولت زندگی کی شب تاریک کو روشنی نصیب ہوتی ہے۔ عقل کا چراغ رہ گزر آس پاس کی کچھ زمین کو تو روشن کر سکتا ہے لیکن انسان کے درون میں جو ہنگامے برپا ہیں اسے تو مذہب و اخلاق ہی کی روشنی سے دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ نیکی اور خیر کے اخلاقی اقدار انسان سے باہر اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے بلکہ اس کی تمام تر تابانی خود اس کی قوت عمل میں مضمر ہوتی ہے۔ نیکی اور خیر کے اخلاقی اقدار ہی انسانی عزائم کی تہ میں پوشیدہ ہوتے ہیں جو افراد اور جماعتوں کو تخلیقی مقاصد پر اکساتے رہتے ہیں اور یہی اعلیٰ مقاصد ایک اچھے ادیب و شاعر کو اعلیٰ ادب و فن کی تخلیق پر آمادہ کرتے ہیں۔ جب کوئی فنکار ان ادبی اقدار اور اخلاقی اقدار کو ہم آہنگی سے اپنے اندر سمو لیتا ہے تو اس کی مثال اس ماہِ نو کی ہو جاتی ہے جس کے اندر "ماہ تمام" بننے کی پوری صلاحیت پوشیدہ رہتی ہیں۔ اس طرح اس فنکار کی مخفی قوتوں سے اعلیٰ تخلیق کے امکانات کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

(بقیہ: منصور عالم صفحہ ۲۶۴ کا)

ناولوں میں پیش کیا۔

پریم چند کے بعد ترقی پسند تحریک زور شور سے پھیلی، اور اس کے طفیل میں بے شمار افسانہ نگار سامنے آئے، لیکن مشاہدے کی گہرائی، تجربات کی وسعت، جزئیات زندگی کی تفصیل اور شعور و آگہی کی روشنی جتنی اختر اور ینوی نے اردو افسانے کو دی، وہ دوسرے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو افسانہ نگاری میں پریم چند کے بعد ہماری توجہ کو سب سے زیادہ اختر اور ینوی کھینچتے ہیں۔

(۵)

ڈاکٹر سید محمد حسنین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "اختر صاحب اگر اختر ادب نہ ہوتے تب بھی آبگینۂ اختریت میں بال نہ آتا"۔ میں اختر صاحب کا شاگرد نہ بن سکا۔ کلاس میں ان کی گرم گفتاری اور دلنوازی کی صورتیں نہیں دیکھیں اور ان کی دلکش و باغ و بہار شخصیت سے کبھی قربت بھی نہ رہی۔ اس لئے مجھے اختریت کا ذاتی تجربہ نہیں اس کی حسرت ہی رہ گئی۔ ان کے شاگردوں کی زبانی اختریت کے کئی دلنواز پہلو سامنے آئے ہیں۔ اپنی حسرت کی تکمیل میں نے ان کی ساری تخلیقات کو پڑھ کر کی ہے۔ ان کی ادبی نگارشات کا مطالعہ میں نے توجہ اور یکسوئی سے کیا ہے۔ ان کی قلم کاری کے حسن و قبح پر غور بھی کیا ہے اور زیادہ سے زیادہ روشنی حاصل کی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اختر صاحب اختر ادب ہیں اور جو شئے انہیں یہ مقام بخشتی ہے، وہ ان کی شاعری اور افسانہ نگاری ہے۔

سلطان احمد

اختر اور اُن کا فن

رنگ گورا، بدن چھریرا، قد بلند و بالا، فراخ پیشانی، طالع ارجمند، یہ آواز، یہ بولی یہ کہانی کس کی ہے؟ "بابا تیری نگری میں بولتا ہے کون؟" ایک نوجوان، جس کے جوان ہوتے ہی جان کے لالے پڑے، اُس کے عزیز اقربا تیمارداری سے تھک گئے، وہ خود اپنی جان سے تنگ و بیزار، معالج دل برداشتہ، مگر زندگی مسکرائے اور بفضلِ ربّی صحت پائے، تعلیم سے فارغ، حصول معاش میں کامیاب، اپنے فرائض کی خدمتوں میں لگے، اقدام کی برکتوں اور افکار کی جولانیوں سے بھرپور ہو۔ تو واقعہ افسانہ سے زیادہ حیرت انگیز کیوں نہ ہو؟ واقعی لرزتے ہوئے دلوں کی تمنائیں مالکِ حقیقی سے عاجزانہ التجائیں وہ بھی کر سکتی ہیں، جو سمجھ بوجھ میں نہ آئیں۔ اس عالم کی سب سے بڑی حیرت یہ ہے کہ انسان ظاہر پرست ہے، وہ ان واقعات کے باوجود صرف اسباب کو دیکھتا ہے، مُسبّب الاسباب کو نہیں۔ دعاؤں میں اٹھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر عقیدتوں سے سرشار ہو جائے۔ لیکن ان کے اثر و قبولیت کی حقیقتوں سے غافل رہے ؂

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

بتاؤ یہ سبب تھا یا حکم؟ کہ لفظ کُن سے فیکوُن کا منظر سامنے آگیا۔ حرکت سے زندگی اور خیال سے سخن، آواز حرکت میں آئی سخن میں گویائی۔ سخت تیز و رواں اور سُست، نرم و نازک، اسی آہنگ سخن میں شعر، نغمہ، افسانہ اور وہ سب کچھ جو جادو جگادے اور دلوں کو مسخر کرے، اپنا اپنا لہجہ اپنی اپنی دُھن، فن کی مہارتیں اور بیان و کلام کی صورتیں مختلف ہوں۔ لیکن خیال ہی کے جلوے سب میں روشن و نمایاں ہوتے ہیں۔ افسانہ مختصر طویل جو بھی ہو اثر نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ حکایت کی لذت اثر میں ہے۔ طوالت کے باوجود اثر کو ڈھونڈو، وہ نہیں ملتا اور کبھی چند ہی جملوں میں پکار اُٹھے۔ یہ لگن کی بات ہے۔ سخن جب خونِ جگر سے پیدا ہو تو دل نواز اور دل نشین ہوتا ہے۔ اب ستار ہو یا ستارہ، ایک نغمہ ہے ایک سُرور۔ لیکن اختر وہ ساز ہے جس میں نغمہ ہے اور سرور بھی۔ بس چھیڑو اور دیکھو کیا نغمہ ہے کیا سُرور۔ افسانے میں کون چھپا ہے، جلوہ گری کس کی ہے؟ شخصیت پکارے، انفرادیت نعرے لگائے کہ یہ سخن ہے، یہ جانِ سخن۔

ہماری زبان میں مختصر افسانوں کے استاد منشی پریم چند نکلے۔ انہوں نے اس فن میں جو کمال دکھایا، وہ انہی کا حصہ تھا۔ افسانوں کی اولیت و طول نویسی میں کسی کو فوقیت حاصل ہو، لیکن چھوٹے چھوٹے مؤثر مضامین، قریوں، دیہاتوں کی زندگی اور انسان کے سوز و گداز کی جو تصویریں پریم چند نے کھینچی ہیں۔ ان کا رنگ و روغن کہیں نہیں ملتا۔ ان کے افسانوں کی مقبولیت ہر طرف پھیلی، پڑھنے والوں کے ساتھ ساتھ لکھنے والوں کی بڑی کثرت ہوئی۔ مذاقِ سخن میں تبدیلی ہوئی۔ اور فن کی ترکیب، تشکیل، ہیئت و صورت میں کتنا ہی فرق پایا جائے، پھر بھی رسائی فکر، رجحانِ طبع اور میلانِ فن کے اعتبار سے یہ سب پریم چند کے گلشن بہار کی خوشہ چینیاں ہیں۔ خواہ کرشن چندر کی جہانبانی ہو یا علی عباس

کی جہاں بینی، بیدی کی نکتہ دانی، منٹو کی چابک دستی اور اختر کی حق شناسی، یہ تمام واردات ایک ہی رشتۂ فکر سے متعلق ہیں، سب نے خونِ جگر اور دماغ سوزی سے کام لیا۔ اپنی مشق ہے اپنا بیاں، سرچشمہ قائم ہے اور نہریں جاری۔ افسانوں کو کسی رنگ میں رنگ لو، وہ ہر رنگ کو قبول کرے اور اجاگر ہو، جلوے کی تابانیاں گویا خواب کی تعبیریں ہیں۔ کتنے جلوے ایسے بھی ہیں جو نظروں میں سمائیں، خیالوں میں آئیں مگر تعبیروں کو ترسیں۔ یہ فنکار جانیں اور ان کا فن۔ ع بسیار عشوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست۔

فسانوں کے اسی دورِ قمر میں ستارۂ اختر طلوع ہوا، دبیرِ فلک کا اشارہ پاکر سامری صفت سامنے آیا۔ اس کی چمک کی ساحرانہ کشش میں بعض کرنوں سے ایسی شعاعیں بھی نکلیں جن سے فکر و فن کے علاوہ تبلیغ و ہدایت کی ضیا باریاں ہوئیں۔ کیونکہ وہ صرف اختر شماری کا قائل نہیں۔ ایک مشنری کا دل و دماغ رکھتا ہے، ولولوں و حوصلوں سے کام لینا جانتا ہے۔ یہی وہ معنوی ربط و تعلق ہے جس نے فن اور تبلیغ کے درمیان غیرت دلائی اور راہ عمل دکھائی۔ پہلے متوجہ و متاثر کرتے ہیں، پھر دل کی لگن اور کام کی دھن ہوتی ہے، ورنہ "حسرتِ تعمیر اور سپنوں" کے دیس میں کیا دھرا ہے؟ اس لحاظ سے اختر کی بساط زیادہ وسیع و دراز ہے۔ اس کی جلوہ نمائی وسعتوں میں پھیلی۔ نتائج میں دُور رس اور ہمہ گیر ہوئی۔ بمقابلہ پریم چند کے، جن کی کہانیاں سمٹی سمٹائی اثر میں ڈوبی ہمارے سامنے ضوفگن ہوتی ہیں، بلاشبہ فن کی یہ کامیابیاں نمایاں اور شاندار ہے۔ مگر مبلغ کی سرگرمیوں میں صحرا نوردی کی بے تابیاں رجز خواں ہیں اور تعمیرِ حیات کی شادکامیاں گامزن۔ بظاہر یہ صورت مبہم و پس ماندہ نظر آئے۔ لیکن دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے انجام کار اپنا اثر دکھلاتی ہے۔ اختر نے اپنے افسانوں میں تبلیغ کی ہے۔ فن کو نوعیت دی ہے۔ آہنگ کو راگ اور زندگی کو تعمیر کا سبق۔

یہ کوئی راز نہیں کہ عورت دمساز ہے، ہمدم اور نصف ثانی۔ وہ اپنی خوشگواریوں کی بدولت نصف اول سے بہتر۔ اس کی صورتیں عام ہوں، لیکن خانۂ اختر میں خاص الخاص، کہ شکیلہ اختر بہتر نصف ہونے میں افسانہ سے زیادہ حقیقت ہیں۔ فنکار کی فنکار اور رفیق کی رفیق، گویا قران السعدین"۔ وہ اختر کے سکون و طمانیت کے ساتھ ساتھ ان کے فکر و فن کی گنجائشوں میں سمائی ہوئی ہیں۔ شکیلہ کی خوبیوں میں اختر جلوہ گر۔ اختر کی سرگرمیوں میں شکیلہ سایہ فگن۔ اور ان دونوں کی مشترکہ توانائیوں سے فن کو غیر معمولی تقویت پہنچی ہے۔

لیکن فن کا کمال یہ ہے کہ فن کار اپنے عمل سے مطمئن نہ ہو، وہ خوب سے خوب تر کا خواہاں ہو۔ اختر کے فنی رجحان کا یہ عالم دیدنی تھا کہ دہلی کی ایک افسانوی تقریب سے پہلے وہ اپنے افسانوں کے کہنہ سال کرداروں کو کھوج کھوج کر جمع کرتے ہیں اور فن کی خصوصیات پر پوری آزادی کے ساتھ مباحثہ ہوتا ہے۔ ہمیں کسی بزمِ خاص کے راز و نیاز کا کیا علم؟ البتہ دور کا جلوہ، جو اس صحبت عزیز کے بیان مجریہ سے ہمیں حاصل ہوا۔ ظاہر کرتا ہے کہ یہ مذاکرۂ جمیل اپنی جدت کے علاوہ فن کی بعض خصوصیات کا علمبردار ہوا۔ وہ اپنی وضاحتوں میں پراسرار ہوکر علم حجاب کا پردہ دَر۔ لیکن زندگی کی ہر آن متوقع اور پُرامید ہوتی ہے۔ اب یہ کون بتائے کہ ہر سانس آہ کی گرمی ہے یا واہ کی ٹھنڈک؟ اچھائی سے محبت، مصیبت نہیں مسرت ہے۔ اور بُرائی سے نفرت انسان کی طبیعت۔ آدمی کتنا ہی بُرا ہو اس کی خلقت بری نہیں۔ کہتے ہیں شدتوں میں آنے والی مسرتوں کا مزہ ہے اور لذتوں میں نکل جانے والی حسرتوں کا گلہ۔ فکر کا تقاضا ہے کہ آگے دیکھے، پیچھے سے غافل نہ ہو اور آنے والے کا منتظر رہے۔ دراصل افراط و تفریط ہی برائیوں کی جڑ ہے۔ اعتدال صحت اور اچھائی کی دلیل۔ اس زندگی میں تپتے رہنا آدمی کا وہ منصبِ جلیل ہے جو آزمائشوں کی شرطوں کو پورا کرتا اور گفت و بیان کے لئے قابلِ رشک ہوتا ہے۔ پھر خیر ہی خیر اور محسن ہی محسن ہونے میں ہماری منزلت کیا ہوئی؟ ہماری تخلیق بہمہ وجوہ کامل ہی نہیں اس میں

اکمل ہونے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ یہ اس کا احسان ہے۔ ورنہ ہم خیر و حُسن کو بس اتنا ہی جانتے ہیں جہاں تک ہماری نظر پہنچے۔ یہ نظر دیکھتی ہی کب ہے "وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہو" یہاں کی ہر شے اپنی ضد سے پہچان میں آتی ہے۔ مگر کسی شے کا نہ معلوم ہونا اس کی نفی نہیں، نہ ہمارے ذہن کی کوئی مبہم شکل اس کی اصلی و حقیقی صورت ہے۔ یہ معاملہ صرف اشیاء اور اسماء تک محدود نہیں، بلکہ ان کے اقدار کے صحیح سمجھنے کی صورتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ یہ جسم خاک میں ملے، آگ میں جلے، ہوا میں اڑے، منتشر و برباد ہو۔ اس سعی تمام کے بعد، جب حضوریٔ حق میں آئے تو ذات کا پتہ چلے اور حقیقت معلوم ہو۔ اگر ابن آدم خیر و شر میں نہ پڑے تو اپنی کھوئی ہوئی جنت کیونکر پائے، اپنے خالق کی بخششوں اور اس کے کرم کی بارشوں کا شکر کس منہ سے ادا ہو، جو ہماری غلط کاریوں کو اپنی ستّاریوں سے ڈھانپ لے اور آدمیت کو اس درجہ نوازے اور وہ مرتبہ بخشے کہ اپنے عطیہ کو صلہ بنا دے۔ اس رحم کی بخششوں میں کرم کی دوگونہ لذتیں ہیں کہ نقص کی خامیوں کے باوجود اعمال کی قبولیت کو نیتوں پر محمول رکھا اور اپنے عطیہ کو ہمارے لئے صلۂ کار ٹھہرایا۔ یہ ہے عُروجِ آدم جس سے انجم ہی نہیں فرشتے بھی حیرت میں ہیں کہ یہ خاک کا پُتلا تپنے کے بعد کیسا روشن اور کتنا قریب تر ہو گیا۔

انسان کی عظمت اس کے زورِ کلام میں نہیں، نرمیٔ کلام اور پاک باطنی میں ہے۔ اختر کا احتسابِ عمل اس کی بڑائی کا ثبوت ہے۔ وہ تخیل کی وسعت رکھتا ہے اور تعمیل کی گنجائش۔ اس کے فن کے شاہکار ہونے کی یہی ضمانت کافی اور اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ کوئی اُلٹا سیدھا نہ دیکھے، یہ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ کون سیدھا ہے کون اُلٹا۔ جامۂ ہفت رنگ کی زیبائشوں میں اگر اُلٹے سیدھے کی تمیز نہ ہو، بلکہ اس کی اُبھری بناوٹ، چمک دمک کے موٹے نشان اور خط و لکیر کی پُرپیچ کشش کا شیدائی اُلٹے ہی کو سیدھا سمجھ لے، تو اس کی جدت پسندی میں پائیداری بھی رخصت۔ انسانی اعمال کی کسوٹی پر جانچ اتنی ہی ہے کہ توفیق ہمت سے ہے اور تفوق و برتری اس کی عنایتوں سے یہاں جس کی جتنی قدر ہو جائے، غنیمت ہے۔ ورنہ میدانِ حشر اور میزانِ عمل کی ضرورت کیا تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ جلووں کا قرب مل جائے، قرب کا جلوہ نہیں ملتا۔ کچھ یاد ہے ایک ذرا سی تابش نے کیا کیا؟ وادیٔ مقدس کا پہاڑ جل اٹھا اور کلیم اللہ کے ایسا جلیل القدر نبی (علیہ السلام) جن کی نظریں پہاڑ پر جمی ہوئی تھیں، آن واحد کی چمک سے غش کھا کر گر پڑا۔ اس لئے ذات کا تصور اسی قدر ہو سکتا ہے کہ اس کی مثال نہیں، وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ ہے اور بس۔ ذات کا تصور کیونکر ہو، جب اس کی شرط نقدِ جاں ٹھہری۔ خرابی کی یہ صورت ہی ہماری تعمیر کی بنیاد ہے۔ نئی تعمیر کے لئے پرانی عمارت گراتے ہیں۔ اس عالم میں ہمارا تپتے رہنا اسی بنا پر ہے کہ ہمارے اندر تسلیم و رضا کی کتنی صلاحیتیں پیدا ہوئیں اور ہم اس کی بخششوں کے کس درجہ امیدوار ہیں۔

غرض جتنا غور کرو اتنا ہی پاؤ۔ اختر کی ضیا باریوں میں فکر کی شعاعیں روشن ہیں، افسانوں میں حیات کی بیتابیاں ہیں اور اقدام کی سرگرمیاں۔ قدم بہ قدم، منزل بہ منزل آہستہ و محتاط چلنے والے ہی زندگی کے مقابلوں میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اقدام کی تیزی سے پہلے اپنی طاقت کا اندازہ، رُخ کا درست اور رفتار کا ٹھیک ہونا ضروری ہے۔ اختر شناسی میں فن کے قطب نما نشانات ملتے ہیں۔ ان کا محاسبۂ عمل ہمیں یہ بتاتا ہے کہ افکار کی تصویروں کا رنگ، رُوپ ہی قابلِ توجہ نہیں، صرف دیکھنا نہیں، بلکہ سننا بھی ہے کہ وہ کیا بولتی ہیں! ہاں تصویریں گویا ہیں کہ وہ تاثر کو پیدا، میلان کو ظاہر اور جذبے کو موجزن کرتی ہیں۔ اور گویائی ہے کیا؟ اختر کے سرگم میں ایک مدھم آواز بھی ہے کہ افسانے کا ایک نہ ایک بول پیارا ہونا ضروری ہے۔ یہ ٹیپ کا بند ہے، جو دہرائے، اترائے اور دوڑائے۔ اس کے بغیر افسانہ کتنا ہی رنگین و طرفہ تماشا ہو، اُس پھول کے مثل ہے جس میں شادابی و جاذبیت کی فراوانی ہو، مگر خوشبو نہ ہو کہ مشامِ جاں بنے اور گلے کا ہار ہو۔ افسانہ زندگی کی حرکت اور حیات کا پیغام ہے۔ وہ ساکت ہے نہ خاموش۔ اس کو دوڑنا چاہئے اور گونجنا۔ تاکہ حرارت پیدا ہو، سرگرمی دکھلائے، زندگی کو مشغول رکھے اور مشغولیت کو زندہ!

پروفیسر سید احتشام حسین

اختر اورینوی کا نظریۂ تنقید

اکثر ادیب اپنی شخصیت اور تصورات کے اظہار کے لئے اصناف ادب میں سے ایک یا دو صنفوں کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے راستوں پر چلنا اور ہر ادبی صنف میں اپنے نقش بنانا قاری کے دل میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ لکھنے والا اپنی منزل مقصود سے ناواقف ہے اور مختلف راہوں پر بھٹک رہا ہے۔ لیکن یہ بات ہر حال میں صحیح نہیں ہوتی۔ بعض ادیبوں کی قوت تخلیق اظہار کی مختلف راہوں سے ایک ہی منزل کی طرف جانا چاہتی ہے۔ چنانچہ یہ بات مجھے پروفیسر اختر اورینوی کی ذات میں بھی نظر آتی ہے۔ انہوں نے ناول بھی لکھے ہیں اور افسانے بھی۔ شاعری بھی کی ہے اور ڈرامے بھی تخلیق کئے ہیں۔ تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہے ہیں اور تحقیق کی راہوں سے بھی گزرے ہیں اور قابل غور بات یہ ہے کہ ان سب میں انہوں نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان تخلیقات کا جائزہ لیا جائے گا تو غالباً ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعلیٰ ترین مظہر ان کے افسانے اور تنقیدی مضامین قرار پائیں گے۔ تحقیق ایک طرح سے تنقیدی شعور کے لئے معاون ثابت ہوگی۔ اور شاعری افسانہ نویسی کی تخئیلی فضا کو تقویت بخشے گی اگر غور سے دیکھا جائے تو اختر اورینوی کے ذہنی عمل میں تنقید اور افسانے کی شاہراہیں بھی متوازی چلنے کی بجائے ایک ہی مرکز خیال کی طرف جاتی ہوئی نظر آئیں گی جسے ہم حسن۔ خیر اور حقیقت کی جستجو کا سنگم کہتے ہیں۔

اس مختصر سے مقالے میں اختر اورینوی کے تنقیدی تصورات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ بنیادی افکار کو سمجھنے کی کوشش بھی کی جائے گی، جن سے ان کے نظریات فن کی تخلیق ہوتی ہے۔ انہوں نے مختلف مقامات پر اپنے تنقیدی اصول اور نظریوں کی وضاحت اس طرح کر دی ہے کہ ان کے نقطہ نظر کے سمجھنے میں کچھ زیادہ دشواری نہیں پیدا ہوتی۔ انہوں نے تنقید کی طرف توجہ ۱۹۳۶ء کے بعد کی۔ اور چند سال کے ایک معمولی وقفے کو چھوڑ کر جسے ذہنی تعمیر کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کے خیالات ہمیشہ بڑے واضح انداز میں ایک ہی سمت میں بہتے رہے ہیں۔ اپنے ایک مجموعہ مضامین کے دیباچے میں اختر اورینوی نے اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ "بنیادی اور مجموعی طور پر آج بھی میرے خیالات وہی ہیں (غالباً ۱۹۴۲ء میں) جو ان مقالوں کے لکھنے کے وقت تھے۔ مگر خیالات کے بعض پہلو بدل گئے ہیں۔ میں ادب و شعر کی تخلیق میں سماجی میلانات اور ماحول کی معروضیت اور مزاج کی اہمیت کو آج بھی تسلیم کرتا ہوں لیکن اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس عمل میں انفرادی قوت تخلیق و تعمیر کی اہمیت نسبتاً زیادہ ہے۔ ناقد کا فرض ہے کہ اس پہلو پر تاکیدی نشان لگائے . . . ادب میں رفیع مقصد کا ہونا بہت ہی اہم بات ہے مگر اس اختراعی اور جمالیاتی مطالبوں کا پورا کرنا فنکار کا فرض اولین ہے۔" یہ بات اختر نے مختلف شکلوں میں بار بار دہرائی ہے اور بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ فنکار کے انفرادی میلانات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ انہوں نے متعدد مضامین میں اس خیال کو واضح

کرنے کے لئے لکھے ہیں کہ ادب میں تبدیلی اور تغیر فطری اور لازمی ہے، ارتقاء زندگی کا ایک ناگزیر عمل ہے۔ ادب اپنی پیدائش اور کام کے لحاظ سے سماج، مذہب، سیاست ہر ایک سے اثر قبول کرتا ہے۔ شاعر اور ادیب اپنے ماحول کی زندہ عکاسی کرتا ہے اور بدلتے ہوئے ماحول کی ترجمانی سے کسی وقت غافل نہیں رہتا۔ ان خیالات کی موجودگی میں ادیب اور شاعر کے انفرادی میلانات کو اہمیت دینے سے وہ توازن پیدا ہوتا ہے جس کو پیش نظر رکھے بغیر شعر و ادب سے انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اختر اورینوی عہد جدید کے ان تقاضوں کا شعور رکھتے ہیں جس میں نہ تو کھلی ہوئی انفرادیت ذہنی آسودگی کا سامان فراہم کر سکتی ہے اور نہ کوئی ایسا سماجی نظام تسلط حاصل کرتا نظر آتا ہے جو فرد کی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ سائنس، عمرانیات، مذہب، فلسفہ اور فنون لطیفہ کی مختلف شاخوں کے وسیع مطالعے نے ان کے سامنے زندگی کو ایک بڑے کینوس کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جس میں یہ مختلف مظاہر الگ الگ بھی نظر آتے ہیں اور مل جل کر ایک نقش میں بھی تبدیل ہو جاتے ہیں جس کا حسن اپنی الگ کیفیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ان کے اکثر تنقیدی مضامین میں بھی تخلیق ادب کی اس پیچیدگی کو ملحوظ رکھا گیا ہے، ان کا ایک بہت ہی اہم مضمون ادب و فن کی بنیادی قدریں (جو نقد و نظر میں شامل ہے) اس نقطۂ نظر کی بہت واضح ترجمانی کرتا ہے۔ اس مضمون کو ان کے نظریۂ فن کا ایک ادبی منشور کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس میں نہ صرف علمی حیثیت سے مختلف فنون لطیفہ کی باطنی ساخت اور بنیادی مسائل سے بحث کی گئی ہے بلکہ اظہار خیال نے عقیدے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جگہ جگہ پر ایک ایسے خطیبانہ جوش کی جھلک ملتی ہے جو اپنے نقطۂ نظر پر یقین اور اعتماد کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔

اختر کے مختلف وقتوں میں لکھے ہوئے مضامین کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے مزاج کی لطافت اور ذہن کی قوت تخلیق حقائق کا احساس کرنے کے بعد ایک عالم مثال کی جستجو میں نکل کھڑی ہوئی ہے۔ جہاں وہ ادب اور شاعر سے حسن کے بکھرے ہوئے جلووں کو ایسے منظم انداز میں پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں جو حسن کو بقائے دوام عطا کرے۔ اختر کے خیال میں ذوق حسن عطیۂ فطرت ہے اور اگرچہ حسن مطلق تک انسان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کا ذوق جمال اسے حسن کے گیت گانے کے لئے مجبور کرتا ہے اور اظہار کے جو ادھورے ذرائع اس کے پاس ہیں ان سے کام لے کر وہ جلوۂ حقیقت کو جسم مجاز عطا کرتا ہے۔ یہاں میں نے جس مثال پرستی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اختر کے بنیادی افکار کا جزو ہے۔ بہت سے مغربی علماء کی طرح وہ بھی مذہب اور آرٹ کو ایک ہی سرچشمۂ فیض سے متعلق سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "آرٹ اور مذہب دونوں کا بنیادی اور حقیقی تعلق وجدان سے ہے اور دونوں کا سرچشمۂ فیض جمالیاتی تجربے ہیں، آرٹ میں ہیئت کا وہی مقام ہے جو مذہب میں شریعت کی جگہ ہے، اور اول الذکر میں فنی تجربے کی وہی کیفیت ہے جو ثانی الذکر میں طریقت یا باطنی تجربے کی۔ لطیف و حسین باطنی تجربے آرٹ اور مذہب کی روح ہیں۔۔۔ اسی منزل سے صوفی، نور و سرور حاصل کرتا ہے اور صناع میتھو آرنلڈ کے "اسکالر جپسی" کی طرح اسی شیرازۂ سماوی سے سوز و نور پاتا ہے۔ حسن ہی مذہب اور آرٹ کی بنیادی قدر ہے اور اسی سے خوبی اور حسن کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔" اس میں شک نہیں کہ فن کے اعلیٰ تجربے ایک طرح کے روحانی تجربوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ لیکن شاید ہر شخص اس بات کو تسلیم نہ کرے کہ مذہب کی باطنیت فن کی باطنیت سے وہی مماثلت رکھتی ہے جس کی طرف اس عبارت سے ذہن منتقل ہوتا ہے۔ غالباً اختر کا یہ مقصد بھی نہیں ہے کیونکہ وہ جہاں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ "خود مذہب فنون لطیفہ میں لطیف ترین فن ہے۔" وہیں وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ آرٹ کی ایک بنیادی قدر عشق بھی ہے جو حسن کاری کا محرک بنتا ہے۔ اسی لئے اس کے دائرے میں جہاں مسجد قرطبہ اور گوتم بدھ کے مجسمے آتے ہیں وہیں اسٹالن گراڈ کی جنگ کی داستان، شاہنامہ، خمریات خیام اور عریانیات امراء القیس بھی۔

اختر اورینوی نے اپنے چند مضامین میں اپنے نظریہ تنقید کو بڑی گہری اور فلسفیانہ بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے جو شخص ان کے اس قبیل کے مضامین کا مطالعہ کرے گا۔ اسے بالکل شبہ نہیں باقی رہ سکتا کہ وہ تنقید کو محض ایک ذوقی چیز سمجھتے ہیں۔ یہ مضامین ہیں جبلتیں اور قدریں، ادب اور نفسیات، تخلیق و تنقید، ادب و فن کی بنیادی قدریں۔ فن اور ماحول، ادب میں روایات اور تبدیلیاں اور ترقی پسند ادب، ان میں سے ہر مضمون ان بنیادی مسائل کی طرف متوجہ کرتا ہے جو ادب کا مطالعہ کرنے والے کو پیش آتے رہتے ہیں، اگرچہ انہوں نے کہیں کہیں اپنے خیالات جذباتی انداز میں ظاہر کئے ہیں، لیکن ان کے پیچھے گہری علمی بصیرت اور زبردست مطالعہ سے پیدا ہونے والا شعور ہے کیونکہ جب وہ تنقید نگار کی ذمہ داری کی گفتگو کرتے ہیں تو اس توازن کو برقرار رکھتے ہیں۔ جس میں ادب اور ادیب سے ہمدردی کے باوجود صداقت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے کو فرض شناسی سے غفلت قرار دیا جائے گا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "نقاد کا فرض ہے کہ وہ کاذبوں کے کذب سے اہل ادب کو آگاہ کرتا رہے، ادبی گمراہوں، خامکاروں، خطاکوشوں اور باغیوں پر نگاہ رکھنا بھی اس کا کام ہے۔۔ غیر جانبداری بھی ایک اہم اصول تنقید ہے اور یہ بھی وسعت تخیل اور لامحدود ہمدردیوں سے حاصل ہوتی ہے"۔

اختر ادب میں نصب العین کے بھی قائل ہیں اور یہ نصب العین ان کے نقطۂ نظر سے اخلاق اجتماعی کی روح پیش کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ادب کو تبلیغ کا آلہ کار بنانے کے مخالف ہیں۔ حالانکہ اگر ادب تبلیغی مقصد کو اجزائے حسن و لطافت کے ساتھ شیر و شکر کر کے پیش کرے تو وہ اسے جمالیاتی اصولوں کے منافی نہیں سمجھتے، چنانچہ ایک جگہ وہ ادب پر امریکی اثرات اور روسی اثرات دونوں کو اس لئے انتہا پسندی سے تعبیر کرتے ہیں کہ دونوں کے پیچھے سیاسی پروپگنڈے کی مشین حرکت کر رہی ہے، لیکن اگر کوئی ادیب کسی مخلصانہ تحریک کی بنیاد پر کسی ایسے موضوع کو بھی فن پارے کی شکل میں ڈھالتا ہے جو بظاہر تبلیغی یا سیاسی نظر آتا ہے تو وہ خلوص اور حسن کاری کی بنا پر اسے ادب کے دائرے میں شامل کر لیتے ہیں۔ اپنے کئی مضامین میں انہوں نے جبلت جمال کو فن کی بنیادی قدر قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہی قدر فن کے اندر حسن اور اثر پیدا کرتی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "مخلصانہ تحریک و افکار کا مصدر پوری کائنات ہو سکتی ہے اس کا کوئی حصہ ہو سکتا ہے، پھول یا تارے، کوئلے کی کانیں یا زلف شبگوں، سبزہ زار یا ایروڈروم، مسجد قرطبہ یا کوریا، بھوک یا جزیرہ بالی کا رقص، بنگال کا قحط یا صبح بنارس۔ شرط یہ ہے کہ ان کا جذبی، تخیلی، جمالی، صناعانہ، موزوں ترنم، حسین اظہار فن پارے میں ہو"۔ حقیقت یہ ہے کہ اختر نے اپنے تمام نظریاتی مضامین میں اس بات پر زور دیا ہے کہ ادب میں حسن و صداقت دونوں کا موجود ہونا لازمی ہے۔ ادیب اور شاعر کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے سچے تجربات کو حسین انداز میں پیش کرے۔

تنقید جدید کا یہ ایک بہت ہی الجھا ہوا مسئلہ ہے کہ موضوع اور اظہار کو کس طرح خالص ادبی اور جمالیاتی قدروں کے ذریعے سے پرکھا جائے۔ کیونکہ خود زبان اور اسلوب خیال کے تابع ہو جاتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ موضوع کی عظمت اور حسن ہی سے زبان کے تخلیقی استعمال کے لئے راستہ ہموار ہوتا ہے۔ اختر نے اس نکتہ کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور مختلف شکلوں میں اظہار کی پیچیدگیوں اور اسالیب کی رنگا رنگی کو صناعت اور حسن کاری کا جزو قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اختر اورینوی کا ذہن وجود انسانی کو ایک اخلاقی نظام کے تابع لانا چاہتا ہے۔ اور ان کا دل جمال پرستی کو فن کا بنیادی وصف قرار دینے پر مصر ہے۔ اس کشمکش سے اکثر فنکاروں کو سابقہ پڑتا ہے اور اسی کی توجیہ اور تاویل سے وہ ایک ایسا نظریۂ فن ترتیب دے لیتے ہیں جس میں دونوں کے لئے جگہ نکل سکتی ہے۔ کچھ ایسی ہی بات ہے جیسے قلب تو مومن ہو اور دماغ کافر پر آمادہ ہو۔ تاہم یہ بھی صحیح ہے کہ اس کشمکش کے بغیر فن وجود میں بھی نہیں آتا ہے۔ اختر اپنے نظریہ تنقید اور نظریہ فن میں اسی نصب العین کی جستجو کرتے ہیں۔

اوپر کی سطروں میں اختر اورینوی کے نظریہ فن کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ایک تنقید نگار کی حیثیت سے ان کی کامیابی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ ان نظریات کو نہ صرف اپنے افسانوں اور شعری کارناموں میں پیش کرتے ہیں۔ بلکہ دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی فنکاری کا جائزہ لیتے ہوئے بھی انہیں سے کام لیتے ہیں میرا خیال ہے کہ اس کا خوبصورت مظہر ان کا آخری مجموعۂ مضامین "سراج و منہاج" ہے۔ اس میں اختر اورینوی نے جن شعراء کا جائزہ لیا ہے ان میں سے ہر ایک کے اندر انہوں نے حسن و اخلاق کی انہیں قدروں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے جن سے ان کے نظریۂ فن کے تانے بانے تیار ہوئے ہیں۔ خاص طور پر شاد عظیم آبادی کی غزل گوئی اور انداز فکر، جمیل مظہری کی غزل نگاری، پرویز شاہدی کی فنکاری، اور اجتبیٰ رضوی کی شاعری، ان کی عملی تنقید کے دلکش اور اعلیٰ نمونے ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے تنقیدی انداز نظر کی جلوہ نمائی بھی کرتے ہیں۔ ان مضامین میں انہوں نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ شاعر کی اس انفرادیت کا سراغ لگائیں جو اپنے ذاتی جمالیاتی تجربوں کو ایسے فنی ڈھانچوں میں ڈھالتی ہے جو تاثیر سے لبریز ہیں۔ یہ تاثیر خود اختر کی تحریروں میں موجود ہے کیونکہ ان کا ذہن تخلیقی ہے اور وہ محسوس کر کے لکھتے ہیں۔ گو ان کے چند مضامین ہلکے پھلکے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور سے ان کا انداز بیان دلکش، اُن کے تجزیئے عالمانہ، اور ان کے اصول ادبی ہیں تنقید جدید نے اپنے سر یہ ذمہ داری لے رکھی ہے کہ وہ ذوق اور شعور کا تجزیہ ہی نہ کرے بلکہ ادبی ذوق کی تربیت میں بھی مدد دے۔ اختر اورینوی کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کرنے والا اسے محسوس کرے گا کہ وہ اس ذمہ داری سے باخبر ہیں اور پڑھنے والے میں صحیح اور صحت مند ذوق تجسس پیدا کرتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ان کے نظریات تنقید محض ادبی تنقید کے مطالعے کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان کے سوتے ان کے تصور حیات سے مل جاتے ہیں جو کائنات کو حسین اور متوازن دیکھنے کا متمنی ہو۔

(بقیہ: شمسی ص ۵۸ کا)

قیامت آ چکی بچھڑے ملیں گے کب؟ — الٰہی ہوگی کب پوری تیری میعاد

ہے قہر و مہر کا خوف و رجا اک ساتھ — الٰہی رحم سے حل کر دے یہ اضداد

خدا حافظ! ہوا ہے رہ سپار اک پیر — سپرد کر کرم کی سوئے خلد آباد

درِ غفراں پر اس کی باریابی ہو — دعائے مغفرت مقبول رحمی باد

تری رحمت ہو یا رب روحِ شمسی پر — رکھ اس کو گوشۂ فردوس میں آباد

ہوئی جب فکر تاریخ وداع اس کو — دل ملہم سے کی مسلم نے استمداد

کہا جو تھا اسیر بند غم، سن لے

وہ فخر الدین شمسی ہوگیا آزاد

۱۳۹۱ ہجری

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی

اردو تنقید میں اعتدال و توازن کی ایک مثال

اردو میں تنقید کا وجود اصلی ہو یا فرضی لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ بعض تاریخی و سماجی اسباب کی بنا پر اعصاب زدگی اور ریک شرا پن ہمارے ادبی و تنقیدی مزاج کا خاصہ رہا ہے۔ مدرسانہ اور مکتبی قسم کی بے مغز تصنیفات و تالیفات کو اگر ہم دائرہ تنقید سے خارج بھی کر دیں تو بھی ہماری جدید تنقید اپنی تمام ترافادیت کے باوجود بت پرستی و بت شکنی، مجادلہ و مناظرہ، مدح سرائی و ہجو نگاری، تبلیغ و اشتہار، وعظ و تلقین، تہدید و تنبیہ، اور سنسنی خیزی و دہشت انگیزی کے حصاروں سے کم ہی باہر نکل پائی ہے۔ اختر اورینوی دور حاضر کے ان معدودے چند نقادوں میں ہیں جنہوں نے ان تمام تاثرات و تعصبات سے بلند ہو کر اپنے ادبی مزاج کی تربیت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدی تحریریں اعتدال و توازن کی ایک خوشگوار مثال پیش کرتی ہیں۔ وہ نہ روایت زدہ ہیں اور نہ روایت سے روگرداں۔ انہوں نے قدیم و جدید کا مطالعہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے اور مشرق و مغرب کے علمی اور ادبی سرمائے سے صالح طور پر استفادہ کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین خواہ وہ اصول و نظریات سے متعلق ہوں یا وہ اشخاص و افراد کے تجزیئے اور محاکمے سے تعلق رکھتے ہوں بالعموم اس افراط و تفریط سے محفوظ ہیں۔ جن سے ہمارے اکابرین تنقید کا دامن بھی پاک نہیں ہے۔

اختر اورینوی کا جو تنقیدی کام ہمارے سامنے ہے۔ ان میں مطالعہ اقبالؔ اور مطالعہ نظیرؔ کے علاوہ کہ وہ مستقل تصانیف ہیں۔ ان کے تنقیدی مجموعے کسوٹی، تنقید جدید، قدر و نظر اور سراج و منہاج اردو زبان کے سرمایۂ تنقید میں دیرپا حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ ان نقادوں میں نہیں ہیں جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ادبی حلقوں میں فتنہ و فساد اور بحث و تمحیص کے دروازے کھول کر گرمی بازار کا سامان فراہم کیا ہو یا بعض رجحانات و تحریکات کی پشت پناہی کے لئے نزاعی یا دفاعی مضامین لکھ کر سرخروئی حاصل کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادبی گروہوں میں کم سے کم زیر بحث رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اسی سبب سے اردو تنقید کا جائزہ لینے والوں کے ذہن سے بھی ان کا نام اکثر و بیشتر اتر گیا ہے۔ "غزل کی گردن بے تکلف ماردینی چاہئے" یا "اردو شاعری میں کیا ہے محض چند دھجیاں اور چند پرزے" قسم کے بیانات کو اہم تنقیدی فیصلے سمجھ کر اس کی موافقت و مخالفت میں ہم اپنی قوت اتنی صرف کر دیتے ہیں کہ ہمیں یہ فرصت ہی نہیں ملتی کہ لوگوں کی قدر کر نا سکیں جنہوں نے اردو زبان کے قدیم و جدید اسالیب و رجحانات کے بارے میں معقول اور مناسب رائیں دی ہیں اور جن کی روشنی میں ہم ادب کا جامع اور متوازن تصور قائم کر سکتے ہیں۔

ممکن ہے اوپر کے چند فقروں سے یہ گمان ہو کہ میں نے یہ خصوصیات فرض کر لی ہیں اور میں کسی خوش فہمی میں یا خوش عقیدگی کی بنا پر انہیں اختر اورینوی سے منسوب کر رہا ہوں اس لئے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض مضامین کی طرف توجہ مبذول کرائی

جائے جنہیں پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا ہے۔

اختر اورینوی بھی ہمارے ان ادیبوں میں ہیں جنہوں نے ۱۹۳۶ء کے آس پاس ادبی دنیا میں قدم رکھا اس وقت روایت اور جدیدیت۔ افادیت اور جمالیت، مارکس اور فرائڈ، غزل اور نظم قسم کی بحثیں چل رہی تھیں۔ رجعت پسندی اور ترقی پسندی، مشرقی زندگی اور مغربی زندگی کے خطابات تقسیم کئے جارہے تھے۔ ان کے ہم نام اختر حسین رائے پوری کا مقالہ "ادب اور زندگی" نئی ادبی تحریکات کی بنیاد دے چکا تھا اور اس کے اثر سے ہمارے یہاں ایک طرف روایت پرستی پر اصرار بڑھ رہا تھا تو دوسری طرف ماضی کے ادب کو جاگیردارانہ عہد کے زوال پذیر قدروں کا نمائندہ سمجھ کر اس سے بغاوت کی جارہی تھی، ایک طرف ہیئت پرستی، دوسری طرف مواد پرستی اس زمانے میں اختر اورینوی نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ آج بھی قابل غور ہیں:۔

"روایات اگر مکمل ڈھچر نہیں تو اس کی ریڑھ کی ہڈی ضرور ہیں۔ آئندہ ہونے والی ترقیاں انہی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں۔ ہر ادب چند خصوصیات ورثے میں حاصل کرتا ہے، یہ روایتی خصوصیات ایک فضا پیدا کر دیتی ہیں۔ اور مستقبل میں نقش ہونے والی تصویریں، اس فضا سے ایک خاص رشتہ رکھتی ہیں۔ ماضی کے خطوط و دوائر مستقبل کے رنگ و روغن سے کم اہم نہیں۔"

"ادبی تبدیلیاں ضروری، لازمی، فائدہ رساں اور فطری ہیں۔ چونکہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے لہٰذا جب کبھی آثار حیات میں تبدیلی ہوگی۔ ادب اس سے ضرور متاثر ہوگا۔ اگر ادب سے تبدیلیوں کو علٰحدہ کر دیا جائے، تو وہ آثار قدیمہ میں شامل کئے جانے کے قابل ہوجائے اور اس کے اوراق کتب خانوں کے بجائے عجائب خانوں کی زینت بنیں۔ تبدیلیاں ادب میں لچک پیدا کرتی ہیں، لچک زندگی کے لئے ضروری ہے۔ جمود حیات کے منافی ہے۔"

"بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو کسی نظریئے کی پیروی کے جنون میں مبتلا ہو کر ہمارے سرمایۂ ادب کے کسی حصّے کو رائیگاں کر دینا چاہتے ہیں مثلاً وہ خالصے جو عربی اور فارسی الفاظ کو ہندوستانی زبان سے نکال پھینکنا چاہتے ہیں یا وہ لوگ جو غزل گوئی کے خلاف علم جہاد بلند کئے ہوئے ہیں۔ یا وہ گروہ جو فارسی عربی اور عبرانی تلمیحات یا ایرانی تشبیہات و استعارات سے متنفر ہے، وہ لوگ بھی حد درجہ بد اندیش ہیں جو فصاحت کے جنون میں مبتلا ہو کر رسیلے ہندی شبدوں کو ادب کے سرمائے سے نوچ کر پھینک دینا چاہتے ہیں۔"

تلمیحات و قصص کے متعلق عرض ہے کہ جس طرح ہماری زبان عربی ایرانی و عبرانی سرمائے سے فیضیاب ہے بالکل اسی طرح انگریزی ادب یونانی و رومی صنمیات و اساطیر سے بھرا ہوا ہے۔"

"ایک گروہ ادبی روایت کی پونجی مٹانے پر تلا ہوا ہے اب اس گروہ کی سنئے جو تبدیلیوں کی مخالفت میں ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ یہ لوگ اسلاف کی ہڈیوں سے چمٹے ہوئے ہیں، نئے خیالات نئے رجحانات، نئے اسالیب اور نئی طرزوں کو بغاوت و طغیان کا نام دیتے ہیں۔ یہ لوگ اردو ادب کا گلا گھونٹ رہے ہیں، زمانہ خود انہیں مٹا کے رکھ دے گا۔" (ادب میں روایات اور تبدیلیاں)

اب اسی زمانے کا ایک اور مضمون دیکھئے جو "ترقی پسند ادب" پر ہے:۔

"زمانے کے ردّ و بدل نے زندگی کے پرانے معیاروں پر نظر ثانی کی ضرورت ناقابل انکار طور پر ثابت کر دی ہے۔ رواں دواں زندگی ہمیشہ نئے مسئلے پیدا کرتی ہے اور پھر ان نئے مسائل کا حل سوچتی اور راہیں بروئے کار لاتی ہے حیات کے خصائص میں تسلسل بھی

ہے اور انقلاب بھی۔ زندگی اپنی بنیادی خصوصیات پر قائم رہتے ہوئے بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ حرکت و ترقی زندگی کا بہت بڑا مظاہرہ ہے۔ ادب مظاہر زندگی میں سے ایک مظہر ہے۔ ادب خلا میں نہیں پیدا ہوتا بلکہ یہ زندگی کے بطن سے جنم لیتا ہے، اور اسی کی آغوش میں پروان چڑھتا ہے۔ لہذا ادب کا زندگی اور مظاہر زندگی سے متاثر ہونا ضروری ہے۔"

"مگر ادب کے نصب العین رکھنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ادب اور پروپگنڈہ ایک ہی چیز ہے۔ ادب ایک کامیاب پروپگنڈہ ہو سکتا ہے مگر ہر پروپگنڈہ ادب نہیں ہوتا۔ خالص پروپگنڈہ ادب نہیں ہوتا۔ خالص پروپگنڈے ہیں وہ حسن کاری نہیں ہوتی جو ادب میں پائی جاتی ہے۔ سخن ہائے گفتنی جب جمالیات سے ہم آغوش ہوتے ہیں تو مقصدی ادب پیدا ہوتا ہے۔ ادب ایک صناعت ہے۔ لہذا یہ جمالیات کے بنیادی اصولوں کی پیروی کرتا ہے۔ لطافت اور حسن کاری ادب کی تشکیل کے لئے ضروری ہے ورنہ محض بے جان سی چیز ہوتی ہے"۔

"ترقی پسند ادیبوں کے لئے فن اور ترکیب فن سے واقف ہونا ضروری ہے۔ قدیم ادب العالیہ کے بہترین نمونے اور شہکار ہمارے لئے رہبری کا کام کر سکتے ہیں۔ گزشتہ تہذیبوں کی ساری اچھائیاں ترقی پسند ادب کے لئے بہت ہی قیمتی ورثہ ہیں"۔

"ترقی پسند ادیب کے لئے ایک اور مسئلہ نہایت ہی نازک ہے۔ پیام اور نصب العین کو اشتہاری یا تبلیغی طور پر نہیں پیش کرنا چاہئے۔ زندگی کی رواں دواں اور محسوس حقیقتوں کے ساتھ پیش کرنا چاہئے۔ اشتہاری ادب پیدا کرنا آسان ہے۔ مگر ادب کو اس طرح برتنا کہ اس کے ذریعے زندگی کا جسمانی اور روحانی اکسرے ہو جائے اور پھر بھی دل کی دھڑکن، خیالات کی پرواز اور اعضا کی حرکت قائم رہے بڑی کٹھن بات ہے"۔

"ترقی پسندی کو اتنا ہی وسیع ہونا چاہئے جتنی حیات حاضرہ وسیع ہے۔ ترقی پسندی سے واقفیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ بھوک افلاس اور جنسی کمزوریوں کو پیش کر دے بلکہ انسان کے سارے جذبات اور لامحدود تخیلات کو موجودہ سٹنگ میں پیش کرنا سچی حقیقت نگاری ہے"۔

"ہمارے ادبا تجربات کو زندگی کا قالب نہیں بخش پاتے۔ ان کے تجربے ننگے اور بے جان ہوتے ہیں، صرف نعرۂ انقلاب یا جلوس کی صداؤں کو ادب نہیں کہتے۔ واقعات کا سرسری بیان داروغہ جی کی رپٹ تو ہو سکتا ہے مگر ادب کہلانے کا مستحق نہیں"۔

"ہر عبوری دور کی ابتدا میں ادب عالیہ سے زیادہ اشتہاری ادب پیدا ہوتا ہے۔ ناقد کا فرض ہے کہ وہ خود مسائل حیات و مسائل ادبیہ سے واقفیت حاصل کرے اور اپنی رہنمائی کے ذریعے اصلاح ادب اور اصلاح زندگی میں حصہ لے۔ نئے پیدا ہونے والے رجحانات کی تنقید و تہذیب، ان کی کانٹ چھانٹ اور ان کی تنظیم باقی رہنے والی ترقی کے لئے ضروری ہے، حیات اور ادب کے رجحانات کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑنا تراج اور تباہی پیدا کرتا ہے۔ ہمیں تراج کی نہیں نئے راج کی ضرورت ہے"۔

ان طول طویل اقتباسات کے لئے کسی معذرت کی ضرورت اس لئے نہیں کہ ان خیالات سے ہماری تنقید کا ایک قابل ذکر پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ کہ اس نوع کا نقطۂ نظر پیش کرنے والوں کو ہم نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ ان کے خیالات نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئے اور اس کے برعکس ان تنقیدوں کو فروغ ہوا جن کے لکھنے والوں نے ترقی پسند ادب کے نام پر لکھی ہوئی ہر تحریر کو ادب سمجھا اور انہیں دستاویز سمجھ کر پڑھا۔ ان کی بنیاد پر ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کو اہمیت دی گئی، ادب کے جمالیاتی اور فنی پہلوؤں کو نظر انداز کر دینے اور ادبی تخلیقات

کا جائزہ لیتے وقت محض ان کے مواد کو پیش نظر رکھنے کا نتیجہ جس شکل میں رونما ہوا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

اس موضوع کے تمام نظریاتی اور اصولی مضامین میں اختر اورینوی کے یہاں سنجلی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔ انہوں نے فن کے رموز و اسرار کا کلی طور پر مطالعہ کیا ہے اور اس کے ہر پہلو پر ان کی رائیں بہت جچی تلی ہیں۔ "فن اور ماحول" "افسانہ فنی نقطۂ نظر سے"۔ "افسانے میں مقصد"۔ "افسانے میں حقیقت طرازی و مثال نگاری"۔ "ڈرامہ، فنی نقطۂ نظر سے"۔ "ادب اور نفسیات"۔ "تخلیق و تنقید"۔ "ادب و فن کی بنیادی قدریں جبلتیں اور قدریں"۔ یہ وہ مضامین ہیں جو اردو کی اصولی اور نظریاتی تنقید میں آج بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ ان مضامین کا محرک کوئی فوری جذبہ یا مقصد نہیں بلکہ ان میں وہ تصورات پیش کئے گئے ہیں۔ جو ادب کے گہرے مطالعے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کی اپیل صحافتی نوعیت کی نہیں ہے اور نہ ان میں کوئی تہلکہ برپا کرنے والے خیالات ہیں لیکن ادب کا کوئی طالب علم جب بھی ادب کے بارے میں کوئی معقول اور سنجیدہ نقطۂ نظر پیدا کرنا چاہے گا تو اس کو ان مضامین سے بہت مدد ملے گی۔

اختر اورینوی ان ادیبوں میں سے نہیں ہیں جنہوں نے انگریزی یا اردو ادب کے چند نمونے سامنے رکھ کر ہی اپنی تنقید کی عمارت کھڑی کی ہو۔ انھوں نے سائنس، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، سیاست، مذہب اور دیگر متعلقہ علوم پر بھی دسترس حاصل کی ہے اس لئے ان کی تنقیدوں میں وزن اور وقار ہے۔ اور ان کے یہاں وہ حکیمانہ بصیرت ملتی ہے جو تنقید کے لئے از بس ضروری ہے، ان کی تنقیدیں تاثراتی انشائیے یا عدالتی فیصلے نہیں ہیں بلکہ ان کے یہاں وہ تنظیم ملتی ہے جو سائنٹفک تنقید کی خصوصیت ہے۔ ان کا مضمون "جبلتیں اور قدریں" اس اعتبار سے اردو تنقید میں ایک بیش بہا اضافہ ہے جس میں انہوں نے تمام علوم سے استفادہ کر کے بہت مدلل طور پر مارکس اور فرائڈ کے پیرووں کے انتہا پسندانہ نظریۂ ادب اور نظریۂ جمال کی تردید ہے۔ اور ادب کی بنیادی قدروں کے بارے میں ایک خیال انگیز نظریہ پیش کیا ہے۔

اصولی اور نظریاتی مضامین کے علاوہ اختر اورینوی کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ان کی علمی تنقید سے کیا جا سکتا ہے۔ علمی تنقید کے لئے صرف کتابی مطالعہ اور معلوماتی علم ہی کافی نہیں بلکہ ادب کے رچے ہوئے ذوق، سوجھ بوجھ، ادبی قدروں سے گہرے لگاؤ، تخلیقی عناصر کی پہچان اور بے لاگ خارجیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ اس کے بغیر علمی تنقید یا تو مدح سرائی کا نمونہ ہوتی ہے یا ہجو و تضحیک کا پیرایہ، ہمارے نقاد عموماً ان اشخاص پر مضامین لکھتے ہیں جن کی تعریف کرنی مقصود ہوتی ہے یا ان پر قلم اٹھاتے ہیں جن کی شہرت خاک میں ملانی ہوتی ہے۔ اختر اورینوی نے جن ادیبوں پر یا شاعروں پر قلم اٹھایا ہے ان کے کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے کی کوشش کی ہے، ان کی خوبیوں کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے اور ان کی خامیوں کی بے لاگ نشان دہی کی ہے۔ نظیر اکبر آبادی، راسخ، شاد عظیم آبادی، غالب، درد، داغ، حسرت، اقبال اور نذیر احمد پر ان کے مضامین پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے فن کا محاکمہ کس دیدہ وری سے کیا گیا ہے لیکن سب سے قابل توجہ وہ مضامین ہیں جو انہوں نے اپنے ہم عصروں پر لکھے ہیں۔ ہم عصروں پر ہمارے سکہ بند نقاد یا تو مستقل مضمون نہیں لکھتے اور اگر لکھتے ہیں تو مروت اور مصلحت ان کی تنقیدی رایوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اختر اورینوی نے جوش (ایک صناع کی حیثیت سے) فیض احمد فیض کی شاعری اور اس کی فضا، جمیل مظہری کی غزل گوئی، پرویز شاہدی کی فنکاری، اور اجتبٰی رضوی کی شاعری پر جو مضامین لکھے ہیں وہ ان کی تنقیدی دیانتداری، فنکارانہ آگہی اور متوازن طرز فکر کا بین ثبوت ہیں۔

جوش کی بعض نظموں پر تجزیہ و تنقید کا عمل کرتے ہوئے انہوں نے نظم نگاری کا یہ اصول پیش کیا ہے:۔

"نظم ایک مکمل تعمیری اکائی ہوتی ہے۔ نظم کی مکمل اور متعین عضویاتی تنظیم کے لئے یہ لازمی ہے کہ ساخت میں کہیں جھول نہ ہو کہیں

رخنہ نہ ہو، بے جا اضافہ و تکرار بھی عیب ہے اور نامناسب کمی، اختصار اور تشنگی بھی۔ نظم کی تکمیل کے لئے اس میں ارتقا ہونا ہے اس کی ابتدا، درمیانی منزل اور انتہا ہوتی ہے۔ ان حصوں میں کڑی تنظیم پائی جاتی ہے۔ ایک کامیاب نظم کی فنکارانہ تکمیل اس کے مجموعی تاثرات پر منحصر ہے کسی ایک جزو کا حسین اور ترشا ہوا ہونا کافی نہیں بلکہ مختلف اجزا کے نظم کا مجموعی حسن ضروری ہے۔"

اب جوشؔ کے سلسلے میں ان کی بعض تنقیدی رائیں دیکھئے:۔

جوشؔ کے فن میں نری نقاشی نہیں بلکہ مصوری ہے یعنی وہ الفاظ کے رنگ و نور سے تصویریں بناتے ہیں۔ اور حقیقتوں کی تخلیق نو بھی کرتے ہیں، مگر جوشؔ کی اوسط درجے کی بڑی نظم میں بھی تنظیم کا عیب پایا جاتا ہے۔ وہ زور تخلیق میں مربوط اور بے جھول نعیر نظم نہیں کر سکتے اور یہ عیب دن بدن زیادہ ہوتا گیا ہے۔ جوشؔ کی چھوٹی نظمیں عموماً اسجل اور مکمل طور پر تراشیدہ ہوتی ہیں۔"

جوشؔ کی نظم "انسان کا ترانہ" کا تنقیدی تجزیہ دیکھئے:۔

"میرے خیال میں یہ سارا کلام منظوم صرف ایک شعر کی شرح ہے اور بس کہ ؎

مری شان سے بحر و بر کانپتا ہے خنجر کانپتا ہے مجبر کانپتا ہے

اسی مطلع کو اور چودہ اشعار کے ذریعے پہلو بدل بدل کر پیش کیا گیا ہے۔ نظم کی ہیئت غزل کی ہے، شاعر مقطع میں بھی وہی بات کہتا ہے جو مطلع اور دوسرے اشعار میں کہی گئی ہے۔ عام طور پر غزل میں ہر شعر ایک منفرد تجزیہ پیش کرتا ہے یا سارے اشعار متنوع کے باوجود ایک جذبہ و کیف میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ غزل کی تعبیری قسم ہے جو نظم نما ہے مگر نظم نہیں اور ابتری خیال کی جگہ تکرار خیال کا عیب لئے ہوئے ہے۔ صرف تشبیہیں اور استعارے بدلتے جاتے ہیں، خیال میں کوئی ارتقا یا تنوع نہیں پایا جاتا۔ اس نام نہاد نظم کا میکانیکی ارتقا محض قافیوں کے سہارے قائم ہے۔"

جوشؔ کی نظموں کے بارے میں مجموعی طور پر جو رائے قائم کی گئی ہے وہ یہ ہے:۔

"جوشؔ کے ہر مجموعے میں ایسی نام نہاد نظمیں کثرت سے مل جاتی ہیں جو تکرار خیال کی وجہ سے غیر متحرک اور نامکمل ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان کی خاش غزلوں جیسی ہے۔ جوشؔ غزل نگاروں کے متعلق کہتے ہیں ؎

ان کے دل میں شعر کی روشن ہو کس صورت سے آگ قافئے کے ہاتھ میں رہتی ہو جن لوگوں کی باگ

خود جوشؔ کی باگ بھی قافئے کے ہاتھوں میں رہتی ہے مثلاً ان کا ترانہ "نظام نو"، "ہم لوگ"، "مشاہدات"، "داغ جگر بجھتا ہوں"، "یوم بہار"، "آج کی رات"، "شام کا رومان"، "تیرے لئے"، "کب آئے گا"، "ابدی شعلہ"، "خرابات"، "جہاں میں تھا" وغیرہ وغیرہ۔

جوشؔ کی موسیقی کا آہنگ تیز اور گونجدار ہوتا ہے۔ وہ نرم تجربوں کو متناسب اور نرم آہنگ میں پیش نہیں کر سکتے۔ ان میں صوتی گداز کی کمی ہے۔"

جوشؔ کی مشہور نظم "کسان" کا فنی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"استعاروں کے سیل رنگ و بو میں کسان گم ہو جاتا ہے۔ یہ اشعار نہ صرف یہ کہ واقعیت کی تصویر کشی سے قاصر رہتے ہیں بلکہ کثرت تکرار سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ ہر شعر اپنی جگہ پر خوبصورت اور پر تاثیر ہے مگر کل کے حسن میں اضافہ کرنے کے بجائے تکرار بے جا سے بدصوتی پیدا کرتا ہے جیسے کوئی تاج محل کے میناروں یا گنبدوں میں اضافے پر اضافہ کرتا جائے۔"

فیض احمد فیض، جن کی شاعری پر تحسینی و تعریفی مضامین بھی خاصے تعداد میں لکھے گئے ہیں اور تخریبی و تنقیصی بھی لیکن ان پر متوازن تنقید کم دیکھنے میں آتی ہے۔ لوگ یا تو ان کی شہرت سے مرعوب ہیں یا برافروختہ۔ اختر اورینوی نے فیض پر جو مضمون لکھا ہے وہ نہ صرف ان کے بہترین مضامین میں سے ایک ہے بلکہ فیض پر لکھی گئی تمام تنقیدوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں فیض کے محاسن اور معائب دونوں کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:-

رچے ہوئے احساسات، گہرے متوازن جذبات، رنگین و شاداب تخییل سے مل کر فیض کی نظموں میں دیرپا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ فیض کی نظموں کا روپ اور تراش مرکب و پیچیدہ اور رابلیدہ نہیں ہوتا مگر اس فنکار کے سادہ خاکوں اور نقشوں میں نفاست و لطافت پائی جاتی ہے۔ ان کی گرہست سبک اور گٹھیلی ہوتی ہے، لیکن فیض میں نانکر اور پھیلاؤ کی کمی ہے، اس کے تخئیل میں اڑان بھی نہیں۔ اس کی اکثر و بیشتر نظموں کی سطح عنفوانِ شباب کے محسوسات سے آگے نہیں بڑھی۔ اس کے شاعرانہ تجربے ارتقا اور بالیدگی سے ہمیشہ منہ موڑے رہتے ہیں۔"

عام طور پر لوگوں نے "دستِ صبا" والے فیض کو "نقشِ فریادی" والے فیض کے مقابلے میں ترقی یافتہ بتایا ہے۔ لیکن اختر اورینوی نے اس دور کے فیض کے شاعرانہ انحطاط سے تعبیر کیا ہے:-

"فیض کی شاعری کا دوسرا دور اس کی ترقی پسندی کے باوجود ترقی یافتہ نہیں۔ اگر فکر میں تھوڑی سی تبدیلی ہوئی ہے اور جذبے کا رخ اور محل بدل گیا ہے تو اس سے شعریت اور رعنائی کو کچھ نقصان ہی پہنچا ہے فائدہ نہیں۔"

"دستِ صبا" کی تین نظمیں تو نقشِ فریادی سے ہی لی گئی ہیں۔ بقیہ نظموں میں بھی ہمیں ترقی فن کی کوئی منزل نہیں ملتی۔"

پرویز شاہدی پر مضمون لکھتے ہوئے بطور تمہید یہ بات کہی ہے:-

"پرویز میرے ہم عصر ہیں، بہاری ہیں، عظیم آبادی ہیں، میرے دوست ہیں، اشتمالی ہیں اور میں ابھی تک اپنے آپ کو مذہبی کہتا ہوں۔ اتنی دیواریں میرے راستے میں حائل ہیں۔ ان کو توڑ کر مجھے پرویز کی شخصیت اور اس کے فن تک پہنچنا ہے۔"

اوپر کی سطروں میں جو نکتہ پیش کیا گیا ہے وہ بہت سے نقادوں کے لئے قابلِ غور ہے۔ خاص طور پر جب ہم دیکھتے ہیں کہ اختر اورینوی نے اپنے مضمون میں ان شخصی تعلقات و تعصبات سے اوپر اٹھنے کی کوشش کی ہے۔ پرویز شاہدی کی نایاب قدر نظموں کو سراہا ہے اور ان کی خوبیوں کا تجزیہ کیا ہے۔ لیکن ایک نظم پر یہ بے لاگ رائے سنئے:-

"ہر کلام منظوم شعر نہیں ہوتا۔ خطابت اور صحافت کو شاعری نہیں کہتے۔ اس پوری نظم کو پڑھ کر یہ اثر ہوتا ہے کہ عنفوانِ شباب میں داخل ہوتے ہی ایک نوجوان کو غصہ آگیا ہے اور وہ غصہ بھی سلیقے سے نہیں کر پایا ہے۔ اس نظم سے کمزور ذہانت اور معمولی ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اخبار کا کالم نویس ایک مراسلہ سپردِ قلم کر رہا ہے جس میں کہیں کہیں ادبیت کی جھلک بھی ملتی ہے اور جو اتفاق سے منظوم بھی ہو گیا ہو۔"

نظم "بنتِ ہمالہ" کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس نظم میں بعض بند بہت خوبصورت ہیں۔ فنکار نے لفظوں سے مصوری کی ہے، پیکر تراشی کی ہے، موسیقی کی لہریں ہیں اور ترکیب و استعارہ سے نئی تعبیریں تخلیق کی ہیں۔ اسلوبِ ادا میں ندرت ہے۔ اس نظم میں بڑے امکانات تھے۔

لیکن شاعر کو آنی جانی تاثرات نے بہکا دیا۔ شاعری لمحے کو ابدیت میں تبدیل کرتی ہے۔ لیکن نظم میں ابدیت کو لمحہ بنا دیا گیا ہے۔"

نظم "قید خانہ" کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"نہایت ایمائی عنوان ہے۔ نظم کی کلی تاثیر، شعریت اور قوت و ندرت کا اظہار قابل تحسین ہے۔ اگر اس نظم کے بندوں میں غزل کی ہیئت استعمال نہ کی جاتی تو بہتر تھا۔ فارم نے مزاج نظم کو بھی منتشر لذت بنا دیا ہے۔ تکرار خیال بہت کھلتی ہے۔"

آگے چل کر ایک عمومی بات یہ کہی ہے:۔

"کاش اردو نظم کو کوئی غزل کی زیادتیوں سے نجات دلا دیتا۔ نظم کے فارم میں تکرار خیال اور لفظوں کا بہروپ بہت برا لگتا ہے۔ نظم کی کاریگری گٹھی ہوئی تراشیدہ اور مربوط ہوتی ہے۔ جوش ملیح آبادی نے نظم کے فارم میں غزل کی بوبودگی دیدی اور ایک بڑے شاعر کی بری مثال سے بہتوں کو ٹھوکر لگی۔"

جمیل مظہری اور راجنبی رضوی پر بھی اختر اورینوی نے اسی طور پر بے لاگ تنقید کی ہے۔ جہاں ان کی شاعری کے محاسن اجاگر کئے ہیں، وہاں ان کی کوتاہیوں اور نارسائیوں پر بھی کھل کر لکھا ہے۔ اس طرح کے تنقیدی مضامین نہ صرف کہ زیر بحث شاعر کے لئے مفید ہو سکتے ہیں بلکہ اس سے دوسرے شعراء اور ادب کے عام طالب علم بصیرت حاصل کر سکتے ہیں۔

عملی تنقید کی جو مثالیں اوپر دی گئی ہیں ان سے یہ خیال دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اختر اورینوی بھی شاید اسی طرح غزل اور غزلیت کے مخالف ہیں جس طرح پروفیسر کلیم الدین احمد، اوّلاً تو اس خیال کی تردید ان کے ان مضامین سے ہو سکتی ہے جو انہوں نے غزل گو شعراء پر لکھے ہیں۔ مثلاً غالب، شاد عظیم آبادی، داغ اور حسرت وغیرہ پر۔ لیکن غزل کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا اندازہ ان کے مضمون "فن غزل" سے کیا جا سکتا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"یہ بات ہرگز صحیح نہیں کہ غزل میں مہذب و متمدن شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ غزل میں اگر عضویاتی تنظیم نہیں ہوتی تو اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ اشعار مفرد کی یکجا پیشکش قطعی طور پر غیر فنکارانہ ہے۔ اشعار مفرد میں بھی حسن کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ وہ کہا ہے گا ہے اچھی نظموں پر بھی بھاری ہوتے ہیں۔ منظم حسن کاری میں ایک خاص قسم کی لذت بخشی ملتی ہے لیکن حسن کی انفرادی اداؤں میں بھی سامان لذت و نشاط ہے۔ ان لذتوں کو برے معنے میں نیم وحشت یا بی نہیں کہہ سکتے۔ کیا وہ ہر میلان فطرت، ہر جبلت ہر خصوصیت، جو دور وحشت یا عہد نیم وحشت میں پائی جاتی تھی، بری ہے؟ کیا متمدن دور کی ساری خصوصیات پسندیدہ و محمود ہیں؟ تفصیلی بحث سے قطع نظر سادگی و معصومیت ہی کو لیجئے، بے ریا محبت، اخلاص و وفا کی استواری ہی کو لیجئے، یہ صفات اس سماج میں زیادہ تابناک طور پر پائی جاتی تھیں، جسے نیم وحشی کہا جاتا ہے اس کے برخلاف تصنّع، دکھاوا، خود غرضی و دون کی پیریت، متمدن دور کی وبائیں ہیں اور ان کا سایہ ادب پر بھی پڑ رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہمارے سماج کے نیم وحشی دور کے بہت سے عناصر آج کی مہذب دنیا کے لئے بیتابانہ طور پر ضروری ہیں۔ اگر غزل کے فن میں ایسے ہی نیم وحشی عناصر ہیں تو وہ اس قابل ہیں کہ انہیں توازن حیات و توازن فن برقرار رکھنے کے لئے قائم رکھا جائے۔"

اختر اورینوی کے مضامین پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اصناف و اسالیب کے سلسلے میں کسی قسم کی تنگ نظری یا تعصب نہیں۔ وہ غزل سے بھی لطف اندوز ہونا جانتے ہیں۔ نظم کی قدر و قیمت بھی پہچانتے ہیں اور ہیئت کے تجربوں کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں۔

لیکن وہ ہر صنف کے مخصوص تقاضوں اور مطالبوں کو سمجھتے ہیں اور ان کی روشنی میں فن پارے کا جائزہ لیتے ہیں۔ انہوں نے مثنویوں اور مرثیوں پر بھی لکھا ہے۔ اور وہاں بھی ان اصناف کی روح کو فراموش نہیں کیا ہے۔ یہ ان کی سلامت طبع اور خوش ذوقی کی دلیل ہے۔

اختر اور ینوی کی تنقیدی کاوشوں کے سلسلے میں ہم نے بعض دوسرے امور سے قطع نظر کر کے محض ان کی اس خصوصیت پر زور دیا ہے جو انہیں اردو کے عام نقادوں میں ممتاز کرتی ہے۔ یعنی اعتدال و توازن۔ یہ اعتدال و توازن صرف ان کے نقطۂ نظر یا ان کی رایوں اور محاکموں تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ ان کا اسلوب نگارش بھی اس کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے ابھی تک اردو میں تنقید کا کوئی معین اور معیاری اسلوب نہیں بن سکا ہے۔ ہمارے یہاں ایک طرف ایسی تنقیدیں لکھی جاتی ہیں جن میں شاعرانہ نثر اور انشائے لطیف کی زبان ہوتی ہے تو دوسری طرف بعض نقادوں کا خشک، سپاٹ اور بے رس طرز تحریر ہے جو سائنس اور ریاضیات کے لئے تو ممکن ہے کہ موزوں ہو لیکن ایک ایسی صنف کے لیے نہیں جو بہرحال ادب کی ایک صنف ہے۔ اختر اور ینوی کی تنقیدوں میں ادبی نثر ملتی ہے۔ لیکن یہ نثر واضح، شفاف شگفتہ اور با وقار ہوتی ہے۔ ان کے مضامین بے کیفی اور اکتاہٹ پیدا نہیں کرتے۔ وہ نہ زیادہ طوالت سے کام لیتے ہیں اور نہ حد سے زیادہ سرسری بیانات اور رایوں کا اظہار کر کے گزر جاتے ہیں وہ حسب ضرورت تاریخی و سماجی ماحول کا بھی حوالہ دیتے ہیں لیکن جا و بیجا تاریخ کا آموختہ نہیں پڑھتے۔ انہوں نے نفسیات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے لیکن نفسیات کو انہوں نے اپنی تنقیدوں کی بنیاد نہیں بنایا۔ انہوں نے جس مصنف یا ادیب پر قلم اٹھایا ہے اس کا کُلّی مطالعہ کیا ہے اور اس کے بارے میں جو بات بھی کہی ہے۔ اس کے لئے دلیل اور ثبوت فراہم کیا ہے، وہ فن پارے کا تجزیہ پہلے کرتے ہیں، اس پر محاکمہ بعد میں کرتے ہیں۔ اس لئے پڑھنے والا عام طور پر ان کے خیالات سے پورے طور پر متفق نہ ہوتے ہوئے بھی بدمزہ یا بدظن نہیں ہوتا۔

پروفیسر عبدالقادر سروری

اختر اورینوی کا ادبی مقام

ڈاکٹر اختر اورینوی میرے کرم فرماؤں میں سے ہیں ان سے میرا تعارف غالباً ۱۹۵۲ء میں ہوا تھا۔ اس سے پہلے سے میں انہیں ایک ادیب کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اس وقت ان کی تصانیف کی تعداد زیادہ تو نہیں تھی تاہم ان کے مضامین اور ان کے افسانوں کو پڑھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا مصنف بہت ہی اچھی صلاحیتوں کا مالک ہے۔

اس کے بعد مجھے پٹنہ جانے کا اتفاق ہوا۔ پروفیسر حسن عسکری میرے ساتھ تھے اور انہوں نے ہی میری رہبری جھجو باغ میں ڈاکٹر اختر اورینوی کے گھر تک کی۔ پروفیسر عسکری اور میں لکھنؤ سے اورینٹل کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے بعد پٹنہ گئے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ فارسی، ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ میرے پٹنہ کے سفر کا مقصد حیات علامہ تمنا صاحب کے مملوکہ ایک قدیم مخطوطے "صراط مستقیم" کو دیکھنا تھا۔ اس مخطوطے کا تذکرہ میں نے پروفیسر حامد حسن قادری کی "داستان تاریخ اردو" میں پڑھا تھا۔ اسے دیکھنے کی مجھے خواہش تھی اور اس سلسلے میں میں نے اختر صاحب سے مراسلت کی تھی۔

صبح اسٹیشن سے ہم سیدھے اختر صاحب کے مکان پر پہنچے تو میں نے دیکھا کہ ایک مقابلۃً کمسن ادیب سے میں متعارف ہو رہا ہوں۔ اختر صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی عمر کو چھپا کر دکھاتے ہیں۔ ان کی شکل و صورت کی نفاست سے ان کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ تاہم پہلی ہی ملاقات میں مجھے احساس ہوا کہ

بالائے سرش ز ہوشمندی   می تافت ستارۂ بلندی

اور اب چند ہی سال کے اندر میرے قیافے کی تعبیر مل گئی۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی تصانیف کے ذریعے اردو کے صف اول کے لکھنے والوں میں جگہ پیدا کر لی ہے۔ تنقید اور تحقیق دونوں میں ان کا پایہ بلند ہے۔ "بہار میں اردو زبان اور ادب کا ارتقا" ان کا اہم کارنامہ ہے۔ بہار کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں ہم کو معلومات تھیں۔ لیکن چیدہ اور غیر مربوط اس کتاب کے ذریعے پہلی دفعہ ہم بہار میں اردو زبان اور ادب کے ارتقا کی مربوط اور تعمیری تفصیل سے واقف ہو سکے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں پٹنہ میں تھا۔ اختر صاحب سے ان کی اگلی ادبی تجویز کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ ان کا خیال بہار کے اردو ناول نگاروں کے بارے میں تحقیق کرنے کا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ ان کی مستعدی، تلاش اور جستجو کی صلاحیتوں کے مدنظر بہار کے سارے ادب کا جائزہ شاید زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ بنیادی کام انجام پائے تو بعد کے لکھنے والے الگ الگ شعبوں پر زیادہ شرح و بسط سے کام کر سکیں گے۔

بہرحال آغاز کسی طرح ہوا ہو لیکن ایک ضروری اور اہم کام کی تکمیل ہوگئی، اب ہمارے ادیب مختلف شعبوں، جیسے زبان، شاعری، افسانہ نگاری، ناول صحافت پر الگ الگ کام انجام دے سکتے ہیں۔

اس کتاب اور غالباً ان کی تصنیف "نئی تحقیق" (تنقید جدید) میں پیش کردہ بعض نظریئے میرے لئے خاص طور پر جاذب نظر رہے۔ ڈاکٹر اختر نے لکھا ہے کہ ریختہ کی نشو و نما کسی مخصوص مقام کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ مختلف صوبوں میں جہاں جہاں فارسی بولنے والے بڑی تعداد میں گئے ریختہ کا ہیولیٰ بنتا رہا۔

نئے خیال ہمیشہ ساری تفصیلات کے ساتھ ذہن میں نہیں آتے بلکہ اجمالی شعور پیدا ہوتا ہے اس اجمال کو بعد کے لکھنے والے تفصیل کی صورت عطا کرتے ہیں۔ بیمز کے پالی کے بارے میں اجمالی اشارہ کے ساتھ یہی ہوا۔ لسانی مسائل میں شواہد اور استدلال کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ لسانی مسئلہ بھی ہمارے لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے علمار کے لئے تحقیق اور تلاش کا باب بن سکتا ہے۔

نئی تحقیق (تنقید جدید) میں ڈاکٹر اختر کے بعض ایسے مضامین بھی شامل ہیں جن میں پہلی دفعہ اردو میں دراوڑ زبانوں کی زیریں تہ SUB STRATUM کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ انگریزی میں ڈاکٹر سینوتی کمار چیٹرجی نے اس موضوع پر کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ موضوعات تنقید کے مقابلے میں شاید زیادہ خشک ہیں۔ لیکن ان سے زبان کے بنیادی مسائل پر روشنی پڑتی ہے اس لئے ان کی چھان بین میں جو وقت اور توانائی صرف کی جاسکے وہ ضائع نہیں جاتی۔

ڈاکٹر اختر اورینوی اچھے افسانہ نگار بھی ہیں، اور تنقید میں تو انہوں نے ایک مقام حاصل کرلیا ہے۔ یہ ان کے ایسے کارنامے ہیں جن کی بدولت وہ اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے

عبد المغنی

جدید اردو افسانہ نگاری کے عناصر اربعہ

اختر اورینوی کے ہم عصروں میں قدر اول کے تین دیو اور ہیں۔ کرشن چندر، منٹو، بیدی۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کے منٹو سے اورینوی کی کوئی مماثلت نہیں، نہ فن میں، نہ فکر میں، دونوں قطبین پر واقع ہیں۔ بیدی سے خالص فنی سطح پر دراول کے اورینوی کا تقابل کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ دونوں اپنی ہیئت کی تراش خراش چینی کے برتن کی طرح کرتے ہیں بلکہ زیادہ موزوں لفظوں میں بلور سازی کرتے ہیں لیکن یہ مشابہت تکنیک سے آگے نہیں بڑھتی۔ اورینوی اور بیدی کے موضوع اور ماحول میں نمایاں فرق ہے۔ اس سے بھی زیادہ فاصلہ دونوں کے احساسات میں ہے، دونوں کے ذہن یکسر مختلف ہیں۔ بیدی گھریلو اور بالعموم پنجاب کے گھریلو معاملات کے بھیدی ہیں، وہ اس حلقۂ زندگی کے ماہر ہیں اور اس مہارت پر قانع ہیں۔ چنانچہ اپنے خاص الخاص معاشرتی دائرے سے قدم باہر نہیں نکالتے۔ وہ اپنے مضبوط قلعے میں محفوظ و مامون رہنا پسند کرتے ہیں۔ بیرونی میدان کے طوفانوں کی زد پر آنا گوارا نہیں کرتے۔ یہ ایک لحاظ سے بیدی کی بڑی خوبی ہے اور دوسرے لحاظ سے یہی خامی ہے۔ بیدی کا فن بہت بالیدہ ہے مگر فکر نہایت محدود، تجربہ قلیل، مطالعہ مختصر اور نگاہ پست ہے۔

اپنے مستند کے ہم عصروں میں اختر اورینوی کا پورا تقابل صرف کرشن چندر سے ممکن ہے دونوں کے تجربات وسیع اور متنوع ہیں، دونوں کے طرز میں شعریت پائی جاتی ہے۔ دونوں ورائے افسانہ چیزے دگر کے طالب ہیں۔ یہ تو اتفاق کے نقطے ہوئے، مگر اختلاف کے نقطے بھی کم نہیں۔ کرشن چندر کپڑے اتار کر زندگی کی تہوں میں غوطے لگاتے ہیں۔ جبکہ اورینوی نے سمندر کی گہرائیوں کو آبدوز میں بیٹھ کر ناپا ہے۔ کرشن چندر تمام تفکر کے باوصف فلسفے یا مذہب کی بلندیوں تک پرواز نہیں کر پاتے اور اورینوی کا تفکر ہی کسی نظریئے یا فلسفے سے وابستہ ہے۔ شاید اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ کرشن چندر معاشیات نفسیات اور بہت ہوا تو سیاسیات سے زیادہ گہرائی میں جانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ انہیں سماجی زندگی کے صرف مسئلوں کا شعور حاصل ہے۔ برخلاف اس کے اورینوی مابعد الطبعیات، سائنس، عمرانیات، اخلاقیات اور الاہیات تک کو کھنگالے ہوئے ہیں، انہیں انسانیت کی بنیادی قدروں کا عرفان بھی حاصل ہے۔ کرشن چندر کے راست مشاہدات اگرچہ اورینوی سے زیادہ ہیں مگر ان کے علمی مطالعات اورینوی سے بہت کم ہیں۔ کرشن چندر کو حیات انسانی کے ایک منظم کل ہونے کا وہ شعور میسر نہیں جو اورینوی کو نصیب ہے، اورینوی زندگی کے کائناتی نظام سے کرشن چندر کے مقابلے میں زیادہ واقف ہیں۔

کہہ سکتے ہیں کہ جدید اردو افسانہ نگاری کی صف اول کے عناصر اربعہ کی ترتیب یوں ہونی چاہئے۔ کرشن چندر — منٹو — اورینوی — بیدی۔

چند تصنیفات

ڈرامے:۔ شہنشاہ جشنہ، زوال کینٹن،

افسانے:۔ منظر و پس منظر، کلیاں اور کانٹے، انار کلی اور بھول بھلیاں، سیمنٹ اور ڈائنا میٹ، کیچلیاں اور بال جبریل، سپنوں کے دیس میں۔

ناول:۔ حسرت تعمیر

تنقیدیں:۔ قدر و نظر، تحقیق و تنقید جدید، کسوٹی، مطالعۂ اقبال، مطالعۂ نظیر، سراج و منہاج۔ تنقیدی مضامین (مجموعہ)

مجموعہ کلام:۔ انجمن آرزو

تحقیقی تصنیف:۔ بہار میں اردو ادب کا ارتقا ۔۔ اور بے شمار مضامین

اختر کی رجائیت

حالات حاضرہ کی بنا پر اسلام اور اہل اسلام کے مستقبل کے بارے میں مجھ پر قنوطیت طاری ہوئی تھی تو ان کی رجائیت نے ہمیشہ میری مدد کی۔ اور میرے ایمان کو تقویت پہنچائی۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ بہت سی مذہبی مجلسوں سے میں اس قدر پرامید ہو کر نہیں اٹھا جس قدر ڈاکٹر اختر اورینوی کی ایمان پرور باتوں سے۔"

(پروفیسر حافظ شمس الدین منیری سابق صدر شعبۂ اردو پٹنہ کالج)

ارتقا کی شرط

اختر صاحب زندگی کے زیادہ گہرے اور حقیقی مسائل پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ انسانیت کو طبقوں میں بٹا ہوا نہیں بلکہ ایک خدا کا کنبہ سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک ارتقا کی شرط تضاد اور ٹکراؤ نہیں بلکہ توافق اور ملاپ ہے۔

(قمر اعظم ہاشمی پٹنہ)

ڈاکٹر محمد منصور عالم

اختر اورینوی کا ادبی مقام

اختر اورینوی نے تخلیق و تصنیف میں اپنا بیشتر قیمتی وقت صرف کیا ہے۔ انہوں نے ڈراما، ناول اور افسانے لکھے، تنقیدی مضامین لکھے۔ تحلیق کی اور شعر بھی کہا۔ لیکن ان کی محنت کا معتدبہ حصہ معمولی اور ادنیٰ درجے کا ہے۔

مختلف اصناف ادب کو اظہار خیال کا ذریعہ بنانا مفید اور مناسب بات ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ چیز جو آسیب کی طرح ذہن پر چھائی ہوئی ہے اور غبارے کی طرح نکلنے کو بیتاب ہو رہی ہے، وہ فنکار کو خود کوئی صنفِ مخصوص اختیار کرنے پر مجبور کر دے۔ اختر اورینوی کے ساتھ یہ صورت حال نہ تھی۔ شاعری اور افسانہ نگاری سے قطع نظر، اردو کی جس صنف کو انہوں نے اپنایا، وہ صرف ظاہری تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ تحقیق کی طرف وہ یونیورسٹی کے مطالبات کے سبب متوجہ ہوئے۔ وہ خود مقر ہیں کہ اس کا انہیں ذوق نہیں:

"تحقیق تو محض میں نے یونی ورسٹی کے مطالبات کے تحت کی ہے۔ اس کا کوئی خاص ذوق مجھے نہیں۔"

(انٹرویو، ساغر نو پٹنہ ۱۹۶۵ء (اختر اورینوی نمبر)

ڈرامے کے متعلق لکھتے ہیں:

"سینا ٹوریم میں ایک ڈرامیٹک کلب تھا۔ وہیں کچھ ڈرامے کی طرف توجہ ہوئی۔ لیکن وہ دلچسپی قائم نہیں رہی۔" (انٹرویو بذا)

ناول کے متعلق کہتے ہیں کہ "ناول لکھنے کی خواہش اس لئے ہوئی کہ میں نے یہ محسوس کیا کہ اس صنف میں اظہار و بیان کی وسعتیں ہیں۔" اور "افسانہ نگاری اور ناول نگاری بہت ہی قریبی تعلق کی صنفیں ہیں۔ ادب عالم میں بکثرت ایسی مثالیں ہیں کہ افسانہ نگاروں نے ناول نگاری کی ہے اور ناول نگاروں نے افسانہ نگاری۔" (انٹرویو مذکور) لیکن اختر صاحب نے صرف ایک ناول حسرت تعمیر لکھا اور افسانوں کے ۵ مجموعے شائع کئے۔

اختر اورینوی اپنے تنقیدی مضامین کے محرکات کے بارے میں جو کچھ بتاتے ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) "تنقید کی طرف اس وقت توجہ ہوئی جب انگریزی ادب کا مطالعہ مجبوراً کرنا پڑا۔" (مجبوراً اس لئے کہ "تنقید پیشہ ہوگیا ہے (اور اردو آنرز اور ایم اے کے طلبہ کو روزانہ تنقید کا پرچہ پڑھانا پڑا)

(۲) "سائنس کی ٹریننگ نے تجزیہ و تنقید کی طرف متوجہ کیا۔"

یہ دونوں باتیں ساغر نو پٹنہ کے اختر اورینوی نمبر میں شائع شدہ انٹرویو سے اخذ کی گئی ہیں۔ موخر الذکر محرک کا امکان نظر نہیں آتا کیونکہ اختر اورینوی کی تنقیدوں میں سائنسی تجزیہ نہیں پایا جاتا۔ اپنے پیشے اور انگریزی ادب کے مطالعے کے سبب تنقید کی طرف توجہ ہوئی ہوگی، اس کا امکان زیادہ ہے۔ اور یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ اختر صاحب نے اپنے عصر کے نقادوں کی تنقیدوں کے ردعمل میں تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔

اختر اور ینوی اپنی جامعیت کے مدعی نہیں وہ کہتے ہیں کہ "میں اپنے کو ہرگز اتنا بڑا فنکار نہیں سمجھتا کہ میں نے ہر صنف میں شہکار پیش کئے ہیں۔ جامعیت کا دعویٰ کرنا بہت بڑا دعویٰ ہے۔ اگر ایک صنف میں بھی کچھ کام ہو جائے تو بہت بڑی بات ہے" (انٹرویو بالا) لیکن یہ حرف ان کی انکساری معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ انھوں نے مختلف اصناف ادب میں جو اظہار خیال کئے ہیں۔ ان کے پس پشت جامعیت کے ہی دعوے کی چنگاری دبی ہوئی ہے۔ اور اگر ایسی بات نہیں تو پھر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مزاج میں بے طرح ناآسودگی تھی۔ وہ کسی ایک صنف سے ہرگز مطمئن نہ تھے۔ ان کے مزاج میں کچھ سیمابیت بھی تھی، وہ اپنے بقائے دوام کے لئے بے چین تھے۔ مختلف اصناف ادب اس سے کسی ایک ہی صنف میں کچھ بڑا کام ہو جائے، یہ خیال انہیں ستاتا تھا۔ لازماً وہ ادب کی ہر وادی میں گئے۔ اس مقالے کے ذریعے ہمیں یہی دیکھنا ہے کہ اختر اورینوی کو "اختر ادیب" کس صنف نے بنایا ہے۔

(۱)

اختر اورینوی نقاد نہیں، انشاپرداز ہیں اور اپنی انشاپردازی سے تنقید پر چھا جانا چاہتے ہیں، وہ تنقید پر انشا کو فوقیت دیتے ہیں خوبصورت لفظوں اور دلفریب جملوں کی بہار ہمیں ان کی تنقیدوں میں ہر جگہ ملتی ہے۔ وہ ہمیں تنقید نہیں سکھاتے۔ رومان کی طرف لے جاتے ہیں۔ ان کے تنقیدی جملے اس طرح کے ہوتے ہیں:

> "اس دور میں جمیل نے خواب سہیں دیکھے ہیں۔ کاجلوں کی کہانی اور رچوڑیوں کے ترانے گنے ہیں، مگر خوابہائے رنگین کی تعبیریں شاعرانہ ہیں اور پیش کشیں صناعانہ ہیں" (سراج و منہاج ص ۲۰۸)

> "جمیل مثالیت پرست ہیں اور ہمیشہ ناآسودہ، حسرت منزل اور ذوق نظر کا سفر مدام ان کی رفعت کا باعث ہے۔ ان کی افتاد طبع میں نالہ فرسائی ہے۔ ان کی محبت ناک فطرت انہیں عشق کی اہمیت سے پرے لے جاتی ہے۔ ان کا شوق ناتمام انہیں محروم ابدی بناتا ہے۔ ان کا وجود سراسر محبت ہے لیکن ان کی محبت کے تقاضے لامتناہی ہیں اور وہ "پرستار تجلی نہیں، خریدار بصیرت" ہیں۔ وہ اپنی سادہ مزاجی میں موسم گل سے آرزوئے گل پیرہنی کرتے ہیں اور خوش ہو کر بھی پاتے ہیں۔ جمیل بہت بھولے ہیں۔ وہ حسن اور فطرت حسن کی فنائی کو دیر میں سمجھے اور ان کا دل اجڑ کر رہ گیا۔ وہ حیات و کائنات کے خیر و شر کے متعلق متشکک ہیں اور ان کی تمنائیں دل کی روشنی کی تلاش میں جلتی رہتی ہیں" (سراج و منہاج ص ۲۱۷)

> "والہانہ نغمگی غزل (جمیل کی غزل) کی رگ رگ کو شیرینی کیکپی بخشتی ہے۔ سرور آلود ہ مخمور ہو کر عصمت آرزو و پاکیزگی عشق کو داغدار بنا تا ہے۔ کیف محبت کو بھی معصوم ہونا چاہئے۔ آگہی کا عذاب، خواہشوں کا ستایا ہوا غرور اور ایک عمر کا ترسا ہوا شعور کی ترکیبیں گہرے احساسات اور تہہ دار جذبات کی نازک پرتیں اٹھاتی ہیں" (سراج و منہاج ص ۲۲۷)

> "جمیل کی شاعری احساسات کی نزاکت، جذبات کی لطافت و ندرت، خیالات کی جدت و نفاست، تازہ کاری فکر انگیز معنویت، اسلوب کی برق تابی، طرز کی سلاست و لچک، زبان کی فصاحت، لب و لہجہ کی نرمی و رسیلے پن، ترنم کی پر کیف فضا، تشبیہات و استعارات کی جانداری، صناعت کی دوسری اداؤں اور قرینوں کے اختراعی استعمال، الفاظ کی مصوری و پیکر تراشی اور نفیس و نادر تنظیم و تہذیب تجربہ کی جہتوں سے رفتہ رفتہ نہایت صناعانہ کمال کو پہنچی ہے۔
> جمیل نے احساسات کے نئے پہلو، جذبات کی نئی آنچ، مشاہدات کے نئے زاویئے، واردات کے تازہ گوشے، تخیلات کی نئی

اڑان، سوز و گداز کے نئے دھارے، تصورات کے جدید صنم کدے، افکار کی نئی سمتیں اور وسعتیں، غور کی ان دیکھی گہرائیاں، نظر کی اچھوتی بلندیاں اور تخلیق کے ایسے امکانات پیش کئے ہیں" (سراج و منہاج ص ۲۲۸)

یہ مثالیں صرف ایک مضمون سے اخذ کی گئی ہیں۔ اور ان میں بھی کوئی تخصیص نہیں ہے پورا مضمون الفاظ کی یہی روانی اور بہار پیش کرتا ہے۔ دنیا کی کون سی ایسی خوبی ہے جو جمیل کی شاعری میں موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف یہی مضمون نہیں، اختر اورینوی کے تمام مضامین یہی انداز رکھتے ہیں جیسے پرانے زمانے کے امرا اپنے گھروں میں باندیوں سے کھیلا کرتے تھے۔ ویسے ہی اختر اورینوی لفظوں سے کھیلتے ہیں۔ چند جملے اور دیکھئے:

"گل و لالہ کا تجزیہ اور فن کا تجزیہ برابر ہے۔ محض تجزیے کے نتائج پر بھروسہ کرنا بد ذوقی اور کم نگاہی ہے، پھر بھی تجزیہ ایک ضروری عمل ہے۔ پھول کو پوری طرح سمجھنے کے لئے برگہائے گل اور زرگل کا نباتاتی تجزیہ کرنا ہی پڑتا ہے اور کبھی رنگ و نکہت کے حکمتی شعور کے لئے گلہائے شاداب کی عطریت اور رنگت کا کیمیاوی تجزیہ بھی ضروری ہوتا ہے، لیکن فقط نباتاتی تشریح اور کیمیاوی تجزیہ کے نتائج و اعداد و شمار کی بنا پر مہکتے جاگتے، لہکتے جھکتے ہوئے پھولوں کی کلّی تاثیر خیزی کا کامل احساس و ادراک نہیں ہو سکتا۔ احساس و شعور حسن کی صحت مندانہ تکمیل، نتائج تجزیہ اور تاثیر ترکیب کی ہمہ جہتی مطالعہ سے ہی ممکن ہے، ایک فرد یا نوع بشر کو سمجھنے کے لئے بھی علم تشریح، علم افعال الاعضا اور علم نفسیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اجتماعیت انسانی کی تفہیم کے لئے علم معاشرہ سیاست و اقتصاد وغیرہ کا مطالعہ ضروری ہے۔" (سراج و منہاج ص ۸۱)

بات محض اتنی سی ہے کہ تجزیہ ایک ضروری عمل ہے، مگر اس کے نتائج پر کامل بھروسہ کرنا موزوں نہیں۔ اس ایک بات کو اتنی طویل عبارت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور اس میں بھی ہاں اور نہیں دونوں باتیں موجود ہیں۔ یہ ہاں اور نہیں اختر اورینوی کی تحریروں میں اکثر پائی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی بات فیصلہ کن انداز میں سامنے نہیں آتی۔

اختر اورینوی تنقید فن کے دو پہلو بتاتے ہیں۔ تجزیاتی اور ترکیبی، کہتے ہیں:

"تبصرۂ جمال اور تنقید حسن کی کامیابی دونوں پہلوؤں پر منحصر ہے۔ یعنی مشاہدۂ اجزا اور مطالعۂ ترکیب پر۔ آرٹ حسن کاری ہے۔ لہٰذا تنقید فن کے بھی دو پہلو ہیں، تجزیاتی اور ترکیبی۔" (سراج و منہاج ص ۸۳)

اور شکایت کرتے ہیں کہ "عصر جدید میں (ہمارے نقاد) تجزیاتی تنقید پر بہت زیادہ زور دینے لگے ہیں۔" (ص ۸۳) اسے وہ "یک طرفہ پن" بتاتے ہیں، جو "ہمیشہ مخدوش ہوتا ہے۔" (ص ۸۳) وہ آگے کہتے ہیں:

"فقط تجزیاتی تنقید ریزہ چینی پر ختم ہو جاتی ہے، ایسے ناقدوں پر اہل بصیرت ادبی چیونٹیوں کی پھبتی کستے ہیں۔ اس سے نیچے بھی ایک مقام ادبی دیمکوں کا ہے۔ صحیح آگاہی کے لئے طائرانہ نظر کی بھی ضرورت ہے۔ نظارگی کی تکمیل تو جزرسی، جلوۂ روبرو اور طائرانہ نگاہی سے ہوتی ہے۔ محض ترکیبی تنقید پر زور دینے سے سطحیت، نارسائی، ادھورا پن، غیر منطقیت اور ادبی آمریت پیدا ہوتی ہے۔" (سراج و منہاج ص ۸۳)

یہ اجمال کی منطق ہے اور تنقید کے لئے زہر۔ اختر اورینوی تجزیہ کا غلط مفہوم لیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مشاہدۂ اجزا اور مطالعۂ ترکیب دو چیزیں ہیں یعنی کسی شے کی تخلیق میں کون کون سے اجزا شامل ہوئے ہیں، یہ "مشاہدۂ اجزا" ہے۔ اور ان کا اختلاط اور حل کس طرح پر ہوا ہے، یہ "مطالعۂ ترکیب" ہے۔ (تجزیہ میں دونوں باتیں شامل ہیں۔ جب ہم کسی شے کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں کون کون سے اجزا ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ کس طرح آپس میں

مخلوط (CONFUSION) ہوئے ہیں۔ اختر اور ینوی تجزیاتی اور ترکیبی، تنقید فن کے دو پہلو بتا کر انتشار (CONFUSION) پھیلاتے ہیں۔ وہ تجزیہ کو صرف مشاہدۂ اجزا سمجھتے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ "محض تجزیہ کے نتائج پر بھروسا کرنا بدذوقی اور کم نگاہی ہے"۔ اور تجزیہ کے علاوہ مطالعہ ترکیب کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ تنقید انہیں دونوں باتوں پر محیط ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ مشاہدۂ اجزا اور مطالعۂ ترکیب جو لازماً عملِ تجزیہ کے دو عناصر ہیں، ادبی تنقید کے صرف ایک پہلو ہیں۔ کوئی شخص اگر صرف یہی بتاتا ہے کہ فلاں فن پارے میں یہ اجزا ہیں اور ان کی ترکیب و تحلیل اس طرح ہوئی ہے تو وہ نقاد نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ تجزیہ کے ساتھ تقابل، فرق و امتیاز اور تعین قدر و مقام نہ کرے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے کہا ہے کہ "تجزیہ، تقابل، فرق و امتیاز اور تعین قدر و مقام تنقید کے چار پہلو ہیں"۔

اختر اورینوی تجزیاتی اور ترکیبی کی بات تو کرتے ہیں لیکن اپنے مضامین میں اس سے بھی مصرف نہیں لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تجزیہ ایک سائنسی عمل ہے۔ میکانکی طور پر کسی فن پارے کا پوسٹ مارٹم کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، یہ وہی کر سکتا ہے جو کسی وہم میں مبتلا نہ ہو۔ وہم میں نے اس لئے کہا کہ یہ بڑی خطرناک شے ہے۔ عام طور پر وہم کو وجدان سمجھا جاتا ہے۔ دل میں کوئی وہم پیدا ہوا تو اردو کے بعض ادیب اسے وجدان تصور کر کے اسے بڑا اونچا مقام دیتے ہیں۔ اس قسم کے جملے وجدان نہیں، وہم کے نتائج ہیں ـــ "گل و لالہ کا تجزیہ اور رنگ کا تجزیہ برابر ہے"۔ "یا پھول یا انسان کی خاص جمالیاتی تاثیر خیزی کبھی ترکیبی و کلی اور تشریحی و جزوی دونوں پہلوؤں سے ہوتی ہے"، "یا ہم میر یا شاد کی غزلوں کو شیکسپیر کی ٹریجڈیوں سے تو نہیں ملا سکتے۔ لیکن کیٹس کے "اوڈ" سے تشبیہ دے سکتے ہیں"۔ آخری جملے کو پڑھ کر پرانی تنقید کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ "غزلش چون غزل نظیری بے نظیر و قصیدہ اش، چون قصیدۂ عرفی دلپذیر"۔ (دلکش بیجا ترجمہ غالب)۔

ہاں تو، تجزیہ جو تنقید کا ایک پہلو ہے، ایک سائنسی عمل ہے اور تنقید میں کبھی کبھی وجدان بھی کام کر جاتا ہے۔ شعر و شاعری کی تفہیم میں اس سے مدد ملتی ہے۔ لیکن یہ اتنا ضروری اور آسان بھی نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ تنقید شاعری یا افسانہ نگاری نہیں جو غیب سے مضامین آنے کا دعویٰ کیا جائے۔ یہ اصول و ادراک کا فن ہے۔ یہاں وجدان یا احساس سے زیادہ ادراک اور ضابطے کام کرتے ہیں۔ اچانک کوئی بات جو قلم سے نکل جاتی ہے، کبھی کبھی تنقیدی نقطۂ نظر سے سو فی صد درست ثابت ہوتی ہے۔ وہیں پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تنقید میں وجدان کام کر گیا۔ ورنہ عام صورت حال مختلف ہوتی ہے۔ اختر اورینوی تنقید کے اصولوں کو بروئے کار نہیں لاتے اور ان کے اپنے جو اصول ہیں وہ وہم پر مبنی ہیں۔

اختر اورینوی کے ذہن میں غیب سے مضامین، انوکھے اور دلکش مضامین آتے رہتے تھے۔ لیکن ان میں تجزیہ کی صلاحیت نہ تھی۔ کون بات ضروری اور اہم ہے اور کون سی غیر ضروری، اس کی وہ پروا نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جذباتی قسم کے انسان تھے۔ تنقیدی مضمون لکھتے وقت ان کے ذہن میں مختلف قسم کے رنگین خیالات آجاتے تھے اور وہ ان سبھوں کو ضبط تحریر میں لے آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں انشا کا طوفان امڈتا ہوا نظر آتا ہے۔ جدید اردو تنقید میں اپنی انشا پردازی سے سب سے زیادہ مجروح اختر اورینوی ہوئے ہیں۔

اختر اورینوی کی تنقید کی وسعت اور بلندی بس ان کا اظہار استعجاب ہے چند نمونے دیکھئے:

"پرتو پڑا جو اس رخ روشن کا باغ پر
کل نخل دفعتاً شجر طور ہو گئے

معرفت کی کتنی بلند جمالیاتی بات کہی ہے!"

(سراج و منہاج صـ ۸۴)

"کنول ہیں چاند ستاروں کے جا بجا روشن
شب وصال میں اللہ رے اہتمام ترا
کیا تابناک منظر ہے! کیسی پرکیف فضا!" (سراج و منہاج ص ۹۵)

"ساقی کی عنایت سے تو بہ پہ ہے لیکن
دھڑکا ہے کہ لغزش سے مری جام نہ چھلکے
کیسی پرمعنی و پرتاثیر تصویر کشی ہے! دھڑکا اور لغزش میں کتنی جہتوں سے ربط ہے!" " ص ۹۵

"محو ہیں اپنی جگہ آسودگان کوئے دوست
آرزو دل میں ہے، دل آنکھوں میں، آنکھیں سوئے دوست
محویت کی کتنی نازک و لطیف مصوری کی ہے! دل آنکھوں میں کا جواب نہیں" " ص ۹۷

تیرے شوریدہ سر اس دشت سے گزرے ہیں ضرور
دھجیاں خار میں الجھی ہیں جو دامانوں کی
کیسی پر درد تعبیری تصویر کشی ہے!" " ص ۹۷

استعجابیہ لہجے میں "یہ تنقید" ہر جگہ موجود ہے اور اسی اختصار کے ساتھ۔ اختر اورینوی اسی کو تنقید سمجھتے ہیں۔

اختر اورینوی کی تنقید نگاری کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ چند اشعار کو چن لیتے ہیں اور ایک ایک جملے میں ان کی خوبیوں کی طرف ہماری توجہ کو مبذول کراتے ہیں۔ مثلاً:

"عشق کی وارفتگی اور شوریدگی دیکھئے ؎

فقط شور دلِ پُر آرزو تھا
نہ دنیا تھی نہ میں تھا اور نہ تو تھا

. . . .

نگہ کا تری ساتھ چھوڑا نہ دل نے
کہیں تیر جائے نشانہ یہی تھا
ترے گیسوؤں کو نہ بھولے کبھی ہم
شبیں مختلف تھیں فسانہ یہی تھا"

"عرفان حسن کے مقامات کی سیر کیجئے ؎

بہار شبنم و گل تیرے اختیار میں ہے
کہیں کسی کو ہنسانا کہیں رلا دینا

. . . .

تری نگاہ کے ناوک جبھی سے ہیں دل دوز
کہ نام تک بھی نہ تھا جب کہیں نشانے کا"

التجائے محبت سنئے؎

چشم سیہ میں سُرمہ دے زلف رسا میں شانہ کر
قتل جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

اور؎

"مجھ سے مایوس ہزاروں ہی تصدق تجھ پر
تو سلامت رہے، تجھ سے ہے تمنا باقی۔"
(سراج و منہاج ص۸۷ و ص۸۸)

یہ روش عام ہے اسے کوئی بھی سمجھ دار تنقید نہیں کہہ سکتا۔ تنقید کا ایک پہلو تشریح ہے۔ شعر کی قدر کے تعین میں تشریح کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ قاری شعر کی گہری اور وسیع دنیا کو تشریح کے ذریعے سمجھ کر شعر کی صحیح قدر و قیمت پہچان سکے۔ لیکن اختر اورینوی تشریح سے بھی سروکار نہیں لیتے۔ اس لئے جس شعر کی وہ تعریف کرتے ہیں، اگر اسی کی تضحیک کی جائے تو ان کا جواب موجود نہیں۔

میں نے کہا ہے کہ اختر اورینوی اکثر وہم میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ وہم کے بل بوتے پر ہی بعض شعروں کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں۔ شاد کا ایک شعر ہے؎

جنبش ابروئے خمدار کا پوچھو نہ سبب
رکھے رکھے یہ کماں یوں بھی کڑک جاتی ہے

یہ شعر اس قابل نہیں کہ اس کی اتنی تعریف کی جائے جتنی اختر اورینوی کرتے ہیں۔ اس میں اگر خوبی ہے تو یہ کہ "جنبش ابروئے خمدار" کی ترکیب اور لفظ 'کماں' کا استعمال نادری ہے۔ شعر میں سادگی ہے۔ رکھے رکھے کمان کا کڑکنا ایک مشاہدہ ہے اور کمان سے ابروئے خمدار کا نقش ابھرتا ہے۔ یعنی یہ استعارہ مناسب ہے۔ اس کے باوجود یہ شعر اعلیٰ درجہ نہیں رکھتا۔ اس میں حسن تعلیل ہے اور علت میں ذم کا پہلو ہے جس طرح کمان رکھے رکھے یوں ہی کڑک جاتی ہے، اسی طرح یوں ہی ابروئے خمدار میں جنبش آجاتی ہے اس کی کوئی خاص وجہ نہیں اس لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ حسن تعلیل ایک صفت شعر ہے مگر علت میں ذم کا پہلو نہیں ہونا چاہئے پھر دوسری بات یہ کہ علت و معلول یا اسباب کی تاثیر ہونی چاہیے۔ حسن تعلیل ہے تو شاعرانہ وجہ لیکن یہ حقیقت سے قریب یا مشابہ ہو تو شعر بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ شعر دیکھئے؎

بے سبب زلزلے عالم میں نہیں آتے ہیں
کوئی بیتاب تہ خاک تڑپتا ہوگا

یہاں بھی حسن تعلیل ہے۔ مگر ذم کا پہلو نہیں، بلکہ دل بیتاب کی تڑپ کی شدت اور اہمیت ثابت ہو جاتی ہے کہ اسی کی وجہ سے عالم میں زلزلے آتے ہیں۔ یہاں علت اور معلول ایک دوسرے کی شان بڑھا رہے ہیں۔ اب ذرا مصرعۂ ثانی پر غور کیجئے۔ کوئی میں محدودیت نہیں وسعت ہے۔ شاعر کی مراد کوئی نہ کوئی عاشق نامراد ہے۔ لیکن اس میں لطیف ابہام ہے جو ہمیں معنی کی وسعت بخشتا ہے اور حقیقت سے قریب بھی کرتا ہے علم جغرافیہ زلزلے کے اسباب میں بتاتا ہے کہ زمین کے اندر کا بخار باہر نکلنے کو جب بیتاب ہوتا ہے تو زمین لرز جاتی ہے۔ اس روشنی میں شعر مذکور کا مصرعہ ثانی ہمیں شعر کی دنیا سے نکال کر علوم کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ شاعر نے خیال اور جذبے کو باہم شیر و شکر کر دیا ہے۔ شاعرانہ خیال

کس طرح علمی خیال بن جاتا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے یہ شعر کافی ہوگا۔ لیکن شاد کا شعر دیکھئے۔ کمان رکھے رکھے بلاوجہ آپ سے آپ کھڑک سکتی ہے لیکن ابروئے خمدار میں جنبش بلاوجہ نہیں آتی۔ اور اگر آتی ہے تو اس سے ہمیں کیا لینا دینا۔ ہم تو جنبش با مقصد کے شہید آرزو ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ ابروئے خمدار کی جنبش پُر معنی اور انقلاب آفریں ہوتی ہے ؎

تم جو نگاہ مست کو جنبش ذرا سی دو — دنیا کے ذرے ذرے میں اک انقلاب ہو

شاد نے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے اور ایک اچھے شاعرانہ خیال کو پھسپھسا بنا دیا ہے پھر بھی اختر اورینوی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں:

"یہ شعر گہرے مشاہدے پر مبنی ہے۔ فطرت حسن کا مشاہدہ۔ شاد حسین محبوب کی نفسیات سے آگاہ ہیں۔ وہ تخیل کی مدد سے ایک استعارہ بروئے کار لاتے ہیں اور موزوں خوبصورت و پراثر الفاظ و ترکیب الفاظ کو قادر الکلامی کے ساتھ استعمال کر کے صنم طرازی و قلم بندی کرتے ہیں۔ اس شعر میں جذبہ فائق عنصر نہیں۔ جذبہ کی نرم رو تحت السطح ہے۔ اس میں بڑا کلاسیکی ٹھہراؤ پایا جاتا ہے۔" (سراج و منہاج ص ۸۲)

ان جملوں کی اہمیت صرف انشا کے لحاظ سے ہے اور یہ رنگین و دلفریب انشا اسی وجہ سے ہے کہ شاد جنبش ابروئے خمدار کی ترکیب لائے ہیں جو اختر اورینوی کے جذبات خوابیدہ کو ابھارنے کے لئے کافی ہے۔ اختر صاحب ہمیشہ جذبات کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ ان کی مثال اس شخص کی ہے جو نیچی دھوتی پہننے کا عادی ہے۔ دھوتی کا نچلا سرا چلنے میں بار بار پھنستا ہے اور لڑکھڑاہٹ کا باعث بنتا ہے۔ پھر بھی وہ شخص اپنی دھوتی کو ذرا اوپر کر کے نہیں باندھتا۔

اختر اورینوی لکھتے ہیں:

"شعر کا تعلق شعور و ادراک سے براہ راست نہیں بلکہ یہ وہ نغمہ ہے جو تحت الشعوری پردے سے نکلتا ہے۔ فلسفہ علت و معلول کے جال بچھاتا ہے اور شاعری ایک دیوانہ جست و خیز کے بعد علت و تعلیل کے چہرے سے نقاب اٹھا دیتی ہے شاعری مذہب ہے لہٰذا اس میں ایمان بالغیب کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ شاعری کو بھی قلب مومن کی ضرورت ہے جو بجلی گرنے کے بے لب کشا ہو۔ اگر کوئی شاعر دل کو نہیں دماغ کو مخاطب کرتا ہے تو وہ آئینہ کو چھوڑ کر سنگ خارا میں اپنی صورت دیکھنے کی حماقت کرتا ہے۔" (سراج و منہاج ص ۱۷۲)

یہ شبلی نعمانی کا اثر ہے۔ شاعری کا شعور و ادراک سے کیا تعلق ہے، یہ اب بتانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ انگریزی ادب کے مطالعے کے باوجود اختر اورینوی ایسی بات کہتے ہیں۔ یہاں پر آ کر شک ہوتا ہے کہ انہوں نے انگریزی ادب سے کچھ نہ سیکھا، وہ انگریزی ادب کا مطالعہ نہ بھی کرتے تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ صنف غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

"میں غزل کی تین قسمیں مانتا ہوں۔ ایسی غزلیں جن میں انتشار خیال ہو، ایسی جن میں تکرار خیال ہو اور ایسی جن میں ایک کیف، ایک تجربہ جاری و ساری ہو۔ میرے نزدیک تیسری قسم سب پر فائق ہے۔" (ص ۱۶۸)

آخری جملہ مقصد اور محنت سے لکھا گیا ہے تاکہ غزل کی ریزہ خیالی کی حمایت کا الزام عائد نہ ہو اور ان ناقدوں میں شمار کیا جائے جو غزل میں تسلسل خیال کے خواہاں ہیں۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ صنف غزل اختر اورینوی کی محبوب ترین صنف ہے۔ غزل گو شعراء پر لکھتے ہوئے انہوں نے شعر مفرد کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کو ہرگز خیال نہیں رکھا ہے کہ غزل میں انتشار خیال یا تکرار خیال ہے تو اس کی قباحت دکھائیں۔ وہ شعر مفرد کی تعریف

یوں کرتے ہیں:

"بنیادی طور پر غزل کا فن شعر مفرد کا فن ہے، تجربہ کی مرکزیت، ارتقا اور تکمیل سب کچھ دو مصرعوں سے وابستہ و پیوستہ ہوتا ہے یہ ایجاز کا ہنر ہے اور اعجاز۔ بلاشک یہ نگینہ سازی کا نفیس و نازک کام ہے۔ آرٹ کی قدریں، توازن و تکمل شعر مفرد کے عالم صغیر ہی میں مل جاتی ہیں ردیف قافیہ و ردیف کے اہتمام میں مفرد اشعار کو ایک منجھے ہوئے ڈور کی مدد سے منسلک کرنے کی کوشش سمجھتا ہوں۔ . . ہر غزل کو ایک وحدت تصور کرنا یا اس کی توقع رکھنا صحیح طرز فکر نہیں۔ بڑی نظموں کے امکانات اور ہوتے ہیں، اوسط درجہ کی نظموں کے اور، مختصر نظموں کے کچھ اور، اس طرح شعر مفرد کے کچھ اور۔ غزل کا ایک مکمل شعر دنیائے شاعری میں مختصر ترین نظم کی مثال ہے۔ ان اشعار کے مجموعہ کو ہم انتشار خیال کا الزام کیوں دیں؟" (سراج و منہاج ص ۱۹۲)

پہلے تو غزل کی تین قسمیں بنائی گئی تھیں اور جن غزلوں میں انتشار خیال یا تکرار خیال ہو انہیں کمتر درجہ دیا گیا تھا۔ لیکن اب غزل کو ایک وحدت تصور کرنا صحیح طرز فکر نہیں کہتے اور شعر مفرد کے مجموعے کو انتشار خیال سے بری قرار دیتے ہیں۔ یعنی صاف بات جو وہ کہنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ غزل میں انتشار خیال کی بات اٹھانا مہمل ہے۔ مگر یہ پہلے انکار پھر اقرار کا معاملہ کیوں؟ شعر مفرد کی مزید تعریف اس طرح کرتے ہیں:

"ہلال سے بدر کامل کا موازنہ فضول ہے۔ لیکن ہلال میں جو حسن، لطافت، نزاکت اور تاثیر ہے وہ ماہ کامل میں نہیں۔ دونوں کے اپیل کی نوعیت جدا جدا ہے۔ دونوں کے حسن کی ادائیں الگ الگ ہیں۔ کامیاب شعر مفرد کے ارتکاز وحدانیت، تعمیر، کاریگری، تکمیل و تاثیر کا دوسری اصناف شاعری میں جواب ملنا مشکل ہے۔ شعر مفرد کی فنی تجلی تو زہرہ، مشتری اور قطب تارے کی طرح جلوہ بار ہوتی ہے۔ ان ستاروں کا حسن کیا نظام شمسی کا مرہون منت ہے؟ آسمان کے ہر ستارے کا حسن منفرد ہے۔ تاروں بھری رات میں ستاروں کے انتشار سے بدنمائی تو پیدا نہیں ہوتی۔" (سراج و منہاج ص ۱۹۳)

کہنا پڑتا ہے کہ تاروں بھرے آسمان اور غزل کو ایک سمجھنا ایسی عجوبہ بات ہے جس کی نظیر نہیں۔ اور ہلال کو ماہ کامل سے زیادہ لطیف و نازک اور پر تاثیر و پر کشش سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ۱۸ برس کی حسینہ کو چھوڑ کر ۵ برس کی لڑکی کی طرف مائل ہو۔ اختر صاحب یہ بات صحیح کہتے ہیں کہ ہلال اور ماہ کامل کی اپیل کی نوعیت جداگانہ ہے اور دونوں کے حسن کی ادائیں الگ ہیں۔ لیکن ہمیں جس لطافت، نزاکت، تاثیر، کشش، حسن اور حسن کی اداؤں کی ضرورت ہے، اس کی تکمیل ہلال سے نہیں ہو سکتی۔ ماہ کامل ہلال کی ترقی یافتہ اور مکمل صورت ہے۔ اس میں شان بلاغت اور ادائے بلوغ ہے۔ اس لئے ہماری خواہشات کے تقاضے اسی سے پورے ہو سکتے ہیں۔

بہرحال اختر اورینوی شعر مفرد کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور اس وقت کرتے ہیں جب وہ غزل گو شعرا پر اظہار خیال کرتے ہیں، اور نظم نگار شعرا پر قلم اٹھاتے ہیں تو پانسہ پلٹ جاتا ہے لکھتے ہیں:

"اردو شعرا عموماً ریزہ کاری کے شکار ہوتے ہیں۔ وہ اجزائے حسن کو اتنا نکھارتے اور ابھارتے ہیں کہ کلی حسن اور لطیف معنویت اوجھل ہو جاتی ہے۔ شاعری دراصل ایک کل ہے اور یہ ذکی الحس شاعر کے لطیف احساسات پر تمام ہوتی ہے۔ جذبات اس کو سوز و گداز عطا کرتے ہیں۔ تخیل اسے وسعت، گہرائی اور گیرائی بخشتا ہے۔ لیکن یہ ساری چیزیں ایک کل، ایک وحدت کے اندر ہی ہونی چاہئیں۔ تب تاثیر ابدی ہوتی ہے۔ ایک کامیاب نظم ایک زندہ وجود کی طرح

ہے۔ ایک زندہ وجود کے الگ الگ عضو کی اہمیت تسلیم۔ مگر سارے عضو مل کر وجود کی تکمیل کرتے ہیں۔" (سراج و منہاج صفحہ ۲۲۴)

پھر وہی انکار اور اقرار کا معاملہ ہے۔ یہ تنقید نہیں مصلحت ہے اور اختر اورینوی اس خوبی کے حامل تھے۔ لیکن ادب و تنقید میں یہ خوبی مطبوع نہیں۔ اس سے حقیقت پر پردہ پڑ جاتا ہے اور نا اہل اہل بن جاتا ہے۔ اختر صاحب ایسی باتوں کی بھی تعریف کر دیتے ہیں جن میں تعریف کے پہلو نہیں ہوتے اس لئے ان کی تعریف میں توازن و تعمق اور دلیل و دیانت گھٹ جاتی ہے: کہتے ہیں:

"فریاد آدم بھی ایک کامیاب نظم ہے۔ اس نظم کی زبان حسین، دلکش، رواں اور آئینہ ساماں ہے۔" (سراج و منہاج صفحہ ۱۸۰)

صرف حسین، دلکش اور رواں زبان ہونے سے کوئی نظم کامیاب نہیں ہو جاتی۔ نظم اگر کامیاب ہے تو اس کی کامیابی کے اسرار کھولنے کی ضرورت ہے۔ مگر اختر اورینوی تنقیدی تفصیل میں نہیں جاتے۔ کسی نظم کی خوبیوں یا خامیوں کو وہ مفصل و مدلل طور پر بیان نہیں کرتے۔ ان کی تنقید پرانے تذکروں کے راستے پر چلتی ہے۔

اختر اورینوی جمال پرست ادیب ہیں۔ وہ ظاہری آرائش و زیبائش پر فدا ہو جاتے ہیں۔ کوئی خوبصورت ترکیب ہو، تانی بنی ہو، رنگین اور چمکیلے الفاظ ہوں، حسین تشبیہ ہو، نادر استعارے اور کنائے ہوں تو اختر اورینوی کو فرحت قلب و نظر حاصل کرنے کے لئے دوسری شئے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں مذکورہ لوازم کا سب سے زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

اختر اورینوی کی اس جمال پرستی نے انہیں ایک فائدہ بھی پہنچایا ہے۔ انہوں نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب ادب میں ترقی پسندی کا زور تھا۔ ہمارے شعراء و ادباء حسن خیال سے زیادہ نظریۂ خیال کے شیدا تھے۔ وہ اردو کی قدیم شاعری کو بیکاری کا شغل سمجھتے تھے۔ وہ ماضی سے مایوس اور حال سے نالاں تھے وہ اچھے مستقبل کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ انقلاب کے آرزو مند تھے ایسا انقلاب جس سے ادب ہماری زندگی کا نقیب اور مصلح بن جائے۔ وہ معاشرے کے عصری تقاضوں کو ہر حال میں فوقیت دیتے تھے۔ محض گل و بلبل کی الاپ ان کا پیٹ بھرنے والا نہ تھا۔ وہ جذبات و احساسات کے حسین خواب صرف دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ وہ زندگی کے حقائق سے نبرد آزما ہونا چاہتے تھے اور اپنے خوابوں کی تعبیر کے لئے ادب و شعر کو راہ عمل بنانے پر بضد تھے وہ کچھ اس طرح کا خیال رکھتے تھے ؎

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر   تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

مگر اختر اورینوی نے کٹر قسم کے ترقی پسندوں سے اختلاف کیا۔ انہیں سمجھایا۔ آرٹ کی حسن کاری کی اہمیت بتائی اور یہ بتایا کہ حیات و کائنات حسن سے عبارت ہے۔ ابدی مسرت کے لئے ہمیں حسین خیالات و جذبات کی دنیا کی ضرورت ہوگی۔ اور ادب جو ہماری مسرت اور تسکین کا سرچشمہ ہے، لطافت اور حسن کاری کا ہی مرہون منت ہے۔

"پروپگنڈے میں وہ حسن کاری نہیں ہوتی جو ادب میں پائی جاتی ہے۔ سخن ہائے گفتنی جب جمالیات سے ہم آغوش ہوتے ہیں تو مقصدی ادب پیدا ہوتا ہے۔ ادب ایک صناعت ہے۔ لہٰذا یہ جمالیات کے بنیادی اصولوں کی پیروی کرتا ہے لطافت اور حسن کاری ادب کی تشکیل کے لئے ضروری ہے۔" (ترقی پسند ادب)

ترقی پسندوں کے دور میں اختر اورینوی کا یہ نقطۂ نظر ہماری توجہ کو کھینچ لیتا ہے۔ وہ معتدل و متوازن نظر آتے ہیں۔ وہ زندگی کو خوبصورت مفید اور بارآور دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے تبدیلی کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر تبدیلی میں صناعی کا اشتراک ہونا چاہئے۔ وہ روایت اور تبدیلی دونوں کو گلے لگاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے یہ مضامین قابل مطالعہ ہیں — "ادب و فن کی بنیادی قدریں" "جبلتیں اور قدریں" "فن اور ماحول"۔

"ادب اور نفسیات"، "ترقی پسند ادب" وغیرہ۔

اختر صاحب نظریاتی تنقید کے مقالے تو عالمانہ ڈھنگ سے لکھتے ہیں۔ مگر کسی شاعر کی شاعری پر عملی تنقید کی نوبت آتی ہے تو وہ جذبات کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی جمال پرستی عود کر آتی ہے اور ان سے عجیب و غریب رومانی جملے سرزد ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا مافی الضمیر پوری طرح واضح نہیں ہو پاتا اور نہ تنقید اپنے مختلف منازل — تقابل، تجزیہ، فرق و امتیاز، اور تعیینِ قدر و مقام — سے گزر پاتی ہے۔ بعض جذباتی جملے سطحِ آب پر سوکھے پتوں کی طرح تیرنے لگتے ہیں جو بعض دفعہ بدصورت اور بے محل ہوتے ہیں۔

اختر اورینوی اردو کے جذباتی نقاد ہیں۔

(۲)

اردو تحقیق میں اختر اورینوی کا کوئی مقام نہیں ہے۔ یوں تو انہوں نے ایک ضخیم تحقیقی مقالہ "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" بھی قلم بند کیا تھا جس پر انہیں ڈی۔ لٹ کی ڈگری ملی۔ لیکن اس میں متعدد تحقیقی لغزشیں اور مشکوک باتیں ہیں۔ ان کی نشاندہی قاضی عبدالودود نے سہ ماہی نوائے ادب بمبئی میں کی تھی جو نومبر ۱۹۵۸ء تا نومبر ۱۹۵۹ء پانچ قسطوں پر محیط ہے۔ اختر اورینوی ان میں سے ایک کا بھی جواب نہیں دے سکے۔

اختر اورینوی میں نہ تو تحقیق کا ذوق تھا (بقول خود) اور نہ وہ اصول تحقیق کو برت سکتے تھے۔ وہ سکون و ثبات سے زیادہ عالم اضطراب سے دوچار رہے تھے۔ ان کی سیمابیت نے ہی ان میں مثالیت کا عنصر پیدا کر دیا تھا۔ وہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتے تھے۔ لازماً مختلف اصناف سخن کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے صبر سے کام لے کر ایک راہ اختیار نہ کی۔ وہ صبر سے کام لے بھی تو نہیں سکتے تھے۔ ان میں اس کا مادہ کم تھا، اتنا کم تھا کہ عرصۂ تحقیق میں ٹھہرنا ان کے لئے مشکل تھا۔ جہاں سیمابیت ہوگی وہاں صبر نہ ہوگا۔ اور اپنے اندر تخلیقی قوت ہو تو سیمابیت صبر پر اور بھی غالب آجاتی ہے۔ اختر صاحب کے ساتھ یہی معاملہ ہوا۔ ان کی سیمابیت اور مثال پرستی انہیں ادب کی مختلف وادیوں میں گھماتی رہی۔

اختر اورینوی شہر جذبات کے انسان تھے۔ اگر وہ تحقیق پر اصرار کرتے تو اور بھی بھٹکتے۔ غنیمت ہے کہ انہوں نے اس جانب زیادہ توجہ نہ کی۔ فن تحقیق کے متعلق میں نے لکھا ہے:

> "یوں اپنی جگہ پہ ہر فن مشکل ہے مگر فن تحقیق سے زیادہ دشوار کوئی صنف ادب نہیں۔ یہ ایک صبر آزما کام ہے۔ یہاں ایک راہ نکالنے کے لئے کوہِ عظیم کھودنا پڑتا ہے۔ تاہم کہا نہیں جا سکتا کہ وہ راہ کسی بڑی شاہ راہ، کسی بلند کامیابی تک پہنچا ہی دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔۔۔ تحقیق کی ضروری شرط ذوق جستجو ہے۔ محقق اپنے زمانے میں تجسس کے اعلیٰ ترین مقام پر ہوتا ہے۔ اس کا ذہن اس کی نگاہیں ہمہ وقت مصروف کار رہتی ہیں۔ کریدنا اور کھوجنا اس کا دیرینہ لائحہ عمل ہوتا ہے۔ وہ نکما نہیں ہوتا اور نہ نکموں کی تقلید کرتا ہے۔ وہ بہت بڑا کارندہ اور رجفاکش ہوتا ہے۔ وہ سدا سرگرم عمل اور ہر بسر تلاش رہتا ہے۔ وہ ذوق فرہاد رکھتا ہے۔ اس لئے تحقیق جستجو و آرزو کا فن ہے۔ ۔۔۔ ایک کامیاب محقق گھبرانے یا اکتا جانے والا نہیں ہوتا۔ وہ سدا صبر سے کام لیتا ہے۔ اس کا قلب مضبوط اور مزاج مستقل ہوتا ہے۔ وہ کسی امر کی تحقیق میں بعض وقت سالہا سال کی محنت لگا دیتا ہے۔ تاہم کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ پاتا۔ اس کے باوجود وہ انتہائی صبر و سکون کے ساتھ سعیٔ مسلسل میں منہمک رہتا ہے۔ جلد گھبرانے والے ۔۔۔ جذباتی ہوتے ہیں۔ سچا محقق جذباتی نہیں ہوتا۔ اس لئے

نیشاد دیر تک اور اعتدال کے ساتھ ہر مسئلے پر غور کرتا ہے۔ محقق ایک صابر اور شاکر ذہن کا انسان ہوتا ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جس کے ذریعہ وہ کسی نتیجہ تک رسائی حاصل کرتا ہے۔" (ماہنامہ شاعر بمبئی۔ اپریل مئی ۱۹۷۲ء)

ان باتوں کا اختر اورینوی سے کوئی تعلق نہیں۔ تحقیق اور اختریت میں منزلین کی دوری ہے۔

اختر اورینوی نے اپنے ڈی۔ لٹ کے تحقیقی مقالے کے علاوہ چند اور بھی تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ مثلاً "شاد کا عظیم آباد"۔ "شاد عظیم آبادی کی ناول نگاری"۔ "اقبال کا ایک خط شاد عظیم آبادی کے نام"۔ "محمد حسن وحدت"۔ "لالہ جگر ناتھ سنگھ"۔ "بولیوں کا سنگم"۔ "اردو زبان کا ارتقاء"۔ "سور داس اور تلسی داس پر اردو کا حق" وغیرہ۔ میں یہاں صرف چند مضامین سے متعلق اظہار خیال کروں گا۔

"شاد کا عظیم آباد" ایک سرسری اور معمولی مضمون ہے۔ عنوان کا تقاضا تھا کہ شاد کی موت سے پہلے کے عظیم آباد کی سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، تہذیبی اور ادبی و فنی حالتوں کو دلیلوں اور مثالوں سے پیش کیا جاتا۔ شاد کی عمر کا نصف اول کس قسم کے عظیم آباد میں گزرا اور نصف آخر میں کیا حال رہا۔ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالنی تھی اور اس کے لئے زیادہ محنت کی ضرورت بھی تھی۔ زیادہ سے زیادہ مواد مطبوعہ تھا قلمی نسخوں کی ورق گردانی کا جھمیلا بہت کم تھا۔ لیکن اختر صاحب نے کچھ نہ کیا۔ ۱۹۰۷ء میں عظیم آباد میں ایک شاندار مشاعرہ ہوا تھا جو ایک ہفتے تک لگاتار ہوتا رہا تھا۔ ایک گمنام دہلوی شاعر نے چھ مصرعہ طرح دیے تھے اور چیلنج کیا تھا کہ ان طرحوں میں بہار کے شعرا غزلیں کہیں تو جانوں۔ یہ مشاعرہ نواب بادشاہ رضوی کے دولت کدے پر ہوا تھا۔ مشاعروں کی تاریخ میں عظیم آباد کا یہ مشاعرہ جو شاد کی زندگی میں ہوا تھا، ناقابل فراموش ہے۔ اختر صاحب نے اس طرف ذرا بھی اشارہ نہیں کیا۔

"شاد کی ناول نگاری" ایک گمراہ کن مضمون ہے۔ اس مضمون میں اختر اورینوی نے لکھا ہے کہ شاد ناول نگار بھی تھے اور انہوں نے ایک ناول "ولایتی کی آپ بیتی" لکھا تھا جو تین حصوں میں ہے اور ہر حصے کے الگ الگ نام ہیں — صورت الخیال، ہیئتہ المقام اور حلیۃ الکمال۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ صورت الخیال شاد نے نہیں لکھا، البتہ اپنے نام سے شائع کرایا تھا، اور دیباچے میں غلط دعویٰ کیا تھا کہ قصے کا منصوبہ" (پلاٹ سازی) انہوں نے باندھا ہے۔ صورت الخیال سے متعلق پروفیسر سید حسن، سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی نے مفصل تحقیق پیش کی ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اس کا خلاصہ ان ہی کی زبان میں سنئے:-

۱۔ سجاد سنبل اور ناول صورت الخیال دونوں کے "مصنف یا مؤلف اصل میں مولوی حسن علی مرحوم ہیں"۔

۲۔ سجاد سنبل ایک ڈراما ہے جو پنڈت کیشو رام بھٹ کے نام سے ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا۔۔۔ صورت الخیال (عرف ولایتی کی آپ بیتی کا پہلا حصہ) ناول ہے جسے شاد عظیم آبادی نے ۱۸۷۶ء میں اپنے نام سے شائع کرایا تھا"

۳۔ "نقش طاؤس۔۔۔ کے متعلق تو یہ بات بالکل متیقن ہے کہ وہ مولوی حسن علی کی تالیف ہے"۔

۴۔ "نقش طاؤس اور سجاد سنبل دونوں کے پلاٹ بنگالی زبان کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ نقش طاؤس۔۔۔ بنگلہ ناول جگنگرگی کا ترجمہ ہے۔ سجاد سنبل کے متعلق بھی یہ بات معلوم ہے کہ وہ بنگلہ زبان کے ناٹک سے اخذ کیا گیا ہے۔۔۔ صورت الخیال کے نقادوں کی بھی یہی رائے ہے کہ وہ بنکم چٹرجی کے ناول اندرا سے مستعار ہے۔ اس طرح تینوں کتابوں کی بنیاد بنگلہ زبان کی کتابوں پر قائم کی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تینوں کتابیں جو تقریباً ہم زمان ہیں، ایک شخص کی کوشش تالیف کا نتیجہ ہیں۔ مولوی حسن علی مرحوم بھاگلپور کے باشندے تھے جو ان کے زمانے میں صوبۂ بنگال کے حدود میں شامل تھا۔۔۔ وہ بنگلہ زبان سے واقف ہوں گے۔۔۔ شاد کی بنگالی زبان سے واقفیت کا کوئی ٹھوس ثبوت

نہیں ملتا۔"

۵۔ "صورت الخیال کے دیباچے میں شاد نے اس امر کی طرف ذرا بھی اشارہ نہیں کیا کہ اس کا قصہ بنگالی زبان کے کسی ناول سے ماخوذ ہے۔ بلکہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ قصہ کا منصوبہ (یعنی پلاٹ) ہم نے باندھا ہے"

۶۔ "شاد کی خود نوشت سوانح عمری، شاد کی کہانی شاد کی زبانی"۔ میں ... اس قضیہ کا شاد نے جن الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ ان سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب شاد کی تالیف نہیں ہے۔ شاد نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ یہ ناول ۱۸۷۶ء میں حسب ایمائے منشی حسن علی مرحوم مسلم منشری لکھا گیا (ص ۱۰۰) اور دوسری جگہ یہ اقرار کر لیا کہ مولوی حسن علی مرحوم مسلم منشری بھاگلپور ایک زمانہ میں برسوں تک ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کے ترغیب دینے اور اسلوب بتانے پر اور اندھیرا (یعنی اندرا) نام بنگلہ ناول سنانے پر انہوں نے (یعنی شاد نے) بھی ۱۸۷۶ء میں ایک ناول لکھا (ص ۱۵) اب صورت الخیال کے دیباچے میں پلاٹ کے متعلق دعویٰ اور مذکورہ بالا ارشادات کو سامنے رکھ کر غور فرمائیے تو دونوں بیانات کے تضاد سے حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔

۷۔ "... ماخذ داستان، مقصد و موضوع قصہ، طرز تحریر و انداز بیان اور اشخاص و اماکن کے نام کے لحاظ سے تینوں کتابوں میں جب اس قدر اشتراک پایا جاتا ہے تو ہم یہ مان لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان کا مؤلف ایک ہی شخص ہے"

۸۔ "صورت الخیال کی شہرت و مقبولیت کو دیکھ کر شاد نے قصے میں اضافہ کر کے اس کی دو اور جلدیں تصنیف کیں۔ .. لیکن قصے کی دلکشی و حسن زبان و بیان کے لحاظ سے یہ دونوں حصے صورت الخیال کے مقابلے میں بہت کم تر ثابت ہوئے ... صورت الخیال اور اس کی دوسری جلدوں میں طرز تحریر کے اعتبار سے بھی نمایاں فرق ہے۔ زبان کی فطری سادگی اور سلاست جو صورت الخیال کی ہر سطر سے ظاہر ہے وہ ہیئۃ المقام اور حلیۃ الکمال کی عبارت میں گویا مفقود ہے۔ .. ناول کے آخری دو حصوں میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو پہلے حصے کے بیانات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔"

۹۔ "صورت الخیال کی اشاعت کے بعد ہی لوگوں کو شبہ ہوا تھا کہ یہ شاد کی نہیں بلکہ مولوی محمد اعظم کی تصنیف ہے۔ مولوی محمد اعظم نے اس کتاب کا مسودہ شاد کو نظر ثانی کے لئے دیا تھا لیکن شاد نے اسے واپس نہیں کیا اور کتاب اپنے نام سے شائع کر دی۔ ایڈیٹر بہار بندھو (پٹنہ) نے ناول کی تیسری جلد حلیۃ الکمال پر تبصرہ کرتے وقت اس واقعے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ... یہ مولوی محمد اعظم وہی ہیں جن کا نام نقش طاؤس کے مؤلف کی حیثیت سے مولوی حسن علی کے نام کے ساتھ درج ہے۔ میرا گمان ہے کہ نقش طاؤس یا صورت الخیال دونوں کے حق تالیف کو مولوی محمد اعظم کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ مولوی محمد اعظم لودی کٹرہ پٹنہ کے ایک زمیندار اور رئیس تھے۔ مولوی حسن علی ایک اسکول کے معمولی ٹیچر۔ کیا عجب ہے کہ دونوں میں دوستی ہو اور مولوی حسن علی نے دوست نوازی یا احسان شناسی کے طور پر نقش طاؤس میں مصنف کی حیثیت سے اپنے دوست یا مربی کو بھی شریک کر لیا ہو۔"

۱۰۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صورت الخیال کی اشاعت کے بعد اصلی مصنف نے شاد کے دعوی کو چیلنج کیوں نہیں کیا؟ ... اصلی مصنف کے پاس کوئی تحریری ثبوت تو موجود نہ تھا کہ اس سرقہ کو ثابت کر سکے۔ مولوی حسن علی مرحوم نے بھی اس امر کو زیادہ اہمیت نہ دی ہوگی کیونکہ ان

---

(۱) "اصلی مصنف کے پاس ... ثبوت ... نہ تھا کہ وہ اس سرقہ کو ثابت کرتے" مولوی حسن علی مرحوم نے بھی اس امر کو بھی زیادہ اہمیت نہ

(باقی نوٹ اگلے صفحہ پر)

کے دل ودماغ میں ایک انقلاب آرہا تھا۔ وہ روز بروز مذہبی معاملات اور دینی تبلیغ کی طرف مائل ہوتے جارہے تھے اور اس میں انہماک بڑھتا جارہا تھا۔ ایسی صورت میں ان کو ناول اور افسانہ وغیرہ کی لغو کتابوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی ہوگی۔" (چند تحقیقی مقالے از سید حسن۔ مقالہ بہار کا ایک گمنام مصنف ــ مولوی حسن علی)

"اقبال کا ایک خط شاد عظیم آبادی کے نام" ــ اس عنوان سے اختر اورینوی کا جو مضمون ہے۔ اس کی ابتدا میں زبان اردو کی ابتداء اور بہار کی ادبی حیثیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جس کی یہاں مطلق ضرورت نہ تھی۔ آخر میں اقبال کی مکتوب نگاری کا مختصر ذکر ہے اور یہ بھی غیر ضروری ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اقبال کے اس خط کی تلاش کا سہرا اختر اورینوی کے سر نہیں۔ اسے شاد عظیم آبادی کے پوتے محمد سعید فاطمی نے انہیں دیا تھا۔ یہ خط ۲۵ اگست ۱۹۲۴ء کو لکھا گیا۔ ۲۶ اگست کو لاہور میں سپرد ڈاک کیا گیا اور ۲۸ اگست ۱۹۲۴ء کو پٹنہ سٹی کے ڈاکخانے میں پہنچا جہاں تین بجے دن میں اس پر مہر لگائی گئی۔ خط پر بادشاہ جارج پنجم کی شبیہ ہے۔ اس خط کی روشنی میں اقبال کے املا، حروف سطر، عبارت وغیرہ سے متعلق معلومات فراہم کی جاتیں تو یہ مضمون مفید ہو جاتا۔ لیکن اختر اورینوی کی توجہ اس جانب نہیں گئی۔

"محمد حسن وحدت" سے متعلق مضمون تشنہ ہے۔ وحدت کے متعلق صرف یہ اطلاع ہے ــ "نام محمد حسن، تخلص وحدت، وطن پھلواری شریف آپ شاہ آیت اللہ مذاقی کے پوتے تھے۔" مضمون کے عنوان کے نیچے ۱۲۱۶ھ تا ۱۲۹۵ھ مرقوم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وحدت کا سال پیدائش ۱۲۱۶ھ اور سال وفات ۱۲۹۵ھ ہے۔ لیکن ان ساری باتوں کا ماخذ کیا ہے، نہیں بتایا گیا۔ قیاس غالب ہے کہ مجلد نسخہ پھلواری ہی اس اطلاع کا مدار ہے جسے اختر اورینوی نے دیکھا ہے۔ لیکن یہ تحقیق نہیں۔ اگر اختر صاحب محنت کرتے تو وحدت کے متعلق معلومات مل سکتے تھے۔ اور کہیں کچھ نہ ملتا تو کہنا تھا کہ وحدت کے حالات کہیں نہیں ملتے۔ وہ پھلواری جاکر تلاش کر سکتے تھے۔

"لالہ جگناتھ سنگھ بھی ایک گمراہ کن مضمون ہے۔ عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون میں لالہ جگناتھ کا حال ہوگا، لیکن اس میں تو جگر کی مثنوی "ست کنور" کا تعارف ہے اور یہ تعارف بھی مجمل ہے۔ کسی مخطوطے کا تعارف کس طرح کرایا جاتا ہے، اختر اورینوی بظاہر یہ بھی جاننا ضروری نہیں سمجھتے۔ معاصر پٹنہ کے قدیم شماروں میں قاضی عبدالودود اور پروفیسر سید حسن عسکری نے متعدد قلمی نسخوں کے تعارف پیش کئے ہیں۔ اختر اورینوی بھی معاصر سے وابستہ تھے، وہ معاصر دیکھتے ہوں گے۔ مگر ذوق اور تحقیق کی بات اور ہے۔

مثنوی "ست کنور" جو ایک فارسی مخطوطات کے مجلد مجموعے میں شامل تھی ڈاکٹر ممتاز احمد کی وساطت سے اختر اورینوی کو ملی۔ اس کا ذکر اختر صاحب نے حاشئے میں کیا ہے۔ اقبال کے خط بنام شاد کے متعلق بھی انہوں نے حاشئے میں کہا تھا کہ محمد سعید فاطمی سے یہ خط ملا ہے۔ یہ دیانت داری کی بات ہے۔ اور اختر اورینوی میں دیانت داری تھی۔ لیکن وہ "ست کنور" کے سلسلے میں مفید معلومات بخشتے تو اس تعارف

(بقیہ نوٹ پچھلے صفحہ کا) دی ہوگی"۔ یہ کہہ کر پروفیسر سید حسن نے شبہ پیدا کر دیا ہے کہ اصل مصنف مولوی محمد اعظم تھے یا مولوی حسن علی اس شبہے کو تقویت اس سے بھی ملتی ہے کہ اخبار "الپنچ" بانکی پور پٹنہ کے شمارہ ۳۳ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۸۸۵ء میں شاد کی کتاب حلیۃ الکمال پر تبصرہ کرتے ہوئے صورت الخیال کو "نتیجۂ طبع وقاد اعظم" لکھا گیا تھا۔

بہر حال پروفیسر سید حسن نے جتنے دلائل پیش کئے ہیں، وہ مضبوط ہیں اور انہیں ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان کی روشنی میں یہ امر تو ثابت ہو ہی جاتا ہے کہ صورت الخیال شاد کی قلمکاری کا نتیجہ نہیں اور شاد کی ناول نگاری پہ لکھتے ہوئے بھی اختر اورینوی اس سے بے خبر ہیں۔

کی اہمیت بڑھ جاتی۔

کہنا پڑتا ہے کہ اختر اور ینوی محقق ہیں تو نا استوار محقق ہیں۔

(۳۰)

اختر اورینوی شعر نہ کہتے تو ان کی شخصیت نہ نکھرتی۔ ان کی شخصیت میں لطافت تھی۔ حسن اور حسن کی کشش کا راز تھا۔ سپردگی اور جمال پرستی تھی۔ شاخ گل کی طرح لوچ اور لچک اور عطر بیزی کی خوبی اور سورج کی کرن کی طرح اندھیرے پر چھا جانے کا حوصلہ تھا۔ یہ خوبیاں ہمیں ان کی شاعری میں بھی ملتی ہیں۔

اختر اورینوی کی شاعری کا زمانہ اردو ادب میں ترقی پسندی کا زمانہ ہے۔ ادب کو با مقصد ہونا چاہئے۔ اور با مقصد سے مراد یہ کہ اسے ملک میں سیاسی، سماجی اور معاشی انقلاب پیدا کرنے کے لئے آواز اٹھانی چاہئے۔ اسے تلقین، موعظت اور خطابت سے کام لینا چاہئے۔ اور نزاکتوں اداؤں اور غمزوں کی شاعری سے پرہیز کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ ان باتوں سے نہ آزادی حاصل ہوگی نہ پیٹ بھرے گا بلکہ استحصال بڑھتا جائے گا۔ یہی ترقی پسند شاعری کی شاہ راہ تھی اور اس پر ترقی پسند شعرا چل رہے تھے۔ مجاز کہتے ہیں ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن — تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اور جوش کہتے ہیں ؎

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب — میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اور اقبال نے ترقی پسندوں کے خیالات کا تعارف یوں کیا ہے ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روٹی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اختر اورینوی اس قسم کی شاعری پر ایمان نہیں رکھتے۔ انہوں نے انقلاب زندہ باد اور مزدور جاگ اٹھا کی بات نہیں کی۔ شاید ایک یا دو نظمیں مل جائیں جس میں پند و موعظت سے کام لیا گیا ہے اور اپنے انداز میں گھن گرج پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اختر اورینوی کا عام انداز یہ نہیں ہے۔ وہ اپنی باتیں ہنگامہ خیز رہنما کی طرح پیش نہیں کرتے بلکہ بلبل بے اختیار کی طرح پھوٹ پڑتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ ترقی پسندی سے متاثر نہیں تھے اور تغیر نہ چاہتے تھے مگر انہیں وحشت پسند نہ تھی۔

اختر اورینوی زندگی میں کاوش، خلش اور حرکت و عمل کے خواہاں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جنت میں ہر طرح کی آسائش و آسودگی ہے۔ عیش و عشرت کے سارے سامان ہیں، اور جو چاہیئے فوراً ہو جاتا ہے مگر تگاپوئے دمادم جو زندگی کی دلیل ہے، وہ نہیں ہے۔ وہاں آرزوئیں ختم ہو جاتی ہیں۔ کوشش و کاوش کا جذبہ مٹ جاتا ہے۔ انتظار کی خلش باقی نہیں رہتی۔ لذت طلب سے جی محروم ہو جاتا ہے۔ مکمل وابدی یکسانیت طاری ہو جاتی ہے جو ایک حوصلہ مند اور طوفان حوادث سے لڑنے والے انسان کے لئے سوہان روح ہے۔ اختر اورینوی جنت سے اس لئے انکار کرتے ہیں۔ انہیں جنت میں زندگی کے مہمل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ شاعر کو زندگی اسی لئے ملی ہے کہ وہ لطف و کاوش اٹھائے۔ اسے ذوق ایذا طلبی ہے۔ اس کی وسعت شوق کی انتہا نہیں ہے۔ اس کے دل میں نت نئی آرزوئیں جاگتی ہیں۔ وہ مرگ آرزو سے گھبراتا ہے۔ وہ تو گلشن میں برق و صیاد کا منتظر ہے۔ وہ جام نوشیں کے ساتھ نیش اور حور کے ساتھ حسن ستم کیش کا پرستار ہے۔ وہ اس عشرت کا شیدا نہیں جو عزائم کو ختم کر دیتی ہے اور بیتاب تمناؤں کو سلا دیتی ہے۔ شاعر اسے روح کی موت کہتا ہے۔ اختر اورینوی کی اس نظم کو میں ایک علامتی نظم سمجھتا ہوں جنت سے انکار در اصل عیش کوشی، راحت طلبی اور حوادث سے بھاگنے کے خلاف ایک لطیف پیغام ہے۔ یہ نظم ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی۔ اس وقت ملک

کی سیاست میں ایک بھونچال تھا۔ اردو کے شعرا اور مصنفین بھی سیاست میں آتا ولے ہو رہے تھے۔ اور کئی شعرا نے سیاست اور شاعری کی تمیز چھوڑ کر خالص سیاسی شاعری شروع کر دی تھی۔ جنہوں نے عقل و تمیز سے کام لیا، انہوں نے شعر کو شعر اور سیاست کو سیاست سمجھا۔ انہوں نے سیاسی نعرہ بازی پر شاعری کو قربان نہیں کیا۔ باتیں کیں۔ وہی باتیں کیں جن کی ضرورت تھی۔ جو مردہ رگوں کو خون ناب دیتی تھیں۔ لیکن ان میں توڑ دو، پھوڑ دو کا طریقہ نہ تھا۔ تخریبی کاروائی کی جھلک نہ تھی۔ شمشیریں، زنجیریں، تدبیریں، تقدیریں تعزیریں جیسے الفاظ کا بارعب استعمال نہ تھا۔ ان کے یہاں شعور تھا جو شاعری کی پہلی شرط ہے۔

اختر اورینوی پیغام دیتے ہیں مگر ایسے انقلابی خیالات نہیں رکھتے۔ ان کی شاعری میں حسن اور رعنائی کے جلوے ہیں وہ پتھر کو کاٹ کر صرف بت نہیں بناتے، بتوں کے عشوے بھی نمایاں کرتے ہیں، کیونکہ وہ عشووں کے دلدادہ ہیں ؎

چشم مے ریز کے مارے کو عطا جام نہ کر
دے کے فردوس مرے شوق کو بدنام نہ کر

. . . .

جام نوشیں تو ہے جنت میں مگر نیش نہیں
مہرباں حور تو ہے حسن ستم کیش نہیں

. . . .

دودھ کی نہر تو ہے کاہش فرہاد کہاں
گلشن خلد میں بجلی کہاں، صیاد کہاں!

اختر اورینوی ہندوستان کی آزادی کے متمنی تھے۔ انہوں نے سیاست میں باضابطہ حصہ نہیں لیا۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت ملی نظم نہیں لکھی۔ لیکن ان کی شاعری میں جو تڑپ ہے، اس کی ایک وجہ ان کا جذبۂ بغاوت بھی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد انہوں نے اپنی مسرت کا اظہار کئی نظموں میں کیا ہے۔ "بہار آزادی"۔ "عید آزادی"، "جشن جمہوریہ"، "ہندوستان"، "گوا" وغیرہ جیسی نظموں سے ان کی آزادی پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو ہندوستان کی آزادی سے جو امیدیں وابستہ تھیں، وہ شکستہ سی نظر آئیں، شاعر کا لہجہ بعد کی قومی نظموں میں شکایتانہ ہو گیا ہے۔ "عید آزادی" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہی ہے روز مسرت، یہی ہے شام نشاط
بجھی بجھی ہوئی کرنیں اڑا اڑا ہوا رنگ
کہاں وہ ساز محبت، کہاں وہ پیار کی لے
کرم کے پر بھی ہیں ٹوٹے، وفا پاؤں بھی لنگ
بہار آئی مگر مستیٔ بہار کہاں؟
لبوں پہ خوف کے تالے، دلوں پہ حرص کا رنگ

چمن چمن میں ہے پھولوں کے خوں سے گلکاری

کہ خار و خس کے لئے اب سجائیں گے اورنگ

یہی ہے امن کہ مرغ حرم ہی بسمل ہو

اسے سلام محبت کہیں کہ سازشِ جنگ

نہیں تبسم جاناں پہ اعتبار نہیں

کہ طبع غنچہ میں پیدا ہوا مزاج سنگ

ان اشعار کے بعد اس نظم میں صرف تین شعر ہیں جن میں شاعر چمن ہند سے اپنی محبت کا اظہار کر کے اہل وطن کو ہم آہنگ ہونے کی دعوت دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ زندگی دراصل عزم نمو ہے۔ بہر اس نظم میں شاعر عہد آزادی سے اپنی مایوسی ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح دوسری نظم ہے "غم نارسائی"۔ اس میں شاعر کہتا ہے کہ فراق کی رات تو کٹی اور صبح ہوئی مگر وصل کا نوید نہ ملا۔ نئے ساز کو سنگیت ملے مگر میرا دل شکستہ رباب نہ پا سکا۔ ساقی نو خیز نے مے تو لٹائی مگر جس شراب کی طلب تھی، وہ نہ دی۔ اور یہ سب کہتے کہتے شاعر یہاں تک کہتا ہے کہ نئے نظام نے نیا گلدستہ سجا تو لیا مگر شکستِ گل کا اس نے حساب نہ دیا اور شاعر اب خانہ خراب ہو گیا ہے گو اس کی دلی آرزو تھی کہ قلب عالم کو سوز و ساز دیتا مگر اب اس لائق بھی نہیں کہ وفا میں جان دے سکے۔ اور آخری شعر یہ ہے ؎

تمہاری بزم میں جمہوریت تماشائی

یہاں یہ غم۔ وفا کی نہیں پذیرائی

غرض اختر اورینوی کی قومی نظمیں کئی لحاظ سے اہم ہیں۔ ان میں صرف یہی نہیں کہ ہندوستان کی تعریف و توصیف ہے اور آزادی کے گیت گائے گئے ہیں۔ بلکہ آزادی کے بعد ہندوستان کی کیا حالت رہی، اس پر بھی تبصرہ ہے اور بغیر اپنی شدید نفرت کا اظہار کئے اہل وطن کو متوجہ کیا گیا ہے۔ اختر اورینوی کی قومی نظموں کو پڑھ کر حالی کا شعر ذہن میں آتا ہے ؎

پھوٹ پڑتے ہیں تماشا اس چمن کا دیکھ کر

نالۂ بے اختیار بلبل نالاں ہیں ہم

اختر اورینوی کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اصلی جوہر مناظر فطرت اور حسن و شباب کی کہانیوں میں کھلتا ہے۔ وہ ایک جمال پرست شاعر ہیں اور حسن و فطرت کی رنگینیوں سے شدت سے متاثر ہوتے ہیں۔ حسن کو وہ جہاں اور جس حال میں دیکھتے ہیں مچل جاتے ہیں اور ان کی طبع رواں ہو جاتی ہے۔ اس معاملے میں وہ کسی آورد کے محتاج نہیں۔ ان کی شاعری میں آمد کا زور پایا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں "تاج محل"، "دھان کا کھیت"، "جگنو"، "برق"، "نغمے"، "پیام فطرت"، "دریائے سون"، "رومان رفتہ"، "ابدی رات"، "روح صحرا سے"، "مشین"، "نذر نیتان لکھنؤ"، "ارمغان شباب"، "جلوہ گریزاں" وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اختر اورینوی کی نظمیں ہندوستان سے متعلق ہوں یا گوا اور فلسطین سے، انہوں نے تاج محل پر نظم لکھی ہو یا دھان کے کھیت پر، روح صحرا سے خطاب کیا ہو یا ماضی سے، ہوش و خرد کی بات کی ہو یا پیغام جنوں دیا ہو۔ سرخئ افسانۂ دل لکھی ہو یا گریۂ بے اختیار کو قلم بند کیا ہو، نگاہ ناز سے اجتناب کیا ہو یا چشم مے ریز سے تجدید سحر کی ہو۔ ان کی شاعری کے بنیادی محور چار باتیں ہیں۔ محبت کی خلش، وفا کی پکار، انسانیت کا درد

اور خلوص و سادگی کی آرزو۔ اور یہ باتیں کہیں جذبات و احساسات کی شکل میں ابھری ہیں۔ کہیں تجربات کے روپ میں کہیں افکار کی صورت میں اور کہیں واقعات کے بھیس میں، مگر یہ عموماً اپنی توانائی و تونگری اور خیز یتی و شعریت کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہیں اور ان باتوں میں کسی قسم کی ضد یا ہٹ دھرمی یا انتشار و ہیجان یا ہنگامہ اور شور و غوغا نہیں ہوتا جیسا کہ بعض ترقی پسندوں کی روش رہی ہے۔ اختر اورینوی کے خیالات اپنے شاعرانہ رنگ روپ میں صفحۂ قرطاس پر اس طرح اترتے ہیں جیسے جگر لالہ میں شبنم کے قطرے۔ ان کا نظریۂ شعر یہ ہے:

"ترقی پسند ادیبوں کے لئے فن اور ترکیب فن سے واقف ہونا ضروری ہے۔ قدیم ادب العالیہ کے بہترین نمونے اور شہکار ہمارے لئے رہبری کا کام کرسکتے ہیں۔ گزشتہ تہذیبوں کی ساری اچھائیاں ترقی پسند ادب کے لئے بہت ہی قیمتی ورثہ ہیں"۔

"ترقی پسند ادیب کے لئے ایک اور مسئلہ نہایت ہی نازک ہے۔ پیام اور نصب العین کو اشتہاری یا تبلیغی طور پر نہیں پیش کرنا چاہئے، زندگی کی رواں دواں اور محسوس حقیقتوں کے ساتھ پیش کرنا چاہئے۔ اشتہاری ادب پیش کرنا آسان ہے۔ مگر ادب کو اس طرح برتنا کہ اس کے ذریعہ زندگی کا جسمانی اور روحانی اکسرے ہو جائے اور پھر بھی دل کی دھڑکن، خیالات کی پرواز اور اعضا کی حرکت قائم رہے۔ بڑی کٹھن بات ہے"۔ (ترقی پسند ادب)

اور رشک ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر اپنی شاعری میں اس امر کا لحاظ رکھا ہے۔ وہ ہمیں زندگی سے قریب کرتے ہیں اور زندگی کو اس کی تمام کلفتوں کے ساتھ گلے لگانے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔ جہاں انہوں نے حقائق زندگی کی تلخیوں کو بے نقاب کیا ہے وہاں زندگی کے حسن کو بھی قریب سے دیکھا ہے۔ دکھوں اور مصیبتوں کے ساتھ وہ ہمیں رومانی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ وہ معشوق کی محبت اور اپنی سپردگی کا جلوہ اس طرح دکھاتے ہیں جیسے معلوم ہوتا ہے کہ دریائے سون کے متوازی محبت و سپردگی کی ایک انجو نغمہ ریز ہے۔ اسی طرح اپنی ایک شام کی سہانی کیفیت بیان کرتے ہیں ؎

سینۂ رنگیں پہ غلطاں شعلۂ ملبوس تھا
حسن مضمر جلوۂ بیتاب میں محسوس تھا
شام کو ان کی نگاہیں میکدہ بردوش تھیں
آتشِ عریاں سے میرا دل بھی کیا مانوس تھا
گلستاں در گلستاں وہ پھول سے رخسار تھے
آسماں پر تھی شفق اور رقص میں طاؤس تھا
تھی لبِ جاں بخش میں تابانیٔ سوزِ حیات
حسن کی روحِ تجلی کو بدن فانوس تھا

یہ اختر اورینوی کی شاعری کا خاص رنگ ہے۔ اس میں روایت سے روگردانی نہیں کی گئی ہے۔ اختر اورینوی مشرقی مزاج رکھتے ہیں اور مشرقی مزاج کی پوری نمائندگی ہماری کلاسیکی شاعری میں ہوتی ہے۔ اس لئے وہ روایت سے بغاوت نہیں کرتے۔ لیکن ان کی روایت پسندی میں صحت اور غور و فکر ہوتی ہے۔ وہ قنوطی شعرا کے پیرو کار نہیں ہیں جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، وہ زندگی سے قریب کرتے ہیں، اور جینے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔ لازماً روایت اور تبدیلیاں دونوں سے مصرف لیتے ہیں اور دونوں میں متوازن ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ اور اس

ہم آہنگی میں وہ اقبال کے قریب ہوجاتے ہیں۔ اقبال کی شاعری سے اختر اورینوی نے کافی اثر قبول کیا ہے۔ اقبال سے وہ صرف خیالات ہی نہیں لیتے بلکہ بعض دفعہ ان کا لب و لہجہ بھی اقبالیانہ ہوجاتا ہے۔ ان کی نظم "فلسطین" اس کی مثال ہے۔

اختر اورینوی جتنے اقبال سے متاثر ہیں۔ اتنا ہی اثر مجاز اور اختر شیرانی کا بھی ان پر ہے۔ شیرانی کی طرح اورینوی نے بھی سلمیٰ، ریحانہ، عذرا کو مخاطب کیا ہے۔ مگر اختر اورینوی کا رومان اجنبی محبت کی پکار یا دل شکستہ کا مجروح ارمان نہیں ہے۔ وہ نگار محبت کے بلبل ہزار داستان اور طوطی شیریں بیاں ہیں۔ انہوں نے وادیٔ محبت میں حسین لمحے گزارے ہیں۔ دریائے سون کی بیقرار موجوں میں اپنا قرار دل کھو لا ہے اور شام کے سہانے سماں میں نگاہوں کو میکدہ بردوش اور لب جاں بخش میں تابانی سوز حیات دیکھی ہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں اطمینان و آسودگی کی فضا ملتی ہے۔ وہ وحشتِ دل کے شکار نہیں ہوتے اور نہ زمین کے کناروں اور آسمان کے تاروں کو نوچتے ہیں۔ ان کی شاعری میں غم و غصہ کا اشتعال نہیں۔ کبھی محبت کی خلش انہیں بیقرار کرتی ہے تو نرمی سے لب کشا ہوتے ہیں۔ ان کی نظم "ابتلائے محبت" دیکھئے۔

اختر صاحب کا رومان مجاز اور اختر شیرانی کے رومان سے زیادہ معقول، مفید اور باوقار ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپے سے نہیں گزرتے ؎

اپنے آپے سے گزر جانا زلیخائی ہے!
عشق یہ عشق نہیں۔ عشق کی رسوائی ہے

اختر اورینوی دراصل نظم کے شاعر ہیں۔ اور ایک دو نظموں سے قطع نظر انہوں نے کامیاب نظمیں لکھی ہیں ان کی نظموں میں تنظیم کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کی ایک نظم ہے "محبت" اس کی تنظیم اٹل ہے۔ اور جو خیال اس نظم میں پیش کیا گیا ہے وہ مفید، مہذب اور اچھوتا ہے۔ نظم یہ ہے:

اپنی محرومیٔ قسمت پہ تو فریاد نہ کر
آبروئے عشق کی اے دل کبھی برباد نہ کر
عشق معصوم بھی ہو حسن کی صورت روپوش
اصل نغمہ ہے کہ ہو ساز محبت خاموش
عشق خوددار ہے گو شان نہیں ناز نہیں
گرمیٔ بزم نہیں، عشق میں آواز نہیں
دل میں ہو حشر بپا، لب ترا خاموش رہے
راز رسوا نہ ہو، اتنا تو تجھے ہوش رہے
اپنے آپے سے گزر جانا زلیخائی ہے
عشق یہ عشق نہیں، عشق کی رسوائی ہے
آرزو سینہ میں ہو صورت دُرِّ نایاب
سنگ کے بطن میں خوابیدہ ہو جیسے سیماب
جس طرح نغمۂ بلبل ہو کہستانوں میں
جس طرح چشمے ابلتے ہوں بیابانوں میں

جیسے کہساروں میں خاموش ہو سرو غم گیں
جیسے تنہائیوں میں عطر فشاں نافۂ چیں
جیسے ویرانیٔ صحرا میں ہو نور مہتاب
جیسے وادی کی خموشی میں ندی چھیڑے رباب
جیسے جنگل میں ہوں چرواہے کہیں نغمہ سرا
جیسے سنسان چراگاہوں میں گھنٹی کی صدا
عشق ہو زر کی طرح مخزن پوشیدہ میں
لعل و گوہر کی طرح معدن نادیدہ میں
جیسے مندر میں ہو دوشیزہ پجارن کا چراغ
حور کے ہاتھ میں یا بادۂ کوثر کا ایاغ!
بر بط روح کی مضراب ہے دل، تار ہے عشق
خالق حسن کا اک پرتو انوار ہے عشق
دشت کے غنچۂ بے مونس وہمدم کی قسم!
رات کو اشک فشاں قطرۂ شبنم کی قسم!
چشم گریاں کی قسم، صبح کی آہوں کی قسم!
گرسنہ جاں کی قسم، تشنہ نگاہوں کی قسم!
مجھ کو اس ہوک کی جو رات کو اٹھتی ہے قسم!
صبح صادق کے ضیا پاش ستاروں کی قسم!
مجھ کو ایمان کے مستور شراروں کی قسم!
چاہتا ہوں تجھے گو لب پہ مرے نام نہیں
دل میں ہے یاد تری ذکر مگر عام نہیں
اے مرے چاند، مری تیری عجب دوری ہے
دل سے قربت ہے مگر جسم سے مہجوری ہے
میں تو چاہت کے بھلانے کا گنہگار نہیں
کیا کروں پر تری الفت کا سزاوار نہیں
مجھ کو تو غیر سمجھ بھول کے بھی یاد نہ کر
دل نازک کو کسی کے لئے ناشاد نہ کر

یہ ہے نظم! شاعر کا دل جذبۂ عشق سے سرشار ہے، لیکن وصالِ یار اس کی قسمت میں نہیں۔ وہ اداس ہے، مغموم ہے، مگر مایوسی یا بیہوشی کو راہ نہیں دیتا۔ نظم کی ابتدا پر غور کیجئے۔ شاعر عقل و شعور سے کام لیتا ہے۔ اپنی محرومی قسمت کے باوجود فرماد و فغاں سے بچتا ہے۔ اسے وصل کی خواہش سے زیادہ آبروئے عشق عزیز ہے۔ شاعر خود کو سنبھالتا ہے۔ اپنے عشق کی حفاظت کرتا ہے۔ عشق کی عظمت سے دلِ بیقرار کو آگاہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اصل عشق اپنے اندر کی طغیانی کو دبانا اور عالم سے بیگانہ و بے نیاز رکھنا ہے۔ اور پھر قسم کھاتے ہوئے اپنے مخاطب سے کہتا ہے کہ میں تجھے دوسری تمام چیزوں کے مقابلے میں زیادہ چاہتا ہوں۔ مگر تجھ سے دوری ہے اور وصل کی صورت نہیں۔ شاید میں تیری محبت کا سزاوار ہی نہیں۔ اس لئے تو مجھے بھول جا اور اپنے دلِ نازک کو میری خاطر ناشاد نہ کر۔

یہ اس نظم کا خیال ہے اور کیسا انوکھا خیال ہے! انوکھا اس لئے کہ اس میں جگر کو سخت بنایا گیا ہے۔ اردو شعرا اپنے جگر کو اس طرح پتھر نہیں بنا پاتے۔ وہ زیادہ تر واویلا مچاتے ہیں۔ شاعر کے لئے دلِ گداختہ کے ساتھ ...... سینے کے بوجھ کو برداشت کرنے کی صلاحیت ضروری ہے۔ ہاں تو، یہ ایک انوکھا خیال ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا، یہ مفید اور مہذب خیال ہے۔ اس کی افادیت اور تہذیب یہ ہے کہ اس میں ابتذال و رکاکت یا ہوس و بے شعوری نہیں۔ بلکہ غمِ عشق کو برداشت کرنے کا حوصلہ و سلیقہ اور اعلیٰ جذبات کی تربیت ہوتی ہے۔

اب اس خیال کی تنظیم دیکھئے۔ بات محبت کی ہے مگر محرومی قسمت سے شروع ہوتی ہے پھر عشق کی عظمت کا راز بتایا جاتا ہے وہ راز یہ ہے کہ عشق تمام معاملات سے بے نیاز ہے۔ شاعر بھی اپنے عشق کو بے نیاز و باوقار رکھنا چاہتا ہے، گو وہ اپنے معشوق کو بے حد چاہتا ہے۔ مگر معشوق کو یقین ہو تو کیسے ہو۔ اسے یقین دلانے کے لئے شاعر قسمیں کھاتا ہے اور آخر میں کہتا ہے کہ میں تو ہرگز نہ بھولوں گا، البتہ تو مجھے یاد رکھ کر اپنے دل کو ناشاد و مضطرب نہ کر۔ خیال کے اس ارتقا میں کوئی بے ترتیبی نہیں ہے۔ ہم اس نظم کے حصوں کو آگے پیچھے نہیں کر سکتے۔

اختر اورینوی اپنے خیال کا خوبصورت نقش ابھارتے ہیں۔ یہ شعر دیکھئے ؎

آرزو سینہ میں ہے صورتِ دُرِّ نایاب
سنگ کے بطن میں خوابیدہ ہو جیسے سیماب

پتھر کے اندر سیماب نہیں ہو سکتا۔ مگر شاعر نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔ سینے کے اندر آرزوئیں مچل رہی ہیں۔ مگر شاعر اپنے سینے کو پتھر کی طرح سخت رکھنا چاہتا ہے تاکہ زلیخائی نہ سرزد ہو جائے۔ اس خیال کا نقش شاعر نے نادر تشبیہ کے ذریعہ مرتب کیا ہے ع سنگ کے بطن میں خوابیدہ ہو جیسے سیماب۔ اگر پتھر میں سیماب ہے تو وہ کتنا نایاب اور مفید ہے اور اسی لئے اس کی قدر و قیمت ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ پتھر کے اندر بھی سیماب ہوتا ہے۔ جب ہم سنگ کو تراشتے ہیں اور خوبصورت سڈول مورت تیار کرتے ہیں تو اس کی سیمابیت اچھلنے لگتی ہے اور مورت محض مورت نہیں رہتی۔ ذی حیات معلوم ہونے لگتی ہے۔ اختر اورینوی اپنی آرزوں کو اسی طرح ذی حیات و زندہ جاوید بنا دیتے ہیں۔ عشق کے خلوص و وارفتگی اور اس کی خاموش کڑھن اور عالم سے بے نیازی کی عکاسی کے لئے شاعر نے کئی تشبیہات استعمال کی ہیں۔ کہستانوں میں نغمۂ بلبل، بیابانوں میں ابلتے چشمے، کہساروں میں سرو، تنہائیوں میں تانہ چیں، ویرانیٔ صحرا میں نورِ مہتاب، وادی میں ندی کا بہاؤ وغیرہ سے شاعر کا گہرا مشاہدہ ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ تشبیہات بڑے فطری انداز میں روانی کے ساتھ یکے بعد دیگرے آئی ہیں۔ غور کیجئے تو ان میں سے ہر تشبیہ اپنی جگہ پر موزوں ہے۔ کہستانوں میں نغمۂ بلبل کو کون سنتا ہے مگر بلبل گاتی ہے۔ بیابانوں میں ابلتے چشمے کو کون دیکھتا ہے مگر چشمے ابلتے رہتے ہیں۔ کہساروں میں خاموش سرو کے غم کو کون پہچانتا ہے مگر سرو اداس کھڑے ہوتے ہیں، ویرانیٔ صحرا میں نورِ مہتاب کی

چمک اور دلکشی کو کون دیکھتا ہے لیکن چاند اپنی روشنی سے صحرا کو منور کرتا رہتا ہے اس طرح دوسری تشبیہات پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا عشق کی بے نیازی ہر جگہ موجود ہے اور شاعر نے اپنے مشاہدے کی بنا پر ایسی ہی تشبیہات استعمال کی ہیں جس میں والہانہ پن بھی ہے اور بے نیازی بھی۔ غرض یہ تمام تشبیہات عشق کی عظمت کا راز بتاتی ہیں اور شاعر کے بھڑکتے جذبات کو صحیح سمت عطا کرتی ہیں۔

شاعر نے اس نظم میں جن چیزوں کی قسم کھائی ہے، وہ یہ ہیں: دشت کے غنچۂ بے مونس و ہمدم، رات کو اشک فشاں قطرۂ شبنم، چشم گریاں، صبح کی آہیں، گرسنہ جاں، تشنہ نگاہیں، وہ ہوک جو رات کو اٹھتی ہے، وہ آہ جو قلب میں گھٹتی ہے، صبح صادق کے ضیا پاش ستارے اور ایمان کے مستور شرارے۔

جس شے کی قسم کھائی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شے اسے بے حد عزیز ہے۔ اس خوبی کے علاوہ ان قسموں کی یہاں دوسری خوبی بھی ہے اور وہ بہت اہم اور فنی نزاکت سے بھرپور ہے۔ وہ یہ کہ جو بات آگے کہی جانے والی ہے، اس کا اثبات ان قسموں سے ہوتا ہے۔ غور کیجئے دشت کا غنچۂ بے مونس و ہمدم ہے۔ شاعر خود بے مونس و ہمدم ہے۔ وہ دشت کے غنچے میں اپنی سی کیفیت پاتا ہے اس لئے غنچہ اسے عزیز ہے اور شاعر جس طرح مونس کے لئے بیقرار ہے، غنچۂ بے مونس میں بھی وہی تڑپ ہے مگر وہ اپنا کام جاری رکھتا ہے۔ کھلنا اور عطر بیز یاں کرنا اس کا کام ہے۔ شاعر بھی اسی طرح صرف اپنی چاہت کا شیدا ہے۔ وہ غنچۂ بے مونس یا اشک فشاں شبنم کی طرح خموشی سے سب کچھ برداشت کر لیتا ہے اور ہر رنگ میں جلتا جاتا ہے۔ اسی طرح دوسری قسموں پر بھی غور کیجئے۔ الفت، شدت، اضطراب اور صبر ہر جگہ نظر آئے گا جس سے شاعر دوچار ہے۔ جذبے پر ایسی گرفت اور اس کی ایسی تہذیب و عکاسی ہمیں مجاز کیا اختر شیرانی کے یہاں نہیں ملتی۔

اختر اور میتوکا کی ایک دو نظموں میں جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے تنظیم کی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کی ایک نظم ہے "جنون تمنا" پہلا شعر یہ ہے:

اگر وہ محبت کا اقرار کر دے
تو شاعر دو عالم سے انکار کر دے

یہ دراصل غزل ہے مگر شاعر نے غالباً اسے نظم سمجھا ہے۔ اس لئے عنوان دینا ضروری سمجھا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ اس غزل میں تمناؤں کا جنون ہر شعر میں موجود ہے لیکن یہ نہ نظم ہے اور نہ غزل مسلسل۔ اس کے اشعار آگے پیچھے بآسانی کئے جا سکتے ہیں۔ اور تمناؤں کا جنون محض برائے نام ہے۔ اس میں شدت، وارفتگی اور بے خودی و سرشاری نہیں ہے۔ خیالات اوچھے، پھیکے اور بیشتر پامال افتادہ ہیں۔ اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ان میں تکرار ہے۔ پہلا شعر جو مطلع تھا آپ نے دیکھا اب مقطع دیکھئے ؎

اگر تیری آغوش جنت کشا ہو
تو اختر دو عالم سے انکار کر دے

تکرار ظاہر ہے۔ مطلع کو پھر پڑھئے ؎

اگر وہ محبت کا اقرار کر دے
تو شاعر دو عالم سے انکار کر دے

اب یہ شعر دیکھئے ؎

خودی اور خدا کو فراموش کر دوں
اگر وہ محبت کا اظہار کر دے

یہاں بھی تکرار بھیس بدل کر ظاہر ہوتی ہے اور مطلع کے بعد حسنِ مطلع بالکل فضول ہے:

تو شرمیلی نظروں سے اظہار کر دے
نگاہوں نگاہوں میں اقرار کر دے

ایک نظم ہے "گاندھی جی"۔ مستزاد کی شکل میں ہے۔ ابتدائی چند بند ملاحظہ ہوں ؎

لے کے تیرے جرأتِ کردار سے سوزِ وطن
شمعِ آزادی جلی ہے انجمن در انجمن — سوزِ وطن سازِ وطن
سوزنِ تدبیر سے تو نے سیے داماں، چاک
ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا زندگی کا پیرہن — شانِ وطن نازِ وطن
تو نے ذروں کو ملا کر عظمتِ صحرا دیا
ہند کی قوموں کو تو نے کر دیا گنگ و جمن — جیسے ملے گل سے سمن
تیرے نقشِ پا سے ہیں منزل کی تنویریں عیاں
خار و خس سے تو نے پیدا کر دیئے تازہ چمن — آنِ وطن شانِ وطن

گاندھی جی کی عظمت کو شاعر نے دل سے محسوس کیا ہے۔ اس لئے باتیں دل سے نکلتی ہیں اور تاثیر رکھتی ہیں بعض اشعار شعریت سے لبریز ہیں۔ لیکن مستزاد لگا کر نظم کو بگاڑ دیا گیا ہے۔ مستزاد کے ٹکڑے مصرعوں میں کھپ نہیں پاتے۔ یہ اپنی الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ اوپر کے دو اشعار دیکھئے۔ سوزِ وطن سازِ وطن اور شانِ وطن نازِ وطن کو ایک دوسرے کی جگہ پر رکھ دیں تو کوئی فرق نہ پڑے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی مطلق ضرورت نہ تھی مستزاد نہ ہوتا تو یہ نظم زیادہ کامیاب ہوتی۔ اور مستزاد ہوتا تو ایسا ہوتا جیسے تیرا شعر ہے۔ تیسرے شعر میں "جیسے ملے گل سے سمن" مصرعے میں مل جاتا ہے۔ اس طرح یہ شعر دیکھئے ؎

عین طوفاں میں ڈبو دی ہم نے کشتیٔ نجات
حلقۂ گرداب میں اب کیجئے لاکھوں جتن — ملتا نہیں تیرا شرن

یہاں بھی "ملتا نہیں تیرا شرن" مصرعے میں مل جاتا ہے۔ کاش اسی طرح دوسرے اشعار کے ٹکڑے بھی مربوط ہوتے!

بعض دفعہ اختر صاحب مبہم اور غیر واضح سی نظم لکھتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ہے "خندۂ دزدیدہ"۔ پہلا بند یہ ہے ؎

مغموم فضاؤں میں
ویران دیاروں میں
مظلوم کی آہوں میں
دلدوز تو رز ہیں

اک عشرت پنہاں ہے　　اک لطف ہے پوشیدہ

تو کیا ہوا؟ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ اگر صرف یہی کہ مصیبتوں میں بھی عشرت اور سامانِ لطف ہے، تو ہمیں یقین نہیں آتا۔ یقین اس وقت آتا جب بات مدلل و مکمل ہوتی۔ دعویٰ میں دلیل ما دلیل ہوتی اور کچھ معقول وضاحت ہوتی تو ذہن انہیں قبول کر لیتا شاد کہتے ہیں خ تڑپ لے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے اس ایک بات کو ایک مصرعہ میں کہئے یا پانچ مصرعوں میں اور ایک بار کہئے یا متعدد بار، سننے والے کو تشفی نہ ہوگی۔ اس مصرعۂ ثانی کو مصرعۂ اول کے ساتھ پڑھئے تو بات اہم، مفید اور مکمل ہو جاتی ہے اور سننے والا معقول ہو جاتا ہے ؎

خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے

تڑپ لے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

اسی طرح مغموم فضا دل میں اک عشرت پنہاں ہے۔ کی کوئی دلیل ہوتی تو بات نئی انوکھی اور شیریں ہو جاتی۔

”خندۂ دزدیدہ“ میں تنظیم کی بھی خرابی ہے، ہر بند آزاد ہے، اور کسی کو کسی جگہ رکھا جا سکتا ہے۔ اور تکرار بھی ہے۔ پہلا بند آپ نے دیکھا۔ اب دوسرا بند دیکھئے ؎

مغمومی ہر دم میں

محرومی پیہم میں

اور غم کی گھٹاؤں میں

ارمان کے ماتم میں

فرحت نہ داماں ہے　　اک کیف ہے خوابیدہ

جو بات اختر صاحب کہنا چاہتے ہیں وہ پہلے بند سے ظاہر ہے۔ دوسرے کی ضرورت نہ تھی۔

بہر حال اس قسم کی چند خامیاں اختر اورینوی کی شاعری میں ملتی ہیں۔ مگر یہ خوبیوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں اس لئے یہ زیادہ قابل توجہ نہیں۔ اختر اورینوی اپنے عہد کے بزرگ شعرا میں شامل کئے جانے کے مستحق ہیں۔

(۴)

اختر اورینوی نے ایک ڈراما ”شہنشاہ حبشہ“ اور ایک ناول ”حسرتِ تعمیر“ بھی لکھا لیکن وہ بنیادی طور پر افسانہ نویس ہیں۔ ”حسرتِ تعمیر“ چھوٹا ناگپور کا ماحول پیش کرتا ہے۔ اس کا مرکزی کردار یوسف محبوب ہے جو ایک معمولی آدمی سے بہت بڑا دولت مند بن جاتا ہے۔ وہ چھوٹا ناگپور کے قدرتی وسائل سے مصرف لے کر کئی قسم کے کاروبار شروع کر دیتا ہے۔ وہ چھوٹا ناگپور کو ہندوستان کا ترقی یافتہ صنعتی علاقہ بنا دینا چاہتا ہے۔ وہ محبوب نگر بساتا ہے۔ آمدنی کے ساتھ چھوٹا ناگپور میں اس کی شہرت بڑھتی ہے۔ اس کی مساعی سے چھوٹا ناگپور جیسا کوردہ اور وحشی علاقہ سائنس کی نعمتوں سے فیض یاب ہوتا ہے لیکن یوسف محبوب کی ذاتی زندگی اطمینان بخش نہیں ہے۔ اس کی بیوی اس کے مزاج کے میزان پر پوری نہیں اترتی۔ وہ سخت گیر واقع ہوئی ہے۔ بڑے گھرانے کی لڑکی اور جہیز میں وافر دولت لانے کی وجہ سے وہ یوسف محبوب پر حاوی رہتی ہے۔ یوسف اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ جرأت نہیں کر پاتا۔ اس کے شب و روز زہریلیوں کی طرح گزرتے ہیں۔ اس کی زندگی میں کئی لڑکیاں آتی ہیں اور چل چل ہو جاتی ہیں وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ پہلی بیوی سے اس کی مخاصمت بڑھتی جاتی ہے اور بالآخر وہ دوسری شادی کر لیتا ہے اور اس کی انا کو تسکین مل جاتی

ہے۔ مگر چھوٹا ناگپور کی تشکیل جدید کا خواب پورا نہیں ہوتا اس کی آرزوئیں منتشر ہو جاتی ہیں اور دل میں حسرت تعمیر لئے وہ جیل چلا جاتا ہے۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اس ناول کا جائزہ لیتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے کہ بوس کے جیل چلے جانے پر ناول کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ اختر اورینوی نے پلاٹ سازی کے لئے واقعات کے بہت سے جال بنے ہیں۔ بظاہر یہ واقعات بے تعلق معلوم نہیں ہوتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صفائی کے خیال سے ناول کو جھاڑ پونچھ کر دیکھا جائے تو کئی واقعات گرد و غبار کی طرح جھاڑ کر الگ کر دیئے جانے کے لائق نظر آئیں گے۔ ناول پیچیدہ اور طویل ہے اور اس طوالت کے باوجود بعض جگہ تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ بوس محبوب کی تنزلی کے حقیقی اسباب کیا تھے۔ وہ ایک ذہین، جفاکش، ملنسار، مہذب، دولت مند اور باوقار انسان تھا۔ اس کی پرانی بیوی جس سے ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی، الگ کر دی گئی تھی۔ بوس نے دوسری شادی بھی کر لی تھی۔ پھر کیا ہوا کہ اس کی ساری اسکیم ختم ہو گئی۔ ناول نگار نے لکھا ہے کہ دوسری بیوی سے بھی بوس خوش نہ ہوا، خوش نہ ہوا تو وہ تیسری شادی کر سکتا تھا۔ اسے اچھی ازدواجی زندگی کی جیسی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے تحت یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنی زندگی کو یوں گھٹتا ہوا محسوس کرے۔ اور دولت کی فراوانی کے باوجود آزادیٔ افکار کو راہ نہ دے۔ خیر یہ یا ناکہ اس نے تیسری شادی کی طرف توجہ نہ کی، مگر صنعتی ترقی میں وہ ناکام کیسے ہوا؟ بورڈ آف ڈائریکٹرز میں دوسرے لوگ کیسے گھس آئے؟ اور محبوب کو کیوں نکال پھینکا۔ محبوب نے کون سی حماقتیں کیں یا کہاں پر غفلت واقع ہوئی؟ ناول نگار نے ان باتوں پر روشنی نہیں ڈالی۔ حالانکہ واقعات کی روشنی میں ان باتوں کو مفصل پیش کرنا ضروری تھا۔ بوس محبوب کے کردار کی بنتی ہوئی تصویر کو جس طرح ناول نگار نے ابھارا ہے۔ اسی طرح اس کی بگڑتی ہوئی تصویر کو بھی منعکس کرنا تھا تب حسرت تعمیر کی مکمل صورت سامنے آتی۔

"حسرت تعمیر" میں سلمیٰ سوگیتی اور منظر سے متعلق جو واقعات پیش کئے گئے ہیں وہ جاندار ہیں۔ لیکن انہیں بوس محبوب کی حسرت تعمیر کا جز نہیں بنایا گیا ہے یہ اپنی علیحدہ حسرت تعمیر رکھتے ہیں۔ انہیں ناول سے کاٹ دیا جائے تو ناول کو کوئی نقصان نہ ہوگا صرف تھوڑا موڈیریٹ کرنے کی ضرورت ہوگی۔ پلاٹ سازی کا یہ انداز اچھا نہیں۔ یہ ایسا ہی طریقہ ہے جیسے آپ اپنے کمرے کو سجانے کے لئے مختلف قسم کے آرائشی سامان رکھتے ہیں، ان میں سے کسی ایک یا دو یا کئی سامانوں کو بھی ہٹا دیں تو کمرے کے حسن میں فرق نہ آئے گا۔ ناول، اچھے ناول میں۔ پلاٹ سازی اعضائے جسم کی طرح موزوں ہوتی ہے۔

اختر اورینوی کردار نگاری میں اکثر و بیشتر بیانیہ انداز اپناتے ہیں۔ وہ کرداروں کی صورت و سیرت کے متعلق خود بتاتے ہیں، مکالمہ یا خود کلامی یا اپنے حرکت و عمل اور مشغولیات سے کردار زیادہ واضح طور پر اپنی نفسی پیچیدگیوں کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ مگر اختر اورینوی یہ طریقہ بہت کم اپناتے ہیں اس ضمن میں مزید روشنی آگے ڈالی جائے گی۔

اختر اورینوی منظر نگاری پر اپنا سارا زور قلم صرف کرتے ہیں۔ اس سے ان کا قوی مشاہدہ ظاہر ہوتا ہے اور قدرت بیان بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اختر اورینوی جزرسی میں تجربہ نگاری بھی خوب کرتے ہیں جن سے ہمارے ذہن میں شعور و آگہی کی روشنی آتی ہے۔ اور ہمیں زندگی کی پیچیدگیوں کا علم ہوتا ہے۔ اس نہج سے ان کا ناول ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

"حسرت تعمیر" پڑھنے کے بعد مجھے کرشن چندر کا ناول "شکست" یاد آیا۔ شکست نسبتاً چھوٹا ناول ہے۔ اس میں کشمیر کی دیہی زندگی کو پیش کیا گیا ہے اس کا موضوع محبت کی شکست ہے۔ اس ناول میں کئی سماجی مسائل بھی سامنے لائے گئے ہیں جو ترقی پسند رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کرشن چندر کا اپنا مخصوص نظریہ تھا۔ اور وہ اسی نظریئے کے تحت قلمکاری کرتے تھے اختر نے ان کی طرح ناول نگاری کو اپنے نظریئے کی اشاعت کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ اختر کے کردار سوشلزم یا کمیونزم کی حمایت نہیں کرتے۔ سماجی رسم و رواج سے بغاوت نہیں کرتے۔ اختر کے یہاں یہ بھی کوشش

نہیں ملتی کہ چمارن کو برہمن سے بیاہ دیں۔

کرشن چندر کا اصل موضوع محبت ہے۔ وہ نوجوانوں کی محبت ہو یا ادھیڑ عمر کے افراد کی۔ وہ عورت اور مرد کے باہمی جائز تعلق کو زندہ پیش کرتے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

کرشن چندر کی کہانیوں اور ناولوں میں عورت ہر جگہ ہے۔ وہ عورت اور مرد کے تعلق کے ذیل میں ہی سماج کے دوسرے مسائل اور تقاضے پیش کرتے ہیں۔ گویا عورت وہ خام مال ہے جسے کارخانے میں لا کر ڈھالا جاتا ہے۔ اختر اور رضوی بھی عورت کو خام مال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن عورت اور عورت سے محبت ہمیشہ اصل موضوع نہیں ہوتی۔ "شکست" اور "حسرت تعمیر" میں یہ بھی ایک فرق ہے۔

پلاٹ سازی اور کردار نگاری کی وہ خامیاں جو اختر اور رضوی کے یہاں ہیں۔ کرشن چندر کے یہاں بھی ہیں۔ "شکست" اس کی نمایاں مثال ہے اور منظر کشی اور جزئیات نگاری میں اختر اور رضوی کرشن چندر سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ اختر کے یہاں ہماری زندگی کی جو تفصیل اور حسن فطرت کی جیسی جھلک ملتی ہے وہ کرشن چندر کے رومانی اسلوب کے باوجود "شکست" میں موجود نہیں ہے۔ نتیجتاً کہنا پڑتا ہے کہ "حسرت تعمیر" شکست سے بہتر ناول ہے۔

اختر اور رضوی کا ڈراما "شہنشاہ حبش" فن ڈراما نگاری پر پورا نہیں اترتا۔ گو اس میں حبش کے بادشاہ اور اطالیہ کے آمر مسولینی کے درمیان جنگ کا معرکہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن وہ کشاکش نہیں جو ہمارے رونگٹے کھڑے کر دے۔ شاہ حبش کی بیٹی شہزادی فلورا اور حبش کے ایک فوجی افسر ڈیڈ شاہ سماچ کی محبت بھی دکھائی گئی ہے۔ لیکن کہیں کوئی کشمکش نہیں۔ پیچ و تاب نہیں اور ذہنی الجھن نہیں۔ ڈرامے میں حرکت تو ہے مگر بہت آہستہ دھیمی۔ جیسے کوئی ملاح دھیرے دھیرے جال کھینچ رہا ہو۔ حرکت و عمل میں کہیں شدت نہیں طغیانی نہیں۔ ڈرامے کا نقطۂ عروج ڈیڈ شاہ سماچ کی موت پر ابھرتا ہے۔ وہاں پر فلورا کی بے ہوشی اور شکستگی کو پیش کرنا مناسب حال ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی دکھانا ضروری تھا کہ جنگ پر اس کا کیا اثر پڑا۔ ڈرامے کا بنیادی خیال مسولینی اور شاہ حبش کی جنگ کو پیش کرنا ہے۔ اس لئے شاہ سماچ کی موت سے جو حبشی افواج کا کمانڈنگ افسر تھا۔ افواج کا انتشار، ان کی مکرر صف بندی، ان کا سرنڈر کرنا یا نئے جوش اور ولولے سے لڑنا، یہ ایسی باتیں تھیں جنہیں اسٹیج پر لانا ضروری تھا۔ اگر افواج میں بھگدڑ مچائی جاتی اور اطالیہ کی فوج کا روندنے والا انداز دکھایا جاتا تو مسولینی کے رعب و جلال کا نقش ابھر جاتا۔ یا حبش کی فوج شاہ سماچ کی موت کے بعد بھی جم کر لڑتی۔ اور مسولینی کے ناپاک ارادہ کو کچلنے کی کوشش کرتی تو میدان جنگ کا ہیبت ناک سماں ناظرین پر چھا جاتا۔ اور دوسری طرف شہنشاہ حبش کا اضطراب پیش کیا جاتا۔ مسولینی کی تدبیریں دکھائی جاتیں تو ناظرین پورے تجسس کے ساتھ انجام کا انتظار کرتے حقیقت تو یہ ہے کہ اس ڈرامے میں تجسس نام کی کوئی شئے نہیں ہے ہم ڈرامے کو پڑھ تو لیتے ہیں لیکن بے تابی سے نہیں پڑھتے اور نہ اس کی گرفت میں آتے ہیں۔

ڈراما نگار کو طویل بیان کی عادت ہے خواہ مخواہ مجلس اقوام کو سامنے لایا گیا ہے اور اس کی برائیاں تقریروں میں بیان کی گئی ہیں۔ اس سے ڈرامے کی وحدت اثر اور شدت عمل کافی مجروح ہوئی ہے۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ مجلس اقوام ایک کھیل ہے۔ مگر ڈرامے میں اس کی نکتہ چینی کا محل نہ تھا۔ ڈراما نگار نے کرداروں سے لمبی تقریریں تو کروائی ہیں لیکن مختصر، برمحل اور خوبصورت مکالمے شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ڈراما رستم و سہراب کے آگے ایک حقیر سی چیز معلوم ہوتا ہے۔

اختر اورینوی میں کہانی لکھنے کی فطری صلاحیت تھی۔ ان کے افسانوں کے پانچ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ اختر صاحب ذہین اور جذباتی تھے۔ ان کی طبیعت حساس تھی۔ وہ واقعات زندگی سے بہت جلد متاثر ہوتے تھے۔ اور متاثر نہ ہوتے تو افسانہ نہ لکھتے اور نہ شاعری کرتے۔

اختر اورینوی نے افسانوں کے علاوہ ایک ناول غالباً اس لیے لکھا تھا کہ ناول میں بیان کی وسعت ہوتی ہے اور یہ صحیح ہے کہ [illegible] ناول میں وسیع زندگی کو سمیٹا ہے اور اپنی جزرسی کی بنا پر وسیع زندگی کی نیرنگیوں کا گہرا مشاہدہ پیش کیا ہے۔ جزئیات زندگی کی تفصیل ان کی [illegible] وصف ہے۔ یہ چیز ہمیں ان کے افسانوں میں بھی ملتی ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کے افسانے بھی طویل ہوتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو نے اپنے ایک [illegible] ندیم قاسمی کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا:

”آپ بقدر ضرورت کفایت کو کام میں نہیں لاتے۔ آپ کا دماغ اسراف کا زیادہ قائل ہے۔۔۔ آپ کا۔۔۔ افسانہ پڑھ کر آپ اس بچے کی مانند نظر آئے جو سینما ہال میں فلم دیکھتے دیکھتے بیچ میں کئی بار بول اٹھتا ہے۔“

یہ بات اختر اورینوی کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ وہ کُل کو جُز میں پیش کر سکتے ہیں۔ مگر بعض دفعہ اس کی فنی اہمیت سے بے نیاز [illegible] طوالت پر اتر آتے ہیں۔ ایک مثال کافی ہوگی۔ ”ٹائپسٹ“ ان کا مشہور افسانہ ہے۔ اس میں وہ اس محلے کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں جہاں ٹائپسٹ [illegible] محلے کی گندگی، زبوں حالی اور دوسری باتوں پر طویل اقتباس لکھ دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ افسانہ نگار کا مقصد ”ٹائپسٹ کی زبوں حالی [illegible] یا محلے کی گندگی؟ ظاہر ہے کہ مرکزی نقطہ ٹائپسٹ ہے۔ یہ غریب ٹائپسٹ اچھے صاف ستھرے محلے کا بھی ہو سکتا ہے۔ اگر محلے کا تفصیلی ذکر [illegible] خیال میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ بلکہ میرے خیال میں صاف ستھرے محلے کا نقشہ کھینچنا اور ٹائپسٹ کے مکان کے سامنے عالی شان عمارت دکھانا فنی لحاظ سے زیادہ اثر بخش ہوتا کیونکہ اس سے لطافت و کثافت کا تضاد ظاہر ہوتا۔

اختر اورینوی کے افسانوں میں پلاٹ سازی کی خامیاں نہیں ہوتیں۔ وہ واقعات کو عضویاتی طور پر تشکیل دیتے ہیں۔ ان کی کہانی کے واقعات ایک دوسرے کے بطن سے نکلتے ہیں اس لئے ان میں گہرا ربط ہوتا ہے۔ لیکن ان کے افسانوں میں اچانک پن نہیں ہوتا ہے۔ وہ افسانے میں حیرت افزا موڑ دے کر تجسس کی فضا قائم نہیں کرتے۔ اور نہ افسانے کا راز ایک عرصے تک پوشیدہ رکھ کر آخر میں کھولتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان کے افسانے واقعاتی ہوتے ہیں، حادثاتی نہیں۔ واقعہ نگاری ہو یا منظر کشی، وہ ہر جگہ تفصیل کو راہ دیتے ہیں اور دھیرے دھیرے کہانی ختم کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ٹرین ہے جو مین لائن پر اپنی رفتار سے چلتے چلتے لوپ لائن پر چلی جاتی ہے اور دور تک جاتی ہے پھر دھیرے دھیرے رکتی ہے۔ اختر اورینوی کے افسانوں میں واضح نقطۂ عروج کا پتا بیک لمحہ اسی لئے نہیں ملتا۔

اختر اورینوی کی ناول نگاری پر لکھتے ہوئے میں نے کہا ہے کہ وہ بیانیہ انداز میں کردار نگاری کرتے ہیں۔ یہی انداز ان کے افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ وہ مکالمہ یا خود کلامی سے بہت کم معرف لیتے ہیں۔ اکثر وہ کرداروں کی سیرتی خصوصیات خود اپنی زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کردار از خود سامنے نہیں آتے بلکہ رپورٹڈ (REPORTED) ہو جاتے ہیں۔ اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کردار کی نفسیات کی کچھ پیچیدگیاں ادھ کھلی رہ جاتی ہیں۔ کردار خود چپ رہے تو افسانہ نگار کی وضاحتوں کے باوجود اس کے بہت سے عیوب پردۂ خفا میں پڑے رہتے ہیں۔ اختر اورینوی میں مکالمہ نگاری کی صلاحیت شاید نہ تھی اس لئے کہ اس کے اچھے نمونے ہمیں ان کی تخلیقات میں نہیں ملتے۔ مگر ان کا مشاہدہ بہت تیز تھا اور قوت تخیل زندہ۔ میرے خیال میں ان کی بیانیہ کردار نگاری کی وجہ یہی ہے کہ ان کو اپنے مشاہدے پر بڑا اعتماد تھا وہ کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ پہلے کر لیتے ہیں تب لکھتے ہیں۔ لازماً ان کا قلم بے اختیارانہ واقعات کی روانی کے ساتھ سیرت پر بھی چلتا جاتا ہے۔

اختر اور ینوی کے بعض افسانے کہانی سے زیادہ خاکے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اختر اور ینوی فرضی کہانیاں کم لکھتے ہیں۔ ان کی زیادہ سے زیادہ کہانیاں حقیقی ہیں۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول پر گہری نظر رکھتے ہیں اور آس پاس کے لوگوں سے گہرے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ لازماً ان کی قربت ان افراد سے ہو جاتی ہے اور جب وہ افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوتے ہیں تو وہی کردار و واقعات کہانی کے روپ میں ابھرتے ہیں اس لئے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں وہ ساری باتیں لکھ دیتے ہیں جو ان کرداروں میں پاتے ہیں۔ ایسی کہانیوں کو ہم خاکہ نما افسانے کہہ سکتے ہیں۔

اس ضمن میں اختر اور ینوی کی زبان کی خوبی ہماری توجہ کو خاص طور پر کھینچتی ہے۔ وہ کرداروں کی سماجی حیثیت اور ذہنی سطح کے مطابق زبان استعمال کرتے ہیں۔ ایک مثال کافی ہوگی۔

"پھر وچ جاؤ؟" نمبر والے دروازے پر کسی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ تیس سے رسے حرا مجادہ؟ ہم تیرے پر جاسک ہیں رے؟ کلکھو موہاں گلام جادہ! سات پست حرامجادہ کہے پھرے ہے کہ پھر وچ جان مجھ پر جاسک ہیں:"

یہ زبان نہیں اَن پڑھوں کی بولی ہے۔ کردار چونکہ ان پڑھ ہے، اس نے اس کا لہجہ اپنایا ہے۔ ایسی مثالیں ہر جگہ ہیں۔ بعض دفعہ اختر اور ینوی خود بھی اپنی عبارت میں عام بول چال کے دیہاتی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً:

انٹنا (یعنی سمانا) آڑن (یعنی پیچش) کماشت (یعنی کمانے والا) جفاکش، موچی (یعنی پوری) آتارن، اٹھوانی کھٹواتی، ٹُٹ پنجیے وغیرہ۔

زبان و بیان کی اس روش کو اختر اور ینوی کی بہاریت سے موسوم کرنا مناسب ہوگا۔ اور بہار کے افسانہ نگاروں میں یہ ان کی انفرادیت اور خصوصیت ہے وہ بہاری بولی کو بیباکی، فراخدلی اور جرأت سے استعمال کرتے ہیں اس سے ان کے ذخیرۂ الفاظ کا علم ہوتا ہے۔

اختر اور ینوی منظر اور پس منظر کے بیان میں کافی مہارت اور دلچسپی رکھتے ہیں وہ نہایت تفصیل اور جزرسی کے ساتھ مکان کو نقید قلم کرتے ہیں، کسی جگہ، بازار، میلے کا بیان ہو یا دریاد کہسار اور چمن و سبزہ زار کا ذکر، اختر اور ینوی جیتا جاگتا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ ان کا مشاہدہ کافی گہرا اور تخیل زندہ ہے۔ وہ اپنے مشاہدے اور تخیل کی بنا پر ایسی جزئیات نگاری کرتے ہیں جس کی مثال اردو افسانے میں کم ملتی ہے۔ ان کی منظر کشی کی اہم اور قابل قدر خوبی وہاں نظر آتی ہے، جب وہ کرداروں کے حسب حال مناظر دکھاتے ہیں اور تشبیہات و استعارات کے ذریعہ کرداروں کو مناظر سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ دو مثال ملاحظہ کیجئے:

(۱) "دن نکلتے ابر کا خیمہ غریب کی چادر کی طرح چیتھڑا چیتھڑا ہو چکا تھا، افق میں سورج کبھی ابر کے گالوں سے جھانکتا اور کبھی ان ہی ٹکڑوں میں اپنے آدھے حال کو دیکھ کر شرم سے منہ چھپا لیتا تھا۔"

یہ منظر افسانہ "کوئلے والا" میں پیش کیا گیا ہے جس میں غریب اور مفلوک الحال کوئلے والے کی زندگی کی جھلک ہے۔ آسمان میں ابر کے خیمے کو غریب کی چادر کی طرح چیتھڑا چیتھڑا کہنا اور سورج کے ہراساں ہونے و شرم سے منہ چھپا لینے کی کیفیت طرز دینا کیسی حسین فطری اور ہم آہنگ منظر کشی ہے! اس منظر سے کوئلے والے کی زبوں حالی پوری شدت سے نمایاں ہوتی ہے۔

(۲) "صبح ہوئی۔ مشرقی افق میں ابر کے کٹے کٹے ٹکڑے شفق آلود ہو کر یوں پھیلے ہوئے تھے جیسے مقتولین کے خون سے لت پت بریدہ جسم نے تھے۔"

یہ منظر افسانہ "کل آج اور کل" میں ہے جس میں ۱۹۴۷ء کے فسادات کا ذکر ہے۔ غور کیجئے کہ واقعات سے منظر کس قدر مماثل ہے۔ منظر وہی صبح کا ہے۔ آسمان میں ابر دونوں جگہ ہے لیکن جب کہ غریب کوئلے والے کی مناسبت سے چیتھڑا چیتھڑا ہے اور دوسری جگہ فسادات کی مناسبت سے

بیٹا ہیت خون اور اس میں لت پت بریدہ جسم کے حصے !

یہ اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کا منفرد اسلوب ہے ۔ یہیں پر ان کے فن کا کمال نظر آتا ہے ۔ انہیں بیان پر قدرت حاصل تھی ۔ وہ حالات و ظروف اور ماحول و مواقع کا عمیق و وسیع مشاہدہ رکھتے تھے اور ان سے بڑے اچھوتے تجربات حاصل کرتے تھے ، ان کی جزرسی کے نمونے ان کے افسانوں میں بکھرے پڑے ہیں اپنے افسانوں میں انہوں نے مشاہدہ اور تجربہ کا جو کشادہ دستر خوان بچھایا ہے وہ اردو کے نوجوان افسانہ نگاروں کے لئے خوان یغما سے کم نہیں ۔ کاش ہمارے نئے افسانہ نگار اس دستر خوان سے اپنے لئے کچھ حاصل کرسکتے !

اختر اورینوی کو دوسرے افسانہ نگاروں سے جو چیز منفرد کرتی ہے ، وہ یہ ہے کہ کسی ازم یا تحریک سے ان کے افسانوں کی وابستگی نہیں ۔ اختر اورینوی واقعات کی روشنی میں اپنے مشاہدات اور تجربات بیان کرتے ہیں ۔ انسانی زندگی بے شمار واقعات سے گزرتی ہے اور ہر انسان روزانہ طرح طرح کے [illegible] سے ملتا رہتا ہے ۔ اس کے سامنے نت نئے مسائل آتے ہیں ۔ انسان اپنے طور پر انہیں دور کرتا ہے اور دوسروں کو مسائل سے بچنے کی تلقین کرتا ہے لیکن ایک ادیب کوئی واعظی طریقہ نہیں اپناتا ۔ وہ کسی ایک مسلک یا ازم پر بھی زیادہ زور نہیں دیتا ۔ وہ زندگی کے جس رخ کو چاہتا ہے پیش کرتا ہے اور پوری شدت سے پیش کرتا ہے مگر اس کی حمایت میں نصیحت کے دفتر نہیں کھولتا اور نہ انقلاب کے نعرے لگاتا ہے ۔ وہ فنی لوازم اور نزاکتوں کو ہر حال میں فوقیت دیتا ہے ۔ فن کی عظمت وابستگی یا ناوابستگی میں مضمر نہیں ہے بلکہ اس بات میں ہے کہ ادیب کا قلم اس مظلوم کی طرح چلے جس کی بے زبانی بالآخر زبان بن جاتی ہے اور آستین کا لہو پکار اٹھتا ہے ۔ اس کے لئے بڑی تہہ داری ، اعلیٰ درجے کی تہذیب ، پختہ شعور اور زندہ [illegible] معرفت کی ضرورت ہے ۔ اس کے ساتھ اپنے خیالات ، احساسات اور تجربات کو آفاقی ، دائمی اور حسین بنانا بھی لازمی ہے ۔ اختر اورینوی ان آزمائشوں سے گزرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں ۔

اختر اورینوی بنیادی طور پر ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے تھے ۔ لیکن ترقی پسندوں کا رویہ انہیں پسند نہ تھا ۔ وہ نظریہ و تبلیغ اور بغاوت و اصلاح کے لئے ہٹ دھرمی کبھی نہیں کرتے ۔ ان کا نظریہ اگر ہے تو صرف یہ کہ فنکار کا مقصد حیات و کائنات کا مطالعہ و مشاہدہ کرنا ، تجربے حاصل کرنا اور اپنے مشاہدہ و تجربہ کو واقعات کی روشنی میں پیش کرنا ہے ۔ کیا خیر ہے ، کیا شر اور کیا غلط ہے ، کیا صحیح ، فنکار اس پر بحث نہیں کرتا ۔ ہاں روح کو آسودگی کیسے حاصل ہوگی ؟ وہ اس کی فکر ضرور کرتا ہے ۔ لازماً بالواسطہ طور پر وہ خیر سے منسلک ہو جاتا ہے اور خیر کی نشاندہی تہذیب سے نہیں ہوسکتی اس لئے کہ تہذیب کا معیار بدلتا رہتا ہے ۔ خیر کی نشاندہی صرف مذہب سے ہوتی ہے ۔ اسی لئے بڑے فنکار مذہب سے روشنی حاصل کرتے ہیں ۔ اختر اورینوی کے یہاں بھی یہیں مذہب کا [illegible] ۔ بہرحال فنکار روح کی آسودگی کے لئے خیر کی تلاش کرتا ہے اور نئی دنیا کی تشکیل کے لئے مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ یہ دنیا ناقص ہے ۔ یہ [illegible] فنکار دنیا کے نقص کو دور کرنے کے لئے ہی قلمکاری کرتا ہے اور [illegible] رہتا ہے ۔

ہندوستان میں جس وقت ترقی پسندی کا زور تھا ، اس وقت دنیا دو عظیم جنگوں کے درمیان تھی ، اس لئے انسان اپنے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں زیادہ حیران تھا ۔ اسے دنیا کے نقائص کا زیادہ احساس تھا ۔ ہمارے فنکاروں کے لئے اس ماحول میں ترقی پسندی مناسب معلوم ہوئی اس کے سوا چارہ کار نہ تھا ۔ پریم چند نے پہلی ترقی پسند کانفرنس کی صدارت [illegible] لیکن وہ ایک عظیم فنکار تھے ۔ وہ فن کی عظمت کا [illegible] تھے ۔ وہ وابستگی یا ناوابستگی میں زیادہ اعتبار نہیں رکھتے تھے ۔ انہیں انسانی روح کی آسودگی کی فکر تھی اس لئے انہوں نے اپنے افسانوں [illegible] ، دیہاتی دنیا کو آسودہ حال بنانے کی کوشش کی اور شہری زندگی کو جو پیچیدہ ، [illegible] اور تقابل ہوتی ہے ، اپنے